Proudly Presented by Paksociety.com
MAY 2011
خواتین ڈائجسٹ
سالگرہ نمبر
2
www.paksociety.com
www.paksociety.com
www.Paksociety.com

کہنی سنتی — مدیرہ — 14
کرن کرن روشنی — ادارہ — 15
ہمارے نام — نادرہ خاتون — 28

پیارے نبی کی پیاری باتیں

مشعلِ راہ — آمنہ زرین — 20
یاد ساتھ ہے — شاہین ملک — 23

تہنیت

میری امی — عنیزہ سید — 276

خواتین کی ڈائری

میری ڈائری سے — امت الصبور — 267

انٹرویو

نین فاطمہ — شاہین رشید — 270
لفظ روشنی ہیں — ادارہ — 25

ناول

چراغِ آخرِ شب — رفعت ناہید — 38

مکمل ناول

مصحف — نمرہ احمد — 216
ملائے نی میں — نبیلہ عزیز — 100
بکھر گئے گلاب — مریم ساجد — 156

ناولٹ

سفال گر — بشریٰ سعید — 186
معجزہ — عنیزہ سید — 68

افسانے

بھروسا — سیما بنت عاصم — 58
کھوکھلی عورت — کنیز نبوی — 87
دل دروازہ کھولے — رخ چوہدری — 92
دردِ آشنا — راشدہ نعمت — 149
چند لفظوں کی ریست — مصباح گل — 254

غزل — فراق گورکھپوری — 261
غزل — سعود عثمانی — 261
نظم — ظریف احسن — 260
غزل — افضل خان — 260

رنگارنگ سلسلے

رنگارنگ سلسلہ — شگفتہ جاہ — 262
خبریں و ریں — غزل نوشاں — 280
روشن حرف — ماہتاب گل رانا — 268

میری بیاض سے

آپ کی بیاض سے — خالدہ جیلانی — 265

پکوان

آپ کا باورچی خانہ — اسماء اقبال — 286
موسم کے پکوان — خالدہ جیلانی — 283

نفسیات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں — عدنان — 288

بیوٹی بکس

بیوٹی بکس کے مشورے — امت الصبور — 290

مئی 2011
جلد 39 شمارہ 1
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

خواتین ڈائجسٹ کا مئی کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

زندگی ایک خوبصورت احساس اور اس کا انجام ایک تلخ حقیقت ہے جسے انسان کا دل تسلیم نہیں کر پاتا کر اپنوں سے جدائی بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔

ریاض صاحب کو دنیا سے رخصت ہوئے دس سال گزر گئے۔ ایک شفیق ہستی سے محرومی کا دکھ بھلانا آسان نہیں لیکن باعث اطمینان یہ ہے کہ ان کا مشن، ان کا عمل آج بھی اسی تسلسل سے رواں دواں ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کا اجرا کرتے ہوئے ریاض صاحب کے سامنے ایک واضح نصب العین تھا۔ خواتین کے ذہنوں کو اُجالنا، انہیں باہر کی دنیا کی اونچ نیچ سے روشناس کرانا اور ان کے اخلاق و کردار کی تعمیر۔ اسی مقصد کو سامنے رکھ کر انہوں نے پہلے خواتین پھر کرن اور اس کے بعد شعاع کا اجرا کیا۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ سے شائع ہونے والی تحریروں نے ایک مثبت سوچ پیدا کی۔ خواتین میں لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا کیا۔ وہ خواتین جو گھر کی چار دیواری میں رہتی ہیں، ان کی سوچ میں نکھار آ گیا۔ خاص طور پر ان میں جو شعور بیدار ہوا، اس نے معاشرے میں ایک مثبت تبدیلی کی بنیاد رکھی۔

ریاض صاحب کی شخصیت میں قدرت نے بہت سی خوبیاں یکجا کر رکھی تھیں۔ ان کے دوست، احباب، رشتہ دار اور ان کے ساتھ ادارے میں کام کرنے والے سب ہی ان سے محبت کرتے تھے۔

آج وہ ہم میں موجود نہیں ہیں مگر ان کی یادیں آج بھی ذہن کا حصہ ہیں۔

10 مئی کو ریاض صاحب کی برسی کے موقع پر قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو ہمیشہ اپنے سایۂ رحمت میں رکھے۔ آمین۔

تصویریں بناتے جائیں،

مصنفین کے شخصی خاکوں کا سلسلہ اس ماہ شامل نہ ہو سکا۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ آپ یہ سلسلہ پڑھ سکیں گی۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول ۔ مصحف،
- عنیزہ عزیز کا مکمل ناول ۔ مانے نی میں کنوں آکھاں،
- مریم ماجد کا مکمل ناول ۔ نکھر گئے گلاب سارے،
- عنیزہ سید اور بشریٰ سعید کے ناولٹ،
- کنیز نبوی، رُخ چوہدری، سیما بنت عاصم، راشدہ رفعت اور مصباح گل کے افسانے،
- رفعت ناہید سجاد کا ناول ۔ چراغ آخر شب،
- خواتین کرکٹ ٹیم کی کپتان ثنا میر سے ملاقات،
- لفظوں دوستی ہیں ۔ قارئین سے سرسلے،
- کرن کرن روشنی ۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی اُلجھنیں اور دیگر دلچسپیاں شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ پڑھ کر اپنی رائے ضرور دیجیے۔ ہم آپ کے خطوط اور ای میلز کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

اللہ کے شکر گزار بندے

حضرت ابو کنود (عبداللہ بن عامر) ازدی رحمتہ اللہ نے حضرت خبابؓ سے روایت کرتے ہوئے اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں یہ حدیث بیان فرمائی (ارشاد باری تعالیٰ ہے)

"اور ان لوگوں کو اپنے سے دور مت کریں جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے (اور اس کی عبادت کرتے) ہیں۔ وہ اپنے رب کا چہرہ (رضامندی) چاہتے ہیں۔ ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بوجھ ان پر نہیں اور آپ کے حساب میں سے کسی چیز کا بوجھ ان پر نہیں، پھر اگر آپ ان کو اپنے سے دور کریں گے تو آپ ظالموں میں سے ہو جائیں گے۔" (سورۃ انعام)

حضرت خباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا (قبول اسلام سے پہلے) حضرت اقرع بن حابس تمیمی اور حضرت عیینہ بن حصن فزاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمزور (نادار) مسلمانوں کی جماعت میں حضرت صہیب، حضرت بلال، حضرت عمار اور حضرت خباب رضی اللہ عنہم اور ایسے ہی کچھ دوسرے غریب اور کمزور مومنوں کے ساتھ تشریف فرما ہیں۔ جب انہوں نے ان حضرات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد بیٹھے دیکھا تو انہیں حقیر جانا۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تنہائی میں بات کی اور کہا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے ساتھ (الگ سے) تشریف رکھیں، تاکہ اہل عرب کو ہماری فضیلت (اور بلند مقام) کا پتہ چلے کیونکہ آپ کے پاس عرب (کے مختلف علاقوں) کے وفد آتے ہیں اور ہمیں اس بات سے شرم محسوس ہوتی ہے کہ عرب کے لوگ ہمیں ان غلاموں کے ساتھ بیٹھے ہوئے دیکھیں اس لیے جب ہم آپ کے پاس آیا کریں تو آپ انہیں اپنے پاس سے اٹھا دیا کریں۔ جب ہم فارغ ہو جائیں تو پھر آپ چاہیں تو ان کے ساتھ بھی تشریف رکھیں۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ٹھیک ہے۔"

انہوں نے کہا۔ "ہمیں (اس معاہدے کی) ایک تحریر لکھ دیجیے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھنے کا سامان طلب فرمایا اور لکھنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلا لیا۔ ہم (غریب مسلمان) ایک طرف بیٹھے تھے۔

اتنے میں جبرئیل علیہ السلام اترے اور (وحی کی آیات سناتے ہوئے) فرمایا پھر اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا (جو اس وقت غیر مسلم تھے) اور فرمایا۔

"اور اسی طرح ہم نے بعض کو بعض کے ذریعے سے آزمائش میں ڈالا ہے تاکہ وہ لوگ (انہیں دیکھ کر) کہیں کیا ہم میں سے یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے احسان کیا ہے؟ کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو (ان سے) زیادہ نہیں جانتا؟ پھر فرمایا اور جب آپ کے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں تو کہہ دیجیے تم پر سلام ہو۔ تمہارے رب نے مہربانی کو اپنے ذمے لازم کرلیا ہے۔"

حضرت خباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں چنانچہ ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آگئے حتیٰ کہ ہم نے آپ کے گھٹنوں سے اپنے گھٹنے ملا دیے۔ پھر (یہ کیفیت ہو گئی کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ کافی دیر تک بیٹھے رہتے۔ پھر جب آپ اٹھنا چاہتے تو تشریف لے جاتے اور ہمیں بیٹھے رہنے دیتے۔

تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

"اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھیے جو صبح شام اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ وہ اس کی رضا کے طالب ہیں۔ آپ کی نظریں انہیں چھوڑ کر دوسروں لوگوں کی طرف نہ جائیں (ان سرداروں کے ساتھ نہ بیٹھیں) کہ آپ دنیا کی زندگی کی زینت چاہنے لگیں اور آپ اس شخص کی بات نہ مانیں جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے (عیینہ اور اقرع وغیرہ کی) اور جو اپنی خواہش کے پیچھے چلتا ہے اور اس کا معاملہ حد اعتدال سے ہٹا ہوا ہے (ہلاکت کا باعث ہے۔)"

صحابی بیان کرتے ہیں اس سے مراد عیینہ اور اقرع کا معاملہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے دو آدمیوں کا واقعہ بیان فرمایا اور دنیا کی زندگی کی مثال بیان فرمائی۔

حضرت خباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا (اس کے بعد) ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھتے تھے لیکن جب وہ وقت آتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اٹھنے کا (روز مرہ کا) ہوتا تھا تو ہم خود ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر اٹھ جاتے تھے تاکہ آپ بھی تشریف لے جاسکیں۔

فوائد و مسائل: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی ہدایت کا اتنا خیال تھا کہ اس کے لیے بعض ایسی شرائط بھی تسلیم کرنے کا سوچا جو حقیقت میں آپ کو انتہائی ناگوار تھیں۔

اللہ تعالیٰ مخلص مومنوں کی خواہشات پوری فرماتا ہے۔

اگرچہ زبانی معاہدہ بھی واجب العمل ہوتا ہے' تاہم لکھ لینا بہتر ہے۔

اس واقعہ سے قدیم الاسلام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام اور ان کی عظمت واضح ہے۔

پہلے اسلام لانے والے صحابہ بعد میں اسلام لانے والے صحابہ رضی اللہ عنہم سے افضل ہیں' تاہم بعد والے بھی واجب الاحترام ہیں اور تابعین سے افضل ہیں۔

مربی اور معلم کو چاہیے کہ مخلص ساتھیوں کے جذبات کا خیال رکھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا معمول بھی درست تھا کہ جب ضرورت محسوس فرماتے مجلس سے اٹھ جاتے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیٹھے رہتے تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھے ہوئے مسائل یاد کریں اور ایک دوسرے سے وہ احادیث سنیں جو براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی ہوتی تھیں۔

بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو زیادہ سے زیادہ

استفادے کا موقع عنایت فرمائیں' اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ دیر تک تشریف رکھتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے محسوس کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرز عمل سے مشقت اٹھانی پڑتی ہے' اس لیے وہ خود ہی مناسب وقت پر مجلس برخاست کر دیتے تھے تاکہ آپ کو آرام و استراحت اور دوسرے ذاتی امور کے لیے کافی وقت مل سکے۔ استاد کو چاہیے کہ طلبہ کو زیادہ سے زیادہ استفادے کا موقع دے لیکن طلبہ کو بھی چاہیے کہ وہ استاد پر زیادہ بوجھ نہ ڈالیں۔

حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

یہ آیت ہم چھ افراد کے بارے میں نازل ہوئی ہے' میرے بارے میں' حضرات عبداللہ بن مسعود' صہیب' عمار' مقداد اور بلال رضی اللہ عنہم کے بارے میں۔ انہوں نے فرمایا قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہم ان (غریب افراد) سے کم تر نہیں بننا چاہتے' لہٰذا انہیں اپنے پاس سے ہٹا دیجیے۔ اس بات سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں اللہ کی مشیت سے کوئی خیال آیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی۔

"ان لوگوں کو اپنے پاس سے مت ہٹائیے جو صبح شام اپنے رب کو اس کی رضا کے حصول کے لیے پکارتے ہیں۔"

زیادہ مال رکھنے والوں کا بیان

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

"زیادہ مال رکھنے والوں کے لیے ہلاکت ہے' مگر جس نے مال کو اس طرح' اس طرح' اس طرح اور اس طرح (خرچ) کیا۔" یہ فرماتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں' بائیں' آگے اور پیچھے چاروں طرف (ہر طرف ایک بار) ارشاد فرمایا۔

فوائد و مسائل: مال حرص اور بخل کے ذریعے سے جمع ہوتا ہے اور یہ دونوں مذموم خصلتیں ہیں۔

جائز طریقے سے کمایا ہوا مال بھی اللہ کی راہ میں اور نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا ضروری ہے' اپنی ذاتی آسائشات اور تعیشات پر مال صرف کرنا درست نہیں۔

سخاوت کرنے والا ہلاکت سے محفوظ ہو جاتا ہے کیونکہ اس کا مال اس کے لیے نیکیوں میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ جس قدر زیادہ خرچ کرے گا' اتنا ہی جنت میں بلند درجات کا مستحق ہوگا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"زیادہ مال والے قیامت کے دن (دوسروں سے درجات میں) نیچے ہوں گے' مگر جس نے مال کو اس طرح اور اس طرح خرچ کیا' اور اس کی کمائی پاک (اور حلال ذرائع) سے ہوئی۔"

فائدہ: سخاوت سے اس شخص کو فائدہ ہو سکتا ہے جس کی کمائی حلال ہو' لہٰذا حرام کمائی سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔

زیادہ مال

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"زیادہ مال والے زیادہ نیچے ہوں گے' مگر جس نے اس طرح' اس طرح اور اس طرح خرچ کیا۔" (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے) تین بار (اشارہ) فرمایا۔

سخاوت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر میرے پاس احد پہاڑ جتنا سونا ہو تو میں نہیں چاہوں گا کہ مجھ پر تیسری رات آئے اور (اس وقت بھی) اس میں سے کچھ میرے پاس (بچا ہوا) موجود ہو' مگر اتنی چیز جسے میں قرض کی ادائیگی کے لیے سنبھال رکھوں۔"

فوائد و مسائل: اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سخاوت کا بیان اور امت کے لیے ترغیب

ہے۔

احد ایک بڑا پہاڑ ہے' اتنا سونا دو تین دن میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا اس کے باوجود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہی تھی کہ اگر اتنا مال بھی ہو تو وہ بھی دو تین دن میں مکمل طور پر تقسیم کر دیا جائے۔

قرض کی ادائیگی قرض خواہ کا حق ہے' اس کی ادائیگی سخاوت سے اہم ہے۔

قرض لینا دینا جائز ہے' لیکن قرض لیتے وقت یہ نیت ہونی چاہیے کہ جلد از جلد ادا کر دیا جائے گا۔

سنبھال رکھنے کی ضرورت تب پیش آ سکتی ہے جب ادائیگی کا مقرر وقت آنے میں کچھ وقفہ باقی ہو تاکہ جب قرض خواہ مطالبہ کرے تو ادائیگی کا اہتمام کرتے ہوئے ادائیگی میں تاخیر نہ ہو جائے۔

اگر قرض خواہ قریب موجود ہو تو مقررہ وقت سے پہلے خود جا کر ادائیگی کر دینا افضل ہے لیکن اگر اس سے رابطہ مشکل ہو تو رقم سنبھال کر رکھنا مناسب ہے' تاکہ ادائیگی جلد از جلد کی جا سکے۔

حضرت عمرو بن غیلان ثقفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یا اللہ! جو شخص مجھ پر ایمان لایا' میری تصدیق کی اور اس نے (دل سے) جان لیا کہ میں جو (شریعت) لے کر آیا ہوں وہ تیری طرف سے حق ہے تو اسے کم مال اور اولاد دے' اور اسے اپنی ملاقات کی محبت نصیب فرما اور اسے جلدی موت عطا فرما۔ اور جو مجھ پر ایمان نہ لایا' میری تصدیق نہ کی اور یہ یقین نہ کیا کہ میں جو (شریعت) لے کر آیا ہوں وہ تیری طرف سے حق ہے' اس کو بہت مال اور اولاد دے' اور اس کی عمر طویل فرما دے۔"

دعا

حضرت نقادہ (بن عبداللہ) اسدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک آدمی کی طرف بھیج کر اس سے ایک اونٹنی طلب فرمائی۔ اس شخص نے (اونٹنی دینے سے) انکار کر دیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک اور آدمی کی طرف بھیجا۔ اس نے ایک اونٹنی بھجوا دی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی کو دیکھا تو فرمایا۔

"یا اللہ! اس میں برکت عطا فرما اور اسے بھیجنے والے کو بھی۔"

حضرت نقادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا میں نے کہا جو اسے لے کر آیا (اس کے لیے بھی برکت کی دعا فرمائیں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اور جو اسے لے کر آیا۔" (اللہ اسے بھی برکت دے۔)

پھر آپ کے حکم سے اسے دوہا گیا' اس نے بہت دودھ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پہلے شخص کے بارے میں' جس نے انکار کر دیا تھا' فرمایا۔

"یا اللہ! فلاں کا مال زیادہ فرما۔ اور جس نے اونٹنی بھیجی تھی اس کے حق میں فرمایا۔"

"یا اللہ! اس کو روز کا رزق روز دے۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہلاک ہو جائے (تباہ ہو جائے) دینار کا بندہ' درہم کا بندہ' کمبل کا بندہ اور چادر کا بندہ۔ اگر اسے دیا جائے تو خوش رہتا ہے' اگر نہ دیا جائے تو (بیعت یا اللہ کا وعدہ) پورا نہیں کرتا۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہلاک ہو جائے دینار کا بندہ' درہم کا بندہ اور چادر کا بندہ۔ ہلاک ہو جائے' اوندھا ہو جائے' اسے کانٹا لگے تو نکالا نہ جائے۔"

فوائد و مسائل: دنیا کا لالچ مذموم ہے۔ جب محبت و نفرت کی بنیاد محض دنیوی مفاد پر ہو جائے تو خلوص باقی نہیں رہتا۔ اس صورت میں خلیفۃ المسلمین یا اس کے نائب سے بیعت بھی اللہ کی رضا کے لیے اور اسلامی سلطنت کی حفاظت اور خدمت کے لیے نہیں ہوتی' اس طرح یہ عظیم نیکی بھی تمام برکات سے محروم ہو کر برائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

دینی جماعتوں اور تنظیموں سے تعلق اللہ کی رضا اور ثواب کے لیے ہونا چاہیے۔ اسی نیت سے عہدہ اور ذمہ داری قبول کی جائے۔ اگر محسوس ہو کہ محنت کرنے کے باوجود جماعت میں اہمیت تسلیم نہیں کی جا رہی تو اکابر سے ناراض ہو کر جماعت سے الگ نہ ہو جائے۔ ہاں' اگر یہ محسوس کیا جائے کہ جماعت یا تنظیم کے عہدیدار صحیح انداز سے کام نہیں کر رہے اور توجہ دلانے کے باوجود اصلاح پر آمادہ نہیں تو خاموشی کے ساتھ تنظیم سے الگ ہو جائے۔

درہم و دینار کے بندے سے مراد وہ شخص ہے جو دنیا کے مال و دولت کی اتنی خواہش رکھتا ہے کہ اس کی تمام سرگرمیوں کا محور حصول دولت بن کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح وہ دولت سے خدمت لینے کے بجائے دولت جمع کرنے اور سنبھالنے میں مصروف رہتا ہے' گویا دولت اس کا آقا یا معبود ہے اور وہ غلام یا پجاری۔

دولت کے پجاری کے لیے بددعا کی گئی ہے کہ وہ تباہ ہو جائے۔ منہ کے بل گرنے اور سر کے بل اوندھا ہو جانے سے یہی مراد ہے۔ کانٹا نہ نکالے جانے سے مراد یہ ہے کہ وہ مشکلات میں پھنسا رہے اور اس کی مدد اور نجات کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔

قناعت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "امارت سامان کی کثرت سے نہیں ہوتی بلکہ امیری تو دل کی امیری ہے۔"

فوائد و مسائل: انسان دولت اس لیے حاصل کرتا ہے کہ اس کے کام چلتے رہیں لیکن جب دولت خود مقصود بن جائے تو پھر مال و دولت کی کثرت کے باوجود وہ سکون و اطمینان حاصل نہیں ہوتا جس کے لیے کوشش کی جاتی ہے۔

قناعت کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے پاس موجود رزق کو کافی سمجھے اور اپنی ضروریات کو اس حد تک محدود کر لے کہ حلال روزی میں گزارہ ہو جائے۔

دولت مند وہ ہے' جس کا دل دولت مند ہے اور دل دولت مند تب ہوتا ہے جب اس میں حرص اور بخل نہ ہو۔ ایسا آدمی تھوڑے سے مال سے اتنی خوشی حاصل کر لیتا ہے جو حریص آدمی کو بہت زیادہ مال سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔

کامیاب

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کامیاب وہ ہے جسے اسلام کی ہدایت مل گئی' ضرورت کے مطابق رزق مل گیا اور وہ اس پر قانع ہو گیا۔"

فوائد و مسائل: اسلام سب سے بڑی دولت ہے کیونکہ اس سے آخرت میں جنت ملتی ہے' جس سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔

"رزق کفاف" کا مطلب اتنی روزی ہے' جس سے بنیادی ضروریات' بغیر فضول خرچی کے' پوری ہوتی رہیں اور قرض اٹھانے کی ضرورت نہ پڑے۔

کامیابی دولت کے ڈھیر جمع کرنے کا نام نہیں بلکہ موجود رزق پر قناعت اور شکر اصل دولت اور بڑی کامیابی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یا اللہ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر والوں کو ضروری حاجات کے مطابق رزق عطا فرما۔"

فوائد و مسائل: انسان کو چاہیے کہ اپنے گھر والوں کے لیے بھی اچھی عادات و خصائل کی خواہش رکھے۔ ضرورت کے مطابق رزق کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ نہ ملے جسے جمع کر کے رکھا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زہد و قناعت امت کے لیے بہترین نمونہ ہے۔

☆

مشعلِ راہ

آمنہ زرین

زندگی کا سب سے بڑا راز ــــ جس پر ہمارے جینے کی خواہش اور اس کے لوازمات کا پردہ پڑا رہتا ہے ــــ موت ہے!

"اس حقیقت کو جتنا مرضی جیسے مرضی لول کر بدل کر ــــ رخ پلٹ کر۔ الٹ کر دیکھ لیں ــــ یہ جوڑ کوئی بھی توڑ نہیں سکتا۔ اور یہ بے اختیاری ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ہم خدا نہیں ہیں ــــ خدا کوئی اور ہے! لیکن صبح و شام کے آنے جانے کو معمول سمجھنا ــــ کاروبار حیات میں چڑھنا اور اترنا۔ موت کے مختلف ذائقوں کو چکھنا ــــ ہمیں اس قانون کی یاد دہانی تو کرواتا ہے۔ یاد رہنے نہیں دیتا!

موت سے منسوب خوف ہمیں موت کی طرف سے رخ پھیر کے کھڑا ہونے پر مجبور کرتا ہے ــــ مہلت کم ہے۔ یہ دھمکی ہمیں ہر روز ملتی ہے ــــ مگر ہم اس دھمکی کو جد زندگی میں شامل نہیں کرتے ہیں۔ یہ چیز ہماری حیات کی ترجیحات کا تعین کرتی ہے۔

زندگی بڑی ہے؟ کہ موت کا خوف؟ یا پھر خود موت ہی سب سے بڑی ہے؟

یہ تین سوال نہیں ہیں۔ یہ زندگی گزارنے کے اپنے اپنے ڈھب ہیں۔ زندگی بڑی کب ہوتی ہے؟ کیا سانسوں کی گنتی بڑھ جانے سے؟ یا آسائش کے طویل ہو جانے سے؟

زندگی ختم ہو جاتی ہے؟ جب چلتی ہوئی سانس کی گواہی نہ ملے؟ یا پھر وجود کو حلقۂ احباب سے دوری کا اذن مل جائے؟

جی نہیں ــــ!

زندگی کے حجم کو بڑا کرنے کے لیے نہ سانسوں کا سرمایہ کام آتا ہے۔ نہ دھن دولت کے انبار ــــ اور نہ ہی زندگی موجود کے عدم ہو جانے سے فانی ہو جاتی ہے!

فانی تو وجود ہے ــــ حیات موجود ہے ــــ بعد از حیات بھی ــــ بعد از مرگ بھی ــــ! زندگی کو جب دوسروں کے لیے جیا جائے تو مہلت کے ختم ہو جانے پر ــــ مہلت تو کم لگتی ہے ــــ لیکن زندگی بڑی ہو جاتی ہے!

زندگی انسان ہر دو طرح سے ویسے جیتا تو دوسروں ہی کے لیے ہے۔ اور وہ جو اوڑھے اس کی زندگی دوسروں کے لیے ہی صرف ہوتی ہے۔ مثلاً "دوسرے کون؟ یہ دوسرے خاندان، دوست احباب، ماں باپ، اولاد ــــ رشتے دار ــــ ساتھی ــــ!

جب وہ خود کو نمایاں کرنے کی تگ و دو میں برسرپیکار ہوتا ہے تب بھی ــــ وہ دوسروں ہی کی خاطر جیتا ہے۔ کہ ان کو دکھا سکے کہ وہ کس قدر باصلاحیت ہے۔ انہیں ہی کو دکھانے ــــ بعض اوقات ہم اسے بھی دوسروں ہی کی خاطر جیتے ہیں ناں ــــ؟

لیکن دوسروں کی یہ صف جب اپنے پرائے کی حد بندی کو ختم کرتی ہے۔ جب یہ ظاہری اسباب کی قدر و قیمت میں کمی بیشی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ ان دوسروں میں شامل ہونے کے لیے حسب نسب نہیں پوچھا جاتا۔

تو اس زندگی اور ایک عام گزر جانے والی زندگی میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

عام سے مراد؟ کیا عام لوگوں میں ہم محض محروم وسائل لوگوں کو شمار کرتے ہیں۔ جن کو روزی روٹی کے لیے نامناسب حالات میں ناپسندیدہ مشقت کرنی پڑتی ہے۔

جی نہیں!

دھن دولت۔ اسباب و وسائل نام و نمود۔ مقدر کا سکندر جیسی خوبیوں سے مرقع لوگ بھی عام زندگی گزار جاتے ہیں۔ جب وہ محض اپنے اور اپنے اپنوں کے لیے زندگی سے لڑ بھڑ کر اپنا حصہ کامیابی کی صورت وصول کر رہے ہوتے ہیں!

کولہو کے بیل صرف وہ مزدور نہیں ہیں ــــ جو صبح سے شام مشقت کی زندگی گزارتے ہیں۔ وہ بھی ہیں۔ جو اپنی اعلا ترین صلاحیتوں کو حاصل بھی پیسے کے بل بوتے پر کرتے ہیں۔ اور جب خرچ کرتے ہیں۔ تب بھی حاصل صرف پیسہ کرتے ہیں۔

یہ مئی کا مہینہ ہے۔

سارا سال ہم جن کو تصور میں آباد اور خیال کو شاد رکھتے ہیں۔ یہ برسی آکر ہمیں پھر سے حقیقت کی دھوپ تلے کھڑا کر دیتی ہے۔

دس مئی محمود ریاض صاحب کی برسی کا دن ہے۔ اس بار مجھے یہ اعزاز بخشا گیا ہے کہ اس دفعہ ان کی یاد میں کچھ لفظ نذرانۂ عقیدت کے طور پر پیش کروں۔ اور محبت، حرمت، اقدار کے تحفظ کا عزم لیے جو قافلہ انہوں نے تشکیل دیا تھا۔ میں بھی اس کا حصہ ہونے کا اعتراف کروں۔

اس قافلے کا حصہ کون نہیں؟

ہر پڑھنے والا اس کارواں کا حصہ ہے۔

یہ محض وقت گزاری کی دلکش ترغیب نہیں۔ بلکہ ایک سوچ۔ ایک فلسفہ اور ایک خاموش تحریک ہے۔ خاموش اس لیے نہیں کہ مکالمہ بازی نہیں۔ بلکہ اس لیے کہ بلند و بانگ انقلاب کے دعووں کے بغیر اس کی رسائی ذہنوں تک ہے۔

آج میں سوچتی ہوں۔ تو مجھے خیال آتا ہے۔ کیونکہ ہر حاصل شدہ چیز کو انسان بس استعمال کر لیتا ہے مگر اس کی دستیابی کے مراحل پر غور کرنے کی مہلت کم ہی پاتا ہے۔ خواب بھی محض خیال کا سندر روپ نہیں۔ بلکہ خواب کے بھی بخت ہوتے ہیں۔ بلند بھی اور پست بھی۔

ہم میں سے کبھی کسی نے 39 سال پہلے دیکھے جانے والے ایک خواب کو بھی سوچا؟ سوچیے۔ کسی کے کیے ہوئے تجربے۔ دیکھے ہوئے خواب کو سوچنا بھی ہمیں ایک نئی دنیا سے روشناس کرواتا ہے۔

اس خیال کی ندرت خود آپ اپنی مثال ہے۔

اور انہوں نے محض خواب دیکھا نہیں۔ کاشت کر دیا ــــ فکر کی زرخیز زمین میں انہوں نے اس

خواب کا بیج بو دیا۔ جس کی تعبیر نے نہ صرف ان کی حیات کو روشن کیا۔ بلکہ آنے والی کئی نسلوں تک اس روشنی کی شعاعیں پہنچ رہی ہیں۔

لیکن کیا محض بو دینے ہی سے کبھی فصل لہلہاتی ہے؟

روشن تعبیریں پانے کے لیے۔ خواب کاشت کرنے کے لیے۔ ہاری اپنی لگن سے آبیاری کرتا ہے۔ کڑے موسموں کو جھیلتا ہے۔ اقدار کی پاسداری، نظریات کا تحفظ۔ تخلیق سے محبت اور خالق کی شناس اور تلاش۔ ان تھک محنت اور خالص جذبہ۔ محبت اور محض محبت!

کیا ہمیں اپنے شمارے سے محبت نہیں؟

تو یہ اسی محبت کا فیض ہے!

ہے نا؟

ہمیں ہمارا شمارہ ملتا رہا۔ کیسی ہی قیامت کیوں نہ گزر گئی۔ مگر نظام چلتا رہا۔

کیا یہ حقیقت بذات خود استقلال کی کہانی نہیں؟ کیا یہ حقیقت خود، حقیقت شناس رویے کا مظہر نہیں کہ قدرت کا کام قادر ہونا ہے۔ اور بندے کا کام محض اپنے فرض کی ادائیگی۔ اب وہ اس فرض کو محض اپنے وجود تک محدود کرے یا فلاح عامہ کی طرف۔۔۔ تو پھر یہ اس کے بخت ہیں!

تو پھر؟

زندگی ختم ہو گئی؟

"ہاں۔ ہو تو گئی۔ مگر کیا واقعی۔؟ یہ خاتمہ ہے؟

خواب سے حقیقت تک کے اس سفر میں کارواں چلتا رہے گا۔

سالار کارواں کو بھول پائے گا؟ اور آخر میں شاید میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ زندگی کارزار ہستی ہے۔ یہاں ڈٹے رہنا ہی بہادری ہے۔

محمود ریاض صاحب کی تمام زندگی ہمارے سامنے نہ سہی۔ ان کی زندگی کے چند گوشے تو ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ خواتین، شعاع، کرن ہی کی بدولت ہمارے لیے وجود میں آیا۔

اور اس کی تشکیل، ترسیل میں ان کی شبانہ روز ان تھک محنت اور لگن کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ جواں سال بیٹوں کی مرگ ناگہانی کے صدمے جھیل کر بھی ان کے پایۂ استقلال میں لغزش نہ آئی۔

مگر دل تو ان کا۔ ایک دل ہی تھا نا۔ کب تک سہتا؟

مگر میں ان الفاظ کے توسط سے ہر ایک تک یہ بات پہنچانا چاہتی ہوں کہ ایسی زندگیاں ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ ہمارے لیے بالواسطہ سیکھنے کا ذریعہ ہیں۔

سخاوت صرف مال کی نہیں ہوتی۔ یہ اخلاق، علم اور محبت کی بھی ہوتی ہے۔ یہ زندگی کو قیمتی بنانے والے وقت کی بھی ہوتی ہے۔

اور آپ ہی بتائیں کہ سخاوت کبھی کوئی محض اپنے ساتھ روا رکھ سکتا ہے؟ یہ تو دوسروں ہی کے ساتھ جڑے رہنے والا عمل ہے۔ جو آپ کو کسی بھی لمحہ ان سے الگ ہونے ہی نہیں دیتا۔ وہ من دولت کی سخاوت سے بڑی سخاوت ہے۔ اپنے نظریات، اپنے تدبر اور وقت کو دوسروں کے لیے خرچ کرنا۔

اور اس کا اجر، اس کا نتیجہ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ تو پھر کیا یہ انسپائریشن نہیں؟

محمود ریاض صاحب کی زندگی کی جہد مسلسل، استقامت، بلند نگاہی، اپنی اقدار سے وابستگی تو ان کی کامیابی کیا ہمارے لیے امید کی کرن نہیں؟

خدائے کل کائنات سے استدعا ہے کہ ان کے کارواں کو رواں دواں رکھے

اور ان کے طرز زندگی سے دوسروں کو فیض ملتا رہے

اور ہمیں بھی اس فیض سے حصہ ملتا رہے۔

اللہ ان کے درجات کی بلندی کا تسلسل جاری رکھے۔ (آمین)

☼

یاد سا تجھے

شاہین ملک

ریاض صاحب کو دیکھتے ہی جو پہلا تاثر ہوتا تھا کہ ان کا چہرہ پوری ایک کہانی کی طرح "اتار چڑھاؤ" خوشی و غمی، ناراضی اور شفقت یعنی اس تصویر میں اس قدر رنگ ہوا کرتے تھے کہ بس فورا" اپنے مزاج کے مطابق فیصلہ کر لیجیے کہ آپ کو کتنا بولنا ہے اور کتنا سننا ہے۔ اچھا بولنا ہے یعنی کوئی اچھی بات ان کے مزاج کے مطابق کرنی ہے یا خاموش رہنا ہے۔

مجھے ان کے مزاج سے بہت ڈر لگتا تھا حالانکہ انشا جی تو بڑے تھے اور ریڈیو پروگرام میں ہمارے جج بنتے "کبھی "حسیر حاصل" پروگرام میں ہم ان کی کتاب پر کچھ لکھنے پڑھنے کی جرأت کرتے تو ہمیں گھورنے کے بجائے مسکراتے رہتے کہتے "لڑکی پوری کتاب واقعی پڑھ لی ہے کیا؟" اور جرأت نہ ہوتی کہ ان کے سامنے زبان کھولتے۔

میرے ابا مرحوم علی محمد ملک سے ان کی امرتسر جالندھر سے یاد اللہ تھی مگر تقسیم کے بعد ابا ایران اور پھر کویت منتقل ہو گئے تھے یوں ملنا ملانا اور خط و کتابت کم ہو گئی جتنی کتابیں مکتبۂ خواتین ڈائجسٹ سے چھپیں یا انشا جی کا کلام آ آ کر کسی نہ کسی صورت گھر کی لائبریری کی زینت بنتا۔

میرے والد مرحوم کہا کرتے تھے "اس خاندان سے میرا ذوق کا رشتہ ہے۔ ان کی کتابیں پڑھو اردو اور مزاح نگاری کا فن سمجھ میں آئے گا۔"

میں پہلے بھی کہیں لکھ چکی ہوں کہ کویت سے لوٹنے کے بعد پڑھنے کے شوق نے مجھے لکھنے پر بھی آمادہ کیا اور پہلا افسانہ میں نے ریاض صاحب کے رسالے "خواتین ڈائجسٹ" میں دیا تھا، خاموشی سے ایک دن ابی کے ساتھ اور رنگ زیب مارکیٹ کی سیڑھیاں عبور کیں "معاف کیجیے گا بڑے ہی بے ادب اور بد ذوق سے ماحول میں مرحوم نے اپنے تخلیقی ولولے کا شانے بنا رکھے ہیں۔ افسانہ ذرا زیادہ بے خوفی اور جرأت سے لکھا گیا تھا پسند آ گیا تو پھر یہ سلسلہ چل ہی پڑا۔

انشا جی کو تو وقت نہیں مل سکا وہ صرف گڈ کہتے اور میں سمجھ جاتی۔ جو چپ رہتے تو ضد کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا پھر ایک روز یونہی بیٹھے بٹھائے اس ونڈر لینڈ میں ملازمت کی ٹھانی "تھا" بی اے کے رزلٹ

میں کافی دن تھے اور ان دنوں سیکھنے کی لگن سر پر سوار تھی۔

"پروف ریڈنگ کیا ہوتی ہے؟" ریاض صاحب نے پوچھا گویا وہ کہہ رہے ہوں کہ کچھ اتا پتا بھی ہے صحافت کا یا یونہی جہاں قدم اٹھے چل دیے، میں نے صاف نفی میں سر ہلا دیا۔

انہوں نے ایک سطر میں غالب کا غلط شعر لکھا اور کہا "بتائیں کہاں غلطی ہے؟" شکر ہے کہ شعر یاد تھا جھٹ سے سیدھا سیدھا شعر لکھ دیا۔

کہنے لگے "آج شام پانچ ساڑھے پانچ تک چھٹی کر لینا دفتر میں زیادہ گنجائش تو نہیں" (کرن کا دفتر ان دنوں از سر نو آراستہ کیا جا رہا تھا) "آج تو کہیں بیٹھ جائیں کل کچھ سوچیں گے" میں نے محسوس کیا جگہ کی تو واقعی کشادگی نہیں ہے مگر احساس اور رویوں میں بڑا پن ہے، لن کے یہاں کارکنوں کی تعداد کم نہیں تھی اب بھی ان ہی کے دور کے کارکنان موجود ہیں کہ پودے کو اپنی زندگی کا نچوڑ دے کر خون پسینے اور محنت کا عرق دے کر تناور شجر بنا دیا۔ جس میں خواتین یا شعاع کے بہترین ڈائجسٹوں میں شمار ہوتے ہیں۔

ریاض صاحب کی اولادوں میں محمود بابر فیصل اور خاور صاحب کے ساتھ کام کرنے کا تھوڑا سا اتفاق ہوا اور دونوں کو تعصب سے پاک صلاحیتوں سے آراستہ اور دوستانہ طرز سے کام کرتے پایا۔ محمود بابر فیصل کی شعلہ بیانی اور بذلہ سنجی دفتر میں مشہور تھی۔ قسمت اور اجل اتنی جلدی نہ روٹھتیں تو بابر صاحب آج شاید کسی الیکٹرانک میڈیا کے کرتا دھرتا ہوتے یا پھر اپنا اخبار کامیابی سے چلاتے اور صحافت کے افق کا پائندہ ستارہ ہوتے۔

ڈائجسٹ کی دنیا میں ان باپ بیٹوں کو جہاں رشک سے دیکھا جاتا کامیابیوں پر سراہا جاتا ہے وہیں حاسدوں کی تعداد بھی کم نہیں، میں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد ایم اے کرنے چلی گئی تھی پھر صحافت کے جھمیلوں میں گم ہو گئی تھی لیکن ہر دوسرے تیسرے مہینے لکھا کرتی اور تواتر سے لکھاؤ باقاعدہ معاوضہ بھی دیتے اور بڑھاوا تو بہت ہی دیتے تھے۔

جہاں غلطی ہوتی وہاں سرزنش بھی ٹھیک ٹھاک کرتے۔ رعایت تو کبھی برتتے ہی نہ تھے بڑا لگے بھی اپنا ہی نقصان۔ لہٰذا مجھے ان کی بھلائی ہوئی کوئی کی بات بری نہ لگی۔ وہ اپنی اولاد کو بھی انتہائی ڈسپلن میں دیکھنا چاہتے تھے۔

ڈائجسٹ تو خیر کاروباری سلسلہ تھا۔ ریاضت اور وقت چاہتا تھا لیکن اولاد کی دوستی۔ فیضیاب ہونے والے ریاض صاحب کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ کم از کم اس روئے زمین پر تو نہیں اللہ تعالیٰ ریاض صاحب اور ان کے صاحبزادوں کی ارواح کو گرم ہواؤں سے بچائے رکھے یقین ہے کہ وہاں بھی وہ تینوں ایک دوسرے کی چھایا بنے رہتے ہوں گے۔ ریاض صاحب نے تو اولاد کو گرم ہواؤں سے بچائے رکھا ہی تھا۔

اب بھی یہ ونڈر لینڈ کے باسی اپنے پیاروں کی سوغاتوں کے منتظر ہوں گے تو چلیے ایسا کرتے ہیں کہ درود شریف کے نذرانے بھیجتے ہیں۔

لفظ روشنی ہیں

ادارہ

ثمینہ عظمت علی...... ٹھٹھہ

1۔ مجھے رفعت ناہید سجاد کے لکھے ہوئے جملے بے حد پسند ہیں اسی وجہ سے میں نے اسٹل سے کمال میں بھی قارئین کے سروے میں حصہ لینا چاہتی ہوں۔ اگر میں "چراغ آخر شب" کی ہر قسط سے اپنے پسندیدہ جملے چن کر لکھنا شروع کر دوں تو وہ خود ایک کتاب بن جائے۔ یہاں ایک پیراگراف لکھ رہی ہوں۔

"پاکستان کیا ہے؟"

پاکستان صرف مارشل لا نہیں ہے جب کوئی دروازہ کھٹکھٹا کر روٹی مانگتا ہے تو تنگ چڑھی سے تنگ چڑھی بیگم بھی اپنا آرام تج کر۔ اٹھتی ہے اور سوالی کو خالی پیٹ اپنے دروازے سے واپس جانے نہیں دیتی۔ یہ پاکستان ہے۔

ایک ایک پیسہ جوڑ کر آخری عمر میں حج کو جاتے، پھولوں میں لدے سفر کرتے بوڑھے پھولس حاجی پاکستان ہیں۔

پڑوسی کی بیٹی بیاہنے کے لیے پیسہ پیسہ جوڑ کر جمع کرتے لوگ پاکستان ہیں۔

جب آپ کے بچے گھر میں گھس کر سب سے پہلے دادا، دادی کو سلام کرتے ہیں اور جب دادی گھر واپسی تک تسبیح ہاتھ میں پکڑے ان کی حفاظت کی دعا مانگتی رہتی ہے۔ یہ روایت پاکستان ہے۔

تم مجھ سے گواہی لیتے ہو، پاکستان کیا ہے؟ پاکستان دانشوروں کے کھیت کی مولی نہیں۔ وہ میری رائے کا محتاج نہیں یاد رکھو میری حق گوئی پاکستان ہے۔"

2۔ کسی بھی کہانی کا اینڈ بدلنے کا دل نہیں چاہا کیونکہ یہ مصنف کی مرضی ہے کہ وہ جیسا چاہے اینڈ کرے۔

رضوانہ خان...... نارتھ کراچی

حقیقتاً "خواتین ڈائجسٹ" سے دانش کے ایسے ایسے بہترین موتی ملے ہیں کہ جن سے زندگی کے بہت سے امتحانات میں آسانی اور سرخروئی نصیب ہوئی۔ ان روشن الفاظ و جملوں نے ذہن میں روشنی ہی روشنی بھر دی۔ "جزاک اللہ خواتین ڈائجسٹ"

1۔ جی جناب! تو اب آتے ہیں شاندار سروے میں پوچھے گئے شاندار سوالات کی جانب۔ قسم سے اتنے زبردست سوالات ہیں کہ جس دن ڈائجسٹ خریدا۔ اسی دن جوابات لکھنے بیٹھ گئی۔ یوں تو بہت سے جملے اور پیراگراف ہیں جو سیدھے جا کر دل میں گھر کر گئے۔ ذہن روشن کر گئے۔ سب لکھ دیے تو شاید سروے میں کسی اور کے لیے گنجائش ہی نہ بچے (لو کر لو گل..... خوش فہمی کی کوئی حد ہے۔ جیسے سب ہی تو شائع ہو جائیں گے ہاہاہا.....!) بہرحال کچھ انتخاب نذر قارئین ہے۔ راحت آپی! "غلط فہمی" سے ایک خوب صورت جملہ جو جولائی 2011ء میں پڑھا۔

"آنکھوں دیکھی جھوٹ نہیں ہوتی۔ مگر کبھی کبھار مفسوموہ نہیں ہو تا جو ہماری عقل سمجھتی ہے۔"

"فوزیہ فرخ احمد" کے ناول "آیئے ہاتھ اٹھائیں" کا ایک حسین جملہ۔

"حالات کتنے ہی بگڑ جائیں۔ راستے کیسے ہی دشوار کیوں نہ ہو جائیں نجات کا ایک در ہمیشہ کھلا رہے گا۔ دعا کا دروازہ۔"

اسماء قادری کے ناول "اپنے حصے کا دیا" سے ایک بے حد متاثر کن پیراگراف۔

"آپ کے خیال میں ہم جو بیچے کسی دوسرے کو

اس کی ضرورت پوری کرنے کے لیے دیتے ہیں تو کیا اس سے ہماری ذات کو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہوتا؟ فائدہ تو ہوتا ہے۔ بس یہ سمجھ لیں کہ وہ رقم اللہ تعالیٰ کے بینک میں فکسڈ ڈپازٹ اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتی ہے اور اللہ اپنے وعدے کے مطابق اسے دس گنا کر کے مجھے لوٹا دیتا ہے۔ اس سے اچھی سرمایہ کاری تو کہیں اور ہو نہیں سکتی۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ کا دیا ہوا ہے۔ اللہ وہ شے میرے ہاتھ سے اپنے دوسرے بندے کو دلوا کر مجھے خوشی بھی دیتا ہے۔ اس رقم پہ نفع بھی اور آخرت کے لیے اچھی امید بھی تو اس کا مطلب تو یہی ہے ناکہ میں نے جو کچھ 'خرچ کیا' خود اپنی ہی ذات پر خرچ کیا۔"

2۔ نہیں! ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مجھے کسی ناول یا کہانی کے اختتام پر تشنگی اور اسے تبدیل کرنے کا احساس ہوا ہو۔ مصنفات کی ہر تخلیق ان کے دل و ذہن کی بہترین کاوش ہوتی ہے اور وہ جو بہتر سمجھتی ہیں وہی انجام / اختتام لکھتی ہیں کہ ان کے پاس اس کی ٹھوس توجیہہ بھی ہوتی ہوگی۔ ہاں! ایک تحریر ایسی ہے کہ جس کے لیے شدت سے دل چاہا تھا کہ ایسا نہ ہوتا۔ میری پسندیدہ ترین مصنفہ فرحت آپی کے ناول "متاعِ جاں ہے تو" کا ہیرو عباد شادی کے تھوڑے ہی عرصے بعد حادثے میں مر جاتا ہے۔ تب میں بہت روئی تھی کیونکہ وہ بالکل میرے مرحوم ماموں "خورشید انور" کا دوسرا روپ تھا۔ اتنا ہی پیارا، مخلص اور ہر رشتے کو بھرپور محبت، احترام اور حق دینے والا۔ کاش...! وہ نہ مرتا مگر میرے پیارے ماموں بھی تو شادی کے فقط گیارہ ماہ بعد صرف اٹھائیس سال کی عمر میں روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال کر گئے تھے۔ وہ انجام / اختتام میرے رب نے لکھا تھا سو ہم اس کی رضا میں راضی (گو کہ صبر بہت قیامت کا تھا جو آتا ہی نہ تھا)

مدیحہ اصغر خان..... صادق آباد

1۔ خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی تحریروں میں بلاشبہ ڈھیروں ایسے دانش کے موتی ہوتے ہیں۔ جو مدتوں یاد رہتے ہیں۔ میرے ذہن میں جس مصنفہ کے لفظوں نے روشنی بکھیری وہ ثروت نذیر ہیں اور وہ الفاظ جو براہ راست دل تک پہنچے اور اپنا گہرا رنگ چھوڑ گئے۔ وہ "میں عبدالقادر" ہوں کی آخری قسط سے لیے گئے ہیں۔

"میں جانتا ہوں تم بدل گئی ہو۔ تم نے خود کو میرے رنگ میں رنگنا چاہا ہے۔ جیسے برسوں پہلے میں تمہارے رنگ میں رنگ گیا تھا۔ مگر انسانوں کے دیے ہوئے رنگ کچے ہوتے ہیں۔ تم خود کو اس رنگ میں رنگو جو سب سے گہرا، سب سے پکا ہے۔ صبغۃ اللہ... اللہ کا رنگ۔"

2۔ جس طرح ایک ماں کو اپنے سب بچے ایک ہی جتنے پیارے لگتے ہیں رائٹرز کو بھی اپنی سب ہی کہانیوں سے اتنا ہی پیار ہوتا ہوگا۔ ایسا کوئی بھی ناول یا کہانی نہیں ہے میں جس کا انجام بدلنا چاہوں کیونکہ "من و سلویٰ" میں اگر زینب کھڑکی سے کود کر خودکشی کرتی "میری ذات ذرہ بے نشاں" میں عارفین صبا کو طلاق نہ دیتا۔ "جو چلے تو جاں سے گزر گئے" میں عالم شاہ نہ مرتا۔ "بن روئے آنسو" میں شمن اگر نہ مرتی اور "امر بیل" میں عمر جہانگیر کو گولیاں نہ لگتیں تو یہ سب کردار اور کہانیاں آج مجھے یاد بھی نہ ہوتے۔ لہٰذا ایسی کوئی کہانی نہیں ہے جس کا انجام میں بدلنا چاہوں۔ ہاں مگر نمرہ احمد کے ناول "بیلی راجپوتاں کی ملکہ" نے آخر میں بہت بدمزہ کیا۔ اتنی کامیابی سے وہ بلیک بیسٹ کو دھوکہ دیتے رہے۔ اتنی آسانی سے بدر غازان الو بن گیا۔ اینڈ پہ آکے ایسا لگا جیسے ہم کسی پرانے انگریزی ناول کا ترجمہ پڑھ رہے ہوں یا کوئی جاسوسی فلم دیکھ رہے ہوں۔

سور تھ سانند..... روحل والی گاؤں

1۔ پہلے تو خواتین کو اپنی سالگرہ کی ڈھیروں مبارک باد ویسے تو ہر تحریر میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہوتی ہے جو ہمارے ذہن و دل کو روشن کر دیتی ہے مگر ہائے ہماری یادداشت۔ جو کچھ یاد ہے۔ وہ اقتباس لکھ رہی ہوں۔

جب کوئی شخص ہمارے سامنے اپنے دکھوں اور المیوں پر رو رہا ہوتا ہے تو ہم نے ان دکھوں کو محسوس ہی نہیں کیا ہوتا ہے۔ در اصل وہ پاگل نہیں ہوتا ہم خود پاگل ہوتے ہیں جنہیں وہ شخص پاگل لگتا ہے۔
(آمنہ ریاض)

انسان کے اعمالوں کی آزمائش ہوتی ہے مجھے معلوم نہ تھا۔ انسان کی سوچ کی بھی آزمائش ہوتی ہے
(عمیرہ احمد)

جب انسان اپنے لیے خزانے کے بجائے دوسروں کے لیے بربادی مانگے اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا
(نمرہ احمد)

آج میں ایمان کے آئینے میں اپنے کردار کے خدوخال دیکھ کر ڈر گیا۔ مجھے زمین کے اپنے مدار پر رواں رہنے سے خوف آیا۔ مجھے آسمان کے نیلگوں پہلوں پر لٹکے سرمئی بادلوں کے ہونے سے خوف آیا۔ مجھے ہولے ہولے چلتی ہوا کے قدموں کی دھیمی سی آہٹ کے احساس سے خوف آیا۔ مجھے سورج سے جلتی تارکول کی سڑک سے خوف آیا۔ میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر ہاتھ رکھا۔ مجھے اپنے چلتے دل سے خوف آیا۔ مجھے ہر متحرک شے سے خوف آیا۔ مجھے ہر ساکت شے سے خوف آیا۔ مجھے اربوں مسلمانوں کی بے بسی سے خوف آیا۔ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے دعوے داروں سے خوف آیا اور زید بن احمد نیازی آج مجھے اپنے نام سے خوف آیا (انیسہ سلیم)

2۔ یہ سوال پوچھ کر آپ نے میرے ذہن کی کئی کھڑکیاں کھول دی ہیں بہت سی ایسی کہانیاں ہیں جن کی انجام مجھے اداس کر گیا جن میں سرفہرست "امر بیل" میں عمر اور علیزہ کا نہ ملنا اور عمر کا مرجانا اور نبیلہ جی کی کہانی شرط میں مکرم آفریدی کے کہانی کے آخر میں کہے جملے مجھے بہت اداس کر گئے "مرد خود قتل بھی کر دے تو چاہتا ہے کہ اسے معافی مل جائے اور عورت کی چھوٹی سی غلطی کو عمر بھر کی سزا بنا دیتا ہے۔" میں موضوع سے تھوڑا سا ہٹ گئی ہوں لیکن سچ پوچھیں تو میں آج بھی وہ کہانی پڑھتی ہوں تو مکرم آفریدی کی بے حسی پر غصہ آتا ہے اور "من و سلویٰ" میں عمیرہ احمد نے کرم الٰہی کو کچھ بھی نہ دیا کاش زینی اور کرم الٰہی کا ملن ہو جاتا...

نور العین شاہ..... سکرنڈ

1۔ "دعا قبول نہیں ہوتی تو آسرے اور وسیلے تلاش کرنے کے بجائے صرف ہاتھ اٹھا لیجیے 'اللہ سے خود مانگیں۔ دے دے تو شکر کریں' نہ دے تو صبر... مگر ہاتھ آپ خود ہی اٹھائیں (عمیرہ احمد)

2۔ بہت سے ایسے ناول' افسانے تھے جن کا اینڈ پسند نہیں آیا جیسا کہ فرحت اشتیاق کا "متاعِ جاں ہے تو" اس میں عباد کو اتنی جلدی نہیں مرنا چاہیے تھا۔ "من و سلویٰ" میں بھی زینب کو مارنے کے بجائے اس کا بھی اینڈ ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔

کرن شاہ..... شجاع آباد

1۔ عمیرہ احمد کے ناول "من و سلویٰ" کا آخری جملہ جو میں نے لاتعداد مرتبہ پڑھا ہے۔
"زندگی میں آپ کی قد جیسی بھی ہو مگر روانگی شاندار ہونی چاہیے۔"

2۔ بالکل نہیں میرا دل تو نہیں مانتا کہ میں کسی کہانی کا انجام بدل دوں۔ یہ تو رائٹر کے ساتھ ناانصافی ہوئی نا! مجھے تو ہر کہانی کا انجام اچھا لگتا ہے۔ بے شک وہ جیسا بھی ہو۔

✡

نادرہ خاتون

نامے مرے نام

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

عائشہ فیاض ...... لاہور

لاہوری میکے کا اس بار کا منظر نامہ قدرے مختلف نوعیت کا ہے۔ امی جی اور باقی تینوں چاچیوں کی مصروفیات یکسر تبدیل ہو چکی ہیں۔ امی جی تو رہتی ہی ہمیشہ کام میں مگن ہیں۔ (خدا انہیں صحت، تندرستی اور زندگی دے آمین)

بڑی چچی اوپر والی منزل سے ہی آواز لگاتی ہیں۔ عائشہ! کاکا کیوں رو رہا ہے اتنی دیر سے، ٹھیک تو ہے ناں؟ ابھی ایکونائٹ بھجواتی ہوں۔ ایک گولی صبح اور ... (ظاہر ہے بھئی وہ ڈاکٹر جو ہیں)

منجھلی چچی بھی رہتی تو اوپر ہی ہیں مگر آج کل ان کا زیادہ تر وقت نیچے ہی گزرتا ہے۔ کاکے کے پاس اور چھوٹی چچی کا تو کیا کہنا وہ روز ہی کوئی ننھا سا، پیارا سا سوٹ اٹھا کر لے آتی ہیں ظاہر ہے میرے لیے نہیں بلکہ کاکے کے لیے۔

ارے آپ تو شاید بور ہو گئیں تو جناب! اللہ جی نے ایک بار پھر مجھے بیٹے کی نعمت سے نوازا ہے۔ یکم اپریل 2011ء کو ولید افضل کے چھوٹے بھائی فرقان افضل پیدا ہوئے ہیں۔ شکر الحمدللہ اور یہی وہ کاکا ہے۔ جو اس بار لاہوری میکے کا منظر بدلنے کا سبب بنا ہے۔

اور اب ذکر ہو گا ہمارے پیارے رسالوں کا [illegible] پڑھنے کے لیے مجھے (آمنہ کے علاوہ) سارے [illegible] کھانا پڑی اور میں نے بھی [illegible] والے بھائی بھی [illegible] دراصل ہمارے ہاں زچہ کو چالیس دن تک [illegible] آرام کروایا جاتا ہے۔ گھر کا کام تو ایک طرف وہ کچھ پڑھ لکھ بھی نہیں سکتی کیونکہ نظر اور دماغ پر زور دینا بھی منع ہے۔

بشریٰ سعید ایک معتبر نام اور آپ کا یہ ناول "سفال گر" آج میرے سامنے اتنا بڑا سوال بن کر کھڑا ہو گیا کہ اس کے بوجھ سے میری چیخ نکل گئی ہے۔ کیونکہ ہر عورت جو ماں ہے وہ سفال گر بھی ہے اور اس کی گود میں [illegible] دراصل مٹی ہے وہ مٹی جسے وہ جس روپ میں چاہے ڈھال سکتی ہے۔ اتنا بڑا فرض، اتنی ساری ذمہ داری اور میری کمزور جان۔ آپ ہی کہو بشریٰ [illegible] اور کیا کروں؟

"منجھلی اور [illegible]" [illegible] کی سب سے خاص تحریر [illegible] محبت اور مقصد کے دو استعارے [illegible] زندگی کا ہر رستہ سہل اور ہر سفر [illegible] کی عکس [illegible] کا نور بنی اور [illegible] ان کی خوشی سے [illegible] اور بہت سی [illegible] روشن ہو گئے۔ امید کے اعتبار کے اور سچائی کی جیت کے۔

نزہت شبانہ حیدر "بھلا نور کی چاہت میں کمی تھی یا نیلی کی قسمت کچھ زیادہ اچھی" جو خضر راہ کی ہمسفری اس سے چھین کر نیلی کو دی گئی۔ فیصلہ چاہے نور کا اپنا تھا مگر کچھ فیصلے اتنے تلخ کیوں ہوتے ہیں کہ سانس بھی ٹھہر جائے۔

ثمرہ بخاری کے لیے دلی دعا کہ ہم کو پھر سے ہنسا دیا "غم دل ہی بھلا دیا۔ ویسے ہر بار جوادی اور شبلی کی ہیرو سٹرز کو بھی ضرور شامل کیا کریں تاکہ ...... تاکہ ہمیں اور بھی اچھا لگے۔

افسانوں میں سب سے اچھا رہا "آزمائش" اور یہ کہ باقی سب کچھ بھی بہت اچھا تھا۔ مگر اب مزید کچھ نہیں لکھوں گی کیونکہ آمنہ بے چاری کب سے فرقان کو سنبھال رہی ہے۔ اب مجھے فوراً "معتصف سے امی جان" بننا ہے۔

ج: عائشہ جی! بہت بہت مبارک باد اور دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے دونوں کاکوں کو دین و دنیا کی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

نزہت شبانہ حیدر کے ناول میں نور کے فیصلے کی ہم نے بھی اسی شدت سے محسوس کی [illegible] نزہت سے آدھا گھنٹہ بحث کر کے یہ فیصلہ [illegible] کی کوشش کی۔ لیکن وہ کسی طور نور سے [illegible] راضی نہ ہوئیں تو ہم نے ہتھیار ڈال دیے۔

یہ بات تو صحیح ہے کہ ماں کی بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قدرت نے ہر مٹی کو الگ صفات [illegible] ہے۔ کچھ زرخیز زمینیں ذرا سی محنت سے [illegible] اور بہت سی صفات تو والدین سے ہی [illegible] ہوتی ہیں۔ اپنا فرض پوری ذمہ داری سے نبھائیں اور بے فکر ہو جائیں کہ اللہ تعالیٰ نیتوں کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔

رابعہ ...... ای میل (ساہیوال)

مونالیزا کو بہت عرصے بعد ٹائٹل پر دیکھا۔ اچھی لگ رہی تھی۔ "محبت خواب سفر" اختتام کو پہنچا۔ رخسانہ جی! آپ نے کہانی کا انجام بہت اچھا کیا۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ میڈم یاقوت "آنیہ" کی شکل میں زندہ رہی۔ "سفال گر" پڑھا۔ بشریٰ جی! آپ کا ناولٹ شروع سے پسند ہے۔ عمر کے حال پہ ترس آیا۔ نمرہ جی! ایک بات کہنا چاہوں گی کہ اس اے ایس پی نے کتنے برے وقت میں محمل کی مدد کی مگر وہ اسے بھی اکڑ دکھا رہی تھی اور ایک طرف تو اس کے گھر والے اسے مارتے پیٹتے ہیں دوسری طرف اسے ہر جگہ آزادانہ آنے جانے کی سہولت ہے۔ باقی دونوں ناول قلمنے سے بھرپور تھے۔ نورالعین کے کردار میں سسپنس رہا۔ عنیقہ محمد بیگ کا "دل کے آئینے" اچھی لگی۔ "ہم سے ہے زمانہ" ایک اچھا مزاح کا رنگ لیے ہوئے تھا۔ "جیو تو ایسے" ام ثمامہ کا افسانہ بہت اچھا تھا۔ "آزمائش اور ماہیوں کا جوڑا" دل کو چھو لینے والی کہانی تھی۔ عائشہ فیاض افسانے نے میرے [illegible] دنوں کی یاد کو تازہ کر دیا۔ آمنہ مفتی کے بارے میں پڑھ کر اچھا لگا۔

ج: رابعہ! ازل سے نیکی اور بدی کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلتا رہا ہے۔ نہ اچھے انسانوں کی کمی ہوتی ہے نہ ہی برے لوگ ختم ہوتے ہیں۔ میڈم یاقوت نے تو یہی کی لیکن برائی کا سلسلہ تو جاری ہی رہے گا خواہ آنیہ کی شکل میں یا کسی اور شکل میں۔

محمل کا تعلق جس گھرانے سے ہے انہیں محمل کی ذات سے نہیں اس کی املاک سے دلچسپی ہے۔ اس پر ان کا قبضہ پکا ہے اب محمل کہیں بھی جائے ان کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یاد آوری کے لیے شکریہ۔ آئندہ بھی خواتین کی محفل میں شرکت کرتی رہیے گا۔

انیقہ ناز ...... چکوال

سرورق پر "مونالیزا" یوں تو مجھے پسند نہیں پر یہاں جچ رہی تھی۔

سالگرہ نمبر کمال کا رہا۔ ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک زبردست۔ آغاز افسانوں سے کرتی ہوں۔ عائشہ فیاض کے "نظر کرم" نے مجھے 2005ء کا وہ وقت یاد کروا دیا جب میں نے بھی اسی قسم کی اوٹ پٹانگ حرکتیں کی تھیں۔ اپنے انسٹیٹیوٹ کے سالانہ فنکشن پر۔ جی کیا دن تھے وہ۔ "آزمائش" نے تو سچ مچ آزمائش میں مبتلا کر دیا۔ "ماہیوں کا جوڑا" بھی پسند آیا اور ام ثمامہ نے تو حسب حالات لکھا۔

"دل کے آئینے" عنیقہ نے اگرچہ کہانی کا مرکزی خیال بہت اچھا چنا مگر اس بار کہانی تیزی میں لکھی گئی کہ تسلسل برقرار نہ رہا۔

ثمرہ بخاری "آخر جوادو اور شبلی کو پھر سے ہی لے آئیں۔ بچپن سے پڑھتے آ رہے تھے ایک کہانی "لالچ بری بلا ہے" ثمرہ نے اس کو نئے انداز میں لکھا۔ مگر اتنا تھوڑا کیوں لکھا اور ثمرہ جی! پنجاب کی پیاسی دھرتی ترس رہی ہے کہ آپ

اس پر بھی لکھیں۔

اب ذکر سفال گر کا! ایک ایک لفظ ایک ایک پہلو قابل ستائش ہے۔ حکیم بیگم جیسے لوگ اس زمین کا حسن ہوتے ہیں۔ مجھے کبری انسیت ہو گئی ان کے کردار سے "بشریٰ! کمال عاجزی ہے آپ کی کہ اتنا زبردست لکھنے کے بعد کہتی ہیں میں نے کچھ نہیں لکھا۔

اب عمر امریکہ جائے گا تو باپ سے تو ضرور ٹاکرا ہو گا ہے نا اور ہاں! فارسی کی غزل زبردست تھی۔ "سنبھل اور پروگالبا" سندھی زبان کے لفظ ہیں ناول اچھا تھا۔ اسیر وفائی "نزہت جی سے پوچھیے کہ وہ اتنا دل دکھانے والا کیوں لکھتی ہیں اتنا اداس کہ آنکھیں بھر آتی ہیں۔ دل بوجھل ہو جاتا ہے۔

"مصحف" کی دوسری قسط بھی شاندار رہی۔ پہلے مجھے یہ بتائیں کہ یہ ہمایوں اور عمر جہانگیر جیسے پولیس افسر کہاں ملتے ہیں؟

ایک بہن کو مخمل کی بوٹی بیل کا ذکر پسند نہیں آیا مگر مجھے تو یہ ذکر بہت اچھا لگا۔ جیسے "بیلی کی ملکہ" "میں ماما کے بالوں میں موتیوں کی لڑی تھی" ایسے مخمل کی بوٹی بیل ہے اور یقین مانیے اس کے ذکر کے بغیر کہانی ادھوری ہو جاتی۔

"محبت خواب سفر" آخر اختتام کو پہنچا۔ وقت کتنی جلدی گزر گیا!! یہ الگ بات کہ گزرا وقت بہت سے نقوش چھوڑ گیا ہے۔ رخسانہ جی! ایک اور بہترین ناول کے لیے مبارک باد قبول کیجیے۔

اب آتی ہوں آپ کے سوال کی جانب! آپ نے پوچھا "لکھنا کیوں چھوڑ رکھا ہے؟"

آپی! میرے ذہن میں کئی خیالات آتے ہیں۔ کئی بار کہانی کا بہترین پلاٹ بنتا ہے۔ لکھنے لگوں تو دل میں خیال آتا ہے میری بھلا کب پذیرائی ہو گی جو میں لکھوں اور یہ خیال آتے ہی ذہن منتشر ہو جاتا ہے اور مجھ سے کچھ لکھا ہی نہیں جاتا۔ اب بھی ایک کہانی لکھ رکھی ہے مگر ڈرتی ہوں کہ۔۔۔ آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں؟

ج: پیاری انیقہ! ڈر صرف یہی ہے نا کہ کہانی شائع نہیں ہو گی۔ یہ کہانی شائع نہ ہوئی تو اگلی کہانی شائع ہو جائے گی۔ بات صرف اتنی ہے کہ اللہ نے آپ کو لکھنے کی صلاحیت دی ہے اسے استعمال کریں۔ [illegible] کے بارے میں سوچ سوچ کر ڈرتی رہیں تو کچھ بھی نہ لکھ پائیں گی۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سماویہ اسلم۔۔۔ ای میل (کراچی)

ناسٹل گرل اچھی لگی۔ سب سے پہلے "محبت خواب سفر" کا اختتام پڑھا۔ بہت بہترین تحریر تھی۔ پھر بڑھے اپنے فیورٹ ناول کی طرف "سفال گر" یا "مصحف" دو ماہ پہلے یہ تذبذب نہیں تھا۔ خیر دونوں تحریریں اتنی شاندار ہیں کہ واقعی تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔ خاص طور پر "سفال گر" کے شروع میں لکھے بشریٰ کے الفاظ ہر بار پڑھنے پر بھی پہلے دن کی طرح سر دھنتے ہیں۔ باقی پورا پرچا ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ مونالیزا سے لے کر پیلا پن ہٹانے تک آپی! میں نے کوئی تنقید اس لیے نہیں کی کہ جب کوئی اتنی محنت سے ہمارے لیے لکھتا ہے تو ہمیں بھی چھوٹی موٹی خامیوں سے صرف نظر کرنا چاہیے۔

ج: سماویہ بہت شکریہ کہ آپ نے ہماری مصنفین کی محنت کا خیال کیا لیکن مثبت تنقید بری بات نہیں اگر کوئی خامی نظر آئے تو اس کا اظہار ضرور کریں تاکہ آئندہ اس کو دور کر سکیں۔ ہماری کوشش مزید بہتری کی طرف بڑھنا ہے۔

نورین آصف۔۔۔ آوھا وسکہ

نمرہ احمد زبردست جا رہی ہیں۔ عنیقہ محمد بیگ کے آئینے کمال کا ناول لکھا۔ عنیقہ کی کہانی میں [illegible] کا ہوتا ہے۔ آمنہ مفتی کے حالات زندگی پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ مصنفین کا تعارف کا سلسلہ سب سے اچھا لگا۔ میری فرمائش ہے۔ کنیز نبوی کا تعارف [illegible] جائے۔ کنیز کے ساتھ باقی رائٹرز نمرہ احمد، [illegible] سعید کی حالات زندگی بھی ضرور شائع کریں۔ افسانے سب ہی اچھے تھے۔

ج: پیاری نورین! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ پچھلے ماہ آپ کا خط شامل نہ ہو سکا۔

"تصویر ہی بناتے جائیں" یہ سلسلہ مصنفین کے تعارف کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ اس میں ہم اپنے سب ہی مصنفین کی لفظی تصاویر شائع کریں گے۔

تسنیم جہاں۔۔۔ کراچی گلبرگ ٹاؤن

میں اس وقت سے پڑھ رہی ہوں جس سال سے خواتین ڈائجسٹ کا اجراء ہوا اور قیمت ڈھائی روپے تھی مگر

آج قلم اٹھانے پر "سنال گر" کی بشریٰ سعید نے مجبور کر دیا جو فارسی کے اشعار انہوں نے لکھے وہ میں نے اپنے والد مرحوم کی زبانی بہت سنے تھے۔ پڑھنے کی عادت ان ہی سے ہی پڑی ویسے تو تقریباً "سب ہی رائٹرز اپنا حق ادا کرتی ہیں۔ مگر انیسہ سلیم، عنیقہ محمد بیگ، راشدہ رفعت، سعدیہ رئیس موجودہ حالات پر بہت اچھا لکھتی ہیں۔ رفعت ناہید سجاد کا ناول بہت اچھا جا رہا ہے۔ قسط کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ باقی جو نئے نام پڑھنے میں آ رہے ہیں۔ اچھے ہیں مگر کبھی کبھی پڑھی ہے... میرا مطلب ہے خاصا بولڈ انداز ہو جاتا ہے۔ بشریٰ سعید سے گزارش ہے کہ اگر اس نظم یا غزل کے اور اشعار ہوں تو ضرور بتائیے گا اور کس نے لکھی ہے یہ بھی بتائیں۔

ج : پیاری تسنیم! آپ اتنے عرصے سے خواتین پڑھ رہی ہیں اور خط پہلی بار...؟ بشریٰ سعید کا شکریہ کہ انہوں نے آپ کو قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ ہم آپ کی فرمائش بشریٰ تک پہنچا رہے ہیں انہوں نے اگر مزید اشعار لکھے تو ضرور شائع کریں گے۔

ندا خان ۔۔۔ ای میل (پشاور)

سالگرہ نمبر کا ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ "تصویر سی بناتے جائیں" ایک نیا سلسلہ تھا۔ جس میں آمنہ مفتی نے بھرپور جان پیدا کر دی اور پڑھ کر مزہ آ گیا۔ فرحت اشتیاق کو اس سلسلے میں ضرور شرکت کی دعوت دیں۔ خدا خدا کر کے رخسانہ نگار نے اپنے ناول کا اختتام کر ہی دیا۔ ناول اچھا تھا لیکن بے جا طوالت کا شکار ہوا اور معذرت کے ساتھ بعض اقساط صرف بھرتی کی خاطر لکھی گئی تھیں چونکہ کہانی بہت پہلے ہی مکمل کر سامنے آ گئی تھی۔ اس لیے اینڈ نے کوئی مزہ نہ دیا۔ "سنال گر" ایک ایسی تحریر ہے۔ جس کو پڑھ کر ہمیشہ لطف آتا ہے لیکن نمرہ احمد کا جادو اس بار ہم پر نہ چل سکا۔ "ماہیوں کا جوڑا" میں بہت مثبت پیغام پوشیدہ تھا۔ آپ لوگوں سے ایک بات پوچھنا تھی۔ آپ کی بعض بہت اچھا لکھنے والی رائٹرز کہاں غائب ہو جاتی ہیں۔ ایک بہت اچھا لکھنے والی تنزیلہ ریاض تھیں نہ جانے کہاں [illegible] ایک شوخ و چنچل اور شرارتی سی [illegible] تعلق رکھنے والی رائٹر صائمہ اکرم چوہدری تھیں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ میری میل شائع نہیں کریں گی کیونکہ میں نے خوب "بمباری" کی ہے۔

ج : ندا! آپ کی بمباری کے باوجود آپ کی ای میل شامل اشاعت ہے۔ آپ پوری "سچائی" سے اپنی رائے کا اظہار کریں۔ ہم ضرور شائع کریں گے۔ یہ کالم آپ کی رائے کے اظہار کے لیے ہی ہے۔ رخسانہ نگار کا ناول ہماری قارئین کی اکثریت نے پسند کیا ہے ہمیں افسوس ہے آپ کو پسند نہیں آیا۔

تنزیلہ ریاض اور دوسری رائٹرز جو غائب ہو گئی ہیں لکھنے والیاں اپنی دنیا میں مگن ہیں اور افسوس کہ وہ ہمیں بالکل بھول گئی ہیں جبکہ ہم ان کو بہت یاد کرتے ہیں۔

ہما صدیق ۔۔۔ سیالکوٹ

زبردست ٹائٹل تھا۔ عنیقہ محمد کا ناولٹ دیکھ کر خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ویل ڈن عنیقہ زبردست لکھا۔ ہجر کا عنوان نزہت شبانہ کا ناول ایک اچھی تحریر تھی۔ عائشہ فیاض کا افسانہ زیادہ متاثر نہ کر سکا۔ البتہ [illegible] ثمانہ کا افسانہ ہلکا پھلکا سا دل پر اثر کر گیا۔ [illegible] "آزمائش" تو سو تھا۔ فاطمہ عسکری "ماہیوں کا جوڑا" ایک اچھی تحریر تھی۔ بشریٰ سعید سنال گر زبردست جا رہا ہے۔ بشریٰ سعید کے انٹرویو کی فرمائش کر رہی ہوں۔ [illegible] مفتی کے حالات زندگی پڑھ کر اچھا لگا۔ "تصویر سی بناتے جائیں" اچھا سلسلہ شروع ہوا ہے۔

ج : پیاری ہما! [illegible] ڈائجسٹ آپ کو پسند آیا بہت [illegible] متعلق [illegible] آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے [illegible] ہیں۔ بشریٰ سعید کا انٹرویو ضرور دیں گے [illegible] رضامند ہو گئیں۔

صبا اعجاز حسین ۔۔۔ پشاور شہر

میں بی اے کی طالبہ ہوں مجھے یہ میگزین پڑھتے ہوئے سات یا آٹھ سال ہوئے ہیں۔ لیکن میرے خاندان اور خصوصاً میرے گھر والوں کا بہت پرانا رشتہ ہے میں اپنے خاندان میں پہلی لڑکی ہوں جو خط لکھ رہی ہوں۔ اس کی وجہ رفعت ناہید سجاد ہیں۔ مجھے ان کا ناول بہت بہت پسند ہے

میں ان کی بہت بڑی فین ہوں۔ ان کے ناول میں عبیر کا کردار میرا پسندیدہ ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے۔ رفعت آنٹی نے عبیر کے کردار میں مجھے لکھ ڈالا ہو۔ بالکل ہو بہو۔ وہی عادات، جو اس کردار میں بتائی گئی ہیں اور ہاں یہ میرے بھائی کی بھی فیورٹ رائٹر ہیں۔

اب کچھ اپریل کے شمارے کی بات ہو جائے تو بشریٰ سعید کے ناول کی قسط بے حد اچھی لگی۔ بہرحال فرحت اشتیاق، راحت جبیں، فائزہ افتخار، رفعت [illegible] سائرہ بخاری، تنزیلہ ریاض، عمیرہ احمد (جو کہ آج کل بالکل نہیں لکھ رہی ہیں) اور جی ہاں رخسانہ نگار عدنان جن کی وجہ میں نے ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا۔ کیونکہ ان کی تحریریں بے حد عمدہ ہوتی ہیں [illegible] تمام رائٹرز میری فیورٹ ہیں۔

ج : پیاری صبا! خواتین ڈائجسٹ کی محفل میں خوش آمدید۔ رفعت ناہید سجاد اور دیگر مصنفین تک آپ کی تعریف پہنچائی جا رہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ساجدہ ۔۔۔ ای میل (لودھراں)

ماہ اپریل کا شمارہ سامنے ہے۔ انفرادی نوعیت کے سلسلے جن میں خاص طور پر "کرن کرن روشنی" "رنگا رنگ پھول" اور "میری بیاض سے" شامل ہیں۔ قابل تعریف ہیں جو ایک انسان کی زندگی پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت سے مالا مال ہوتے ہیں۔ مگر جو شمارے کی جان ہیں، وہ افسانے اور ناولز ہیں۔ رضوانہ تکیل راؤ ہمارے پڑوس میں رہتی ہیں مگر ان سے متعارف خواتین ڈائجسٹ نے ہی کرایا ہے اور وہ بھی اس حد تک کہ وہ کوئی تحریر بھیج دیتی ہیں جو میں خوشی سے پڑھتی ہوں شاید یہی وجہ ہے کہ پہلی بار آپ کو خط لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ میرا تعلق جنوبی پنجاب کے چھوٹے سے شہر لودھراں کے محلہ فیض آباد سے ہے جو شہری اور دیہاتی زندگی کا حسین امتزاج ہے۔ "ہمارے نام" کے سلسلے میں حمیرا رضا کی تحریر نے دل اور دماغ پر دستک دی۔ میں ان کی بات سے کلی طور پر اتفاق کرتی ہوں کہ ہماری زبان کو بڑے چیلنج درپیش ہیں۔ پڑوسی ملک کی ثقافت کی یلغار کے باعث ہم الفاظ اور ان کی ادائیگی کو ان کے طرز پر بولنے لگے ہیں جو کہ سراسر غلط اور اردو دشمنی کے مترادف ہے۔ الیکٹرانک میڈیا میں اینکر پرسن کی ہندی نما اردو سن کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ جہاں اردو کا دامن وسیع ہے، وہاں بھی دوسری زبانوں کا بے دریغ استعمال یقیناً "اردو کے ساتھ زیادتی ہے۔

ج : ساجدہ! ہم آپ کی باتوں سے سو فیصد اتفاق کرتے ہیں کوئی انسان ہو یا قوم اس کی اپنی شناخت ہونی چاہیے۔ دوسروں کی نقالی کرنے والے اپنی شناخت کھو بیٹھتے ہیں۔

سائرہ رمضان ۔۔۔ نامعلوم شہر

اپریل کا شمارہ بہت پسند آیا۔ ٹائٹل بھی اچھا تھا اور سلسلے وار ناول کے علاوہ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ نعیمہ ناز کے والد صاحب کے بارے میں پڑھا یقین کریں۔ بہت افسوس ہوا اور مجھے فوراً "اپنا پیارا بھائی آصف رمضان یاد آ گیا۔ جسے 14 جنوری بروز جمعہ کی صبح فجر کے وقت شہید کر دیا۔ اس سانحے کو چار مہینے گزر گئے۔ کبھی لگتا ہے کل کی بات ہے، کبھی لگتا ہے صدیاں گزر گئی ہیں بھائی کو گئے ہوئے۔ ہر وقت لگتا ہے ابھی آ جائے گا بس ابھی!

وہ ظالم لوگ جنہوں نے میرے بھائی کو شہید کیا، وہ سب پکڑے گئے ہیں۔ یہ سب میرے رب کی مہربانی ہے۔ ورنہ بے نظیر اتنی بڑی لیڈر تھیں ان کے قاتل کھلے عام پھر رہے ہیں۔ اب کیا ہو گا؟ ان لوگوں کو سزا ملے گی؟ اگر پھانسی بھی ہو گی تو ہمارا بھائی تو واپس نہیں آئے گا۔ میرے بھائی کی عمر صرف 20 سال تھی۔

ج : پیاری سائرہ! آپ کے دکھ کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ صرف آپ کا ہی نہیں نہ جانے کتنی مائیں اور بہنیں دکھ کی اس آگ میں جل رہی ہیں۔ کراچی میں تو معمول کی بات ہے، روزانہ دس بارہ افراد نامعلوم گولیوں کا نشانہ بن جاتے ہیں۔ آج تک کوئی قاتل سامنے نہیں آیا۔ دکھی دلوں کی دعا قبول ہوتی ہے۔ ہم آپ سے اور تمام قارئین سے درخواست کرتے ہیں دعا کریں وہ تمام دہشت گرد بے نقاب ہو جائیں اور اپنے کیے کی سزا پائیں، جو بے گناہ افراد کو نشانہ بنا کر چن چن کر قتل کر رہے ہیں۔

شازیہ نیاز احمد ملغانی ۔۔۔ کوئٹہ کینٹ

اس ماہ کا ٹائٹل کچھ خاص نہیں لگا، سب سے پہلے کرن

کرن روشنی" سے فیض یاب ہوئے۔ اس کے بعد اپنا بیسٹ ناول "محبت خواب سفر" کا اینڈ پڑھا۔ رخسانہ جی! بیسٹ آف لک۔ آپ کا یہ ناول بھی یادگار رہے گا لیکن آپ کو تانیہ کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بہت افسوس رہے گا۔ نمرہ احمد کا ناول بھی زبردست ہے۔ نزہت شبانہ حیدر کا بھی ناولٹ بہترین تھا۔ افسانوں میں عائشہ فیاض کا بیسٹ تھا۔ ثمرہ بخاری جی! اب آپ بھی جوادی اور شیلی کی بھی شادی کردیں یہ ورحسن سلیم کہاں غائب ہیں اور حنزیلہ ریاض، عمیرہ احمد، فائزہ افتخار، ساجدہ حبیب، سدرہ سحر عمران، ماہا ملک، انیسہ سلیم، سلمٰی یاسمین راؤ پلیز ہری اپ جلدی سے ان ہو جائیں۔

ج : شازیہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

سونم سفیان۔۔۔ ملتان

دوبارہ خط لکھنے پر مجھے رخسانہ جی نے مجبور کیا۔ پانچ سال بعد "محبت خواب سفر" کا اینڈ بالآخر ہو ہی گیا۔ ان پانچ سالوں میں کبھی ہم بے حد بور ہوئے کبھی بے حد پرجوش۔ کبھی پرنم آنکھیں کبھی مسکراتے ہونٹ گرمیوں کی طویل دوپہروں میں سردیوں کی ٹھنڈی راتوں میں خزاں کے سوکھے پتوں کے ساتھ تو کبھی بہار کے مسکراتے پھولوں کے ہمراہ طویل کہانیاں پڑھنے کا اپنا ہی ایک مزہ ہے۔ رخسانہ جی! میں سکم کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گی اس نے جو بویا تھا وہی کاٹا نہ ہی محمود عالم کے بارے میں کچھ کہوں گی ان دونوں کا انجام آخر کار یہی ہونا تھا مجھے تو عائشہ اور تانیہ کے بارے میں کہنا ہے۔ بہت زبردست اینڈ کیا آپ نے ان دونوں کا۔ ہمارے لیے سوچنے کی راہیں بھی کھول دیں۔ میڈم یاقوت نے ان دونوں کی زندگیاں برباد کی تھیں۔ برا دونوں کے ساتھ ہوا تھا لیکن عائشہ اللہ کی رحمت پر یقین کرکے دوبارہ سے اس دلدل میں نہیں گئی جبکہ تانیہ مراد اللہ کی رحمت سے مایوس ہوگئی۔

اس ماہ کا ٹائٹل بے حد زبردست تھا۔ "تصویریں بناتے جائیں" آمنہ مفتی بے حد کیوٹ لگ رہی تھیں۔ ذرا جلدی سے بس اتنا ہی میری کہانی کے بارے میں بتادیں۔

ج : پیاری سونم! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں ان شاء اللہ اگلے ماہ کے پرچے تک مکمل

کرکے پہلا کام یہی کریں گے۔ آپ کو انتظار کرنا پڑا اس کے لیے معذرت۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

رضوانہ شکیل راؤ۔۔۔ لودھراں

اگر میں یہ کہوں کہ لڑکیوں کی تربیت میں آپ کے پرچوں کا 50 فیصد رول ہے تو غلط نہ ہوگا۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب میں پڑھتی ہوں کہ ہم چھپا کر پڑھتے تھے یا رسالے کو گھر والے پھاڑ دیتے تھے یا ردی والے کو دے دیتے۔ حالانکہ ان ہی ناول پر جب ڈرامے بنتے ہیں تو ہم بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔ میں بس یہ کہنا چاہوں گی کہ اچھا یا برا انسان خود ہوتا ہے یا جیسی تربیت، ماحول یا صحبت ہوگی ویسا ہوگا۔ ماں باپ کو خاص طور پر بیٹیوں کو اعتماد اور مان دینا چاہیے۔ آپ کے پرچوں میں جو تحریریں شائع ہوتی ہیں وہ مثبت راستوں کی طرف رہنمائی کرتی ہیں اور ہمارے مذہب اور اقدار کے مطابق ہوتی ہیں۔ میری سب سے پسندیدہ رائٹرز عمیرہ احمد، بشریٰ سعید، عنیزہ سید ہیں ان کی تحریریں میں پڑھے بغیر بھی اچھے ہونے کی ضمانت دے سکتی ہوں۔ عنیزہ سید کی تحریروں میں کوئی نہ کوئی ایک پوائنٹ ضرور ہوتا ہے جو ہمیشہ کے لیے ذہن نشین ہو جاتا ہے جیسے ماسٹر ہدایت اللہ کا کردار۔ انیسہ سلیم [illegible] چھا گئیں۔ 2008ء میں چھپنے والی ان کی تحریر کے صفحہ نمبر 258 تا 261 کو ہر بار پڑھنے سے [illegible] ایک عجیب سی درد کی لہر اٹھتی ہے۔ آپ کا سلسلہ "کرن کرن روشنی" بہترین سلسلہ ہے۔ فریدہ اشفاق بہت [illegible] کی ہیں۔

ج : پیاری رضوانہ! آپ جیسی قارئین کا تعاون اور اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ ہم خواتین ڈائجسٹ کا معیار برقرار رکھے ہوئے ہیں اور روز اول سے آج تک اس کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔

ثریا نوید یمہ۔۔۔ اسلام آباد

جس کہانی نے تبصرے پر مجبور کیا وہ کہانی ہے نمرہ احمد کا مکمل ناول "مصحف" نمرہ احمد نے بہت اچھے ناول لکھے ہیں۔ مگر اس ناول کی دوسری قسط کو پڑھ کر دل ڈر سا گیا ہے کہ انہوں نے اس ناول کے ذریعے ایک بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے۔ اپنے پڑھنے والوں تک صحیح علم پہنچایا جائے۔ اگر وہ اپنے پڑھنے والوں کو اچھی بات بتاتی

ہیں اور ہم اس پر عمل کرتے ہیں تو ثواب کا ایک حصہ یقیناً نمرہ احمد کو بھی جائے گا۔ انشاء اللہ اور ایسے ہی اگر کوئی غلط یا غیر تصدیق بات قارئین تک پہنچی تو پھر گناہ کا حصہ بھی۔

نمرہ تمام کرداروں کو آپ بخوبی نبھا رہی ہیں۔ البتہ محمل جو کہ ناول کی ہیروئین ہے۔ اس پر تھوڑی حیرت ہے کہ وہ اتنے سخت حالات میں بھی کیسے آزادانہ گھوم لیتی ہے کہ اے ایس پی ہمایوں کے گھر بھی چلی جاتی ہے [illegible] ہے اس کی گھر والوں پر فواد کی گرفتاری کی [illegible] مطلب گھر میں کوئی نوٹس نہیں [illegible] ہمارے دشمن کے ساتھ مل کر کوئی سازش [illegible] رخسانہ نگار عدنان کا ناول "محبت خواب سفر" کا اختتام ویسے ہی ہوا جیسے ہونا چاہیے تھا۔ [illegible] خوب صورت ناول مکمل کرنے پر مبارک باد اور جلدی [illegible] کسی اور انداز میں تحریر لے کر سامنے آئیں۔

عائشہ فیاض کا افسانہ "شکر" ہلکی پھلکی مزاحیہ تحریر تھی۔

ج : عمیرہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ایس اے سونی۔۔۔ لاہور

میں نے ایک اسٹوری لکھی ہے اگر آپ اجازت دیں تو کیا میں اسے بھجوادوں۔۔۔ اپریل کا شمارہ ملا جلدی سے میں "محبت خواب سفر" کا اینڈ پڑھا بہت پسند آیا رخسانہ جی! آپ نے ہر کردار کو بہت خوب صورتی کے ساتھ نبھایا ہے۔ یہ داستان ہمیشہ ہمارے دلوں میں رہے گی اور آپ بھی۔

نمرہ احمد کا "مصحف" پڑھا نمرہ جی! آپ نے بہت اچھا ٹاپک چنا ہے۔ ہمارا دین دلوں میں پھر سے زندہ ہو جاتا ہے اور خدا پر یقین اور پختہ ہوتا ہے غلط اور صحیح کی پہچان بھی ہوتی ہے جو انجانے میں ہم کرتے ہیں۔

بشریٰ آپی کا "سنگ گراں" کمال کا جا رہا ہے پلیز آپی! اسے جلدی ختم نہ کیجیے گا۔

"ہم سے ہے زمانہ" بہت اچھا لگا اور میں نے سب کو سنایا سب سن کر بہت خوش ہوئے۔ شیلی اور جوادی کا کردار بہت اچھا ہے کاش! سب لوگ ایسے ہی ہو جائیں خوشیاں بکھیرنے والے۔

پلیز آپ ہر شمارے میں ایک کامیڈی اسٹوری ضرور شامل کیا کریں۔

عفت سحر طاہر! آپ کہاں گم ہو؟ ہم آپ کی نیکسٹ کا انتظار ہے اس کو [illegible]

[illegible] کی کیا ضرورت ہے اسٹوری لکھی ہے تو فوراً بھجوادیں۔

آمنہ۔۔۔ ڈگری کالج ڈھرکی

سرورق پر سجی ماڈل مونالیزا اچھی لگی۔ ٹائٹل کے ایک جانب بنے ہوئے پھول بے تحاشا بھاگئے۔

سب سے پہلے "چراغ آخر شب" پڑھا۔ رفعت ناہید سجاد کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

"سنگ گراں" بشریٰ سعید صاحبہ کی ایک بے مثال تحریر وہ شاید ہی کبھی ہمارے ذہنوں سے محو ہو پائے۔ اس کی چھٹی قسط بھی نہایت شاندار رہی لیکن پچھلی دو قسطوں میں صوفیہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جا رہا۔

بالآخر "محبت خواب سفر" کا ہر مبہم سفر اپنے اختتام کو پہنچا۔

مگر ہمیں لگتا ہے کہ تانیہ کے کردار کے ساتھ انصاف نہیں ہوا۔

"مصحف" نمرہ احمد کی تحریر لاجواب تھی۔ "ہم سے ہے زمانہ" ہماری فیورٹ سیریز ہے اور میں اپنی چھوٹی بہن کو ہمیشہ کہتی ہوں کہ یہ سیریز ضرور پڑھو۔ یہ تحریر ہمیشہ ہمارے لبوں پر مسکراہٹوں کے پھول کھلا دیتی ہے۔ یہ ثمرہ بخاری صاحبہ کا کمال ہے کہ وہ اس ٹینشن بھرے ماحول میں قارئین کو مسکرانے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

"ماہیوں کا جوڑا" فاطمہ عسکری نے بھی بہترین لکھا "شکر" عکرہ نے بے اختیار ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ واقعی خوشگوار یادیں چراغاں سا کر دیتی ہیں۔ نیا سلسلہ "تصویریں بناتے جائیں" بھی اچھا لگا۔

ابن انشاء کی غزل بے حد پسند آئی۔

آپ سے ایک شکایت کرنی ہے کہ پلیز اشعار کے صفحات کم نہ کریں۔ پچھلے مہینے سے ایسا ہو رہا ہے۔

ج : آمنہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فرحانہ اسحاق۔۔۔ فیصل آباد

"سنگ گراں" ایک بہت ہی خوب صورت ناول ہے۔ بشریٰ

سعید برکات کو بہت خوب صورت انداز میں بیان کرتی ہیں۔ میری سب قاری بہنوں کو تو حکیم بیگم کا کردار بے حد پسند آیا ہے۔ لیکن مجھے اس ناول میں احمد کا کردار سب سے زیادہ اچھا لگا ہے۔ اس کے علاوہ پریاں کا انتظار' آرزک کا غیر موجود عضو کی تکلیف کو محسوس کرنا' وینس کا انداز گفتگو

"سفال گر" مدتوں یاد رہنے والی کہانی ہے اور یقیناً" اس کا انجام بھی دل کو بھا لینے والا ہو گا۔

بلاشبہ "مصحف" ایک بہت اچھی کہانی ہے۔ لیکن کہیں کہیں جھول محسوس ہوتا ہے۔ جیسے پہلی قسط میں محمل کو کچھ کھانے نہ سکے اس لیے فریج کو لاک لگا دیتے ہیں تو دوسری طرف وہ آرام سے نیمل پر سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہی ہوتی ہے۔ اب دوسری قسط میں فواد کا بھانڈا بھرے خاندان میں پھوٹا۔ لیکن گھر میں موجود کسی بھی خاتون نے فواد کے کاروبار کو ملامت بھری نظروں سے نہیں دیکھا۔

"چراغ آخر شب" کے تو کیا کہنے نابید رفعت سجاد کے تو ہاتھ چومنے کو دل چاہتا ہے۔ اب کی بار انہوں نے جس طرح نور کے کردار کی وضاحت کی ہے' دل عش عش کر اٹھا ہے۔ میں نے اس بار کی قسط کو دو بار پڑھا ہے ملک کے ماضی و حال کو کس قدر خوب صورت انداز میں بیان کیا گیا ہے' اس کی تعریف کرنا مجھ سے تو ممکن نہیں۔

کیا عمیرہ احمد کا کوئی ناول جلد یا بدیر پڑھنے کو ملے گا؟

ج : فرحانہ بی! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ نمرہ احمد کی کہانی میں محمل خود فریج سے نکال کر کھانے نہ کھائے اس لیے فریج کو تالا لگایا گیا ہے نیمل پر سب کے ساتھ کھانا تو ان لوگوں کی مجبوری ہے' عمیرہ احمد کی کمی تو ہمیں بھی بہت محسوس ہوتی ہے اور ہماری خواہش ہے کہ وہ ہمارے لیے ناول لکھیں۔ آپ کے سوال کا جواب وہی دے سکتی ہیں۔

اور بلال نسب سے پہلے "محبت خواب سفر" کو پڑھا حالانکہ ہر کردار کے انجام کا کچھ کچھ اندازہ تو پارٹی کے شمارے میں ہی ہو گیا تھا مگر نادیہ کا انجام تھوڑا توقع کے خلاف ہوا تھا۔ تھوڑا شاک تو لگا مگر رائٹر کا یہ کہنا کہ شیطان کا گناہ غرور نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس تھا تو پھر نادیہ کے کردار کا یہی انجام ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال میری طرف سے رخسانہ نگار کو ڈھیر ساری مبارک باد۔ نمرہ کی "مصحف" زبردست تحریر لگ رہی ہے اس کا انجام بھی ڈرامائی ہی ہو گا۔ افسانے سارے اچھے تھے مگر نثر بہت پسند آیا۔ شکر ہے اس بار ثمر بخاری جوادی اور شبلی کو واپس لے آئیں لیکن زیادہ مزہ نہیں آیا پلیز ہمیں ایک بار وہ ناولٹ لکھنا تھا جو ایک جگہ سے شادی تڑوا کے دوسری جگہ کرواتی اس طرح کی کوئی اسٹوری لکھیں۔ "دل کے آئینے" بس ٹھیک تھا۔ مکمل ناول میں "اب جبر کا کوئی عنوان نہیں" میں کافی تفصیل بیان ہونے سے رہ گئی ہے خاص طور سے نیلی کا کردار وضاحت مانگتا تھا کہ وہ نور کی کون تھی۔ اینڈ اچھا نہیں لگا نور کو زندہ رہنا چاہیے تھا اور اب میرا موسٹ فیورٹ "چراغ آخر شب" اس کو پڑھنا تو دو بار پڑتا ہے' تب جا کے یہ سمجھ آتا ہے اس میں ہماری اپنی کہانیاں ہیں۔ اس میں ہم خود کہیں موجود ہیں۔

ج : بینا جی آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔

بینا خان۔۔۔ کوٹ مصرال' خوشاب

سرورق بہت پسند آیا' خاص طور سے ماڈل کی آنکھیں

رفعت ناہید سجاد

چراغِ آخرِ شب

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے۔ جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادیٔ اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر، عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں، اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے۔ جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کرپاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پر اعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی یونیورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کرکے اتنا کمالیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہوجائے۔

عبیر آج کے دور کی لڑکی ہے جو اپنے ذہن سے فیصلہ کرنا جانتی ہے۔ گھر میں باپ سے قریب ہونے کے باعث ان کی علمی تجربے سے فیض اٹھانے کا موقع اسے زیادہ ملا ہے۔ وہ ماسٹرز کی طالبہ ہے "وہ حالات کو حساس انداز میں لیتی ہے۔

عبیر اپنی بڑی بہن سے زیادہ بچپن کی سہیلی حمیرا سے قریب ہے۔ اونچے طبقے کی پروردہ ثریا بھی عبیر کی دوست ہے لیکن وہ صرف عثمان کی وجہ سے اس گھر میں آتی جاتی ہے۔ عبیر اسے خاص وجہ سے عزیز رکھتی ہے۔

گھر میں چچا عبدالعزیز اور ماموں کریم بخش اپنے اسرار کے ساتھ بوجوہ رہائش پذیر ہیں۔ بڑی تائی بے اولاد ہیں اور بیوگی کے بعد سے کچھ دن قیام کے لیے پروفیسر صاحب کے یہاں آتی ہیں۔ جہاں ان کی ساس بھی رہتی ہیں۔

عبیر کا گروپ یوم پاکستان کے حوالے سے اسٹیج شو کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ لوگ وطن سے محبت قوم کے دل میں اجاگر کرنے کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں ناکامیوں سے عبیر دل برداشتہ ہوتی ہے تو وہ کچھ دیر کے لیے حمیرا اور رضا کے یہاں چلی آتی ہے، جہاں ان دونوں کی والدہ آپائی اپنے خلوص اور ڈھیر ساری محبت سے ان کا سواگت کرتی ہیں۔ یہ محبتیں اسے روح تک سرشار کردیتی ہیں۔

ان کے گروپ میں ان کی کوششیں رنگ لاتی ہیں اور شو کرنا صرف ایسا نسرل جاتا ہے بلکہ ڈراما آڈینس میں بے حد پسند کیا جاتا ہے۔ عبیر کو سب سے زیادہ شو میں کزن شہریار کی موجودگی مسرور کرتی ہے، جو محض عبیر کی خاطر طویل سفر طے کر کے شو دیکھنے آتا ہے۔ دونوں میں لفظوں سے زیادہ دل کا رشتہ ہے، اس لیے ایک دوسرے کی بات فوری سمجھ لیتے ہیں۔ عثمان شہریار کے لیے عبیر کے جذبات سے آگاہ ہے۔

ان ہی دنوں بابا جان کی عدم موجودگی میں ایک واقف کار سے عبیر کی ملاقات ہوتی ہے، جن کی مختلف سی شخصیت اسے کچھ الجھادیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۲۰
بیسویں قسط

نعیم ملک گرفتار کرلیا گیا۔

اردو اخباروں کے کونے میں ایک باکس آئٹم درج تھا۔۔۔ چھوٹے موٹے تبصرے بھی زیر بحث تھے، وہ غدار تھا اور لوگوں کا کہنا تھا۔ ایک وہی نہیں ایسے بہت سے دندناتے پھر رہے تھے۔

نعیم ملک چھوٹ کر واپس آگیا۔

اس پر غلط الزام لگایا گیا تھا۔ وہ باعزت بری ہوگیا۔ اسے بدترین حالت میں رکھا گیا۔۔۔ بے جا تشدد کیا گیا۔ لوگوں کا کہنا تھا حکومت زیادتیوں کی انتہا پہ اتر آئی ہے، وہ معصوم صحافیوں سے خوف زدہ ہے۔۔۔ سارا حق اور پریس کلب والے غل مچا رہے تھے۔ کسی چینل والے نے اس کا ایک ہاتھ بھی دکھایا۔۔۔ جو جیل میں تشدد کے دوران زخمی ہوا تھا۔ اس پر چونکہ رومال بندھا ہوا تھا لہٰذا رومال کے اندر کی حقیقت بھی پتا نہیں چل سکی۔

حکومت کی صحافیوں کی حق گوئی پر ایک اور ضرب۔۔۔ گنتی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

احتجاج در احتجاج۔

ایسے چھوٹ کر باعزت بری ہونے والوں کی بھی کوئی کمی نہیں۔۔۔ وہ جو ہتھکڑیوں میں جاتے ہیں اور ہار پھول پہن کر وی (V) کا نشان بناتے باہر آتے ہیں۔۔۔ اور قوم کو یہ اعزاز بخشتے ہیں کہ وہ ان کی پوجا کرے گی۔ کمی تو ان کی بھی نہیں۔۔۔ جیل جانا بھی ایک کمال ہے۔۔۔

دنیا بھر کی تنظیمیں فعال ہوگئیں۔ انسانی حقوق کے علم بردار آزادی صحافت، انصاف کا بول بالا۔۔۔ پھر وہ حق دار کو اس کا حق دلا کر نعرے لگاتے بکھر گئے۔۔۔ تنظیموں کے کھاتے میں بھی ایک کارنامہ درج ہوا۔۔۔ اسکور برابر۔

اماں نے گرفتاری کی خبر بھی برآمدے میں بچھے اپنے مخصوص مونڈھے پہ بیٹھ کے پڑھی تھی کہ جس کا پھونس جگہ جگہ سے گھسیٹا گیا تھا۔

انہوں نے اس کی رہائی کی خبر بھی اسی برآمدے میں سنی۔ وہ حاضر غائب کی سی کیفیت میں غرق، دل گرفتہ حالت میں قطعی مایوس دکھائی دیتی تھیں۔

"کیا ہوا ہے۔۔۔ زیادتی بھی ظالم ہی کے ساتھ ہوتی ہے۔"

"یہ نیا نظام ہے۔" دور سیڑھیوں پہ بیٹھے رضا نے سامنے والے اوورسٹ پہ شور مچاتی لالیوں پر نظر جما کر کہا۔ "نیا قانون۔"

وہ اماں سے نظریں ملاتا ہچکچا رہا تھا۔ کسی زمانے میں غلط کے سامنے ڈٹ جانے والوں کے نام تاریخ میں درج ہوتے تھے۔ اب غلط اور درست کے پورٹ فولو آپس میں بدل گئے ہیں۔

اب غلط پر ہاتھ ڈالنے والے عبرت کا نشان بن جاتے ہیں۔۔۔ بس آپ کی تسلی کے لیے وہ آپ کے سامنے سے انہیں اٹھا کے لے جاتے ہیں۔۔۔ حکومت پاکستان کے خرچے پر وہ سرکاری مہمان ہونے کی وجہ سے ایئرکنڈیشنڈ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرائے جاتے ہیں۔۔۔ اسی کو جیل کا درجہ دے دیا جاتا ہے جہاں ان کو فائیو اسٹارز کی تمام سہولیات میسر ہوتی ہیں پھر وہ قید کی تمام صعوبتیں جھیل کر ہیرو کا درجہ پاتے باہر آجاتے ہیں یا اس سے بھی پہلے۔۔۔

"ہم تنویر کو بچا نہیں سکے رضا! پاکستان کو ان سے کیا بچا پائیں گے۔"

بوڑھی ناامید سی ہولی آواز۔۔۔ زندگی کے خار زاروں پہ آبلہ پا چلتے چلتے۔۔۔ ہر روز تازہ آس کے ساتھ، ہر صبح نئے اجالے کی امید میں۔۔۔ کل جو ہوگا وہ ٹھیک ہوگا۔۔۔ پھر ہتھیار پھینک کر دکھی ہوتے ہوئے۔

"جمال اٹک اٹکوریاں بھگت رہا ہے غریب۔ اس کو کس چیز کی سزا؟"

"وہ کہتے ہیں کہ تم نے شریف آدمی کے کردار پہ کیچڑ اچھالا۔ اس کی سزا۔۔۔"

رضا نے اماں کی طرف دیکھا یہ کیسی بہادر عورت تھیں۔ بارہا زمانے سے انہوں نے پتھر کھائے لیکن انہیں کسی سے کوئی گلہ نہیں تھا نا زمانے سے نا اپنی طرف آئی سنگ باری سے۔ ان کی آس نہیں ٹوٹتی تھی۔ آنے والی کل کی راہ دیکھتی۔ وہ صبح کبھی تو آئے گی۔

"آپ کے ماضی میں ناانصافی کی ایسی مثالیں ملتی ہیں لیکن شاید اتنی عام نہیں تھیں۔ کیا کہتی ہیں آپ اس ماضی پر؟"

پتا نہیں پوچھ رہا تھا یا بتا رہا تھا۔

"تم نے ہر عہد میں ہر نسل سے عیاری کی۔"

ان کی مٹھی میں دبا ایک خاکی سا سرکاری کاغذ مٹھیاں بھینچنے سے چرمرانے لگا تھا۔۔۔

"آپ کا ماضی آپ کی وہ واحد ذاتی جاگیر ہے جس کی وراثت سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ جیسے یہ میرا ذہن اور اس میں پلنے والے خیالات بلا شرکت غیرے میرے ہیں۔ کسی کے لیے اچھی یا بری سوچ رکھنے کا حق صرف میرے دل کو ہے۔"

انسان ایک ہی وقت میں مختلف وقت اور جگہوں میں تقسیم ہے۔۔۔ جیسے ایک نائلہ مہدی ان سیڑھیوں پر یہاں بیٹھی ہے۔۔۔ دوسری وہ جو زینہ زینہ چڑھتی ان راہوں کو کھوجتی، جہاں سے گزر آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

گھر گھر کرتا ٹرک ایک جیسی شکل کے بنے مکانوں میں سے ایک کے پاس آکر رک گیا، آم جامن کے گھنے درختوں کے جھنڈ سے پرے کسی اور کا سامان بھی اتارا جارہا تھا۔۔۔ جگر جگر کرتی تازہ سفیدی میں شامل نیلاہٹ گھر

کو جھلا رہی تھی گھر کے بڑے سامان کو ٹھکانے لگانے کی جدوجہد میں مگن۔۔۔ اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ سامان تھا ہی کیا بانس کی چارپائیاں' صندوق جن میں گھسے ہوئے سادہ سوتی دو چار جوڑے۔۔۔ چند کرسیاں' گول میز' صحن میں رکھنے والا جالی کے دروازے کا ہوادار۔۔۔ دیگچیاں' توے' چمٹے' پھکنی' کسی ایک گٹھری سے اس کی گڑیا کا سامان بھی برآمد ہوا۔۔۔ گڑیا کا گھر بھی مالکن کی سی خستہ حالی کا شکار تھا۔ کپڑے سے بنی ہوئی گڑیا۔ کالے دھاگے کی آنکھ اور لال دھاگے کے ہونٹ سر پہ لگی سیاہ کپڑے کی دھجی' دراصل اس کے لہراتے اور گھٹاؤں کو مات کرتے بالوں کی نشان دہی کرتی تھی۔۔۔ ایک بے وضع سلا فراک گڑیا کے تن پر تھا اور دو جوڑے ٹین کے ایک خالی ڈبے میں بند تھے۔

اس نے باہر کھلنے والی بالکونی پہ بنی بیچ نما سیڑھی پہ گھٹنوں کے بل بیٹھتے غور و خوض شروع کیا۔ گھر کے عین سامنے سڑک پار ایک طویل گراؤنڈ تھا جس میں لوہے کا ایک رنگین جھولا لٹک رہا تھا۔ ایک سی سا اور مختصر سی سلائڈ ایک طرف اس کی ہم عمر دس بارہ بچیاں عجیب سا کھیل کھیل رہی تھیں۔

"پھول چمن میں آتے ہیں۔۔۔ آتے ہیں۔۔۔ آتے ہیں میری پیاری بہنو۔
تم کس کو لینے آتے ہو آتے ہو میری پیاری بہنو۔"

اچانک ان کی نظر نیم کھلی بالکونی سے لگی اس نئی لڑکی پہ پڑی۔۔۔ انہوں نے کھیل روک کر اس کی طرف دیکھا۔ آپس میں کچھ کھسر پھسر کی۔۔۔ پتا نہیں وہ اس کو اپنے کھیل میں شریک بھی کریں گی یا نہیں۔

"تم۔۔۔ 45 اے میں آئی ہو؟" ان میں سے ایک آگے آئی۔۔۔ اس گھر کی پیشانی پہ سیاہ ہندسوں میں کچھ نمبر لکھے تو تھے۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی گھروں کے بھی نام ہوتے ہیں۔ البتہ بڑے بھائی نے جو تختی گاڑی' وہ حروف بخوبی پڑھ سکتی تھی۔

سید مہدی بی اے۔

یہ ایک کلاس ون گزیٹڈ آفیسر کا گھر تھا۔ بہت زیادہ خوش حالی کا زمانہ نہیں تھا۔ زیادہ تر شرفا ایسے ہی حالات میں جی رہے تھے اور خوش تھے۔ حلال کی روٹی کے سوا بھی رزق کی کوئی قسم ہے۔ یہ اطلاع نچلے درجے کے افسر تک نہیں پہنچی تھی۔ لال اینٹوں والے دو منزلہ مکانوں کی کالونی ابھی زیر تعمیر تھی' وہ اتنے نئے تھے کہ ان سے کوری اینٹوں کی مہک آتی تھی۔ کالونی ابھی مکمل نہیں ہوئی اور بستی کو ابھی آباد ہونا تھا۔

سڑک کوٹنے والا انجن دن رات کرتا' سیاہ چمک دار سیال کو تار کو اپنے بھاری پہیوں تلے روندتا گزرتا۔۔۔ ہر دفعہ اس کی چمک پہ میمن صاحب باہر نکل کر اپنی چاروں لڑکیوں کو بری طرح جھڑکتے جو کسی کے قابو میں نہیں آتی تھیں۔ انیسہ' رشیدہ' رضیہ' رئیسہ۔۔۔ روڈ رولر والا کسی نامعلوم زبان میں بڑبڑاتا کہ وہ لوہے کے بھاری پہیوں کے نیچے کچلے جانے کے خوف سے بے نیاز بھاپ دیتے گرم تار کول سے بے پروا اس دوڑتے ہوئے لوہے کے بھوت کے پیچھے لپکی تھیں۔۔۔ ان کی چپلوں پر راکھ چپک جاتی پھر وہ زور لگا کر سڑک سے چپل آزاد کرتیں۔۔۔ ساتھ ہی قلقل کرتے قہقہے آزاد ہوتے۔ وہ گلی سے آئے تھے جس طرح باقی سب بھی کہیں نہ کہیں سے آئے ہی تھے۔ ون یونٹ ابھی بنا تھا۔ ایک سرکاری حکم پر دور دراز کے اپنے گھروں میں بستے لوگ اپنا مال متاع سمیٹ لاہور روانہ ہوئے۔۔۔ ان کے بلاک میں چھ گھر تھے اور پریا جذب اپنے امی ابا کے ساتھ رہتے۔ جوانی باجی کو آپا گلے کہتے تھے۔ وہ پشاور سے آئے تھے اور ہنیار اپنا ساتھا۔ "وہاں کا سیر سوا سیر کا ہوتا تھا یہاں آکر ملی خفا ہے۔"

اور دوسری طرف تیموری صاحب رہتے۔ جو کراچی سے چلے تھے۔۔۔ ان کے بچے کراچی کے قصے سناتے تو مجمع اکٹھا ہو جاتا۔۔۔ کراچی تو جیسے کوہ قاف تھا۔ پورے بلاک میں صرف ان ہی کے گھر ریڈیو تھا جہاں سے رات

گئے ریڈیو سیلون سے بھولے بسرے گیتوں کا پروگرام نشر ہوتا۔۔۔ وہ آواز معمول سے ذرا بلند رکھتے کہ پورا بلاک تا کی بدھر آواز میں سرشار ہو سکے۔

ایک طرف ڈی میلو صاحب کا گھر تھا۔ پاکستان بننے کے بعد اور حکمرانی چھن جانے کے باوجود وہ واپس نہیں گئے۔ ان کے والد کی بھی یہیں کی پیدائش تھی اور دادا کی بھی۔ اس کے باوجود ان کو انگریزی کے سوا کوئی زبان بولنی نہیں آتی تھی۔۔۔ پاکستان سے ان کو قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی اور لاہور ان سے چھوڑا نہیں جاتا تھا۔ شاید آزادی کی کہانی بھی ان کو معلوم نہیں تھی کہ جب بڑی اور جشن کی رات گئے کالونی بھر کے بچے گراؤنڈ میں ادھم مچاتے تو وہ ان میں کھانے ملنے نہیں تھے۔ کالونی میں یہ لفظوں یہ افواہ بھی تھی کہ آج بھی ان کے گھر میں سور پکتا ہے اور شراب پی جاتی ہے۔ وہ ان کے گھر یا کالونی سے لنگ کے جھانکتی ہا رہے نہیں پتا دونوں چیزیں کیا ہوتی ہیں۔ وہ تو بس کرسی پہ دراز ایک ضخیم سے انگریزی اخبار میں غرق ملتے جس کے پہلے ورق پر شاہی خاندان کی مٹی مٹی کی تصویریں ہیں اس وقت تک وہ وفاداری کی تاریخ سے نابلد تھی۔ کیسے ایک ہی شخص دو مختلف جنتوں کا مسافر ہو سکتا ہے۔ لاہور موجود تھا' تاج برطانیہ کا خاتمہ ہوا ایک دل میں موجود تھا۔ وہ سرا ذہن پہ طاری۔۔۔ ان کے گھر کی سب سے دلچسپ چیز ڈی میلو صاحب کا جنازہ تھا کو جنازہ کوئی دلچسپ چیز نہیں ہوا کرتا۔۔۔ لیکن اپنی پانچ سالہ زندگی میں اس نے کوئی میت کبھی نہیں دیکھی تھی لہٰذا جب ان کا کوفن باہر لایا گیا اور اس نے نظر بچا کر اندر جھانکا تو اسے منظر نہایت مزے دار لگا۔۔۔ سیاہ سوٹ پہنے بو باندھے' بالوں کی دائیں طرف کی مانگ قرینے سے جمائے جیسے کسی پارٹی میں جانے کو تیار تھے۔

"کتنے بارعب!" اس نے جیسے اپنے بزرگوں کو دیکھا تھا' ادب سے بول دیا۔ شام کے اس ڈوبتے پہر میں ایسا لگا جیسے بھی پتا نہیں۔ اس سے اس کو کوئی علاقہ نہیں تھا۔

چھتا گھر کوئٹہ سے آئے ایک خاندان کے پاس تھا جن کے بچے نہیں تھے ان کا حوالہ کسی کی امی نہیں تھا۔ لہٰذا

ان کو "کس نے" کہا جاتا اور ایک جملے میں بہت سے معنی سا الفاظ کئی دفعہ بول جاتی۔ یا اس لفظ کا مطلب پوچھنے کی اجازت نہیں تھی۔ سوال کوئی قابل تعریف چیز نہیں تھی۔ اس سے بغاوت کی بو آتی تھی۔ اب جو نسل آئی تھی اس کے ذہن میں سب سوال کلبلاتے تھے۔ لیکن ان پر سوال جواب بند تھے۔

کالونی کی چار دیواری کے باہر ملتان روڈ تھی۔ خاموش طبع ٹھہرے مزاج کی پرسکون سڑک جس کے ایک طرف چوبرجی کے تین میناروں والی عمارت اور دوسری طرف سمن آباد تھا۔ کبھی کوئی موٹر سائیکل پھٹ پھٹاتا یا اومنی بس سروس کی تین نمبر بس بھاگتی نکل جاتی۔ البتہ تانگوں کا رواج عام تھا۔ چرچر کرتے تانگے کے پہیے سے لٹکی لالٹین کی مدھم پیلی روشنی رات کی تاریکی میں سڑک کو بہت پراسرار بناتی تھی۔ تانگہ زبان کی زبان کو تالو سے چپکا کر ٹخ ٹخ کرتا گھوڑا اس ردھم کے ساتھ قدم بڑھاتا۔ کالونی کے ایک گیٹ پہ پانی کی حوضی تھی۔ جس میں منہ دے کے گھوڑا بڑی فرصت سے پانی پیتا اس دوران مسافر زمین پہ بیٹھے خوانچے والے سے سگریٹ خریدتا۔ کیروسین آئل سے جلتی ایک چھوٹی سی ڈبیا سے کیل سے لٹکی سُتلی کو آگ دکھا کر سگریٹ جلاتا یا پھلوں کے ٹھوکے سے گنڈیریوں کا تھیلا بھروا لیتا۔ بہرکیف تھوڑا سی افراتفری کے موڈ میں نہیں ہوتا تھا۔ سڑک کے پار گنوں کے کھیت تھے اور کھیتوں کے پاس دیسی گلابوں کی بستی۔ اندر جا کر ایم اے او کالج کے گراؤنڈ کی بہتات میں رائفل رینج کی بستی میں کھلتی، جہاں صبح صبح سیر کے لیے آئے لوگوں اور کسرت کرنے والوں کا میلا سا لگا رہتا۔ ہر طرف سبزہ اور درخت تھے درخت مکڑی کے دیو ہیکل جالوں سے اٹے پڑے تھے۔

ہر چیز کے پار کچھ نا کچھ آباد ہے کیا کہیں کوئی خاتمہ بھی ہے؟ کوئی ایسی بستی جس کے بعد مکانیت کا خاتمہ ہوجائے؟

سب صوبوں اور الحاقی ریاستوں کو جوڑ کر ایک صوبہ بنایا گیا جس کا نام مغربی پاکستان تھا۔ ایک ہزار میل پرے دشمن ملک سے اس طرف ایک دوسرا یونٹ تھا۔ مشرق میں ہونے کی وجہ سے مشرقی پاکستان نام پڑا جب زبان کا اختلاف شروع ہوا تو یہ بھی پاکستان کہلایا جانے لگا۔ ہجرت میں جو لباس داغدار ہوئے وہ خون کے دھبے ابھی دھلے نہیں تھے اور لاعلم تھے کہ مزید کتنے دھبے منتظر ہیں۔ کثیر الاولادی کا زمانہ تھا۔ ہر گھر میں دس بارہ نفوس رہتے۔ ڈبوں میں جوتوں کی طرح بند ہو کر سوتے لیکن شکووں سے بالاتر تھے۔ ہر شام نہا دھو کر بالوں میں تیل لگا کے پھول بنا کر۔ بہت اچھے بچوں کی طرح پارک میں کھیلنے کا رواج بھی تھا جہاں ایک چچا بچوں کو نمبر کھلاتے تھے۔ انکل بھی ابھی لغت میں شامل نہیں ہوا تھا۔ وہ بچوں کو دوڑا دوڑا کے بے دم کر دیتے۔

منہ میں پچ اور چمچ میں ایک کانچ کا بنٹا۔ تیر کی طرح سیدھا جاتا ہے [illegible] انکل بولے۔ توازن، تناسب اور ارتکاز۔ سب کچھ تھا ایک کھیل میں۔ قانون اور ضابطوں کے لیے ہر سال الیکشن ہوتا۔ بی این آر کے چھوٹے سے آڈیٹوریم میں ریاضی کے ادق سوالات کا حل سکھایا جاتا۔ کبھی مولوی صاحب آکر قرآنی قصے سناتے جس میں قیامت کا ذکر بھی ہوتا تھا۔ کہ قیامت بالکل نزدیک آگئی ہے۔ کبھی کبھی نائلہ کو بہت خوف محسوس ہوتا اگر گھر پہنچنے سے پہلے قیامت آگئی تو کیا ہوگا۔ وہ [illegible] کی جعفری سے باہر جھانکتے دہشت زدہ رہتی۔ اس کے بعد بچوں میں لائبریری سے کتابیں تقسیم کی جاتیں۔ مغرب کی اذان ڈیڈ لائن تھی۔ اس کے بعد کسی کو گھر سے باہر رہنے کی اجازت نہیں۔

والدین سنجیدہ مزاج تھے۔ ہنسی مذاق کا دستور نہیں تھا۔ البتہ نائلہ مہدی کا گھرانہ ذرا ہٹ کے تھا۔ لوگ خاندانوں گھروں سے بچھڑے ہوئے تھے۔ لاہور پردیس کی طرح تھا نہ عزیز رشتے دار نہ کہیں آنا جانا۔ لہٰذا اب بچھڑے رشتے پڑوس سے ملنے کا ذریعہ گھر تھا۔ یہ آج کی عورت تھی۔

ماضی کی عورت گھر میں پابند لیکن اندرون خانہ حکمران تھی۔ بظاہر مظلوم، بے بس لیکن اپنے سے مظلوم تر

طبقے کی زندگی سے کھیلتی۔ اس نے خود کو مظلوم سمجھنا بند نہیں کیا تھا لیکن کبھی اس ظلم کے خلاف آواز بھی نہیں اٹھائی تھی۔ بہرکیف اس نسل کی ماں نے لڑکیوں کو پڑھنے بھیجنے کا ایک انقلابی فیصلہ کر لیا تھا گو ان کے والدین کو اپنی اولاد کے اس آزادانہ فیصلے میں گناہ کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ وہ اپنے بچوں کو آزادی دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے بچوں پر بہت بوجھ ڈال دیا تھا۔ غلطیاں کرنے اور اس کی پاداش میں انجام کے بھگتنے کا بوجھ۔ بڑی قربانی ماں کو دینی پڑی لڑکیوں کو سل بٹے سے ہٹا کر اسکول بھیجا ان کے حصے کا بوجھ بھی سر لے کر۔

یہ پہلی نسل تھی جس نے لڑکیوں اور لڑکوں میں تعلیم کی تفریق ختم کر دی۔

گرمی کی طویل چھٹیاں ایک مستقل پکنک کی صورت گزاری جاتیں۔ امی ابا تاش کی بازی لگاتے اور اس قدر اناڑی تھے کہ جوش میں ساتھی کے پتے ہی کھینچ جاتے۔ وہ فلاسفر بھائی شطرنج کی بساط بچھاتے آمنے سامنے ٹھنڈے سیمنٹ کے کورے فرش پر آلتی پالتی مارے چال کم چلتے تھے سوچتے زیادہ۔ دوسری طرف کیرم کی ٹھاک ٹھاک اور نعروں کی گونج۔ شدت سے پڑھائی کا رواج امتحان سر پہ آنے کے بعد ہی ہوتا تب سب کچھ سمیٹ دیا جاتا پھر کتاب ہاتھ میں پکڑ کر نیم تاریک [illegible] میں "اس دیوار سے اس دیوار تک رٹا لگایا جاتا "ایک سن عموماً" دو چکروں میں یاد ہو جاتا "پہلی عالمی جنگ 1914ء میں لڑی گئی۔ پہلی عالمی جنگ 1914ء پہلی عالمی۔"

جب یقین ہو جاتا کہ جملہ ٹھیک سے ازبر ہو گیا ہے تو دوسرے جملے کو پکڑا جاتا۔ جملہ طویل ہوتا تو اس کو ٹکڑوں میں بانٹ کر رٹا جاتا۔ ہر گھر میں ایک ہی کھانا پکتا تھا۔ آلو گوشت کا شوربہ۔ گو طریقہ اپنے اپنے رواج سے میل کھاتا۔ بازار سے کھانا آنے کا رواج نہیں تھا۔ اس کو چٹور پن سمجھا جاتا اور مائیں مفت میں پھوہڑ مشہور ہو جاتیں۔

ڈرائنگ روم کچھ زیادہ عام نہیں ہوا تھا۔ گھر میں ایک چھوٹی سی بیٹھک ہوتی۔ جس میں آرائش کے بجائے آرام دہ کرسیاں ہوتیں وہیں کہیں کونے میں ایک تخت دھرا رہتا۔ اسی تخت پر نماز پڑھی جاتی۔ گرمی کی چھٹیوں کا کام ہوتا [illegible] کے خط۔ ایک یادگار سفر پہ جواب مضمون۔ وہیں سبزی کاٹی جاتی اسی پر پرانا اخبار بچھا کر کھانا کھایا جاتا۔ گرمیوں کی دوپہروں میں جب حبس کی شدت میں سانس لینا دشوار ہو جاتا۔ وہیں کھڑکیاں دروازے کھول کر نیند کا [illegible] لیا جاتا۔ کھجور کی خشک رنگین پتوں کی پنکھیاں، مکھی سے بچنے کو چہرے پہ اوندھائے استراحت فرماتیں۔ جب پسینے کی دھاریں سر سے گزر کر گردن میں جذب ہوتیں تو عالم غنودگی میں ہی ڈنڈی ہلا کر پھر چہرہ ڈھانپ لیتیں۔

پاکستان کا ماڈل۔

مختلف صوبوں اور اکائیوں سے ہجرت کرکے آئے ہوئے لوگ اپنا قبیلہ، برادریاں چھوڑ کر اپنی زمین، رشتے ناتوں سے تعلق توڑ کر اپنے گھروں سے وعدہ کرتے کہ ہم 30 سال بعد واپس آئیں گے مایوس نہ ہونا، ہمارا انتظار کرنا۔ زمین قدیم ہے۔ وہ آدمی کی مزاج آشنا ہے۔ وہ جانتی ہے ان سے پہلے جو گئے وہ بھی انہیں انتظار کی اذیت سے آشنا کر گئے تھے۔ پر جانے والے پیچھے نہیں دیکھتے۔ وہ ہنس دیتی ہے اور چپ ہے۔

لوگ رزق کی تلاش میں انجان بستیوں کی طرف سفر کرتے پہنچ گئے اور چپ ہیں۔ پاکستان نیا نیا بنا ہے قربانیوں پہ آمادہ، وطن کی محبت میں سرشار لوگ جوق در جوق چلے آتے ہیں۔ ابھی تک انڈیا سے ہجرت کا سلسلہ بھی جاری ہے۔

ایک ایک بلاک ایک ملک نہیں۔ ایک صوبہ ہے۔ ایک کلچر ہے۔ ایک زبان ہے۔ ایک مذہب ہے۔

کسی کو اس بات سے دلچسپی نہیں کہ ساتھ والے گھر میں کون سی زبان بولی جاتی ہے۔ وہ دال کو پکا کے بگھار لگاتے ہیں یا بگھار لگا کر پکاتے ہیں۔ وہ نماز پڑھتے ہیں یا نہیں اور پڑھتے ہیں تو ہاتھ باندھ لیتے ہیں یا چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ

ایک دوسرے کی بخشش کے لیے بھی حیران نہیں۔

وہ سب انجان بستیوں کے مسافر ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں' اپنے گھروں میں اپنی بولی بولتے ہیں لیکن باہر آتے ہیں تو ایک مشترک زبان بولتے ہیں۔

مہدی صاحب کا گھرانا احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یوں تو سب ہی قابلِ احترام ہیں لیکن وہ لیے دیے رہنے اور لوگوں کے کام آنے کی وجہ سے مقبولیت کا بلند گراف رکھتے ہیں۔

ان کی بیٹی ہے سب سے چھوٹی بے قرار روح۔ اس کو جوتیاں چٹخاتے پھرتے رہنے کی عادت ہے۔ کالونی میں اس کی سہیلیوں کی تعداد بھی بے حساب ہے لہٰذا کسی بھی کھلے دروازے سے اندر داخل ہو جاتی۔ کسی کے گھر سے کھانا کھانے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن گھروں سے اٹھنے والی خوراک کی مہک اس کو مسحور کر دیتی۔ قاعدے ضابطے اس کے لیے بنے بھی نہیں تھے۔ پتا نہیں کیسے ہوتا۔ ہر قانون اس سے ٹوٹ جاتا تھا۔ وہ اس کو اپنے کھانے میں ساتھ شامل ہونے کی دعوت دیتے اور وہ بلا جھجک بیٹھ جاتی۔ اجازت نہ ہونے کے باوجود ایک نوالہ ضرور چکھتی۔

اسے لوگوں کی زندگی ایک کہانی لگتی ۔۔۔ اور یہاں کھلی کتابوں کے ڈھیر لگے تھے۔ مثلاً "ثریا جذیب کے آٹھوں بہن بھائی ایک ہی پلیٹ میں کھانا نکال کے کھاتے ۔۔۔ ایک دو لقموں میں پلیٹ خالی رہ جاتی پھر ایک شخص باورچی خانے میں دوڑتا۔ پلیٹ لبالب بھری آتی اور منٹوں میں خالی ہو جاتی ۔۔۔ ان سب کو دنبے کا گوشت بہت مرغوب تھا لیکن آسانی سے ملتا نہیں تھا کہیں سے آجاتا تو عید ہوتی۔ ان کے سالن پہ چکنائی کی ایک دبیز تہہ ہوتی وہ سب آپس میں ہندکو بولتے۔ جو اس کو ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ ان کو اس بات پر بہت فخر تھا کہ ایک مرتبہ قائداعظم ان کے شہر پشاور آئے تھے۔ جب وہ اسلامیہ کالج کے طالب علم تھے اور علی گڑھ کی روایت کو مدِنظر رکھتے انہوں نے بھی ان کی بگھی کے گھوڑے کھول دیے اور ان کی جگہ خود جت گئے تھے۔ انہوں نے قائداعظم کی پوری زندگی میں ایک جھلک دیکھی تھی وہ بھی دور سے اور لمحے بھر کو ۔۔۔ لیکن وہ لمحہ ان کی کل کائنات تھا۔ وہ اپنے بچوں کے سامنے یہ واقعہ بار بار دہراتے۔ ایک لمحے کی کہانی مگر عمر بھر کا بیان ۔۔۔ ان لوگوں کے فخر کے معیار موجودہ عہد سے جدا تھے۔

تیموری صاحب جو کراچی سے آئے تھے جن کے گھر سے رات گئے اداس غمگین دھیمے سروں والے گانے بجتے تھے ۔۔۔ وہ جو موسیقی کو بھی مل بانٹ کر کھانے کے عادی تھے ان کے گھر میں بہت سے بچے تھے۔ ایک گود میں تھا دوسرا چلنا سیکھ رہا تھا اور تیسرا پیدا ہوا تھا۔ کالونی میں کسی کے گھر بچہ پیدا ہوتا تو سب سے پہلے اسی کو خبر ہوتی پھر وہ سہیلیوں کا ہجوم لیے بچہ دیکھنے جاتی۔ بچہ ململ کا دوپٹہ اوڑھے سو رہا ہوتا۔ ماں تو گویا جیتا جاگتا کسی کی طرح اس کے گھر سے نقاب سرکا کے ذرا سی جھلک دکھاتی پھر ان کے آجانے سے اس کو فرصت مل جاتی وہ بچہ ان کے سپرد کر خانہ داری میں جت جاتی۔ وہ گھر پہنچتی تو اس کے کپڑے پانی سے شرابور ہوتے۔ جب تک بچی نے کھانا پکایا اس نے دو سال والے کو کھانا کھلا دیا اور تین سال والے کو نہلا کر کپڑے بدل دیے تھے اور اپنی ان سرگرمیوں پر گھر سے جھاڑ کھائی۔

میمن صاحب کے گھر اس کا بہت دل لگتا کیونکہ وہاں سب لڑکیاں تھیں۔ وہ سب شور مچاتی چیختی چلاتی لڑکیاں تھیں۔ ان کو مزے مزے کے کھیل آتے وہ مائی کے قصے سناتیں' جہاں روٹی کو مانی کہا جاتا۔ وہ مائی جہاں ان کی محبوب خالہ رہ گئی تھیں جس کے ذکر سے وہ غمگین ہو جاتیں۔

کالونی کے اندر ایک ہی اسکول تھا۔ جس میں ایک ہی کلاس تھی۔ لہٰذا ہر بڑے چھوٹے کو اسی کلاس میں ٹھونس دیا گیا۔ لہٰذا ان بونے کے بعد پہلے ہی سال' سب کی سب لڑکیاں تیسری جماعت میں داخل ہو گئیں۔

مائیں زیادہ خوش مزاج نہیں ہوتی تھیں۔ زیادہ وقت وہ جھنجلاتی رہتیں۔ ”چلو پڑھو بیٹھ کر۔“ کسی سے ناخوش ہوتیں تو ان کی سب سے پسندیدہ سزا یہی ہوتی تھی۔

وہ آٹھ سال کی تھی جب اس نے لوگوں کو سخت تشویش کے عالم میں کالونی کے گھروں سے ملنے والی سڑکوں کے سنگم پہ کھڑے دیکھا۔ یہ چوک بزرگوں کا تشویش چوک تھا۔ وہ سخت پریشانی میں مبتلا ہوتے تو یہاں آکر پنچایت لگا لیتے۔

نائلہ نے اپنے ابا کا ہاتھ جھلا کر پوچھا۔

”کیا ہوا ہے ابا؟“

”مارشل لا لگ گیا۔“

”وہ کیا ہوتا ہے؟“ اس نے دو منزلہ عمارتوں کی لال اینٹوں پہ کچھ کھوجنا چاہا۔۔۔ وہاں کچھ نہیں لکھا تھا۔

”آئین منسوخ ہو گیا۔“

”آئین کیا ہوتا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“ کسی نے جھڑک کر کہا ”جاؤ کھیلو۔“

دوسری سزا۔ وہاں ڈانٹ ڈپٹ کے لیے ابا ہونا شرط نہیں تھی۔ کوئی بھی کسی کو بھی ڈانٹ سکتا تھا، کسی قسم کی ممانعت نہیں تھی۔۔۔ وہ ایک ٹانگ سے فرضی کیری کا ڈا کھلتی، اچھلتی اپنی پلاٹون کو خبر کرنے چلی، جو خود اس کے بھی پلے نہیں پڑی تھی۔

پھر اس نے اڑتے اڑتے سنا۔۔۔ وہ جو مارشل لا ہے نا اس کا اصلی نام فیلڈ مارشل ہے۔

”فیلڈ مارشل یہ کیسا نام ہے، ہی ہی ہی۔“

”چپ کرو۔۔۔ پڑھو بیٹھ کر۔“

پھر اس نے دیکھا ابا اور کالونی کے سب چچا اسی سزا کا شکار ہوئے جو بچوں کے لیے ان کی پسندیدہ تھی۔ جیسے ان کے ہونٹ سل گئے سو چپ رہ گئے صم بکم...

چوک پہ کھڑے ہو کر بولنے کی تفریح بھی چھن گئی۔ ابا لوگ منہ بند کر کے سیکرٹریٹ جاتے۔ زبان دانتوں میں بھینچے واپس پلٹتے۔

آزادی کے بعد یہ پہلا دھکا تھا اور لوگ ابھی تک جھوک میں تھے کہ فیلڈ مارشل نے بڑے بڑے کام شروع کر دیے۔ رات کے اختتام پر سڑکیں پانی سے دھلی جاتیں، خوانچہ فروشوں کو تیر کی طرح ہانک کر پیچھے کا حکم دیا گیا، ذخیرہ اندوزی اور ملاوٹ خوروں کے خلاف کارروائی کا آغاز ہوا۔ سیاست کا کیا بنا؟ آئین قانون کس ٹھکانے لگے۔

جاگنے والو جاگو مگر خاموش رہو...

چچا تیموری کا ریڈیو پراسرار سرگوشی کر رہا تھا۔

”یہ ایوب خان کا مارشل لا ہے۔ جنرل ڈائر کا زمانہ تھوڑا ہے۔“ وہ فیلڈ مارشل سے بھی محبت کرنے لگے۔

ابھی حکمرانوں کو ناپسند کرنے کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ سو تو غلام محمد سے بھی نفرت نہیں کرتے تھے۔ یہ اندر اندر کڑھنے والی قوم تھی، غصہ دبا جانے والی۔ سو اپنے حصے کا غصہ اپنے وقت میں نکال آئے تھے۔ اب برداشت کا وقت آن لگا تھا۔ اچانک کہیں سے ایک طبقہ بھی پیدا ہوا جس نے ان تمام اقدامات کے گن گاتے اتنا ڈھول پیٹا کہ خود اس کو یقین ہو گیا وہی نجات دہندہ ہے۔

ہمارا صدر رہے اتنا اچھا۔۔۔ لمبا چوڑا، گورا، خوب صورت۔

حکمران اور فلمی ہیرو میں کوئی فرق ہونا چاہیے یا نہیں؟ پتہ نہیں!

زندگی بوجھل نہیں تھی، لیکن سوگوار تھی۔

خوشحال لوگ بھی سونا اچھالتے نہیں پھرتے تھے۔ لیکن فاقہ کشی کا زمانہ بھی نہیں تھا۔ گندم وافر تھی۔ قیمتیں بتدریج بڑھ رہی تھیں لیکن قابو سے باہر نہیں تھیں۔ سیاست عوام تک نہیں پہنچی تھی۔ زیادہ تر سرکاری ملازم تھے جو سر جھکا کر جینے کے عادی تھے۔ ساری کالونی افسروں کی تھی لیکن کار کسی کے پاس نہیں تھی۔ سب سائیکل پر سیکرٹریٹ جاتے۔ رشوت خور، رشوت لیتا تھا لیکن سب سے منہ چھپا کے جیتا۔ لوگ اس کو نفرت سے دیکھتے اور زیادہ میل ملاپ پسند نہیں کرتے تھے۔ چمچہ کا لفظ بھی نیا رائج ہوا تھا، مخبروں کا سورس افواہ تھی۔

ایسے میں ایک تازہ طبقہ سامنے آیا۔ یہ نئی نسل کے طالب علم تھے، جب پاکستان بنا تو ابھی کم سن تھے۔۔۔ جن کا خون جوش کھاتا تھا۔ وہ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ سب سیاسی لیڈرز ایبڈو زدہ تھے۔ سیاست پر بات منع تھی، ہر پبلک پلیس پر جلی حروف میں حکم درج تھا۔ خلاف ورزی کرنے والا حوالہ پولیس کیا جاوے گا۔

شعر جیسی بے ضرر شے بھی پاکستان [illegible] میں جرم تھی۔ اس لیے حبیب جالب زیادہ تر جیل میں ہی زندگی گزارتے۔

وہ ساتویں میں تھی، جب ایوب خان کا بنایا ہوا آئین آیا۔ اس کی اسکول ٹیچر بہت دکھی تھیں۔ انہوں نے آئین کی تفصیلات اور مارشل لا کے ضابطوں پر تفصیلی گفتگو کی۔۔۔ یہ بھی بتایا کہ پاکستان بناتے کیا کیا سوچا گیا تھا لیکن اس کی بہت کچھ سمجھ میں نہیں بھی آیا۔ سوا اس کے جو ہوا ٹھیک نہیں ہوا اور یہ بھی کہ وہ دکھی تھیں۔۔۔ سب دکھی تھے مگر پرزور اصرار تھا۔ خاموش رہو۔

بڑے بھائی پنجاب یونیورسٹی میں پڑھتے جو مال روڈ پر واقع تھی۔۔۔ ایسے وقت میں جب عوام کی ایوب خان کے خلاف بولتے روح فنا ہوتی۔۔۔ یونیورسٹی میں اس کے خلاف کچھ نہ کچھ بازار گرم رہتا۔۔۔ بچے جیل جاتے کراچی، لاہور اور ڈھاکہ سیاسی طور پر بیدار لوگوں کے شہر تھے۔ طالب علم برادری بہت خوش نہیں تھی۔۔۔ حکومت ان سے خوف بھی کھاتی۔۔۔ گھسٹتی ہوئی گاڑی میں کہیں کہیں ترقی بھی نظر آتی اور تنقید بھی۔۔۔ لڑکیاں سیاہ برقعہ پہنتی تھیں۔ چادر پردے کی علامت نہیں تھی۔ لڑکیوں میں ماسٹرز کا رواج نیا نیا عام ہوا تھا۔ لوگ پڑھی لکھی لڑکیوں سے خوف کھاتے۔ ان کو ایم اے میں داخل کرنے کا مطلب یہ بھی تھا کہ ماں باپ ذہنی طور پہ تیار رہیں کہ ان کی بیٹی ان بیاہی رہ جائے گی۔

کالونی میں پڑھائی لکھائی کا رواج عام علاقوں سے زیادہ تھا۔ شاید اس لیے بھی کہ وہاں نہ جاگیردار تھے نہ دکان دار، نہ بنیے نہ سود خور، نہ کلرک نہ چپڑاسی۔۔۔ وہ تو بس سیدھے سادے سفید پوش سرکاری ملازم تھے۔ لاٹھی چارج، دفعہ 144 کے زمانوں میں اپنے بچوں کو تقدیر کے حوالے کر کے صابر رہنا بھی یہاں ہی تھا۔ صبح صبح سائیکل کے کیریر پہ ٹفن دان لٹکا کر ٹھیک وقت پر دفتر پہنچنے والے۔ چھٹی کے بعد سیدھے گھر آنے والے۔

نہ چھٹیاں، نہ رشوت، نہ ہڈ حرامی۔

اکلوتی تیسری جماعت کے اعلا تعلیم کے بعد اس کو نئے اسکول بھجوا دیا گیا جو ذرا فاصلے پر تھا۔ وہ آٹھویں جماعت میں تھی جب لاہور ایسے الٹ پلٹ ہوا جیسے کوئی پیالہ اوندھا دیتا ہے، وہ اب اس ذہنی سطح تک آ گئی تھی جب معاملات کی سوجھ بوجھ اتنی مشکل نہیں رہتی۔ مادر ملت میدان میں آئیں۔ اپنے بھائی کے بعد سے وہ ایک طویل خاموشی سی لگتیں اور ایوب خان کے خلاف الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا۔ الیکشن کے مزاج اور سیاسی سرگرمیوں میں ابھی عوام طفل مکتب تھے جہاں سیاست جرم ہو، وہاں ووٹ کا تصور بھی گناہ۔۔۔ طالب علم لالٹین کے انتخابی نشان کے پیچھے خلقت لے کر کھڑے ہو گئے۔ اس کا ابھی ووٹ نہیں بنا تھا، مزید کئی سال امکان بھی نہیں تھا لیکن چونکہ

کلاس میں فضا اور ملت کے لیے ہموار تھی۔ وہ اپنے بزرگوں کو چپکے چپکے مسکراتے دیکھتی تھی۔ ایک آس ایک امید۔ مادر ملت انتخاب جیت جائیں گی تو مارشل لا کا تاریک دور اب ختم ہونے کو ہے۔ ایک روشن اجلی صبح منتظر... آپ کے دروازے پر دستک دیتی۔

چچا تیمور کا ریڈیو گاتا تھا۔

رات بھر کا ہے مہمان اندھیرا
کس کے روکے رکا ہے سویرا۔

"ووٹ کیسے دیتے ہیں؟" نائلہ نے بھائی سے پوچھا تھا۔ اس نامانوس لفظ سے آشنائی میں زمانے درکار تھے۔

"ہم اپنے علاقے کے ممبر کو ووٹ دیں گے۔ وہ جاکر مادر ملت کو ووٹ دے گا۔"

لالٹین کے بونے سے پوسٹر پہ رنگ پھیرتے انہوں نے قطعی غیر دلچسپی سے جواب دیا۔

"اور اگر ممبر نے کسی اور کو ووٹ دے دیا؟"

لمحے بھر کو بھائی جان کے ہاتھ ڈگمگائے۔ سب رنگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے۔ ان کا پوسٹر تباہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے کبھی سوچا نہیں تھا یا جو اندیشے ان کو ڈراتے تھے "ایک نان پولیٹیکل نا سمجھ فرد نے بے سوچے بک دیے تھے۔

پھر اس نے ابا کے دوستوں کو اکٹھا ہو کر کہتے سنا۔

"اسٹیبلشمنٹ، بیوروکریسی، صنعت کار، جاگیردار... سب کے سب اس کا ساتھ ہیں۔" وہ کسی کا نام نہیں لیتے تھے۔

"مگر دوسری طرف مادر ملت ہیں۔"

"عورت کی حکمرانی کے خلاف متفقہ فتویٰ آگیا ہے۔"

"ہاں مگر... دوسری طرف..."

وہی ادھورے، بے معنی فقرے۔ "ہم کس سے ڈرتے ہیں۔" اس نے الجھ کر سوچا پھر نانی اماں کیوں کہتی ہیں اپنے گھر میں کاہے کا ڈر۔

انیسہ، رشیدہ، رضیہ، رئیسہ "ایک دائرے کی شکل میں گول گول گھومتی اک عجیب سا گیت گا رہی تھیں۔

"اوہائی نندی ہو جا ریڈی
مال روڈ کی سیر کو چلیں گے۔ آج نہیں ہیں گھر پہ ڈیڈی۔"

"جاؤ لڑکیوں۔" ان میں سے کسی نے ڈپٹ کر کہا۔ "اپنے گھر جاکر شور مچاؤ۔"

انہوں نے تابعداری سے اپنا حلقہ توڑا۔ "مال روڈ کی سیر کو..."

اب آوازیں ان کے صحن سے آرہی تھیں۔ چوک پہ کھڑے اس کے ابا اور دوست "نامعلوم دشمن پہ جھنجلا رہے تھے۔

اس کو زندگی میں پہلی دفعہ احساس ہوا... ہم طاقت ور سے ڈرتے ہیں کمزور پہ غراتے ہیں۔ کیسے ہیں ہم لوگ؟ ان کو ہم نے ہارنے دیا جو بی ڈی ممبرز ان کے نام پہ ووٹ لے کے چلے تھے۔ قافلے سے بچھڑ کیسے گئے ہم نے 58 میں سوال کیا تھا تا 64 میں زبان کھولی پھر کسی ایک دن وہ خاموشی سے اپنے بستر میں مرجھائی گئیں۔ ابھی وہ لوگ زندہ تھے جو قائد کو روئے تھے۔ وہ ایک رونا اور رو گئے... دوسرے ہی دن وہ قصۂ پارینہ ہو گئیں۔

وہ نویں جماعت میں تھی اسکول گرمی کی طویل طویل چھٹیوں کے بعد ابھی چند دن پہلے ہی کھلے تھے اب وہ بڑی کبھی جاتی تھی سڑکوں پہ دندناتے پھرنے کے بجائے اب چھٹیوں میں ان سب کو قرینہ سکھایا جاتا تھا۔ تکیے غلاف

کاڑھو۔ سویٹر بنانا سیکھو اور ہانڈی میں چمچ چلاتے ہلدی کی کچاند دور کرنا سیکھو۔

وہ گھر کی کھڑکی سے جھانکتی تو پارک ویسا ہی توانا اور بھرپور ہو تا چیخ کر گونجنے والی آوازوں کے بول بھی وہی ہوتے۔ "ہم پھول چمن میں آتے ہیں" آتے ہیں...

خلا کہیں نہیں ہے... ایک کی جگہ لینے بڑی آسانی سے دوسرا آجاتا ہے۔ سرسبز گھاس پر بھاگتی دوڑتی تازہ دم زندگی۔ وہ ایک دم بڑی ہو گئی تھی۔ بچپن کی نادانیوں پہ اب اس کا حق ختم ہوا۔

اب تفریح کا مرکز گراؤنڈ نہیں رہا تھا۔ اب اس کی اسکول ہی اس کی ایکٹیویٹی کا مرکز تھا۔ اس دن فضا عجیب و غریب قسم کے شور سے گونج اٹھی۔ آسمان پر ایسا شور کبھی سننے میں نہیں آیا تھا۔ بچے کلاسوں سے نکل کر برآمدوں میں جمع ہو گئے۔

"کیا ہوا؟" تیزی سے بھاگتا ایک جہاز اور اس کے تعاقب میں لپکتے تیز رفتار طیارے۔ اسکول کے صحن سے نظر آنے والے آسمان نے بھاگتے جہازوں کی یہ دوڑ کبھی نہیں دیکھی تھی۔

خبر رسانی کے سست ذریعوں کے باوجود جانے کیسے یہ خبر اسکول کا گیٹ پار کر کے اندر پہنچی۔ انڈیا نے پاکستان پر حملہ کر دیا۔

"یہ خطرے کا سائرن ہے بی بی!" حکم دین اس نسل کا نمائندہ تھے جس نے عالمی جنگ دیکھی تھی۔ سائرن ان کے کانوں میں ہنوز گونجتے۔

"اب خطرہ ٹل گیا۔" اس نے دوسرا سائرن کر اطمینان کا سانس لیا۔ وہ جنگ کی ہولناکیوں سے آگاہ تھے۔ اس قوم کے ساتھ یہ بڑی جنگ میں وہ فریق ہونے کے باوجود کسی کے رفیق نہیں تھے۔ سوال بقا اور فنا کا تھا، پالا جس دشمن سے پڑا تھا اس کا کام پاکستان دشمنی سے آگے کچھ نہیں تھا۔ آج تک آکاش وانی اس کی وضاحت نہیں کر سکا کہ دشمنوں نے لاہور پہ قبضے کی خبر کس خوشی میں اڑائی تھی۔ کہاں سے آئی تھی وہ تصویر جس میں انارکلی میں چہل قدمی کرتی سینا دکھائی گئی تھی۔

"اے دشمن دیں تو نے کس قوم کو للکارا، لے ہم بھی ہیں صف آرا۔"

قوم کا مزاج بدل گیا تھا۔ ساتھ ہی تیمور چچا کا موسیقی کا ذوق بھی۔

لوگ آپس کی رنجشیں مٹا کر ایک ہو گئے۔ سترہ دن کی جنگ نے جس طرح قوم کو متحد کیا وہ 18 سالوں نے نہیں کیا تھا۔ لوگ تن من دھن سے پیسے جمع کر کے حکومت کو دیتے۔ ایک پیسے میں دو ٹینک کی اسکیم آئی۔ رضائیوں، لحاف کے ٹرک بھر کر محاذ پر بھیجے جاتے۔ گھر گھر دم درود وظیفے پڑھے جاتے۔ جہاں لوگ متحد ہوں اور وطن کی محبت کے جذبے سے سرشار، وہاں دشمن کی مکاریاں کام نہیں بنا سکتیں۔

اس سے پہلے ان کو یہ اندازہ بھی نہیں تھا۔ ہر شخص پہ جیتی جنگ، میز پہ کیسے ہاری جاتی ہے۔ لوگ ہاتھ ملتے حسرت زدہ رہ گئے۔ کارواں تاشقند سے واپس آیا تو ملک بھر میں احتجاج کا طوفان برپا ہو گیا۔ یہ پہلی دفعہ تھی کہ حکمرانوں نے اپنے لیے کھانے کا سودا کیا اور جیتے مسکراتے اپنی زمین پر اترے۔ احتجاج کرنے والوں نے ڈنڈے، لاٹھیاں کھائیں۔ اس سارے رگڑے جھگڑے میں عوام کو البتہ ایک لیڈر مل گیا۔ جس کا عرصے سے قحط تھا۔ پچھلے پانچ ماہ سے جس جوش اور جذبے سے کام ہو رہا تھا۔ سرد پڑ گیا، لوگ ڈنڈے، گولیاں کھا کر سر جھکا کر بیٹھ رہے۔ قوم جو فیصلہ چاہتی تھی حکمرانوں نے اس کے بالکل خلاف کیا۔ اس کے بعد ایسے فیصلوں کی ایک قطار لگ گئی۔ حکمران اپنی قوم پہ دشمن کی طرح راج کرنے کے عادی ہو گئے، عوام رعایا تھی، غلام رعایا...

تاریخ کی کتابوں میں درج تھا ہم نے آزادی حاصل کر لی ہے۔ یہ بھی درج تھا۔ یہ آزادی بڑی قربانیاں دے کر حاصل کی گئی تھی۔ اس کے بعد کتابوں پر سکتے کی کیفیت طاری تھی، اس فضا میں آزاد مملکت کی غلام رعایا جیسے

حبس سے بھری فضا میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔
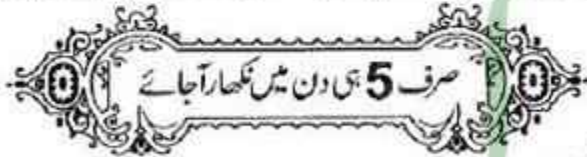
لوگوں کے حافظے اچھے نہیں ہوتے۔ وہ بھول جاتے ہیں یا یاد نہیں رکھنا چاہتے۔ کسی لمحے جب ہم سوچتے ہیں جیسے آج کے بعد ہم کبھی ہنس نہیں سکیں گے، اگلے ہی لمحے ہم خوب ہنس رہے ہوتے ہیں۔ اس دن جب وہ صدیق صاحب کی کینٹین کے سموسے خوب مرچوں والی چنا چاٹ میں ڈبو کے کھاتے اپنی سہیلیوں کے ساتھ خوب سوں سوں کر رہی تھی۔

کسی دن شوقیہ کلاس بنک کرنے کا اپنا مزہ ہے اور ہم کون سا روز... روز...

اپنی غلطیوں کو حق بجانب قرار دینے کو ہمارے پاس کتنی دلیلیں ہیں۔

گیٹ کے اس جانب اس نے لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں بینر تھے۔ "ہماری مانگیں پوری کرو۔" پتا نہیں وہ کیا مانگ رہے تھے اور کس سے۔ لیکن یہ پہلی دفعہ تھی کہ اس نے سچ مچ کا جیتا جاگتا ایک جلوس دیکھا تھا۔ زندگی بھی کیا کیا تماشا نہیں دکھاتی۔ جلوس فاصلے پر تھا اور شور مچاتا نکل گیا تھا۔

ایوب خان کی حکومت نے حال ہی میں اپنے دس سال پورے کیے تھے۔ اور ہم نواؤں کا خیال تھا اس عہد کو یادگار بنانے کے لیے دہ سالہ جشن کا اہتمام کرنا چاہیے۔ کبھی انوکھے لاڈلے ہی چاند نہیں مانگتے۔ لاڈ اٹھانے والے بھی چاند جھولی میں ڈال دینے پر تل جاتے ہیں۔ دانا وزیر تدبیریں لڑاتے۔ اللہ نے ہم پر مہربانی فرمائی کہ ایوب خان جیسا حکمران عطا فرمایا۔ لہٰذا سجدۂ شکر بجا لایا جائے۔ ملک بھر میں چراغاں کیا جائے اور ہر شخص پر لازم ہے کہ خوشی منائے۔ (گویا خوشی کا شمار بھی اب مارشل لا کے ضابطوں میں ٹھہرا۔)

میگزین انچارج نے اس کو آفس میں بلا کر ہدایت دیتے سمجھایا تھا۔ "میگزین کا خاص نمبر نکلوانا ہے۔ دس سالہ دور کی تمام کامیاب پالیسیاں۔ ہر قسم کی اصلاحات اور بے شمار تصویروں کے ساتھ۔ جلدی درکار ہے۔ حکومت کو بھجوانا ہے کہ وہ ثبوت مانگتی ہے۔" "کتنے دن مانگتی ہو؟"

"حکومت کے آرڈرز ہیں کہ کالج کی دیواریں ایوب خان کے پوسٹرز سے بھر دی جائیں۔ لہٰذا فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ دن رات لگا کر دیو ہیکل پوسٹرز تیار کرلے۔ پوسٹرز کا سائز ایسا ہونا چاہیے کہ باہر سڑک سے نظر آئے۔"

کچھ بادشاہ تھے کچھ اس سے زیادہ وفادار۔ کالج میں پڑھائی لکھائی کا دفتر بند ہو گیا اور سب سے اہم مصروفیت جشن بن گیا۔ میں اس وقت جب وہ اس یقین میں جی رہا تھا کہ اس کے عہد میں لوگ خوشیاں مناتے، جھوم جھوم کر رقص کرتے پھر رہے ہیں۔ وہ نجات دہندہ ہے "اس کو اب کوئی عمر بھر اس جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔" تنزل اب وہاں سے آیا، جس کی انہیں توقع بھی نہ تھی۔

پرانے استاد قابل احترام بزرگ دھیمے لہجوں میں بولتے "قربانیاں دے کر وطن حاصل کرتے اور موجودہ حالات پر کڑھتے۔ کہیں کوئی سیدھا راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ وہ مختلف افقی سمتوں میں سفر کرنے والے جیسے ایک دوسرے سے برسرپیکار ہوا ہی چاہتے تھے۔

"بڑا عجیب دن تھا۔" مس تندی اپنی طالبات کے ساتھ چند قدم چلتے وہی قصہ سنا رہی تھیں۔ جو ہر سال ہر بیچ کو سناتی آئی تھیں۔ بعض کہانیاں کہہ کر بھی ان کہی رہ جاتی ہیں۔

"موت چاروں طرف منڈلا رہی تھی۔ 21 سال کی عمر میں میں نے موت کے خوف کو خود سے اس قدر قریب محسوس کیا۔ ہر روز کسی نہ کسی بستی میں آگ لگ جاتی تھی۔ ابا جان کہتے تھے پھر آزادی کے لیے اتنی قربانیاں تو دینی پڑتی ہیں۔ تم کیا چاہتے ہو ہم انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کریں اور ہندو کی غلامی میں جا گریں؟" وہ یہ جملہ کہتے جا رہے تھے جب بلوائیوں نے ہمارے گھر پر بھی ہلہ بول دیا۔

یہاں تک پہنچ کر ان کی آواز بھرا جاتی تھی۔ قربانی کی یہ داستان وہ ادھوری چھوڑ کر آنسو پینے میں مشغول

ہو جائیں۔" پتھروہ ہموار اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھتیں۔

"وہ کیا ہم نے؟ صرف حکمرانوں میں تبدیلی کے لیے اتنی جانیں دیں؟ ان کے مزاج میں ان کی خوئے حکمرانی میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کیا یہ ہجرت اس لیے تھی کہ نئے حکمرانوں کو رعایا چاہیے تھی؟"

پتا نہیں کیسے ہوا اور کیوں۔ جیسے کوئی ایک چنگاری کسی ہوا کے جھونکے کی منتظر لگتی ہے۔ بھڑکتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے جنگل کو لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ معاہدہ تاشقند کے بعد سے اس حبس زدہ فضا کو کسی چنگاری کی ضرورت تھی اور کون جانے جو روشنی دکھائی دے یا خرمن جل کر راکھ ہو۔ تازہ ہوا کے خوشگوار جھونکے نصیب ہوں یا تن آور درختوں کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکتی آندھیاں۔ جیسے برسات میں کھمبیاں اگتی ہیں۔ ملک بھر میں اچانک جیسے جلوسوں کی ایک وبا پھوٹ پڑی۔ بظاہر تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن پتا نہیں کیوں اچانک لوگ بھڑک اٹھے۔ شہر احتجاج کرنے والوں سے بھر گئے۔ کب کب کی دبی حسرتیں' رنجشیں تھیں جو طوفان بنے۔

حکمران ویسے ہی پرسکون اور قابل رشک اطمینان میں نظر آتے تھے جو ان کا خاصا رہا تھا۔ خود کمانی میں سرشار' ان کو یقین تھا یہ دھتکاری ہوئی قوم صرف چار گولیوں کی مار ہے۔ پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔ گولی چلاتے تو ان کا ہاتھ بھی نہیں روکا گیا تھا۔ لیکن اس دفعہ فرق یہ رہا کہ احتجاجیوں کا عزم بھی لڑ کھڑانے سے انکاری ہو گیا۔ جیل روڈ سے اسپیشل بس نکلتی —— ریگل چوک بعض منزلوں سے ہوتی جب ملتان روڈ پر کالونی کے گیٹ کے سامنے رکتی تو معمول سے کہیں زیادہ وقت لے لیتی تھی۔ جگہ جگہ جلوس تھے۔ رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ بس خشک جھاڑیوں اور خاردار تاروں کے پاس رکتی۔ ڈرائیور اتر کر رکاوٹیں دور کرتا' واپس بیٹھ کر پھر منزل کی طرف رواں ہوتا۔

"بیٹھی رہو اپنی جگہ پر۔ خبردار کوئی بس سے اترا تو۔ گردن اندر کرو۔"

چاچا بس چلاتا جاتا اور حکم جاری کرتا جاتا۔ بس میں بیٹھی سب طالبات اس کی ذمے داری تھیں اور وہ اپنی ذمے داریاں نبھانا خوب جانتا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ بڑبڑاتا جاتا' پر اس کی سنتا کوئی نہیں تھا۔

ناصر باغ کے پاس پہنچ کر غیر اختیاری طور پر بس کے بریک اتنی زور سے چرچرائے کہ سب کے سر اگلی سیٹوں سے ٹکرا گئے۔

"سر نیچے کرو۔" ڈرائیور نے چلا کر کہا۔ "سیٹ سے نیچے ہو کر بیٹھو۔"

گاڑی میں آپا دھاپی پڑ گئی۔ لڑکیاں جان بچانے کو ایک دوسرے پر گر کر خود کو محفوظ کر رہی تھیں۔ بس کے اندر لڑکیوں کی خطرے کا الارم بجاتی چیخوں میں۔ کبھی ایک فائر کی آواز بھی نکل سے ... گھبرائی قوم کی چند نمائندہ طالبات جن میں نظم و ضبط کا قطعی فقدان تھا۔ ... کے لیے کھڑکی سے باہر دیکھا۔

ایک بہادر سپاہی بندوق تانے دھڑا دھڑ گولیاں چلا رہا تھا۔ کالج یونین کے ... ایک طالب علم کے پیٹ سے خون کا فوارہ بلند ہوا۔ وہ لڑکھڑایا اور بس اندھا دھند نظر سے دور ہو گئی۔

ایک مدت بعد اسے پتا چلا وہ طالب علم کے لڑکھڑاتے قدم آخری قدم تھے۔ جو اس کے وجود نے زمین پر اٹھائے' پھر وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ یہ پہلی لاش گری تھی اور پہلی لڑکی تھی۔

وطن کی تقدیروں کا فیصلہ کبھی طویل جنگیں ... اور کبھی صرف ایک گولی مقدر بدل کر رکھ دیتی ہے۔ پھر جیسے کچھ ان کے اختیار میں نہیں رہا۔ انسانوں کا ایک سمندر تھا۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے امنڈا آ رہا تھا۔ وہ ناصر باغ سے نکلا اور شہر بھر میں پھیل گیا۔ ... پھر ہجوم نے بسوں کو آگ لگا دی۔ عمارتوں کے شیشے توڑ دیے۔ ٹریفک سگنل اکھاڑ کر پھینک ... دیکھتے دیکھتے شہر بھر میں ویرانی کا راج ہو گیا۔ کچھ عرصہ پولیس نے ڈنڈے برسائے۔ آنسو گیس کے شیل مارے' گولیاں چلائیں۔ لیکن پھر وہ بھی سڑک سے غائب ہو گئے اور شہر احتجاجیوں

کے ہاتھ لگا۔ شہر در شہر چلتی یہ تحریک کہاں کہاں نہیں پہنچی۔

ادارے ہنوز حکومت نے بند نہیں کیے تھے۔ لیکن ان میں حاضری نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ میلوں پر پھیلے جلوس کالج پر ہلہ بول دیتے۔ یہ پہلا احتجاج تھا جس میں صرف لڑکے نہیں لڑکیوں کی بھی بے حساب تعداد شامل تھی۔ گیٹ توڑ کر وہ کالج میں گھستیں۔ اپنے ساتھ پہلے سے منتظر لیکن استادوں سے خوف زدہ ایک دوسرے جلوس کو ساتھ لے کر نکل جاتیں۔ جیل روڈ پر ان بھرے جلوسوں کو آتا جاتا دیکھتی اور حیران تھی۔ اپنی مختصر زندگی میں یہ حادثہ اس پر نہیں گزرا تھا۔

اس دن نائلہ مہدی نے ایک جلوس کو گزرتا دیکھا۔ اسے سخت شرم آ رہی تھی' جس احتجاج میں ساری قوم شامل تھی' وہ کیوں الگ تھلگ بیٹھی تھی۔ اچانک پرنسپل نے آفس سے نکل کر بلند آواز میں کہا۔

"چوکیدار' گیٹ کو تالا لگا دو۔" اور ابھی بجتی گھنٹی میں وہ واپس چلی گئیں۔ بھاری زنجیریں اور تالا لگا کر چوکیدار پلٹا بھی نہیں تھا کہ ہجوم گیٹ پر پہنچ گیا۔ ... میں بچھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے منہ لال تھے' بال بکھرے یہاں تک کہ ان کو اپنے دوپٹوں کا ... ہجوم نے اپنے وجود سے گیٹ پر زور ڈالا۔ لمحہ بھر میں آہنی سلاخوں اور زنجیروں والا ... آہنی گیٹ ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہجوم واپس ہو لیا۔ کلاس روم سے کالج کینٹین اور لائبریری سے بھاگتی لڑکیاں باہر نکلیں اور ہجوم کا حصہ بن گئیں۔ اتفاق ہی سے ہجوم میں شامل ہونے والوں میں نائلہ مہدی اور اس کا گروپ بھی شامل تھا۔ ان کے پیچھے دوڑتے یوں ہی نائلہ مہدی نے پلٹ کر دیکھا۔ مس ... کوریڈور میں کھلنے والی محراب کے پاس ایک بجھی ہوئی شکست خوردہ مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی تھیں۔ ان کے ... ٹھہرے ہوئے تھے۔ پھر پیچھے سے امنڈ کر آنے والے ہجوم نے ان کو دھکا دیا۔ بے دھیانی میں ... لڑکھڑائیں' بھاگتے ہجوم سے انہوں نے سوال کیا۔

"کیا کر رہے ہو؟ سوچا بھی؟"

نائلہ مہدی لوگوں کے ریلے میں پانی کی طرح بہتی باہر نکل چکی تھی۔ وہ جواب نہیں سن پائی۔ جیل روڈ پر چار' چار کی قطار میں ایک جلوس تیار تھا۔ یہ جلوس اس بکھرے ہوئے منتشر ہجوم سے قطعی مختلف تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی سر ہی سر نظر آتے تھے۔ وہ چپ چاپ ان کے درمیان جگہ بنا کر کھڑی ہو گئی۔ آج سے وہ اس احتجاج کا حصہ تھی۔

پھر اسکول کالج بند ہو گئے۔ کاروبار ٹھپ ہو گئے۔ کارخانوں کو تالے لگ گئے۔ شہر شہر کرفیو آرڈر نافذ ہو گئے۔ اس سارے ہنگامے سے بے نیاز' بچے ویران ملتان روڈ پر کرکٹ کھیلتے' دور سے کسی سرکاری جیپ کو آتے دیکھتے تو وڈر کالونی میں گھس جاتے۔ اب تو مدت ہوئی' یہ سڑک دھوئی بھی نہیں گئی تھی۔

پھر ہر طرف' ہر جگہ نعرے گونجنے لگے۔ گرتی پڑتی دیواروں والا لاہور بھی تازہ وارد تھا۔ سیاست دانوں نے تحریک ہائی جیک کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جیسے ہر شخص دیوانہ تھا اور کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔

فیلڈ مارشل نے وعدہ کیا۔ آئندہ الیکشن نہیں لڑے گا' پر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ پانی سر سے گزر گیا۔

جیلوں میں تھوڑے لوگ رہا کر دیے گئے۔ کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جیل میں جانے کے لیے کسی جرم کا سرزد ہونا ضروری نہیں تھا۔ صرف آپ کے خیالات سے متفق نہ ہونے پر جیل ہو جاتی تھی۔ ان کے پیچھے کچھ مجرم بھی نکلے' لیکن بے کار رہا۔

ملک کی سیاست نے پلٹے کھائے۔ پہلے اشتراکی ہونا گالی تھی۔ پھر سوشلزم کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ کثرت سے لوگ دائیں اور بائیں دھڑوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایسی وحشت اور دیوانگی میں اگر ملک بھر میں کہیں امن تھا تو کالونی میں۔ پتا نہیں لوگ کب کب کے دکھی تھے۔ اور معلوم نہیں کیسے دونوں حصوں کے لوگ اپنے اپنے لیڈر

اور اپنے اپنے پرچم کے نیچے اکٹھے ہونے لگے۔ اس دن ایوب خان نے اپنی آخری تقریر کی۔

"مجھ سے لوگوں نے کہا تھا اگر پاکستان کو بچانا ہے تو ان کے سب مطالبات تسلیم کرلو۔ میں نے پوچھا کون سا پاکستان کیونکہ اس کے بعد پاکستان بچتا ہی نہیں۔"

اور کون جانتا تھا 40 سال بعد اسی کی طرح آئے اس کے ایک اور ہم منصب نے لفظوں کو اسی طرح ادا کرنا ہوگا۔ اس نے بھی ذو معنی انداز میں لفظوں کو چباتے کہا تھا۔ "پاکستان۔۔۔ خدا حافظ۔"

کسی کے چلے جانے سے کاروبار بند نہیں ہوتے۔ صرف ہماری خواہش ہوتی ہے کاش! ہمارے بعد دنیا نیست و نابود ہوجائے نہیں، نہیں تو کچھ بھی نہیں، وہ بندوق پہ سوار آیا۔ گولی سے حکمرانی کی اور سب تتر بتر کرکے چلا گیا۔

ان کے بی اے کے امتحان سر پر تھے۔ جب اگلا آیا، نیا حکمران، نئی بندوق، نیا مارشل لا، مگر وہی ضابطے اگر کسی نے تحریر سے، لفظوں سے یا اشارے سے بھی مارشل لا کو غلط قرار دیا تو اسے گولی ماردی جائے گی۔

"ایک گول دائرے کا سفر۔ جہاں سے چلے تھے، ایک تاریک رات کاٹ کر صبح خود کو وہیں کھڑے پایا۔ بے چاری قوم۔۔۔"

نائلہ مہدی نے تاسف سے سوچا۔

کیا کھویا، کیا پایا۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد حکمرانی ایک زبردستی کے حکمران سے دوسرے خود بخود آنے والے حکمران کی طرف منتقل ہوگئی۔ اتنی کامیابی سے تحریک چلانے کے بعد کچھ بھی حاصل نہ ہونے کا نائلہ کا پہلا تجربہ تھا۔

ون یونٹ توڑ دیا گیا۔ آنے والا بنانا کم اور توڑنا زیادہ ہے۔ چودہ سال پہلے مختلف خطوں اور علاقوں سے آئے لوگ اپنی اپنی بستیوں کی طرف واپس پلٹ گئے۔ بچھڑ جانے کے غم میں آنسو بہاتے، لیکن پھر کبھی پلٹ کر بھی نہیں آئے۔

پھر ایک گول دائرے کا سفر جس کی نہ ابتدا ہے، نہ انتہا۔

ہر صوبہ دوسرے صوبے سے خفا ہو کر بیٹھا تھا۔ مشرقی پاکستان جان کنی کے عالم میں تھا۔ اور ریڈیو کا سرکاری بلیٹن کہتا تھا سب اچھا ہے۔ مشرقی پاکستان کی طرف سے ہولناک خبریں آرہی تھیں۔ دلی سے محبت رکھنے والے بنگالی بے بسی سے کہتے تھے، کچھ کرو۔ ایسے میں الیکشن کے اعلان نے مردہ لوگوں میں ایک نئی روح پھونک دی، کچھ ہوگیا تھا۔

اس کی پروفیسر عباس سے ملاقات الیکشن کے دنوں میں ہوئی۔ وہ ایک قطعی مختلف نائلہ تھی۔ اس نائلہ سے جو 56 میں لال اینٹوں کی اس کالونی میں آئی تھی۔

اس دوران بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے گزرا۔ ابا فوت ہوئے۔ بھائی اپنے اپنے گھروں میں آباد ہوئے۔ پہلی مرتبہ جب وہ مس تندی کو آنسو بہاتا چھوڑ کر نکلی تھی۔ اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

امید، جوش، ولولہ، کچھ کر گزرنے کی امنگ، جب تک آپ ظلم سہتے رہیں گے، آپ پر ظلم کیا جاتا رہے گا۔

کوئی نہیں جانتا تھا۔ الیکشن کا نتیجہ کیا آئے گا۔ لیکن جو بھی آئے گا 23 سال بعد انتخاب ہو رہا تھا۔ وہ دونوں جگہ جگہ ساتھ پائے جاتے تھے۔ دونوں کا تعلق مڈل کلاس سے تھا۔ دونوں آئیڈیلسٹ تھے۔ دونوں مستقبل سے پر امید۔ دونوں کی منزل ایک تھی اور دونوں کی امیدیں ایک ساتھ ہی ٹوٹی تھیں۔

☼ ☼ ☼

نائلہ مہدی بدل گئی تھی۔ لیکن اتنی بھی نہیں۔

یونیورسٹی بھر میں وہ سب سے سمجھ دار لڑکی سمجھی جاتی تھی، لیکن شاید اتنی بھی نہیں۔ ہر باغی انقلابی عورت کے اندر ایک بڑی روایتی سی لڑکی کہیں چھپ کر بیٹھی رہتی ہے۔ جب وہ اپنے آنچل کا پرچم بناتی ہے۔ جب جھنڈا اٹھا کر جلوسوں کی قیادت کرتی ہے اور جب لاٹھی چارج میں عین درمیان آکر ڈنڈے کھاتی ہے، اس انداز کی عورت کو جھڑک کر ایک طرف بٹھا جاتی ہے۔

"پڑھو بیٹھ کر، جاؤ کھیلو۔"

پھر کہیں کوئی ایک لمحہ ایسا آتا ہے کہ وہ بٹ کر خیالی سی عورت اوپر آکر اٹھ بیٹھتی ہے۔

اس نے پروفیسر عباس سے عقیدت کی انتہا تک عشق کیا تھا۔ وہ اپنے منہ زور جذبوں کی لگامیں کھینچتی، اپنے آپ پر پہرے بٹھاتی رہ گئی۔ لیکن وہ ہوا جو ہونا تھا۔ عباس اپنی ذات میں گم خاموش طبع انسان تھا۔ بے ضرورت یا اضافی لفظوں کی توقع اس سے کی ہی نہیں جاسکتی تھی۔ اس کے منہ سے تین حرفی ایک روایتی جملہ سننے کی حسرت میں اس نے عمر کاٹ دی۔

جب الیکشن کا نتیجہ ان کی خواہش کے عین مطابق آیا، جب گھناؤنی سیاستوں کا شکار وہ ٹاپ کرنے سے رہ گئی، جب مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش بنا۔ جب عباس کی والدہ پہلی مرتبہ ان کے گھر آئیں۔

وہ ہر قدم، ہر مرحلے پر اس کے ساتھ تھے۔ لیکن خاموش، جیسے ہو کر بھی نہ ہوں۔ زندگی بھر اپنی خواہش سے جیتی مس نائلہ اس وسیع و عریض گھر میں وہ اتری تو گھر میں سناٹے بولتے تھے۔ عباس اور اس کی تنہا ماں، سال بھر کی خاموشی کو لمحوں میں ختم کیا لیکن بے تحاشا بولتی رہی۔

اس نے اس کو کچھ نہیں دیا تھا، لیکن اس نے انقلاب سمیٹ کر ایک طرف ڈال دیا۔ سیاست اور گھر میں بار بار کی ناکامیوں نے اس کا منہ چڑا کر رکھ دیا تھا۔

عباس معطل ہوتے تو وہ آمدنی کے ذریعے تلاش کرنے لگتی۔ جیل جاتے تو صبر سے واپسی کا انتظار کرتی۔ کوڑے کھاتے تو بغیر کچھ جتائے نشانوں پر مرہم کالیپ کرتی۔ وہ ایک ناکام ترین عہد کی مایوس نسل لگتی۔ بہت کچھ گنوا کر خالی ہاتھ اسی گول دائرے میں رقصاں۔۔۔ جس کی کوئی ابتدا ہے، نہ انتہا۔

قیامت قریب ہے اور ضروری نہیں کہ آپ گھر پہنچ جائیں، قیامت تب ہی آئے۔

☼ ☼ ☼

"میرا ماضی؟" اماں نے ایک طویل گہرا سانس لیا۔

"میرے ماضی میں کیا رکھا ہے اور وہ مجھے یاد بھی نہیں آتا، وہ کیا کہتی تھی، ثریا جو یہاں اکثر آیا کرتی تھی۔"

" 70ء کی دہائی کی ناکام نسل۔ ہم وہی ناکام نسلیں ہیں۔ ہم سے کچھ نہیں ہوسکا، ہم تو تمہاری طرف دیکھتے ہیں۔"

وہ انہیں مٹھی میں بھینچا ہوا پسینے سے چر مر کاغذ انہوں نے رضا کو تھمایا اور خاموشی سے اندر چلی گئیں۔

رضا نے لمحہ بھر کو کاغذ کی طرف دیکھا۔ یہ عدالت سے موصول شدہ سمن تھا۔

اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

سیما بنتِ عاصم

گھر سے قدم نکالنے سے پہلے کان کھول کر سن لو مدیحہ بیگم! آگے واپسی کے دروازے تم پر بند ہوں گے۔"

جمشید کا لہجہ سرسری مگر الفاظ سفاک تھے تو وہ ہمیشہ مدیحہ کو پیار سے مدحو کہا کرتا تھا اور آج اس کا مدیحہ بیگم کہنا ہی اس کی خطرناک حد تک سنجیدگی کا غماز تھا۔

کمرے سے نکلتے ہوئے مدیحہ جہاں کی تہاں رہ گئی تھی۔ قدم جیسے زمین میں گڑ سے گئے تھے۔ کھٹک تو وہ تب ہی گئی تھی، جب آفس سے لوٹ کر جمشید بلاوجہ گھنٹہ بھر ساس صاحبہ کے کمرے میں براجمان رہا اور اسے کامل یقین تھا کہ اس وقت کو ساس صاحبہ نے درست مصرف میں استعمال کیا ہوگا اور ایسا ہی وقت مدیحہ کے لیے جان کا آزار بن جایا کرتا تھا۔ مدیحہ کا مطالبہ بجا سہی مگر اس نے غلط وقت منتخب کیا تھا۔ یعنی وہی میکے جانے کی فرمائش جس پر کبھی تو تکرار ہوتی اور کبھی جمشید صاف ہاتھ جھاڑ کر اک طرف ہو جاتا یہ کہہ کر کہ "امی سے پوچھ لو۔" اور آج کی تکرار بگڑ گئی تھی۔

مدیحہ نے تڑپ کر گھائل نظروں سے اسے دیکھا تھا مگر جمشید اسی سرسری سے انداز میں سٹی پر نیم دراز انتہائی بے نیازی کا مظاہرہ کرتا نئی میگزین کے ورق الٹتا رہا تھا۔

"مگر سومو..." وہ دانت کچکچا کر رہ گئی۔ بس نہ چلا کہ اس بلا کے خودغرض بندے کو اٹھا کر ہی پٹخ دے۔ ایسے ہی وقتوں کے لیے شادی کے نام سے ہی بھاگتی رہی تھی۔ ولیمہ کے بعد سے اب تک پلٹ کر بھی نہ دیکھا تھا۔ شادی کو پورے تین ماہ ہونے کو آئے تھے۔ ساس صاحبہ بہوؤں کو میکے کی ہوا بھی لگانے کی قائل نہ تھیں اور بندوق چلانے کے لیے جمشید کا شانہ استعمال کرتیں اور آج تو حد ہی ہو گئی تھی۔ جمشید نے محبت و مروت کا نقاب اتار کر اپنا اصل چہرہ دکھا دیا تھا۔

اس کا دل چاہا، تمام مصلحتیں بالائے طاق رکھ کر الٹے ہی قدموں سے آگے بڑھتی چلی جائے، کبھی اس گھر اور اس کے مکینوں کی طرف پلٹ کر دیکھے بھی نہیں۔ مگر سمجھوتے کے نام پر تمام کی تمام مصلحتیں ایسی گئی گزری بھی نہ تھیں کہ در خورِ اعتنا نہ گردانی جاتیں اور ان ہی لمحات میں آپا رباب کا پڑھایا ہوا سبق تازہ ہو جاتا تھا۔

"یاد رکھو کہ اگر تم اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہو تو تمہارا رب بھی کبھی اس بھروسے کو ٹوٹنے نہیں دے گا۔"

اور اس کا دل جیسے قرار پا جاتا۔ اس نے رات ہی کو خواب میں امی کو دیکھا تھا اور تب ہی سے دل کہتا تھا کہ اڑ کر امی کے پاس پہنچ جائے۔ مگر مجبوری سی مجبوری تھی۔

اب بھی وہ پلٹ کر جہازی سائز بیڈ پر اوندھی گر گئی اور تکیے پر سر مار کر تڑپ تڑپ کر رونے لگی تھی۔ اک پل کو جمشید کے دل کو کچھ ہوا۔ مگر ابھی کانوں میں امی جی کے الفاظ تازہ تھے اور وہ اسے کراچی چھوڑ آنے کی اجازت لینے ہی تو ان کے پاس گیا تھا۔

"مدیحہ کا حال دیکھو ذرا۔ شروع کے دنوں میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلا بچہ ہے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوگا۔ حیدرآباد سے کراچی تک کا سفر۔ گھاس تو نہیں چر گئے ہو؟"

مدیحہ اسے عزیز تر تھی۔ شروع کے دنوں میں تو یوں بھی میکے کی یاد زیادہ ستاتی ہے مگر امی کا فرمان بھی اس کے سر آنکھوں پر رہا کرتا تھا۔ جن کا خیال تھا کہ "لڑکیوں کی میکے کے لیے ایسی تڑپ بھی اچھی نہیں ہوا کرتی اور میکے کی یاد بھلانے کے لیے ان پر تھوڑی بہت سختی بھی کرنی چاہیے۔"

سو جمشید اس قسم کی روک تھام کو جائز اور بجا ہی تصور کیا کرتا تھا۔

اب بھی انہوں نے جھلا کر میگزین پٹخا تھا اور گھر سے باہر نکلتے چلے گئے تھے۔

نفیسہ بیگم یعنی مدیحہ کی ساس صاحبہ کا خیال تھا کہ شادی کے بعد لڑکیاں شوہر اور سسرال کو قابو کرنے کے گر میکے ہی سے سیکھا کرتی ہیں۔ سو وہ بہوؤں کو میکے کی ہوا بھی لگانے کی قائل نہ تھیں۔ ستم بالائے ستم کہ بہو کے نام پر مدیحہ نام کی گدھیا انہیں دستیاب ہو چکی تھی، جس کے کان اینٹھنے کو وہ ہمہ وقت تیار رہا

کرتیں اور اس کا کیا کیا جائے کہ ہر اچھے گھرانے کی طرح مدیحہ بھی اپنے گھر سے زبان بندی اور ہر حال میں سمجھوتے کا سبق پڑھ کر آئی تھی جس پر کاربند رہا کرتی تھی اور یہیں آکر نفیسہ بیگم خود کو داد دیتیں کہ مڈل کلاس گھرانوں کی بیٹیاں ہی اچھی بہو ثابت ہوتی ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو بہوؤں کے معاملے میں اب تک مات ہی کھائی تھی۔ خواہ بہو من چاہی رہی یا بیٹوں کی من پسند ٹھہری اور آج کل کے لڑکوں کے مزاج تو اللہ کی پناہ! ایسی ویسی لڑکیوں پر ہاتھ ہی کہاں دھرتے ہیں۔ تعلیم ہو، اسٹیٹس ہو اور ساتھ چلتی ہنستی بھی لگے۔ مگر اک بات تو طے رہی تھی کہ نفیسہ بیگم نے سکھ ایک سے بھی نہ پایا تھا۔ ایک نہ دو 'چار' کماؤ قابل بیٹوں کی ماں تھیں۔

نئی پرانی گاڑیوں کی خرید و فروخت کا اپنا کاروبار تھا۔ گھر بھر میں چھما چھم دھن برستا۔ سو اسی حساب سے حسب مرتبہ اعلا گھرانوں کی لڑکیاں چن چن کر بیاہ لائی تھیں۔ بہوؤں کے ناز نخرے۔۔۔ الاماں۔ خود نفیسہ بیگم کے مزاج کون سے کم تھے۔ ان کی فطرت میں حاکمیت اور نکتہ چینی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بہت کم کسی سے بن پاتی اور بہوئیں تو پھر بہوئیں ہوتی ہیں۔ دنوں میں پر پرزے نکال لیتیں اور میاں جی کو مٹھی میں کر کے دو چار دنوں میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ۔ ساس کی تنہائی اور خبر گیری کی فکر کون پالتا۔۔۔ اور جمشید سے بڑے جنید کی بار تو حد ہی ہو گئی تھی۔ شازیہ بڑے گھرانے کی اکلوتی سرچڑھی بیٹی تھی اور جنید کی من پسند بھی۔ میکے والوں نے ٹرک بھر کر جہیز کے ساتھ سپر لگژری فلیٹ بھی دیا تھا۔ دلہن رانی کا ڈولا اسی فلیٹ میں جا کر اترا۔

نفیسہ بیگم نے اعلا گھرانوں کی بیٹیوں سے چوٹ کھائی تو از خود یہ فرض کیے بیٹھی تھیں کہ بڑے گھرانوں کی لڑکیاں مزاج دار ہوا کرتی ہیں۔ جمشید ان کا آخری اور لاڈلا بیٹا تھا جس سے وہ [illegible] چاہتی تھیں، اس لیے اس کی بار قصداً اعلا معیار [illegible] رکھا تھا۔ کاروبار جمے۔ نخرے ہو کر برائے نام رہ گیا تھا۔ خود جمشید نے بھی کاروبار میں سر کھپانے کے بجائے ملازمت کو ترجیح دی تھی اور جمشید کے نام کا چوتھا حصہ نفیسہ بیگم اپنی مٹھی میں رکھا کرتی تھیں اور اس فکر میں تھیں کہ اس سے پہلے کہ کوئی ان کے آخری کماؤ اور فرماں بردار بیٹے پر ڈورے ڈال کر اسے بھی لے اڑے، جلد از جلد اس فکر سے بھی خلاصی پا لیں۔ اس ضمن میں جمشید کی بس یہی شرط تھی کہ وہ شادی سے پہلے اک نظر لڑکی کو دیکھنے کا خواہاں تھا۔

اور یہ پچھلے ہی ماہ تک کی تو بات تھی جب نفیسہ بیگم نے حیدر آباد سے کراچی تک کا سفر کسی دور پار کی عزیزہ کے غسل صحت کی تقریب میں شرکت کی غرض سے کیا تھا اور وہیں انہیں محفل میلاد میں مدیحہ بھا گئی تھی۔ انہوں نے جمشید کے خیال سے مدیحہ کی بابت اپنی عزیزہ آپا صدیقہ سے معلوم ہی کیا تھا کہ وہ مدیحہ کی تعریف میں زمین و آسمان ایک کرنے پر تل گئیں۔

"بہت نیک اور شریف گھرانا ہے اور یہ مدیحہ تو بہت ہی پیاری اور ہمت والی بچی ہے۔ سال ڈیڑھ سال گزرا ہے باپ کی وفات کو، ماں بے چاری [illegible] کی مریضہ ہیں اور اس بے چاری نے سارے گھر کو سمیٹ رکھا ہے۔ بی اے پاس ہے۔ کسی آفس میں جاب کرتی ہے۔ گھر اور ملازمت ایک ساتھ سنبھالتی ہے۔ بڑا اچھا خیال آیا ہے تمہارے دل میں نفیسہ! میری مانو تو بسم اللہ کرو۔ [illegible] جمشید کے لیے بہت مناسب ہے۔ اسی کی طرح نیک، فرماں بردار اور ذمہ دار۔"

آپا صدیقہ [illegible] ہی کرتی رہیں اور نفیسہ بیگم کے اندر اک اطمینان سا اتر گیا تھا۔ ان کا کراچی تک کا سفر رائیگاں نہ گیا تھا۔ بالآخر انہیں مطلوبہ لڑکی نظر آ ہی گئی تھی۔ آپا صدیقہ کی عطا کردہ معلومات کے سبب دل اچھل اچھل کر کہہ رہا تھا کہ مدیحہ ہی ان کی مطلوبہ لڑکی ہے۔۔۔ مڈل کلاس کی حالات کی چکی میں پسنے والی لڑکیوں میں ایثار و وفا، خدمت و قربانی اور سمجھوتے کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔

وہ اسی شام آپا صدیقہ کو لے کر مدیحہ کے گھر جا پہنچیں تھیں اور ایک ہی نظر میں تاڑ لیا کہ رکھ رکھاؤ والا شریف و مہذب مگر سفید پوش گھرانا ہے۔ انہوں نے اپنی آمد کی غرض و غایت کے ہمراہ جمشید کی شرط سے بھی ان سب کو آگاہ کر دیا تھا۔ مدیحہ کی امی کے تو [illegible] ہی نہ زمین پر ٹک رہے تھے۔

کھاتے پیتے گھرانے کے قابل و کماؤ لڑکے کا رشتہ ان کے در تک آیا تھا، ان کے لیے ہواؤں میں پرواز کرنے کا مقام تھا۔ شوہر کی ناگہانی وفات کے بعد وہ اپنے فرائض کی بابت ہراساں ہی رہا کرتی تھیں۔ مدیحہ ان کی حساس، ذمہ دار اولاد تھی جس نے باپ کے گزر جانے کے بعد گھر کا سارا بوجھ خود اٹھا لیا تھا مگر وہ ان کے کنبے کی کفالت کی خاطر ہی شادی کی عمر گزار دے، مدیحہ کی والدہ کو یہ بھی منظور نہ تھا۔ مگر وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ رشتہ خواہ کتنا ہی معقول ہو، مدیحہ شادی کے نام پر [illegible] لگتی ہے تب انہوں نے مزید کمک کے لیے مدیحہ کی بیاہتا بہن رباب کو بلا بھیجا تھا۔

☆ ☆ ☆

ابھی وقت ہی کتنا گزرا تھا۔ بس کچھ وقت پرے کی ہی تو بات لگتی ہے۔ جب نفیسہ بیگم نے اس کے لیے پسندیدگی کا عندیہ دیا تھا اور آپا رباب، جمشید کی شرط منوانے کو گھر بھر میں اس کے پیچھے پیچھے پھریں اور مدیحہ کے تو مانو تلووں سے لگی سر پر بجھی تھی۔

"کمال کرتی ہیں آپا! آخر آپ نے ایسی بے تکی شرط پر ہامی کیسے بھر لی؟ اور تو اور اس جمعہ کا وقت بھی دے دیا؟"

"میری جان! شادی سے پہلے اک نظر دیکھنے کی اجازت تو شرع میں بھی ہے۔"

"تو آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں دل و جان سے شادی کے لیے راضی ہوں۔" وہ جھلا ہی تو اٹھی تھی اور آپا جرح پر اتری ہوئی تھیں۔

"کیوں کیا کمی ہے بھلا! لڑکا کماؤ، قابل ہے۔ زیادہ کنبے کا جھنجٹ بھی نہیں۔۔۔"

"آپا!" وہ حیران رہ گئی۔ "حد ہوتی ہے چشم پوشی کی بھی۔۔۔ آپ جانتی ہیں۔ میرے سر پر گھر بھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ ہے۔ اک میری تنخواہ کے طفیل یہ گھر چل رہا ہے۔ پھر امی کی بیماری، بھیا کی معذوری۔۔۔ ابھی تو منا بھی اس قابل نہیں کہ کم از کم گھر ہستی ہی سنبھال سکے۔ ان سب کو کس کے سہارے چھوڑ دوں اور سوچیں تو ذرا، پھر اس گھر کی گاڑی کیسے چلے گی؟"

"مجھے تمہاری ذمہ داریوں سے انکار نہیں، مگر یہ بھی تو سوچو، تمہارے اس دس سالہ منصوبے کی تکمیل تک تمہارے سر میں چاندی اتر آئے گی، تب کیا امی یا ہم سب کے لیے قہقہے لگانے کا مقام ہو گا اور جمشید جیسا اچھا رشتہ کیا تب بھی تمہیں میسر آ سکے گا؟ تقدیر اگر نوازنے پر تلی ہے تو ہاتھ روک کر تم کیوں ناشکری کر رہی ہو؟"

آپا رباب کی بات دل کو لگتی تھی اور سچ ہی تھی کہ پانچ دس سال بعد بھی کیا بدل جائے گا۔ ایسا کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ جس کے طفیل گھر کی گاڑی چلنے کی سبیل نظر آتی ہو۔ پھر جمشید کا رشتہ۔۔۔ اس سے انکار نہ کیا جا سکتا تھا کہ منتوں مرادوں سے ایسے رشتے نصیب ہوا کرتے ہیں۔

"میں اگر ایک منٹ کے لیے بھی اپنے بارے میں سوچوں تو گھر بھر کی فکر گھیر لیتی ہے، ذرا سوچیں کیا بنے گا ان سب کا؟"

"یہ تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دو۔ یاد رکھو کہ جب راستے خود بخود سہل ہوتے چلے جائیں تو سمجھ لو کہ یہی رب کی منشا ہے۔ انسان کو زندگی میں سب ہی کچھ حسب منشا نہیں ملتا۔ تقدیر کا ایک اشارہ انسان کی سالوں کی پلاننگ پر پانی پھیر دیتا ہے اور جو لوگ اپنے معاملات اللہ کے سپرد کرنے کے بجائے اپنی عقل و دانش کو اہمیت دیتے ہیں، لکھ کر رکھ لو کہ تقدیر سے مات ضرور کھاتے ہیں۔"

مدیحہ، آپا رباب کو تکتی رہ گئی۔ وہ ہمیشہ سے ایسی ہی صابر و شاکر و با توکل تھیں اور اسی سبب تقدیر کا ہر وار جھیل کر بھی مسکراتی نظر آتی تھیں۔

"جانے بھی دیجیے آپا! بھلا شادی کر کے ہاتھ بھی کیا

آتا ہے؟ دو چار دن کا سوچ میلہ اور پھر وہی تنخواہ سے بھری منہ چڑاتی زندگی۔۔۔ آپ کو دیکھتی ہوں تو رب کا شکر ادا کرتی ہوں کہ کتنے مصائب سے دور رکھا ہے اس نے ہمیں۔۔۔ مالی تنگ دستی ضرور ہے مگر ذہنی ٹینشن تو نہیں ہے۔" اس کا دل بوجھل ہوتا چلا گیا تھا۔

"تم میرے بارے میں نہ سوچا کرو میں اپنے حال میں بہت خوش اور رب کی رضا پر راضی ہوں۔" آپا رباب اور کھل کر مسکرانے لگی تھیں۔ مدیحہ چڑ گئی۔

"بس وہی بے وقوفیاں۔۔۔ خدمت۔۔۔ قربانی۔۔۔ ایثار۔۔۔ جس کا حاصل۔۔۔ خاک بھی نہیں۔۔۔ شاباش ہے ساجد بھائی کو۔۔۔ آپ کو بیاہ کر سات سمندر پار جا بیٹھے۔۔۔ اور بھرے پرے کنبے کی غلامی کے لیے آپ کو چھوڑ دیا۔۔۔ اف خدایا! اس روز پوری چھتیس روٹیاں پکائیں آپ نے۔۔۔ میں نے خود گنی تھیں۔"

"جانے بھی دو تم میرا درد سر نہ پالو۔۔۔ یہ بتاؤ امی کو تمہاری ہاں کہہ دوں؟"

وہ شرارت سے مسکرانے لگیں۔ تو وہ سوچ میں پڑ گئی۔۔۔ وہ ایک عام سی لڑکی کی طرح خواب ضرور دیکھتی تھی۔ مگر اپنے آس پاس کے حقائق پر بھی نظر رکھتی تھی۔ آپا کا فرمان بجا تھا۔ اس کے تمام پلان پورے ہونے تک جمشید جیسا "نیا" رشتہ جڑتا ہی وہ بھر ہو جائے گا اور حالات جوں کے توں رہیں گے۔۔۔ یعنی وہ کنبے کا بوجھ ڈھوتی ہی مر جائے گی اور بدلے کا کچھ بھی نہیں۔ مشقت کا خسارہ ہاتھ لگے گا۔ مگر وہ کچھ اور سوچتی تھی۔ پانچ دس سال میں اگر شادی کے ارادے باندھے تب بھی کسی موٹی آسامی پر ہاتھ ڈالنا ہے۔ بھلے وہ شادی شدہ یا عمر دراز ہو۔۔۔ دلکش نوجوان لڑکیوں کو امیر بوڑھے بھی خوشی اپنا لیتے ہیں۔۔۔ اس کی رفاقت کے عوض اگر کوئی اس کے کنبے کو سمیٹنے پر آمادہ ہو تو وہ بھی راضی تھی۔۔۔ کوئی ایک جھنجٹ تھوڑی تھا۔ گھر کے اخراجات کے علاوہ امی کی دوا دارو۔ چھوٹی بہنوں کی اسکولنگ ہی چل رہی تھی۔ بھیا کا داہنا ہاتھ بچپن ہی میں پولیو سے ناکارہ ہو گیا تھا۔ بمشکل ایف اے کیا تھا اور اب دو چار ٹیوشنز کا ٹوٹا پھوٹا سا سہارا تھا یا پھر ابا کی پنشن۔۔۔ جس کے بل بوتے پر ابھی امید بھی نہ باندھی جا سکتی تھی۔

"کہاں کھو گئیں؟" آپا نے اسے ٹہوکا دیا تو وہ چونک اٹھی مگر وہ کچھ اور بھی تھیں۔

"میں نے کہا نا! میری ٹینشن نہ لیا کرو۔ ساجد پانچ سال کے کانٹریکٹ پر سعودیہ گئے ہیں۔ ان شاء اللہ آئیں گے تو مکان کا بٹوارا ہو گا۔ تب ہم بھی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائیں گے اور سارے جھنجٹ ختم۔۔۔ ساجد کوئی مناسب سا کاروبار یا جاب کر لیں گے اور ہم سکھ چین سے جئیں گے۔"

مدیحہ کا دل آپا کے لیے کڑھتا مگر وہ دیکھتی کہ آپا اللہ سے نہایت خوش امید رہتیں اور اچھے وقتوں کے خواب دیکھا کرتی تھیں۔

"ہونہہ! انہیں تایا جی کے گھر بیاہا تھا تو سوچا بھی نہ تھا کہ سب کے سب یوں رخ بدل لیں گے۔ نام ہو گیا شادی کرنے کا اور تمہارے ہاتھ لگی مفت کی چاکری۔۔۔ اب تایا، تائی گزر چکے ہیں تو بٹوارہ ہو ہی جانا چاہیے۔"

"میں نے کہا نا، میرا درد سر مت پالو۔ یاد رکھو انسان کے لیے رتبے اور مقام پروردگار خود مشخص کرتا ہے اور جو انسان جس رتبے کا اہل ہو [illegible] رتبہ عطا کرتا ہے۔ تو انسان کو اس کی رضا میں راضی رہنا چاہیے۔"

"میں ابھی تو کہہ [illegible] فائل کر [illegible]" آپا [illegible] اچھے لگیں تو وہ جھجکی [illegible]

"آپا شادی لازمی ہی ٹھہری تو کوئی قریب جوار کا ہی بندہ ڈھونڈ نکالو۔ کم از کم میں ان سب کی خبر گیری تو کر سکوں۔"

"میں نے کہا نا! اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دو۔ وہ اپنے بندے کی بہتر خبر گیری کرنے والا ہے اور یاد رکھو کہ اگر تم اپنے رب پر بھرپور بھروسا رکھتے ہو تو تمہارا رب بھی کبھی تمہارے اس بھروسے کو ٹوٹنے نہیں دے گا۔ پھر حیدر آباد کون سا دور ہے؟ یہ تو رہا حیدر آباد۔"

انہوں نے یوں کہا جیسے حیدر آباد وہیں سے نظر آ رہا ہو۔ وہ کلس اٹھی تھی۔ ایک وہی تھی جو گھر بھر کی فکر میں ہلکان تھی۔ کیا مجال جو کبھی کسی اور کو اس کی دوری کے خیال سے ہول اٹھا ہو، غرض کی سی محبت جاگی ہو جیسے وہ گھاس کوڑا ہی تو تھی۔ اٹھایا اور پھینک دیا۔ سارے کنبے کا بوجھ ڈھونے کے لیے اپنی زندگی دان کرنے پر تلی تھی۔ حیل و حجت کرتی بھی۔۔۔ اور وہاں کس کو پڑی تھی کہ فکر پالتا پھرے۔۔۔ امی کے کانوں میں اس کی بحث و تکرار پڑی تو گھر بھر میں بڑبڑاتی پھریں۔

"آج کل کی لڑکیوں کے مزاج۔۔۔ اللہ بچائے۔۔۔ امریکہ، لندن کی بات ہو تو منٹوں میں راضی اور دور دراز کی جگہوں کو گاؤں دیہات سمجھ کر ناک مار دیں گی۔"

مدیحہ اس رات آئینے کے سامنے بیٹھ کر آٹھ آٹھ آنسو روئی۔

"بھلا خوبی ہی کیا تھی اس میں۔ ایک ذرا رنگ ہی تو اجلا پایا تھا۔ یا قسمت سے دو چار جماعتیں پڑھ ڈالی تھیں۔۔۔ ویسے کوئی لعل بھی نہ جڑے تھے کہ نفیسہ بیگم اک ہی نظر میں ریجھ گئیں اور اب تو بس اک ہی امید تھی کہ جمشید ہی رد کر دے۔ آج کل کے لڑکوں کے مزاج بھی تو کم نہیں ہوتے۔"

مگر قسمت چاروں طرف سے دغا دینے پر تلی تھی۔ جمشید نے اسے ایک نظر میں اوکے کر دیا اور دل ہی دل میں سراہا بھی تھا کہ امی کی پسند لاجواب تھی۔ تبھی تو ہاں ہی ہاں تھی اور یہیں آکر آپا رباب درست ثابت ہو جائیں کہ جب سارے راستے سہل ہوتے چلے جائیں تو مان لینا چاہیے کہ یہی منشائے رب ہے اور واقعی قدرت کی منشا بھی تب ہی تمام مشکل مرحلے آسانی سے طے ہوتے چلے گئے تھے۔ اس نے بھی رب کی منشا پر سر جھکا دیا تھا۔۔۔ تب امی نے جو کمیٹی گھر کی دیواروں کے پلستر اور چھتوں کی درستی کے لیے ڈال رکھی تھی، پیشگی لے کر مدیحہ کے فرض سے ادائیگی میں صرف کر ڈالی تھی۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ والا معاملہ رہا تھا۔

⁂ ⁂

اور وہ جو کہتے ہیں کہ دور کے ڈھول سہانے تو مدیحہ کے معاملے میں یہ بات سو فی صد درست ثابت ہوئی تھی۔ نفیسہ بیگم کے مزاج کی رعونت اور حاکمیت سے قطع نظر تمام روشن پہلوؤں پر نظر ڈالی گئی تھی۔

مدیحہ کی امی نے سوچا بیماریوں کی پوٹ ہیں۔ آج مریں کل دوسرا دن۔ جمشید انہیں نیک طبع لڑکا محسوس ہوا تھا اور وہ تھا بھی۔۔۔ مہذب، تمیزدار اور شریف النفس۔ کل کلاں کو نفیسہ بیگم گزر گئیں تو گھر پر مدیحہ کا راج چلے گا کہ باقی کی تمام بہوویں تو غالباً ان کی تنگ مزاجی کے باعث الگ ہو رہیں۔ مگر یہ گمان چھو کر بھی نہ گزرا تھا کہ جمشید، ماں کی جی حضوری کے معاملے میں بالکل ہی کاٹھ کا الو ثابت ہو گا۔

نفیسہ بیگم کے دل میں کون کون سے کانٹے چھپے تھے، یہ تو بس ان کا رب جانتا تھا یا وہ خود واقف تھیں۔ انہوں نے بہوؤں کے معاملے میں مات کھائی تھی تو از خود فرض کیے بیٹھی تھیں کہ بڑے گھرانوں کی لڑکیاں بری بہو ثابت ہوتی ہیں۔ اگرچہ اس میں بڑا حصہ ان کی اپنی فطری حاکمیت اور اسی سبب نکتہ چینیوں کا رہا تھا۔ لب و دود ور کہاں رہا تھا کہ بہویں ساسوں کی جی حضوری میں ان کے آگے پیچھے پھرتی نظر آئیں۔ ان کی لاکھ باتیں ماتھے پر بل ڈالے بغیر سن کر ٹال دیں۔۔۔ زبان بندی۔ وفا شعاری اب ڈھونڈے سے بھی میسر نہیں تو یہ ان کے اپنے خیالات تھے ورنہ دیکھا جائے تو وہ اپنا بویا کاٹ رہی تھیں۔ بہوؤں کے معاملات میں اس حد تک دخل در معقولات خود اپنی اولاد کو بھی دشمن بنا دیتی ہے اور وہی ہوا تھا۔۔۔ ان کی ساری حاکمیت منہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

معیار کے نام پر چن چن کر بڑے گھرانوں کی لڑکیاں لائی تھیں، جنہوں نے شوہروں کو مٹھی میں کیا۔ ماں کے خلاف کان بھر کے اکسایا اور لیجیے جناب! ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ۔ اب کون سسرال پرستی کا درد سر

پالنا پڑا ہے۔ اسی کھینچ تان میں کاروبار کے بھی حصے بخرے ہو گئے تھے۔ جمشید ان کا لاڈلا اور آخری بیٹا تھا اور ان کی امیدوں کا محور و مرکز۔ وہ جمشید سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتیں تو بڑھاپا کس کے سہارے کٹتا۔ سو انہوں نے چھانٹ کر نسبتاً "متوسط طبقے کی لڑکی منتخب کی تھی۔ جسے اس کے میکے سمیت جوتی تلے دبا کر رکھنا سہل ثابت ہوتا اور یہی ہوا بھی۔

اپنی فطری فرماں برداری کے سبب جمشید تو ان کی مٹھی میں تھا ہی۔ مدیحہ بھی اپنے میکے سے زبان بندی اور ہر حال میں سمجھوتے کا سبق سیکھ کر آئی تھی۔ اگرچہ وہ دیکھتی کہ نفیسہ بیگم کی بہت کم کسی سے بن پاتی ہے۔ مگر نفیسہ بیگم کو بھی دوسروں کو دبانے کا ہنر آتا تھا۔

جمشید کی اعلا درجے کی اطاعت کے سبب اس کی ساری تنخواہ سہولت سے نفیسہ بیگم کے ہاتھوں میں منتقل ہو جاتی تھی۔ پھر وہ ہوتیں اور گھر کا سیاہ و سفید اور معاملہ گھریلو ہو یا مدیحہ کی ذات سے وابستہ۔ جمشید کا ہر فیصلہ نفیسہ بیگم سے شروع ہو کر ان ہی پر ختم ہو جایا کرتا تھا۔ گھر میں روپے پیسے کی تنگی نہ تھی اور نفیسہ بیگم کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نظر سے' والے مقولے پر عمل پیرا رہا کرتیں۔

کھانے پینے' پہننے اوڑھنے یہاں تک کہ گھومنے پھرنے تک پر پابندی نہ تھی۔ بات بگڑتی تو میکے جانے کے نام پر۔۔۔ جس پر آکر جمشید صاف ہاتھ جھاڑ کر ایک جانب ہو جاتا کہ "امی سے پوچھ لو" اور یہ بات نفیسہ بیگم کے دل میں گھر کر گئی تھی کہ لڑکیاں گھر بگاڑنے کے سو گر میکے سے ہی سیکھتی ہیں۔ سو وہ مدیحہ کو میکے کی ہوا بھی لگانے کی قائل نہ تھیں اور یہ بات مدیحہ کو بڑی دیر سے سمجھ میں آئی۔

شروع کے کچھ دن تو آنا کانی میں ہی گزر گئے۔ فلاں رشتے دار کا چہلم ہے۔ ڈھمکی بیٹی کا چلہ متوقع ہے۔ ابھی موسم سخت سرد ہے۔ یہ وہ اور۔ جب شادی کے تیسرے ہی مہینے مدیحہ کے پیر بھاری ہونے کی خبر آگئی تب تو جیسے اس کے میکے نہ جانے پر پکی مہر ہی لگ گئی تھی۔ حیدر آباد سے کراچی تک کا سفر آسان کام ہے بھلا۔۔۔

اور آج تو حد ہی ہو گئی تھی۔ آج اسی ضمن میں جمشید سے اس کی تکرار زور پکڑ گئی تھی۔ جس کے بعد اس کے دل شکن الفاظ۔۔۔ جیسے وہ کھڑے قدسے گر گئی تھی۔۔۔ کتنا بھروسا تھا اسے جمشید کی محبت پر۔۔۔ کہ وہ اسے روکنے تھامنے کی کوشش کرے گا۔ ماں کے سامنے اس کی حمایت میں کچھ تو کہے گا۔ مگر یاجی۔۔۔ کتنے ماہ ہو گئے تھے اسے قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے۔۔۔ میکے کی یاد ستاتی تو اس کے اندر ہارنے کا سا دکھ ابھر کر آتا۔۔۔ جمشید کی سفاکی اسے عمر سو سو سے مشابہ محسوس ہوتی۔

اسے رہ رہ کر ان سب کی یاد ستاتی۔ گھر کی بابت فکریں لہو نچوڑ کر رکھتیں۔ ولیمہ کے بعد اس نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا تھا نہ جانے لوگ کیا کیا باتیں بناتے ہوں گے اور بے چارے گھر والے کس کس طرح کے جھوٹ گھڑتے ہوں گے اس کے کبھی میکے نہ آنے کی بابت۔۔۔ ایسی باتیں تو یوں بھی جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں۔ خود ان سب نے بھی تو کبھی اس کی خبر نہ لی تھی۔

اک بار ابا سمیت وہ سب لوگ اس کی محبت میں کھنچے چلے آئے تھے مگر ساس صاحبہ کے تیور ایسے روکھے اور کڑے رہے کہ وہ سب جلد ہی سدھار گئے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ نفیسہ بیگم کو غریب لوگوں کو منہ لگانا پسند نہیں کرتیں۔

میکے والوں کی بے عزتی پر اس کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ اور جمشید کی لاتعلقی اسے مزید اذیت پہنچاتی تھی۔ جمشید اس سے اپنے تعلقات خراب نہ کرنا چاہتا تھا اس نے یہ بات ای پر رکھ کر ٹال جاتا۔ اسے مدیحہ سے محبت تھی مگر نفیسہ بیگم کی دل جوئی بھی مقصود رہا کرتی۔ مگر تھا تو بہرحال اک مرد ہی جو ازل سے کانوں کا کچا ثابت ہوتا چلا آیا ہے۔ آج بھی نفیسہ بیگم کی پڑھائی پٹیوں کی بدولت مدیحہ پر زیادتی کر بیٹھا تھا اور مدیحہ کے دل پر جیسے قیامتیں گزر گئی تھیں۔ مگر اس نے جمشید کے ان سفاک لفظوں کے بعد کبھی میکے کا نام بھی زبان پر نہ لانے کا خود سے عہد کر لیا تھا۔۔۔ اور واپس پچھانا اتنا سہل بھی کب ہوتا ہے' خصوصاً" اس صورت میں جب مقابل انسان کے اپنے ہوں۔

ان سب کی یاد اس کے دل میں روز بروز جڑ پکڑتی جاتی اور اس کے تفکرات کو ہوا ملتی رہتی۔ دل میکے ہی میں پڑا رہتا تھا۔ بارش برستی تو اسے گھر کی ٹپکتی چھتوں کا خیال آن گھیرتا۔۔۔ نہ جانے گھر کی گاڑی کیسے چل رہی ہوگی؟ اس کی لگی بندھی تنخواہ آتی تو ای ابا اس کو دعائیں دیتی بھر تیں۔ پچن کا سامان لاتیں تو بھائی کی جیب خرچ اور ابا کی پنشن سے بھلا کہاں گزارا ہوتا؟

رات میں سوتے ہوئے چھوٹی کتنی بار ڈر کے اسے پکارتی تھی اور اس سال تو اسے بورڈ کا امتحان دینا تھا۔ اس کے امتحانوں کے دنوں میں وہ رات گئے تک جاگ کر اسے پڑھاتی تھی۔ حق ہاہ! ابا کو لوٹے سے پانی بھرتے تو دوسرے ناکارہ ہاتھ کی وجہ سے ٹونٹی بند کرنے کے لیے کس بے چارگی سے ادھر ادھر دیکھا کرتے تھے۔۔۔ ای کو ہر شے اپنے سرہانے درکار ہوتی تھی اور ساجد بھائی کو بھی اسی سال آنا تھا۔ جانے کیا کچھ لائے ہوں گے اس کے لیے اسی لیے تو شادی کے نام سے رتے جاتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ زندگی سے ہی بے زار ہو جاتی تھی کہ ماکی کی طرح ہوا کے دوش پر سندیسے لکھ لکھ کر اس پار بسنے والے اپنوں کو بھیجا کرتی۔

بول ہوا اس پار زمانے کیسے ہیں؟
دور شہر میں یار پرانے کیسے ہیں؟
چاند اترتا ہے اب کس کس آنگن میں
کرنوں سے محروم گھرانے کیسے ہیں!
لب بستہ دروازوں پر کیا بیت گئی
گلیوں سے منسوب فسانے کیسے ہیں!
جن کے جھرمٹ میں شامیں دم توڑ گئیں
وہ پیارے' پاگل' دیوانے کیسے ہیں؟

اس کا اتنا دل چاہتا' کسی نہ کسی طرح اک موبائل ہی خرید کر ای کو بھجوا دے' کم از کم ان سب کی احوال پرسی کا ہی کوئی وسیلہ ہو مگر۔۔۔ زندگی حقیقی معنوں میں اس پر تنگ پڑ جاتی یا کم از کم وہ حوصلہ تو ضرور ہی کھو بیٹھتی اگر جو تایا کا خر ہلایا گیا تو کل کا درس اس کی روح سے تنگ بندھا ہوتا اور وہ جو اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کرنے کا سبق تھا' وہ اک پل کو نہ بھولتی۔ یہی جب متفکر ہوتی۔ اسی بھروسے کا دامن تھام کر کھانے سرے سے جی اٹھتی تھی!

☼ ☼ ☼

خستہ حال دروازے کو درست کر کے تازہ رنگ و روغن کے ذریعے نیا سا بنا دیا گیا تھا' بغیر پلستر کی دیواروں پلستر چڑھا کے تازہ قلعی کروائی گئی تھی۔ اب گھر کے باہر ایک کی جگہ دو دروازے تھے' اس نے جھجکتے ہوئے وہی پرانا دروازہ بجا دیا اور برآمد ہونے والی کرخت صورت سے دوبارہ دریافت کیا۔ بھیا کا نام لینے پر دائیں دروازے کی جانب اشارہ کر کے وہ کرخت صورت غڑاپ سے دوبارہ اندر روپوش ہو گئی' مدیحہ نے ایک گہری نظر پہلو میں کھڑے جمشید پر ڈالی تھی۔ حیدر آباد سے کراچی تک ڈرائیونگ کے بعد اک کندھے سفری بیگ اور دوسرے کندھے سے فراز کو لگائے تھکن اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"ڈھائی سال" مدیحہ نے وہیں کھڑے کھڑے ایک بار پھر دہرایا تھا۔ شادی کے پورے ڈھائی سال بعد وہ آج میکے آئی تھی۔ جب فراز ڈیڑھ سال کا ہونے کو آیا تھا اور شاید یہ عنایت اب بھی اس کے بخت میں درج نہ ہوتی اگر جو قدرت احتساب پر نہ آتی۔۔۔

اس نے ایک گہری سانس بھر کر اگلے دروازے پر دستک دی تھی اور اس بار دروازہ کھولنے والی چھوٹی تھی۔ جو اب بڑی ہو گئی تھی۔ اگلے ہی پل چھوٹی نے گھر بھر میں شور مچا دیا تھا اور کچھ ہی دیر میں ای واکر کی مدد سے چلتی ہوئی آ گئی تھیں۔ مدیحہ کے دل کو دھکا سا لگا۔ وہ پہلے سے زیادہ کمزور' مضمحل اور بیمار نظر آتی تھیں۔ نہ جانے اس کی چشم پوشی کے طفیل کیا کیا نہ خسارے جھیلے ہوں گے۔ کتنے دکھ اٹھائے ہوں گے۔ وہ ای سے مل کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

"ہم بھی تو بڑے بیں راہوں میں۔۔۔" آپا سچ سچ اک اک قدم اٹھاتی چھت کو جاتے زینے سے اترتی آ رہی تھیں۔

مدیحہ مسکرا دی۔ آپا امید سے تھیں۔

"آپا! آپ کو معلوم تھا کہ میں آرہی ہوں؟" وہ آپا سے گلے ملتے ہوئے شاداں سی تھی "میرا مطلب ہے آپ یہاں کیسے۔۔۔؟"

"دیکھ لو۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اور جناب! یہ رونا دھونا بند کرو اور فریش ہو جاؤ۔ ذرا جمشید کا خیال کرو۔ کیا حال ہو رہا ہے بے چارے کا۔۔۔؟"

وہی آپا کی پل پل ہر اک کی خبر گیری کا انداز۔ مگر اس کی نظریں یہاں سے وہاں تک دور دور بھٹک رہی تھیں۔ مانو سارے گھر کی کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ مکان کے درمیان دیوار کھینچ کر آدھا کرائے پر دیا گیا تھا یقیناً" مگر موجودہ حصہ نکھرا ستھرا سا تھا۔ چھتوں کی مرمت اور دیواروں پر پلستر کرکے نیا رنگ و روغن۔ لشکارے مارتا کچن وہیں سے نظر آرہا تھا۔ کچن کی بیرونی دیوار سے لگا بیسن۔ چھت کو جاتے زینے کے ساتھ خوب صورت ریلنگ لگ چکی تھی۔

چھوٹی نے جھٹ پٹ دسترخوان کا اہتمام کیا تھا۔ ان دونوں کے فریش ہونے کے درمیان ہی سارا کام ہو گیا تھا۔ دوپہر کے لیے مٹر پلاؤ دم پر رکھا تھا۔ چھوٹی نے سلاد رائتہ بنایا اور آپا نے کسٹرڈ بنا کے فریج میں رکھ دیا تھا۔ ڈونگہ بھر کے رات کے بچے کوفتوں کے سالن پر بگھار لگایا گیا۔ فریزر کی کئی کباب کی ٹکیاں نکال کر تلی گئیں۔

دسترخوان لگا تو امی اس پر بھی شرمسار تھیں۔

"بیٹا! اطلاع ہی دے دیتے کسی نہ کسی طرح۔" امی کے لفظوں میں سادگی تھی مگر مدیحہ نے ایسی کاٹ دار نظروں سے جمشید کی جانب دیکھا کہ وہ شرمسار ہو کر پلیٹ پر جھک گیا۔ امی اور آپا جمشید کی خاطر میں لگی جا رہی تھیں اور اس کی نظروں میں وہ وقت گھوم رہا تھا جب انہیں مہینے میں بمشکل دو چار بار ہی گوشت نصیب ہو پاتا تھا۔ بنا جانے ہی اتنا اہتمام ہو گیا تھا۔

چھوٹی دسترخوان سمیٹنے لگی تو چائے دم ہو چکی تھی۔ اس کے دل میں بہت کچھ جاننے کی، کہنے اور سننے کی چاہ تھی مگر آپا کی طویل دوپہریں، امی دوائیں کھا کے آرام کرتیں۔ اس کی بھی پلکیں بوجھل ہونے لگی تھیں۔

تب آپا نے ہی کہا۔

"کچھ دیر آرام کرلو۔ ساجد شام تک لوٹ آئیں گے۔ افتخار (بھیا) سے تو اب رات ہی میں ملاقات ہو گی۔"

مدیحہ منتظر ہی رہی۔ کوئی گلہ، شکوہ، ملامت یا لعن طعن۔ مگر چہار سو خاموشی تھی۔ جیسے وہ سب ان کے اندر تک جھانک ان ڈھائی سالوں کا احوال پڑھ چکے ہوں۔ یہ تو طے تھا کہ وہ خطاکار نہ تھی مگر خود کو بے خطا ثابت کرنا ابھی باقی تھا۔ اس کا جا نماز، سائز بیگ اس کے طویل قیام کا غماز تھا۔ فراز جاگا تو پھوپی اسے اٹھائے اٹھائے پھری۔ ورنہ جانے کتنی دیر غافل رہی۔

☼ ☼ ☼

"کہتے ہیں کہ وقت کیسا بھی ہو، بدلتا ضرور ہے۔ مگر کبھی کبھی یہ بدلتا ہوا وقت خود انسان کے بدلاؤ کا باعث بن جاتا ہے۔ فقط یہ جب احتساب پر اتر آئے تو انسان از خود اپنے اعمال کو میزان میں رکھ کر تولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کسی بڑی مصیبت کا شکار ہو تو سوچتا ضرور ہے کہیں کوئی استحصال، بددعا تو کام نہیں دکھا رہی؟ اور قسمت سے اگر تدارک کا موقع نصیب ہو جائے تو کون ہاتھ کھینچ سکتا ہے۔ وہ بھی اس صورت میں جب زندگی داؤ پر لگی ہو؟"

شاید وہ بھی اس استحصال کا سرا نہ پکڑ پاتیں اگر جو خود رب کے انصاف کی پکڑ میں نہ آتیں۔

مدیحہ آج سب کچھ کہہ ڈالنے پر کمربستہ تھی اور آپا اپنی شخصیت کے تمام تر ٹھہراؤ سمیت ہمہ تن گوش۔

"ہدایت بھی رب کا بخشا ہوا اعزاز ہوا کرتی ہے۔ وہ جسے چن لیتا ہے۔ بہتری کے لیے اسے کسی نہ کسی طرح اپنی راہ سے لگا ہی لیتا ہے؟" آپا کا یہی فلسفہ ہدایت اس کے سفر کو سہل بنا دیا کرتا تھا۔

"شاید میں اپنا گھر بگاڑ لیتی، ورنہ حوصلہ تو کھو ہی چکی اگر جو آپ کا بخشا ہوا ایقان زاد راہ نہ ہوتا۔۔۔"

"تو مان گئیں نا تم۔۔۔ کہ جب ہم اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں تو وہ رب بھی کبھی اس بھروسے کو ٹوٹنے نہیں دیتا۔" آپا مسکرائی تھیں اور جیسے چار سو اجالا بکھرتا چلا گیا تھا۔

"گھر کی بابت تمہاری تمام فکریں بجا تھیں۔ مگر وہ اک ذات جو ہم سے بڑھ کر اپنے بندوں کی خیر خواہ اور ان سے محبت کرنے والی ہے۔ اک در بند ہو تو ستر در وہی کھولتا ہے۔ ہزار وسیلوں سے بندوں کو رزق عطا کرنے پر قادر ہے۔ مگر ہم اس کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھیں تب نا۔"

"آپ درست کہتی ہیں آپا! ہم رب پر بھروسا کرنے کے بجائے اپنی عقل و دانش کو اہمیت دیتے ہیں پھر مات کھاتے ہیں۔ سچ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو بہتر خبر گیری کرنے والا ہے۔" "مگر یہ سب کیسے۔۔۔؟" بالآخر سے اس کے اندر کلبلاتا سوال لبوں پر آتے آتے ٹھہر گیا اور آپا مسکرا دیں۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ رب ایک در بند کرتا ہے تو ستر در کھولتا ہے۔۔۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تمہارا وجود اس گھر کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔ تمہارے گھر سے سدھارنے کے بعد معاشی ہی نہیں گھریلو مسائل بھی منہ پھاڑے کھڑے تھے۔۔۔ تمہاری تمام فکریں بجا تھیں۔۔۔ مگر وہ رب جس پر بھروسا کرکے تمہیں بیاہا تھا، ہم سے غافل تو نہ تھا۔"

آپا نے اک ٹھنڈی سانس بھری۔ مدیحہ ٹکر ٹکر انہیں دیکھتی ہی چلی گئی۔

"شاید پروردگار نے اس بار اس گھر کو سنبھالنے کا فریضہ مجھے سونپنا تھا۔ ساجد کا معاہدہ ختم ہوا تو انہیں اک نئے کاروبار کی بنیاد ڈالنی تھی۔ عمران کی آمد کے ساتھ ہی گھر کے بٹوارے کا غلغلہ اٹھا۔۔۔ ہمارے پاس جو رقم تھی اس میں یا تو کاروبار شروع کیا جا سکتا تھا یا گھر کی چھت ہی میسر آتی کہ مکان کے بٹوارے کی مد میں ملنے والی رقم سے تو اک پلاٹ بھی خریدنا دشوار تھا۔۔۔ ہمیں چھت درکار تھی اور ان سب کو سہارا۔۔۔ اور شاید یہی رب کی منشا تھی کہ ہم اک دوسرے کے مسائل بانٹ لیں۔۔۔ ساجد نے مکان کے حصے سے امی کے گھر کے اوپری حصے میں اک پورشن بنا لیا اور کاروبار کی رقم سے اک موبائل شاپ کھول لی۔ کچھ بھاگ دوڑ کرکے اپنی پرانی جاب کے حصول میں کامیاب ہوئے تو دن بھر کے وقفہ میں شاپ افتخار کے حوالے کر دی۔ سمجھو یہ اسی اتحاد و اتفاق کی برکت ہے۔۔۔ میرا کچھ احسان نہیں ہے۔ افتخار اپنی معذوری کے سبب کسی وقت طلب کام پر تو قادر نہیں تھا مگر اس موبائل شاپ کی آمدنی سے گھر کی آمدنی کا وسیلہ بنا اور حالات میں بہتری آئی، نتائج تم دیکھ رہی ہو۔"

"آپا!" تشکر و ممنونیت سے اس کا گلا رندھ گیا۔ ایک ایک پل کیسے کانٹوں پر گزارا تھا اس نے۔ اس گھر کی فکریں لہو نچوڑ کے رکھتیں مگر آپا کا توکل بے جا نہ تھا۔ ان سے بڑھ کر امی، بھیا اور چھوٹی کی خبر گیری کا وسیلہ اور کون بن سکتا تھا۔ اسے آپا پر خود سے بڑھ کر اعتماد تھا۔ آپا پر آب بھی جیسے اس کے اندر اٹھتے بھنور کو پاکر مسکرا دی تھیں۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ اگر ہم اپنے رب پر بھرپور بھروسا رکھتے ہیں تو جان لیں کہ وہ رب بھی کبھی اس بھروسے کو ٹوٹنے نہ دے گا۔"

اور مدیحہ کو بھی کامل بھروسا تھا جو اب مزید پختہ ہو گیا تھا۔

ناولٹ

مریم نے غزالہ کی طرف دیکھا' اس کی نظریں ٹی وی اسکرین پر جمی تھیں۔ مریم کی نظروں نے اس کے تعاقب میں ٹی وی کی طرف رخ موڑ لیا' کسی چینل پر قسط وار ڈراما چل رہا تھا۔ اس نے دوبارہ غزالہ کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے کے تاثرات کو جاننے کی کوشش کی' مگر کچھ دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ غزالہ کے چہرے کے تاثرات کو جاننا مشکل کام تھا یا اس کے چہرے کے تاثرات ایسے ہوتے تھے کہ ان کے بارے میں حتمی رائے نہیں دی جا سکتی تھی۔ وقت کے ساتھ اس کے چہرے کے نقوش بھی بدل

"اچھا!" غزالہ نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا' جیسے اسے مریم کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ دوسرے ہی لمحے وہ ہولے سے مسکرا کر بولی۔ "شاید مجھ سے غلطی ہوئی ہو' میری عقل کچھ اتنا ٹھیک کام بھی تو نہیں کرتی۔"

"یہ آپ کہہ رہی ہیں؟" مریم نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں تو اور کیا۔" وہ پھر مسکرا کر بولی۔ "میں کئی چیزوں' لوگوں اور باتوں کے بارے میں غلط اندازے لگاتی ہوں' حالانکہ مجھے زعم ہوتا ہے کہ ان کے بارے

عنیزہ سید

گئے تھے' ان پر بڑھتی عمر کے آثار نے ڈیرا جما لیا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات ان نقوش کے کونوں کھدروں میں کہیں گڈمڈ ہو جاتے تھے۔

"اس لڑکی کو اداکاری کے متعلق بنیادی باتوں کے بارے میں کچھ علم نہیں۔"

کچھ دیر بعد غزالہ نے اپنی سوچ کو زبان دی جو ڈراما دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں ابھری تھی اور جس کے بارے میں اس کے چہرے سے اندازہ لگانا مریم کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

"ارے' یہ لڑکی تو آج کل ٹاپ پر جا رہی ہے۔" مریم نے بے ساختہ کہا۔ "ہر دوسرے ڈرامے میں یہ لیڈ رول کر رہی ہوتی ہے۔"

میں جو سوچ رہی ہوں۔ وہ بالکل ٹھیک ہے' بعد میں مجھے پتا چلتا ہے کہ میرا اندازہ غلط تھا' شاید وقت آگے نکل گیا اور میں بہت پیچھے رہ گئی ہوں' میں پیدل چلنے والا ایک ہانپتا کانپتا مسافر ہوں اور وقت ایک تیز گام پر سوار ہے۔"

"ایسا نہیں ہوتا میری پیاری آپا!" مریم نے اپنی جگہ سے اٹھ کر غزالہ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے ہاتھ غزالہ کے شانوں پر تھے۔

"وقت جوں جوں آگے بڑھتا ہے ہماری عمر بھی بڑھتی ہے' بڑھتی۔ عمر ہماری حیات کو ضرور کمزور کرتی ہے' لیکن ہماری سوچ کو بہت توانا بنا دیتی ہے' تجربہ ہمیں زیادہ باشعور اور ہماری سوچ کو پختہ بنا دیتا ہے اور

ہم اپنے اردگرد کے لوگوں کو اسی تجربے کی عینک سے دیکھنے لگتے ہیں۔ اس عینک کے شیشے اتنے تیز ہوتے ہیں کہ ہمیں ہر شخص، ہر چیز کی جذبات کا مشاہدہ ہو جاتا ہے۔ ہمیں خفیہ خامیاں اور ڈھکے چھپے چور بھی نظر آنے لگتے ہیں مگر....."

"مگر کیا؟" غزالہ نہ صرف اس کی بات سن رہی تھی، بلکہ اس پر غور بھی کر رہی تھی، اس کے رک جانے پر تیزی سے بولی۔

"مگر یہ کہ تجربے کی عینک کے پیچھے سے لوگوں اور چیزوں کا جائزہ لیتے ہوئے ہم اکثر بھول جاتے ہیں کہ یہ لوگ وہاں کھڑے ہیں جہاں سے ہم نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ہم میں بھی ایسی خفیہ خامیاں اور ناتجربہ کاری کے ڈھکے چھپے چور تھے۔ ہم اپنی ابتدا بھول جاتے ہیں۔ ہر کام میں پختگی وقت کے ساتھ آتی ہے۔ ہر انسان وقت کے ساتھ پہلے سے بہتر ہوتا جاتا ہے۔ آج یہ لڑکی" اس نے ٹی وی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں کھڑی ہے، جہاں کئی سال پہلے آپ تھیں، یاد کریں وہ دن، جب آپ نے اپنے کیریئر کا تیسرا یا چوتھا ڈراما کیا تھا۔ یاد کریں، آپ کے کام میں اس وقت کتنا کمال تھا اور اس وقت کتنا تھا جب آپ کا دورِ عروج چل رہا تھا۔"

"تمہیں اندازہ ہے کہ ہمیں دورِ عروج پر پہنچنے کے لیے کن کن مراحل سے گزرنا پڑا؟" غزالہ نے اس کی جانب دیکھا۔ "کتنی بار ری ٹیک ہوا کرتے تھے، گھنٹوں کی مشقت کے بعد ایک سین اوکے ہوتا تھا اور ہمارے کام کو اس گلیمر اور انتہائی مہارت کے میک اپ اور اوریجنل میٹس کی سہولت بھی میسر نہیں تھی اور...." غزالہ تیزی سے بولتے ہوئے ایک دم خاموش ہو گئی، جیسے اسے اچانک احساس ہوا تھا اسے اس موضوع پر زیادہ نہیں بولنا چاہیے۔

"اور...؟" مریم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "آگے بولیں" اس کا چہرہ غزالہ کو [illegible] رہا تھا۔

جواب میں غزالہ نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔

"اور میرا تو آغاز ہی بلیک اینڈ وائٹ دور میں ہوا۔" خاصی طویل خاموشی کے بعد غزالہ نے نظریں جھکائے اپنی بات مکمل کی۔

"ہاں یہ تو ہے، اس وقت یہ کام خاصا مشکل تھا۔" مریم نے اسے سپورٹ کرنے کی کوشش کی، وہ چاہ رہی تھی کہ غزالہ کے ذہن میں جو کچھ ہے وہ کہہ ڈالے۔ "مگر تیکنیکی لحاظ سے آج سے بہت بہتر، اداکاری عروج کمال پر، ہدایت کاری لاجواب، سب کچھ قابلِ تعریف، لائٹنگ، کیمرہ، سیٹ، ریکارڈنگ، ضروری سامان کی کمیابی کے باوجود ایک دم پرفیکٹ، میرا مطلب ہے جو چیز آخر میں سامنے آتی تھی وہ نہایت عمدہ۔"

"جی!" مریم نے غزالہ کے شانے پر ایک بار پھر ہاتھ رکھا۔ "آپ لوگ تو اس میدان کے نایاب نگینے ہو۔"

"جب ہی..." غزالہ نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "جب ہی اس حال میں بیٹھے ہیں، میرا کام، میرا فن، میری پرفیکشن، میری زندگی کے کتنے سال کھا گیا، تمہیں اندازہ نہیں" کسی کو، اس کے چہرے پر وہ مانوس سی وحشت اترنے لگی جس سے مریم سمیت اس سے متعلق تمام لوگ خوف کھاتے تھے۔

"میرا قصور..." کچھ دیر کی خاموشی کے بعد غزالہ نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "میرا فن تھا، میرا جرم، مجھے مسلسل کئی سال بہترین اداکارہ کا ایوارڈ ملتا تھا۔ میرا گناہ یہ تھا کہ مجھے، میرے کام کو سراہنے والے، میرے چاہنے والے فلم کی کاسٹ میں میرا نام دیکھ کر جھوم اٹھا کرتے تھے۔ میرے قصور، میرے جرم اور میرے گناہوں کی سزا مجھے کانٹوں پر گھسیٹ کر دی گئی، مجھ سے کہا گیا شعلوں پر برہنہ پیر رقص کرایا گیا، جنون کا رقص، دیوانے کا رقص، میرے دماغ کو آؤٹ...!" اس نے اپنا ہاتھ اٹھا کر چٹکی بجائی۔ "قرار دے دیا گیا۔

ایک سرٹیفکیٹ" پھر وہ اپنی وحشت بھری نظریں مریم کے چہرے پر گاڑتے ہوئے بولی۔ "ایک سرٹیفکیٹ درکار تھا انہیں کہ غزالہ سلطان فاترالعقل قرار دی جاتی ہے، وہ ذہنی طور پر معذور ہو چکی ہے، کسی کو پہچانتی نہیں، وہ کسی کی بات سمجھ نہیں سکتی، وہ ٹھیک طرح سے بول نہیں سکتی۔" اس نے مریم کے بازو میں اپنے ہاتھ کی سخت انگلیاں گاڑ دیں۔ "ہاں ایک سرٹیفکیٹ۔ وہ جو میری جگہ لینا چاہتے تھے، وہ جنہیں میری موجودگی میں اندر کا راستہ بند ملتا تھا، وہ جو میری کیٹگری سے خائف تھے اور ان کو وہ سرٹیفکیٹ مل بھی گیا۔" پھر اس نے مریم کو دیکھا، اس کی نظروں میں اب وحشت کے ساتھ ساتھ بے چارگی بھی اور آنسو بھی۔

"وہ سرٹیفکیٹ ان کو مل گیا اور اس سرٹیفکیٹ نے میری زندگی کے ان گنت سال کھا لیے۔ میری خوشیاں، میری خواہشات، میرا شوق، میری لگن، میرا جنون حتیٰ کہ میرا ناصر۔" وہ کچھ دیر کو رکی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ "وہ میرے ناصر کو بھی کھا گیا۔ وہ سرٹیفکیٹ جس نے کچھ بھی سلامت نہ چھوڑا، وہ سب کچھ کھا گیا۔"

اب وہ چیخنے لگی تھی، وحشت کا دورہ مکمل طور پر اس کو اپنے حصار میں لے چکا تھا۔ مریم نے حواس باختہ ہو کر اسے بازوؤں میں جکڑ کر صوفے تک لانے اور بٹھانے کی کوشش کی، وہ گھر میں موجود دونوں ملازمین کو اونچی آواز میں بلا رہی تھی اور دل میں خود کو ملامت کر رہی تھی کہ اس نے اس موضوع کا آغاز کیوں کیا جس کا اختتام غزالہ کی یہ حالت تھی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے تم پر حیرت ہوتی ہے، تم یہ سب کیوں کر رہی ہو؟" سرمد نے اسٹرابیری جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "بلکہ سچ پوچھو تو کبھی کبھی مجھے جھنجلاہٹ ہونے لگتی ہے۔"

"کیونکہ مجھے غمِ دوراں لاحق ہے۔" مریم نے مسکرا کر جواب دیا، اسے معلوم تھا کہ اس کے اس جواب پر سرمد بری طرح چڑ جائے گا۔

"اور غمِ جاناں۔" سرمد نے ابرو اچکاتے ہوئے پوچھا۔ "اس کا کیا ہوا؟ [illegible] اس کی بھی کچھ گنجائش ہے یا نہیں؟"

"ہاں!" مریم نے میز کی سطح پر چھلک جانے والے جوس کے چند قطروں کو ٹشو پیپر میں جذب کرتے ہوئے کہا۔ "اس کا بھی کچھ سوچیں گے، فرصت ملنے پر۔"

"میں یقیناً بہت مایوس ہوا ہوں۔" سرمد نے صاف گوئی سے کہا۔ "میں نے ایک عام سی بہت نارمل سی لڑکی مریم ثاقب سے محبت کی تھی۔ شاید آج سے تین سال پہلے۔" اس نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ محبت کا آغاز کیا تھا۔"

"پھر کیا ہو گیا ان تین سالوں میں جس نے تمہیں از حد مایوس کیا؟" مریم نے دانستہ اس کو تنگ کر رہی تھی۔

"وہی۔" وہ شانے اچکاتے ہوئے بولا۔ "میں نے بتایا نا کہ میں نے ایک عام سی، نارمل سی لڑکی کو پسند کیا تھا، اس وقت جب اس نے یونیورسٹی کو نیا نیا جوائن کیا تھا، اس وقت جب وہ عام لڑکیوں کی طرح ہنستی، گنگناتی، زندگی کی ہر چھوٹی چھوٹی مزیدار اور دلچسپ بات پر محظوظ ہوا کرتی تھی، جب وہ ایک انتہائی مترنم نغمے کی طرح تھی، اس وقت جب اسے رنگوں، پھولوں، خوشبوؤں، چاند، ستاروں، بادلوں، بارشوں سے محبت تھی، جب اسے دوستوں کے ساتھ مل کر ہلا گلا کرنے میں مزا آتا تھا، وہ جہاں جاتی چھا جاتی تھی، اپنی خوشگوار طبیعت اور خوش مزاجی کی وجہ سے۔"

"پھر کیا ہوا؟" مریم نے یوں کہا جیسے اسے اس داستان کو سننے میں بہت مزا آ رہا تھا۔

"پھر جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گھما دی، وہ مترنم نغمہ ایسے ہو گیا جیسے..." سرمد نے کسی مناسب لفظ کا انتخاب کرنے کی کوشش کی۔

"جیسے کسی میراثی کا گیت۔" مریم نے سنجیدہ چہرے کے ساتھ اس کا جملہ مکمل کر دیا۔

"خدا سے ڈرو یار!" عاقب اس کی بات پر جھنجلا کر رہ گیا۔ "میں جو کہنا چاہ رہا ہوں تم ساری بات سمجھ رہی ہو۔ تم خواہ مخواہ انجان بن رہی ہو اور مجھے الفاظ کے چکر میں ڈال رہی ہو۔"

"الفاظ کے چکر میں تو تم خود پڑ رہے ہو۔" مریم نے مسکرا کر کہا۔ "جب تم جانتے ہو کہ ساری بات میری سمجھ میں آ رہی ہے تو اسے الفاظ کی شکل میں نہ ڈھالو تو فرق نہیں پڑتا۔"

"پھر؟" سرمد کے چہرے پر بے بسی تھی۔ "پھر تم کیوں کر رہی ہو ایسا؟ تم جانتی ہو کہ تم نے خود کو کتنا محدود، کتنا پابند کر لیا ہے؟ تم جانتی ہو کہ تمہاری عمر میں زندگی ایسی نہیں ہوتی۔ تم کیوں ایسا کر رہی ہو، خود اپنے ساتھ اور میرے ساتھ بھی۔ کیوں آخر کیوں، تم جانتی ہو کہ میں۔"

وہ اپنی بات کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے بولتے ہوئے سر کو جھٹکا اور گردن جھکالی۔

"میں کیا کر رہی ہوں سرمد؟" اس کو یوں مایوس دیکھ کر مریم کو افسوس ہوا۔ "زندگی بہت کچھ کرنے کے لیے ملی ہے نا ہمیں۔" اس نے اسے سمجھانا چاہا۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کسی کی عمر کم ہے یا زیادہ، کسی مقصد کے لیے زندگی گزارنا ہی اصل جینا ہے۔" اسے لگا جیسے اس کا لہجہ کسی واعظ کا سا رنگ اختیار کر گیا تھا۔ اس نے فوراً اپنا لہجہ بدل لیا۔ "کوئی بھی کام جو ہم کر رہے ہوں، اس کے ساتھ ساتھ نارمل زندگی کے باقی کام بھی تو کیے جا سکتے ہیں اور وہ میں کر رہی ہوں۔"

"کیا کر رہی ہو؟" سرمد نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ "تمہارے پاس اس گاڈ فارسیکن 'پناہ' کے علاوہ کسی اور کام کے لیے وقت ہو گا تو کچھ کرو گی، ہر ایک چیز سے زیادہ اہم تمہارے لیے وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ وقت گزارتے گزارتے تم بھی عقل سے پیدل ہوتی جا رہی ہو۔"

"خدا سے ڈرو سرمد!" مریم بے اختیار ہوئی۔ "وہ لوگ عقل سے عاری نہیں ہیں، ان میں سے بہت سے کسی وقت دوسروں کو علم و حکمت کی تعلیم دیا کرتے تھے، انسانوں پر کسی بھی قسم کا وقت آزمائش بن کر آ سکتا ہے اور اس صورت حال سے کوئی بھی دوچار ہو سکتا ہے۔ میں یا تم، ہم میں سے کوئی بھی اس سے بالا نہیں ہے۔"

"یقیناً۔" سرمد نے اس بات پر قطعی بحث نہیں کی۔ "مگر ضروری تو نہیں کہ ہم جب ذہنی طور پر بالکل ٹھیک ہیں، ایک مفروضے کی وجہ سے اپنی زندگی اس طرح ضائع کر دیں۔"

"اب کے تم نے مجھے مایوس کر دیا سرمد!" مریم کو دکھ سا ہوا۔ "کیا یہ زندگی کو ضائع کرنا ہے؟" اس نے بے یقینی سے سرمد کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال تھا کہ تم اس کام میں مجھے سپورٹ کرو گے، مجھے شاباش دو گے اور پل پل میرے ساتھ ہونے کا احساس دو گے۔"

"میں نے تمہیں ہمیشہ سپورٹ کیا، تم شاید بھول رہی ہو۔" سرمد نے کہا۔ "میں مانتا ہوں کہ تم ایک بہت اچھے کام میں مصروف ہو، لیکن یہ جو تم نے اپنے غزالہ سلطان کی چوبیس گھنٹے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے، مجھے اس سے اختلاف ہے اور میری بات نہیں آئی کہ اس قصے میں سے تم نکلنا کیا چاہتی ہو، جو کام یا کارنامہ تم سر انجام دینا چاہتی ہو وہ ممکن نہیں ہے، وہ ذہنی طور پر اس قدر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے کہ زندگی کے مختلف خانوں میں سے کسی ایک بھی ٹریک پر اس کی واپسی ناممکن ہے جبکہ اس کے سارے ٹریکس گڈمڈ ہو چکے ہیں۔"

"میں [illegible] کارنامہ سر انجام نہیں دینا چاہتی ہوں سرمد!" مریم نے اس کی بات سن کر تحمل انداز میں کہا۔ "غزالہ سلطان ہمارے معاشرے کا ایک ایسا جیتا جاگتا چلتا پھرتا المیہ ہے کہ ہم اس پر جتنا بھی افسوس کریں، کم ہے۔ اس کے ساتھ جو زیادتی ہوئی وہ ہم سب کے علم میں ہے۔ غزالہ سلطان ایک مثال ہے، اس جیسے کئی اور ہوں گے جن کا ہمیں علم نہیں یا پھر جن کے بارے میں جان کر بھی ہم انہیں نظر انداز

کر دیتے ہیں، وہ اتفاق سے میرے سامنے پر آ گئیں۔"

اس نے ایک نظر سرمد پر ڈالی جو کچھ روٹھا ہوا سا بیٹھا تھا، مگر یقیناً اس کی بات کو غور سے سن رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے، جس دن پہلی مرتبہ میں نے غزالہ کو "پناہ" کے ایک بستر پر پڑے دیکھا، یقین جانو میرے اردگرد دنیا گھوم گئی۔ یہ وہ خاتون تھی جس کو بچپن میں میں نے صرف ٹی وی اسکرین پر دیکھا تھا۔ ممی اور خالاؤں کو اس کی اداکاری کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے سنا تھا۔ اس کی آنکھیں اس کے ہونٹوں کا ساتھ دیتی تھیں، اس کے چہرے کے تاثرات اس کے کردار کے تمام اتار چڑھاؤ کا اظہار کرتے تھے، کیا کمال اداکارہ تھی وہ، میں نے سن رکھا تھا مگر وہاں پناہ کے بیڈ پر پڑی خاتون صرف اپنے خدوخال سے ہی اس باکمال فنکارہ کی پرچھائیں معلوم ہوتی تھی۔ میں نے سن رکھا تھا کہ وہ ایک بہت اچھی فنکارہ تھی، مگر وہ شخصیت جو میرے سامنے پناہ میں موجود تھی، اس کی تعلیم، اس کا فن، اس کا سارا ہنر، اس کی ساری شائستگی کہیں گم ہو چکی تھی، وہ سراپا وحشت بن چکی تھی، محض وحشت جو کسی کے بھی قابو نہیں آتی تھی۔" مریم کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

"وہ سب ٹھیک ہے مریم!" اب کے سرمد قدرے نرم لہجے میں بولا۔ "مگر وہ تمہاری ذمہ داری کیسے بن گئی، وہ ایک قومی فنکارہ تھی، حکومت کے زیر نگرانی چلنے والے ایک ادارے کا اثاثہ تھی، وہ تو اسٹیٹ کی ذمہ داری تھی مائی ڈیئر! پھر تم نے اس ذمہ داری کو اپنے ہاتھ میں کیوں لے لیا؟ تم ایثار اور قربانی کی تاریخ میں اپنا نام کیوں رقم کرنا چاہتی ہو؟"

"اسٹیٹ؟" مریم نے سوالیہ نظروں سے سرمد کی طرف دیکھا۔ "کس اسٹیٹ کی بات کر رہے ہو؟ وہ اسٹیٹ جس میں کام کرنے کے لیے بیٹھے ہوئے لوگ برسوں اس بات پر محنت کرتے رہے کہ کیسے اس ماہر فن فنکارہ کو بیک اسٹیج پر سے جایا جائے؟ کیسے اسے اس صورت حال سے دوچار کیا جائے، جس میں یہ گمنامی کی دنیا کا فرد بن کر ماضی کی جھلملاتی روشنیوں کو محض یاد کرنے میں باقی کی زندگی گزار دے؟ کیسی حکومت اور کیسی سرپرستی فن؟ اگر یہ سچ ہوتا کہ اسٹیٹ ایسے لوگوں کو جو کسی بھی میدان میں اپنے کام کا لوہا منوا لیتے ہیں، ہر طرح سے سپورٹ کرتی ہے تو پھر بہت سے لوگ گمنامی کی زندگی گزارتے فاقہ حال نہ مرتے۔"

"یہ سب باتیں سلوگنز کی شکل اختیار کر چکی ہیں مریم! کلیشے بن کر الفاظ محض ڈکشنریوں کا حصہ بن کر رہ جاتے ہیں، ان کو دہرایا بھی جائے تو کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔"

سرمد اس کی گفتگو سے ذرا سا بھی متاثر ہوئے بغیر بولا۔

"حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے تمہاری اس ساری مشقت کا کوئی مثبت نتیجہ نکلتا نظر نہیں آ رہا ہے۔ غزالہ سلطان کو پناہ والے ذہنی صحت کا سرٹیفکیٹ کب دیں گے اور کب وہ واپس ایک نارمل زندگی کی طرف لوٹے گی، یہ دو بڑے سوال ہیں اور مجھے ان سوالوں کا فی الحال کوئی جواب ملنے کی دور دور تک کوئی امید نظر نہیں آتی۔"

"جو بھی ہے۔" مریم نے اس کی بات پر دل میں مایوسی کی اٹھنے والی لہر کو دباتے ہوئے بات کو ختم کرنے کے لیے کہا۔

"میں غزالہ کی ذہنی صحت کی بحالی کے لیے بہت پرامید ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب وہ ایک صحت مند ذہن کے ساتھ ان لوگوں کے سامنے کھڑی ہو گی، جنہوں نے اسے اس حد تک پیچھے دھکیلا۔"

"اس کا تمہیں کیا فائدہ ہو گا؟" سرمد اکتا کر بولا۔

"میں اسی معاشرے کی ایک فرد ہوں سرمد! مردہ ہوتے ذہنوں کو بیدار کرنے کا ایک موقع اگر مجھے ملا ہے تو میں اس میں اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش ضرور

کروں گی۔" مریم نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "تم کو اگر یہ برا لگتا ہے تو صاف الفاظ میں کہہ دو' ٹھیک ہے ضروری نہیں کہ جو ہم اپنے لیے چاہتے اور پسند کرتے ہیں ویسا ہی ہو جائے۔"

"تم ایک تیسرے فرد کو اپنے اور میرے تعلق پر ترجیح دے رہی ہو' اگرچہ یہ بہت تکلیف دہ بات ہے مگر یاد رکھو کہ میں نے محض تمہارے چہرے اور ذہن کو نہیں چاہا' میں جانتا ہوں کہ اس چہرے سے زیادہ خوب صورت دل تمہارے اندر موجود ہے اور وہ مجھے انتہا سے زیادہ عزیز ہے' تم اپنی مرضی کرتی جاؤ' خون دو عالم میری گردن پر سہی۔" سرمد پہلی بار ذرا سا مسکرایا۔

"کوئی زبردستی نہیں ہے۔" مریم نے ایک بار پھر اسے یاد دلایا۔

"یہ بات بار بار کر کے مجھے تکلیف مت دو مریم! اگر تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا اگر ہمارے راستے الگ ہو جائیں' مگر میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا' کیونکہ میرے لیے تم ہر صورت بہت ضروری ہو۔"

"اگر تم مجھے سمجھتے ہو تو تمہیں ایسی بات کہنے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟" مریم نے خفگی کا اظہار کیا۔

"اس لیے کہ جب میں تم کو خود سے غافل دیکھتا ہوں تو مجھے سب کچھ بھول جاتا ہے' مجھ سے ایسی صورت حال برداشت ہی نہیں ہوتی' میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میرے علاوہ کچھ اور نہ کرو' میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم کچھ بھی کرو مجھے نظر انداز مت کیا کرو۔" اس نے دل کی بات کہی۔

"وہم ہے تمہارا کہ میں تمہیں نظر انداز کرتی ہوں' میں اس خیال میں ہوتی ہوں کہ میں جہاں بھی ہوں جو بھی کر رہی ہوں' تمہاری مکمل رضامندی کے ساتھ کر رہی ہوں اور تمہیں میری کوئی بھی بات بری نہیں لگتی۔" مریم نے اس پر اپنے اعتماد کو ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"پھر ٹھیک ہے' بس مجھے نظر انداز ہونے کا احساس نہ دلایا کرو' باقی سب ٹھیک ہے۔" سرمد فوراً ہی مطمئن ہو گیا۔

"اچھا پھر یہ بتاؤ کہ تم نے غزالہ کے کتنے ڈرامے ڈاؤن لوڈ کر لیے اب تک اور کب مجھے مل جائیں گے؟"

"میرا خیال تھا کہ اب کوئی رومینٹک سی گفتگو ہو گی اور تم ہو کہ پھر وہی غزالہ۔" سرمد نے سر پکڑ کر ہنستے ہوئے کہا۔ "رقیبِ روسیاہ کا روپ دھار لیا ان محترمہ نے تو۔"

"سرمد پلیز! یہ چیز اس کی ذہنی صحت لیے بہت ضروری ہے۔" مریم نے اسے یاد دلایا۔

"بہت جلد' یہ ہی ایک' دو دن تک۔" سرمد نے اسے یقین دلایا۔

"تم بہت اچھے ہو۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"تمہاری چوائس اچھی ہے دراصل۔" وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

☼ ☼ ☼

غزالہ سلطان ٹی وی ڈرامے کی دنیا میں لیجنڈ کا سا مقام رکھتی ہیں' وہ اپنی ذات میں فن اداکاری کی ایک چلتی پھرتی اکیڈمی کی طرح تھیں ان کے بعد آنے والی فنکاراؤں نے ان کو نقل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہیں' غزالہ سلطان اپنے کردار میں ڈوب کر اداکاری کرتی تھیں' ان کے چہرے کا ہر حصہ ان کے بولے ہوئے ڈائیلاگ کا ساتھ دیتا تھا۔ ایک نوادلڈ' دیہاتی سے شہری ماڈرن لڑکی کا کردار ہو یا خانہ بدوش عورت کا' ایک لاپروا سی بے نیاز لڑکی کی کہانی ہو یا ایک باشعور سمجھ دار و رکھ رکھاؤ کا کردار' غزالہ اپنے ہر رول میں جان ڈال دیتی تھیں' وہ اس طرح کہ دیکھنے والے کو کہیں بھی اداکاری کا گمان نہیں ہوتا تھا' غزالہ سلطان جیسی فنکار...

"وہ ہی ایک سے الفاظ' وہ ہی ایک سی باتیں۔" مریم نے اکتا کر ہاتھ میں پکڑا میگزین میز پر رکھ دیا جس میں ماضی کی مایہ ناز اداکارہ غزالہ سلطان پر آدھے صفحے کا ایک آرٹیکل شائع ہوا تھا۔ "لگتا ہے کہ خالی صفحوں کے پیٹ بھرنے کے لیے لفظوں کے انبار لگا دیے

گئے'' یہ غزالہ جو ہمارے درمیان رہتی ہے اس سے کون واقف ہے'' اس سے کتنوں کو ہمدردی ہے؟'' اس نے اسی کمرے میں موجود ڈاکٹر فرح سے پوچھا۔

''ہم واقف ہیں نا اس سے'' ہمیں پیار ہے اس سے'' ڈاکٹر فرح نے نرمی سے کہا۔

''تمہارے اکا دکا کے واقف ہونے سے کیا ہوتا ہے' اس ملک میں فنکاروں کی کتنی قدر ہے۔ وہ جب تک بقائمی ہوش و حواس دیکھنے والوں کو تفریح کا سامان مہیا کرتے رہیں' سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے ہیں اور جب وہ نظر نہیں آتے تو فوراً ذہنوں سے محو ہو جاتے ہیں۔'' مریم کے لہجے میں دکھ تھا۔

''غزالہ کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ حد سے زیادہ حساس تھی۔ اس کے ساتھ کی کئی فنکارائیں ابھی تک سروائیو کررہی ہیں اور ہر دل عزیز بھی ہیں۔'' فرح نے سے آئینے کا دوسرا رخ دکھانے کی کوشش کی۔

''وہ ہی لوگ سروائیو کررہے ہیں جنہوں نے غزالہ جیسوں کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچی۔ کسی ایک ذاتی مسئلے کی وجہ سے جب غزالہ کا ذہن دباؤ کا شکار ہونے لگا تو یہ ہی لوگ تھے جنہوں نے مشہور کیا کہ غزالہ پاگل ہو گئی ہے' یہ ہی لوگ تھے جنہوں نے کہا کہ اس کی ذہنی حالت ایسی نہیں کہ وہ کام کرسکے' وہ کام دینے والے' کام کی ستائش کرنے والے اور جن کے ساتھ کام کیا' ماضی کے ایک ایک چہرے کے پاس جاکر یقین دلاتی رہی کہ وہ ذہنی طور پر بالکل ٹھیک تھی اور کام کرسکتی تھی' وہ اپنی انا' خودداری اور ناموری کو پس پشت ڈال کر منتیں کرتی رہی کہ اسے کام دیا جائے' اسے آزمایا جائے۔ مگر سب نے اس کا استہزا اڑایا' اسے پاگل کہا اور یہ بھی کہا کہ وہ فن کی دنیا سے ریٹائرمنٹ لے گئی یہ سب لوگ جو آج سروائیو کررہے ہیں' سب کے سب اس کی فنی زندگی کے قاتل نہیں؟ کیا انہوں نے اسے بری سے بری ترین صورت حال کی طرف نہیں دھکیلا؟ کیا ان سب کو کٹہرے میں کھڑا نہیں کرنا چاہیے؟''

''تم جذباتی ہو رہی ہو مریم۔'' فرح بدستور نرمی سے بولی۔ ''یہ ایک عام سی کہانی ہے' ہر جگہ کی' جس کا زور چلتا ہے' وہ دوسرے کو اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی جگہ لے لینے کی بھی' کہاں یہ نہیں ہو رہا؟ نامور کھلاڑی اچانک سے منظر عام سے غائب ہو جاتے ہیں' کسی نہ کسی بے مقصد وجہ کو آڑ بنا کر ان کا کیریئر ختم کر دیا جاتا ہے' قلم کار' فنکار' مصور' گلوکار' سب کی تاریخ اسی قسم کی زیادتیوں سے بھری پڑی ہے۔ غزالہ حساس تھی' اس سے شہرت کی بلندی سے یوں نیچے آنا برداشت نہیں ہوا اور وہ شیزو فرینک ہو گئی۔ یہ اس پرانے المیے کی پیدا کردہ انتہائی افسوسناک صورت حال ہے۔''

''کیا ہم غزالہ کو ایک مثال نہیں بنا سکتے' ان لوگوں کے لیے' جو دوسروں کو دیوار سے لگا دینے کے ماہر بن چکے ہیں۔ مجھے تو جنون ہو چکا ہے اس بات کا کہ غزالہ کو واپس صحت مند زندگی کی طرف لانا ہے۔''

''ہم سب ہی یہ چاہتے ہیں' مگر ایک بات ذہن میں رکھنا کہ غزالہ کے ساتھ کئی طرح کے مسائل تھے۔ اس کی ذاتی زندگی کے مسائل' فن کی دنیا میں بھی ہر جگہ کی طرح سروائیول آف دا فٹسٹ کا اصول کار فرما ہوتا ہے' غزالہ اپنی نجی زندگی کے مسائل سے نمٹتے نمٹتے ہی دراصل ذہنی تنہائی اور عدم توازن کا شکار ہو گئی تھی' بال بعد میں یہ ہوا کہ جتنی بڑی وہ فنکارہ تھی' اس کے مطابق اس کا ساتھ دیا جانا چاہیے تھا۔ اس کے مسئلے کو سمجھا جانا چاہیے تھا' مگر سوائے اسٹیٹ اونڈ اداروں کے سرپرستوں نے غزالہ کو ذہنی بدحالی کی اس اسٹیج تک پہنچا دیا۔''

''اور پھر کسی کے کان پر جوں نہیں رینگی۔'' مریم نے کہا۔ ''کیا اخباروں میں شور نہیں مچا' یا پھر فنکاروں کی پرورش کرنے والے لوگوں تک یہ بات نہیں پہنچی' کیوں ہر جگہ اس کو دھتکار دیا گیا۔''

''اس کی قسمت میں یہ لکھا تھا شاید اس لیے۔'' فرح نے قسمت کو الزام دے کر بات ہی ختم کردی۔

''بس آگے دیکھو' خدا کرے کہ جو ہم کرنا چاہ رہے ہیں وہ ہو جائے اور یہ ناممکن بھی نہیں ہے' اگر غزالہ پورا تعاون کرے۔''

''وہ ٹھیک ہو چکی ہوتی اگر ناصر والا حادثہ نہ ہوتا۔'' مریم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''اب اس کی تم کیا کروگی سوائے قسمت کی ستم ظریفی کے۔'' فرح نے کہا۔

''ناصر کی موت میں تو کسی ادارے یا کسی ایسے شخص کا دخل نہیں تھا نا جو غزالہ کے فن کی دنیا سے تعلق رکھتے تھے۔'' فرح نے سوال کیا۔

''کچھ دکھ اللہ کی طرف سے آئے اور کچھ متعلقین سے ملے' ایک انسان جو بے حد حساس ہے' اس کا یوں ہو جانا کچھ عجب بھی نہیں' جو غزالہ ہو گئی ہے۔'' مریم نے زیرِ لب کہا۔

☆ ☆ ☆

''یہ اس زمانے کی بات ہے جب مجھے تیسرا مسلسل ایوارڈ ملا' نگار ایوارڈ۔ سب نے کہا کہ غزالہ کی پی آر مضبوط ہے' اس لیے اسے ہر سال ایوارڈ مل جاتا ہے' پھبتیاں کی گئیں' جی بھر کر لعن طعن کی گئی اس کمیٹی کو جو ایوارڈز کا فیصلہ کرتی تھی۔ مگر میں تو...'' غزالہ کی نظریں حسبِ معمول خلاؤں میں کچھ کھوج رہی تھیں اور وہ اپنے ذہن پر زور دے کر کچھ یاد کررہی تھی۔

''میں تو شاید کبھی نہیں گئی تھی کسی کے پاس کہ آؤ جی مہربانی کرو ایوارڈ مجھے دو۔'' اس کے ذہن کی رو پھر قدرے بھٹکنے لگی۔ ''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اس بات سے کہ ایوارڈ ملتا ہے یا نہیں' مگر لوگوں کو پڑتا تھا۔ لوگوں کو بہت فرق پڑتا تھا۔''

''لوگوں کی پروا نہیں کرتے غزالہ!'' ڈاکٹر فاروق نے کہا۔ ''ہم نے ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا کہ لوگوں کو برا لگنے کے خوف سے اپنا حق چھوڑ دیں۔''

''ہاں ہم نے ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔'' غزالہ کی عادت تھی جب اسے کوئی بات سوجھ نہ رہی ہوتی وہ اپنے مخاطب کی کہی ہوئی بات کو دہرا دیتی۔

''وہ زمانہ تو ٹھیک تھا نا غزالہ! جب ''چپ کہانی'' چل رہا تھا۔'' ڈاکٹر فرح نے غزالہ کو کیو دینے کی کوشش کی۔

''وہ زمانہ... وہ...'' بھول کر بیٹھی جیسے بہت کچھ یاد آگیا ہو۔ ''میں بازار سے شاپنگ کرنے نہیں نکل سکتی تھی' جہاں جاؤں وہاں ہی رش' ذرا سا باہر نکلنا ناممکن تھا' آٹو گراف' آٹو گراف' ایک تصویر کی درخواست' ایک بار جنڈ شیک' کیا زمانہ تھا ہر طرف ہجوم ہی ہجوم' ہجوم ہی ہجوم۔'' اس کی ذہنی پھر ایک جگہ ٹھہر گئی اور الفاظ کی تکرار شروع ہو گئی۔

''وہ لمبی پلکوں اور کرلز کا زمانہ تھا نا غزالہ! پلیٹ فارم ہیل اور کھلے پائنچوں والے فلیئرز' اونچی شرٹس اور باہر کو نکلی لائنز۔'' ڈاکٹر شہلا نے آگے سے ٹریک پر واپس ڈالنے کی کوشش کی۔

''ہاں!'' اسے پھر کچھ یاد آیا۔ ''بلیک اینڈ وائٹ زمانہ ہے نا!'' اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

''آغا نے کہا کہ اگر اس وقت وہ میرا شوہر ہوتا تو میرے ان کپڑوں کو تیلی دکھا دیتا۔'' اچانک اسے کچھ یاد آیا۔

''اور وہ سیریل جو خانہ بدوشوں پر تھا۔'' مریم نے فوراً بات بدلی' ان کی گفتگو میں غزالہ کی نجی زندگی کے کسی المیے کا ذکر نہیں آنا چاہیے تھا' یہ ڈاکٹر فاروق کی خاص ہدایت تھی۔

''جرس۔'' حیرت انگیز طور پر غزالہ کو فوراً یاد آگیا۔ ہالی کا اطمینان ہی نہیں ہوتا تھا' ری ٹیکس' ری ٹیکس' پاکستان کے ڈرامے کی تاریخ میں اتنے ری ٹیکس کسی اور ڈرامے میں نہیں ہوئے ہوں گے' جتنے اس میں ہوئے اور پھر وہ تھا' مطلب لوکیشن تھی' کیا اسے کہتے ہیں...'' وہ سر پر انگلی مارتے ہوئے یاد کرنے لگی۔

''صحرا۔'' رشنا نے کہا۔

''ہاں صحرا۔'' اسے یاد آگیا۔ ''کون سا صحرا تھا بھلا'' ''وشت لوط؟'' اس نے تائید طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

ان سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا' یہ ایک پوائنٹ تھا' غزالہ کے ذہن کے کسی گوشے میں اس کی

معلومات عامہ موجود تھیں۔

"چولستان غزالہ!" ڈاکٹر فاروق نے کہا۔ "دشت لوط پاکستان میں تو نہیں ہے نا!"

"ہاں یہ پاکستان میں تو نہیں ہے نا۔" اس نے پھر بات دہرائی۔

"ہاں تو کیا ہوا جرس کی شوٹنگ کے دوران؟" مریم اسے دوبارہ اسی ٹریک پر لے جانا چاہتی تھی۔

"ماجد علی تھا نا!" اس نے ایک مشہور سینئر اداکار کا نام لیا۔ اسے یہ نام بھی ٹھیک یاد تھا۔ "اس کے ساتھ ایک رومانٹک سین ہو رہا تھا۔ ہلالی نے ری ٹیکس کا سلسلہ شروع کر دیا' رات کا سین تھا۔ ماجد کو کہنا تھا کہ میں تمہارے بغیر جی کر کیا کروں گا۔ جینا ہے تو تمہارے ساتھ' ورنہ مرجانا ہے' اور میں نے جواب میں کہنا تھا۔ "مریں تمہارے دشمن" کبھی ماجد غلط جملہ بول جاتا' کبھی میرا لہجہ ہلالی کو پسند نہ آتا۔ پانچویں ری ٹیک پر ماجد نے کہا۔ "میں تمہارے بغیر جی کر کیا کروں گا۔" اور ساتھ ہی گر گیا۔ کٹ' ہلالی کی آواز آئی۔ سین او کے ہو گیا تھا۔ حالانکہ یہ ہونا نہیں تھا کیا شاندار اداکاری کی ہے۔" ہلالی خوش ہو رہا تھا اور لائٹ مین ماجد کی طرف بھاگا تھا۔ وہ بری طرح کراہ رہا تھا کیونکہ اس کے پیر پر جو سین کی ڈیمانڈ کے مطابق ننگے تھے کوئی کیڑا کاٹ گیا تھا۔ اس کے بعد تین دن تک اس کے پیر پر ورم رہا اور وہ کھڑا ہونے سے بھی گیا' مگر ہلالی بے انتہا خوش کہ کمال کی اداکاری کر گیا تھا۔" غزالہ بات سناتے ہوئے ہنسنے لگی تھی اور ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی آگیا تھا۔

"ونس سچا نیشو۔" ڈاکٹر فرح نے کہا۔

"ہیٹس ڈی آر۔" ڈاکٹر فاروق کی آواز آئی۔ "مریم! اس کو کچھ اور ڈراموں کی سی ڈیز دکھاؤ یوٹیوب پر سب موجود ہیں۔ غزالہ کے لیے نہ سہی' ان ڈراموں کی دوسری کاسٹ کے لیے سہی۔"

"وہ میں کر چکی۔" مریم نے بتایا۔ "اور آج کا یہ سیشن اسی کا نتیجہ ہے۔"

"گریٹ!" ڈاکٹر فاروق نے اسے شاباش دی اور ڈاکٹر فاروق کی شاباش ان کے جونیئرز کے لیے بہت بڑا اعزاز ہوا کرتی تھی۔ وہ اس روز غزالہ کے ذہن کی روانی کا دورانیہ بڑھا ہوا محسوس کر رہے تھے اور انہیں یہ ایک امید افزا بات محسوس ہو رہی تھی۔

"اس بار عید ملن پر غزالہ کے چند ہم عصروں کو دعوت دی جائے گی' صرف یہ دیکھنے کے لیے غزالہ کا ردعمل کیا ہو گا؟" انہوں نے کہا تھا۔

"اور یہ بھی دیکھنے کے لیے اس کے ہم عصروں کا ردعمل کیا ہو گا۔" رشنا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہم راستے پر چلنا شروع ہوئے ہیں' مگر منزل بہت قریب نہیں ہے۔" ڈاکٹر فرح نے اسے یاد دلایا۔

"شاید ہم منزل سے اتنا دور نہ ہوتے' اگر غزالہ کی امی اور پھر اس کے بعد ناصر کی وفات نہ ہوتی۔" وہ مریم کے ساتھ میس کی طرف جا رہی تھیں۔

"میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ پریس کو کیوں برا لگتا ہے' اگر غزالہ کے لیے کچھ اچھا ہو رہا ہے۔" مریم نے کہا۔

"پریس کے اندر وہ لوگ موجود ہیں' جنہوں نے اس کی ذہنی صحت کے متعلق شکوک پھیلائے' اس کے کیریئر کو بگاڑنے' اس کے پاگل پن کے دوروں کے بارے میں مبالغے کی حد تک خبریں پھیلانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا' وہ کب چاہیں گے کہ غزالہ ٹھیک ہو جائے اور ان کے بارے میں بتاتے ان کے چہروں سے نقاب اٹھائے' انہوں نے لوگوں کو باور کرا رکھا ہے کہ غزالہ فاترالعقلی کی اس اسٹیج پر پہنچ چکی ہے جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔"

"لیکن اس سب میں ان کا کیا فائدہ ہے؟" مریم کے ذہن میں یہ سوال ہمیشہ اٹکتا تھا۔

"یہ وہ لوگ ہیں جن کے لکھے اور کہے ہوئے الفاظ کسی کو آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیتے ہیں اور کسی کو عرش سے فرش تک لے آتے ہیں۔ غزالہ کی ذہنی بدحالی کے ابتدائی دنوں میں انہوں نے ہی اس کے بارے میں ان لوگوں کے کہنے پر کالم اور خبریں لکھیں جو غزالہ کی جگہ اپنے پسندیدہ لوگوں کو سامنے لانا چاہتے تھے۔ غزالہ کے پہلے شوہر نے جو زیادتیاں اس کے ساتھ کیں وہ ان ہی لوگوں کی پھیلائی جھوٹی خبروں کا نتیجہ تھیں۔ جب غزالہ نے پرفارمنگ آرٹ اکیڈمی بنانے کا ارادہ ظاہر کیا تو یہی لوگ تھے جنہوں نے اسے ایسے رنگ میں فاترالعقل قرار دیا کہ پرفارمنگ آرٹ اکیڈمی تو کجا غزالہ کا اپنا پروفیشنل کیریئر ہی تباہ ہو گیا۔"

"مگر غزالہ کا ایک نام' ایک مقام تھا' پھر اس نے ان سب چیزوں کو آنکھیں کھول کر فیس کیوں نہیں کیا؟"

"وہ بے حد حساس تھی۔ انسان جب خود کو … سمجھ رہا ہو اور اس کی اس خوش فہمی کو غلط فہمی قرار دے دیا جائے اور اسے نظرانداز کر دیا جائے' درحقیقت وہ تو بالکل تنہا ہے اور وہ … جن کے ارد گرد وہ گھومتا رہتا تھا وہ تو خواب ہوا' اس پر اس کی ذاتی زندگی میں بھی اتنی دراڑیں ہوں کہ انہیں بھرنا ناممکن ہو جائے تو پھر وہ ایک کے بعد ایک غلط فیصلے کرتا چلا جاتا ہے۔ غزالہ نے بھی ایسا ہی کیا۔ اس نے حالات سے لڑنے کے لیے جن لوگوں کا سہارا لیا وہ مطلبی اور خود غرض تھے اور ایک ایک کر کے اس کا ساتھ بھی چھوڑتے چلے گئے۔ فنکار بنیادی طور پر حساس ہوتا ہے' تم دنیا کے کسی بھی ملک میں فن کی تاریخ دیکھ لو' اپنے وقت کے نامی گرامی فنکاروں کو جب گمنامی کی تاریکی میں جانا پڑا تو ان کی ذہنی حالت پر کیسا کیسا کڑا امتحان آیا' چند ہی ہوں گے جو حالات سے سمجھوتا کر گئے اور صبر کی زندگی گزارتے رہے' بیشتر کے ساتھ یہ ہی ہوا جو غزالہ کے ساتھ ہوا۔"

"مگر ستم تو یہ ہے کہ کوئی بھی اس کی مدد کو نہ آیا' آج بھی پاکستان میں ڈرامے کی کہانی لکھتے ہوئے اہم ترین ناموں میں اس کا ذکر ہوتا ہے' اس کے ڈرامے آرٹ اکیڈمز کی لائبریریوں کا حصہ ہیں' اس کے فن پر کالم لکھے جاتے ہیں' مگر خود وہ کس کسمپرسی اور بے کسی کی زندگی گزار رہی ہے اس کا کسی کو خیال تک نہیں آتا۔" مریم کے لہجے میں انتہا کا دکھ تھا۔

"سرمد نے غزالہ کی ذہنی بحالی کے لیے اس کے علاج کے لیے جو فنڈ ریزنگ مہم شروع کی ہے اس کے سارے اہم نکات مجھے سنائے' میں بے حد متاثر ہوئی' سرمد انتہائی ہمت ہے کہ جو ارادہ کر لے اسے ضرور پورا کرے گا' میرا خیال ہے کہ اب بہت سے کانوں پر جوں رینگے گی۔" فرح نے اسے چونکا دینے والی خبر سنائی۔

"سرمد؟" مریم کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ "وہ کیا کر رہا ہے اس سلسلے میں' مجھے تو اس نے نہیں بتایا؟" اس کی آواز بلند ہو گئی۔

"وہ شاید تمہیں سرپرائز دینا چاہتا ہو۔" فرح نے مسکرا کر کہا۔ "مجھ سے غلطی ہو گئی' مجھے تم سے اس کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا ابھی۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا۔" مریم نے اپنی آواز میں جھلکتی مسرت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تو بری طرح اس بات کی مخالفت کرتا رہا ہے' کچھ دن پہلے اس نے امی اور بابا کو بھی اکسایا کہ وہ مجھے سختی سے منع کر دیں' میں کیوں ناصر کے قتل پر احتجاجی جلوس نکال رہی ہوں اور قاتلوں کو پکڑنے کے مطالبے والی خبر پر تو اس نے کامران بھائی کے کان ایسے بھرے کہ انہوں نے مجھے سختی سے کہہ دیا' میں نے اب کسی صحافی سے رابطہ کیا اس سلسلے میں تو وہ مجھے گھر ہی سے نہیں نکلنے دیں گے۔"

"خیر ایسا تو وہ تمہاری حفاظت کے خیال سے کہتا ہے' ناصر کے قتل میں ڈرگ مافیا کا ہاتھ ہے اور وہ لوگ کتنے خطرناک ہوتے ہیں' اس کا تمہیں اچھی طرح اندازہ ہے۔"

"مگر پھر بھی سرمد..." مریم کو یہ خبر ہضم کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

"تمہاری محبت میں وہ یہ بھی کر گزرا مریم! خوش قسمت ہو تم۔" فرح نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔ مریم بے اختیار مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

"ایک تھی شہزادی۔" کمرے کے سکوت میں ایک آواز ابھری۔ "شہزادی میلے میں گئی' میلے میں جتنے لوگ تھے وہ سب کے سب شہزادی کو پسند کرتے تھے'

شہزادی بہت پیاری گڑیا جو تھی' سنہرے بالوں اور گوری رنگت والی شہزادی تھی نا وہ' سارا دن شہزادی میلے میں کھیلتی رہی' گھومتی رہی' لوگ اس کے لیے تالیاں بجاتے رہے۔ اس کی تعریف کرتے رہے' پھر یہ ہوا کہ میلے پر رات آئی' بتیاں جل اٹھیں' یہ روشنیاں ہی روشنیاں ہر طرف تھیں' شہزادی خوش تھی کہ روشنی میں وہ اور بھی اچھی اور بھی پیاری لگنے لگی۔ پھر پتا ہے کیا ہوا؟؟" کچھ دیر کے لیے خاموشی چھائی رہی اور گرو پر سکوت رہا۔

"پھر..." ایک سوچتی ہوئی آواز ابھری۔ "پھر یہ ہوا کہ ایک طرف سے گرد آلود آندھی اٹھی' اچانک اتنی تیز' اتنی طوفانی کہ پل بھر میں میلے کو اجاڑ کر رکھ دیا اس آندھی نے' روشنیاں اڑ گئیں' دکانیں اجڑ گئیں اور ہر کوئی بھاگ نکلا۔ شہزادی بے چاری کے ساتھ کیا ہوا بتاؤں؟" سوالیہ آواز آئی اور پھر سکوت چھا گیا۔

"شہزادی کی آنکھوں میں ریت چبھنے لگی' اس کے پیروں سے جوتے نکل گئے' اس کے سنورے بال بکھر گئے' اس کا خوب صورت لباس گرد آلود ہو گیا' وہ چیختی چلاتی اِدھر اُدھر بھاگنے لگی' اسے راستہ نہیں ملا۔ وہ اکیلی تھی اور بھرا میلہ اجڑ گیا تھا۔ وہ بھٹکتی رہی' چیختی رہی' پکارتی پھری' مگر کہیں سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کے ساتھی دوست سب غائب ہو گئے اور راستہ گم ہو گیا۔ شہزادی بے چاری ابھی تک بھٹکتی پھر رہی ہے' ایک بھرے میلے میں جانے کی سزا' بھٹکتی پھر رہی ہے۔"

سسکیوں کی آواز کمرے کے سکوت میں ابھرتی رہی۔ مریم اور رشنا سامنے صوفے پر بیٹھی غزالہ کو دیکھ رہی تھیں جو گود میں ایک اسٹفڈ کھلونا بٹھائے اسے کہانی سنا رہی تھی۔ ان دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ غزالہ چند دن پہلے کے سیشن میں' جس طرح یادداشت کے ٹریک پر سوار ہوئی تھی' اس وقت اس سے بالکل مختلف راستے پر چڑھ گئی تھی۔ اسے بہت کچھ یاد تھا۔ مگر وہ تمام یادوں کو گڈمڈ کر جاتی تھی۔ اسی طرح کی کہانی اس نے اس کھلونے کو سنائی تھی۔

"اس کو اسی طرح بولنے دیا جانا چاہیے' کتھارسس بہت ضروری ہے' اس کے لیے۔" رشنا نے دوسرے کمرے سے نکلتی غزالہ کی بہن فوزیہ سے کہا جو غزالہ کا بازو سختی سے جھنجوڑ کر اسے خاموش کرا رہی تھی۔

"یہ کیوں اتنا شور کرتی ہے؟" فوزیہ نے کہا۔ "کس میں اتنا حوصلہ ہے کہ اس طرح کی بے تکی گفتگو سنتا رہے۔"

"جب تم پہلی بار اسے "پناہ" میں لائی تھیں' اس وقت یاد کرو اس کی ذہنی حالت کیا تھی۔" رشنا نے کہا۔ "یاد کرو' تم کیا کہا کرتی تھیں کہ تمہارا گھرانہ غزالہ کی کمائی پر چلتا تھا اور تم لوگ اس کے یوں بیمار ہو جانے پر مفلوک الحال تر ہوتے چلے جا رہے ہو' مقروض ہو۔ اور قرض خواہ جان کھاتے ہیں' اس وقت تم رو رو کر ہاتھ جوڑ کر اس کی ذہنی اور جسمانی صحت کی بھیک مانگا کرتی تھیں۔ یاد ہے۔" جواب میں فوزیہ خاموش رہی۔

"پھر تم بھی اس کو چھوڑ کر غائب ہو گئیں اور یہ بے آسرا صرف "پناہ" کے عملے کے رحم و کرم پر دن رات گزارتی رہی۔ کتنا ساتھ دیا اور کتنا ساتھ تم نے اسے' کتنی خدمت کی تم نے اس کی؟ ان ساری آسائشوں کے عوض ہی سہی جو اس کی وجہ سے تمہیں میسر تھیں۔"

رشنا کے لہجے میں تلخی اور غصہ تھا۔

"اور اب جو تم کہیں سے یہ بھنک پالی کہ غزالہ پہلے سے بہت بہتر ہے اور یہ کہ سعد اور اس کے ساتھیوں کی کوششوں سے صوبائی حکومت کے کانوں تک اس نایاب اثاثے کی دکھ بھری داستان کی جوں رینگ گئی ہے اور قریب ہے کہ حکومت اس کو اپنی سرپرستی میں لیتی ہے اور اس کی مالی طور پر مدد بھی کرتی ہے تو تم کہیں سے اچانک نمودار ہو گئی ہو۔" رشنا کا لہجہ مزید کڑوا ہوتا جا رہا تھا۔

"اور اگر کچھ ملنے کی آس میں آئی ہو تو ذرا ٹھنڈی کر کے کھانے کی کوشش کرنا چاہیے تمہیں۔" مریم نے کہا۔ "تم دیکھ رہی ہو کہ بچوں جیسا نازک ذہن ہو چکا ہے غزالہ کا' ذرا سی سختی' تھوڑی سی درشتی اس کے ذہن کو واپس اسی جگہ لے جا سکتی ہے جہاں سے یہ چلی تھی' برائے کرم ہماری اتنی طویل محنت کو ضائع مت کرو۔"

"میں کسی لالچ میں نہیں آئی' میں اس کو صرف بتانا چاہتی ہوں کہ ناصر جس لڑکی کے چکر میں تھا اسی کے یار دوستوں کے ہاتھ مرا ہے۔" فوزیہ نے اپنے تئیں ان دونوں کے خیال کی تردید کی۔

"اس کو ناصر سے متعلق ہر بات بھول جانے دو' خدا کا واسطہ ہے۔" رشنا نے کہا۔

"کیسے بھول جانے دوں؟" فوزیہ نے برا مانا۔ "ناصر بیٹا تھا اس کا' میں جانتی ہوں صرف کہ کتنی مصیبتوں سے اس نے اسے اس کے ظالم باپ کے چنگل سے نکلوا کر لائی تھی' کیسی محنتوں سے اسے پالا تھا اس نے' کیا کیا ارمان تھے اس کے دل میں ناصر کے لیے' اس کی یادیں ہی تو اس کی زندگی ہے' اس کی موت نے ہی تو اس کا یہ حال کیا ہے' پہلے اس پر کیا کم ظلم ہوئے تھے جو ظالموں نے جوان بیٹا بھی مار ڈالا' یہ سال سے ٹھیک ہو کر چلی گئی تھی اپنے گھر' کسی کو بھلایا ہی نہیں اس کا چین' انہوں نے جوان بیٹا ہی مار دیا اس کا' جو کوئی امید تھی اس کے ٹھیک ہونے کی' وہ بھی نہیں رہی۔"

"یہ باتیں اتنی بار دہرائی جا چکی ہیں کہ اب ان کو مزید دہرانے کا کچھ فائدہ نہیں' بھول جانے دو اس کو یہ تکلیف دہ باتیں۔" رشنا نے اب کے سختی سے کہا۔ "حادثے بہت سوں کے ساتھ ہوتے ہیں' المیے بہت سوں کی زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں' مگر یہ سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے' اگر اللہ کی طرف سے آئے حادثوں پر صبر کر کے زندگی کو اس کے پورے حق کے ساتھ گزارنے کا موقع ملے تو ضرور گزارنا چاہیے۔ غزالہ کو بھی زندگی کا حق لینے کی اجازت دے دو' تم لوگ اب بہت ماتم ہو چکا گزرے واقعات کا۔"

"تم ماں نہیں ہو نا' ماں کے جذبات کا تمہیں کچھ علم نہیں ہے نا' اس لیے ایسی باتیں کر سکتی ہو' میں دیکھتی ہوں کیسے تم لوگ اس کو سمجھا لو گے کہ ناصر کو بھول جائے' اس کا غم بھول جائے' یہ ممکن ہی نہیں ہے۔" فوزیہ نے انہیں چیلنج کیا۔

"ناصر اللہ کی امانت تھی' اس نے واپس لے لی۔" فوزیہ کے عقب سے غزالہ کی آواز آئی۔ رشنا اور مریم کو جیسے کرنٹ لگا۔ یہ الفاظ مشہور مذہبی اسکالر ڈاکٹر تیمور عباسی نے "پناہ" کے دورے کے موقع پر غزالہ سے کہی تھی اور اس وقت ایسا لگتا تھا جیسے غزالہ نے ان کی یہ بات سنی ہی نہ تھی۔

"اللہ کو اختیار ہے دی ہوئی چیز واپس لے لے اور واپس لی ہوئی چیز پھر دے دے۔" غزالہ ڈاکٹر تیمور کے الفاظ بلا کم و کاست دہرا رہی تھی۔ "ہمارے مذہب کی تاریخ بھری پڑی ہے ایسی ماؤں کے قصوں سے' جن کے جوان بیٹے واپس لے لیے گئے اور وہ اللہ کی رضا میں راضی صبر شکر کرتی رہیں۔ ان کا مقام اللہ کے نزدیک بہت بلند ہے۔"

نہ جانے ذہن کے کس گوشے نے یہ بات محفوظ کر رکھی تھی' جو وہ اس وقت دہرا رہی تھی' رشنا اور مریم کی جیسے عید ہو گئی تھی۔

"ویل ڈن یو آر غزالہ آپا!" مریم نے سرخوشی کے عالم میں غزالہ کو گلے لگا لیا۔

"مجھے بھوک لگی ہے' مجھے کچھ کھانا ہے' کچھ کھانے کو ملے گا کیا؟" وہ ایک دم پچھلی بات بھول کر ایک نئی بات کرنے لگی تھی' لیکن مریم اور رشنا کے لیے یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ ان کی طویل محنت کچھ کچھ رنگ لانے لگی تھی اور یہ شادیٔ مرگ کی سی صورت حال تھی۔

☼ ☼ ☼

"غزالہ کی آواز گورنر اور وزیر اعلا تک پہنچ چکی ہے' اس کا علاج اور اس کی کفالت سب حکومت اپنے ذمہ لینے والی ہے' اسی بہانے "پناہ" کے فنڈز بھی زیادہ ہو جائیں گے اور تم لوگوں کو آسانی بھی ہو جائے گی آنے والے سالوں میں۔" سعد نے اسے بتایا تھا۔

"یہ سب کیسے ہوا؟" مریم نے تشکر بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم جانتی ہو، پھر بھی پوچھ رہی ہو؟" سرمد کی نظروں میں اس کے لیے محبت تھی۔

"ہاں، پھر بھی پوچھ رہی ہوں۔" اس نے اصرار کیا۔

"میڈیا میں سب لوگ ہی برے اور خود غرض نہیں ہوتے مریم!" اس نے کہا "ٹھیک ہے کہ غزالہ کی شخصیت کے اس بگاڑ میں بہت سا ہاتھ پرنٹ میڈیا کا ہے، مگر اب وقت اس زمانے سے کافی آگے نکل چکا ہے، اب میڈیا پہلے سے زیادہ طاقت ور لیکن مثبت ہو گیا ہے، بس وہاں تک بات پہنچانے کا طریقہ آنا چاہیے۔ ہم نے یہ سارا کام اسی میڈیا کے ذریعے کیا جو غزالہ اور اس جیسے کئی اور فنکاروں کو اس صورت حال تک لے آیا تھا۔ جمہوری حکومتوں کی مجبوری بن جاتی ہے کہ وہ ایسی خبروں کا نوٹس لیں اور اس پر ایکشن بھی لیں، اسی لیے بات جلد وہاں تک پہنچ گئی ورنہ تو سالہا سال تمہاری طرح بینر اٹھا کر سڑکوں پر احتجاجی جلوس نکالتے رہتے، مگر کوئی بھی نہ سنتا، زمانہ بدل گیا ہے، اب ایسی بات بہت جلد ایشو بن جاتی ہے، حکومت کو ایکسپلائٹ کرنا آسان ہو چکا ہے اور یہ ساری آسانیاں میڈیا کی وجہ سے ہی ممکن ہوئی ہیں۔"

"مجھے یقین ہے کہ اس سب کے پیچھے ہماری نیک نیتیں ہیں، "پناہ" نے جو بھی غزالہ کے لیے کیا بڑی نیک نیتی کے ساتھ کیا، یہ اسی کا ثمر ہے۔" مریم نے کہا۔

"پناہ کا جو کردار ہے سو ہے، اس میں تمہارا رول سب سے اہم ہے مریم!" سرمد نے نرمی سے کہا۔ "تم نے ہی پناہ جوائن کرنے کے بعد غزالہ کو اسپاٹ کیا اور پناہ والوں کی توجہ اس کی طرف کرائی۔ اس کے ماضی کے متعلق، اس کے ساتھ پیش آئے حادثوں کے متعلق ہمیں کی سائیکی کے حوالے سے جو کچھ تم نے کھوجا، جتنی محنت تم نے کی اور جیسی کیس ہسٹری تم نے تیار کی، اس کے بغیر ڈاکٹر فاروق اور ڈاکٹر فرح بھی کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ میں جانتا ہوں کہ تم اپنے گھر سے غزالہ کے لیے مختلف چیزیں لاتی رہی ہو، کیسے اتنا لمبا عرصہ تم نے ذاتی طور پر اس کا خیال رکھا ہے۔ اپنی امی کو کئی بار ناراض کر کے معافی مانگی، محض غزالہ کی خاطر۔" وہ کہہ رہا تھا اور مریم خاموشی سے اپنے سامنے کی دیوار پر ہوا کے ساتھ ہلکورے کھاتی بیل کے پتوں کو دیکھتی رہی۔

"مگر یہ محض غزالہ کی خاطر نہیں۔" سرمد نے پھر سے کہنا شروع کیا۔ "میں جانتا ہوں کہ تم نے ایک زندگی کی خاطر یہ سب کچھ کیا، غزالہ جو تھی اور جو بن گئی تھی، تمہیں اس سفر نے تاراج کیا۔"

"ہاں مجھے اس سفر نے تاراج کیا۔" مریم نے کہا۔ "مجھے غزالہ کے ماضی کی تصویریں بہت اچھی لگتی تھیں، ذہانت بھری خوابیدہ آنکھیں، ستواں ناک، خوب صورت ہونٹ ایک گریس فل شخصیت، جو غزالہ میں نے پناہ میں دیکھی وہ بہت تکلیف دہ تھی اور میرا دل اس بات پر اٹک گیا کہ حالات کی ستم ظریفی کی شکار اس عورت کو واپس اس حالت میں لانا ہے، جو اللہ نے اس کو عطا کی تھی۔ کئی بار میرے دل نے سوچا کہ میں بھی نظریں چرا کر نکل جاؤں، غزالہ میری ذمہ داری تو نہیں تھی، نا ہی اس کے حالات کی میں ذمہ دار تھی، تمہارے ردِ عمل کئی بار مجھے اس کام کو چھوڑ دینے پر اکساتے بھی رہے، مگر نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ جو میں سوچتی ہوں وہ ممکن ہو جائے گا۔ منزل تو اگرچہ ابھی بھی دور ہے، مگر پڑاؤ آسان ہوتے جا رہے ہیں۔"

"مگر تم کیسے اس کام میں مدد دینے کو تیار ہو گئے، یہ تو بتاؤ؟" مریم نے سرمد کی طرف دیکھا۔

"تمہیں پتا ہی ہے، جانتی ہو مریم!" وہ بھی مسکرا دیا۔

"میں جانتی ہوں، پھر بھی بتاؤ۔" اس نے ضد کی۔

"ایک روز جب میں تمہارے خود کو اگنور کرنے پر بری طرح تپا ہوا تھا، میں نے خود اپنا تجزیہ کیا اور بہت ایمان داری سے کیا، میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر میرا اندر یہ کہہ دے کہ اگر مریم کو تمہاری پروا ہی نہیں تو تم اپنا راستہ بدل ڈالو تو اس آواز کو جھٹلانا نہیں اور وقت کو مزید آگے ٹالے بغیر راستہ بدل لینا ہے۔"

"اوہ!" مریم نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں یقین مانو ایسا ہی ہوا تھا۔" سرمد نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے میں اس بات پر غور کرنا چاہتا تھا کہ کیا واقعی تم کو میری کوئی پروا نہیں۔"

"پھر تم نے غور کیا؟" وہ بے صبری سے بولی۔

"ہاں میں نے ڈھیر سارا غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنا راستہ بدل ڈالنے والی آواز پر لبیک کہہ کر درحقیقت میں تمہیں عذاب میں ڈال دوں گا کیونکہ تم غزالہ والے کام میں اسی یقین کے ساتھ لگی ہوئی ہو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، میں تمہیں جانتا ہوں اور صرف میں ہی تمہیں جانتا ہوں اور صرف میں ہی تمہیں سپورٹ کروں گا۔" اس نے تائید طلب نظروں سے مریم کی طرف دیکھا، مریم نے اثبات میں سرہلایا۔

"اور راستے بدل لینا شاید اتنا مشکل نہ ہو جتنا اپنی محبت کے لیے عذاب کھڑے کرنا ہے۔ میں تمہیں دکھ اور تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا، میں جانتا ہوں کہ تم میرے بغیر خوش نہیں رہ سکتیں۔ اس لیے میں نے اپنے اندر سے کچھ نہیں پوچھا اور اسی وقت مجھ پر انکشاف ہوا کہ جو تم کر رہی ہو وہ تو ایک بہت بڑا کام ہے، ایک زندگی کو زندگی کی طرف واپس لانے کا مشکل کام، یہ تو صرف وہ ہی کر سکتا ہے، جس کے پاس دل صرف ایک گوشت کے لوتھڑے کی شکل میں نہ ہو، جس کا دل محض زندگی کے تار و پود جوڑے رکھنے کے لیے نہ دھڑکتا ہو، بلکہ جو واقعی دل ہے، جس کے اندر وسعت، نرمی اور روشنی ہے، جو دوسروں کے لیے خود کو مشکل میں ڈال لینے کی ہمت رکھتا ہے، بس اسی دل کی روشنی نے مجھے بھی منور کر دیا اور میں اس کی روشنی میں ایک نئے راستے پر چلنے لگا، ایسا راستہ جو ابدی نور کی طرف لے جاتا ہے، جس پر چل کر انسان خدا کو بھی پا سکتا ہے۔" وہ نرمی سے کہہ رہا تھا۔

"اف ڈائیلاگ..." مریم نے اس کی بات کے سحر سے نکلنے کے لیے مذاق سے کہا۔

"ہاہا... ٹھیک سمجھیں۔" وہ ہنسا۔ "میں نے سوچا تم ایک اداکارہ کے ساتھ رہ رہ کر ڈائیلاگز کی زبان ہی سمجھتی ہو گی اب، تو پھر ڈائیلاگ ہی بولے جائیں۔"

"میں ممنون ہوں۔" مریم نے آنکھوں میں اترتی نمی کو خشک کرتے ہوئے کہا۔ "حقیقت یہ ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی شامل نہ ہو جاتے تو پناہ والے شاید تھک چکے تھے، اب اگر حکومت اس چیز کا نوٹس لے رہی ہے تو آگے غزالہ کو شاید کچھ مسئلہ نہ ہو۔"

"پھر میرا انعام!" سرمد نے ہاتھ آگے کیا۔

"کیا مانگتے ہو؟" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"تمہیں مانگتا ہوں۔" وہ فوراً بولا "بی بی! میرے حال پر رحم کرو، کئی برس ہو گئے تمہارے پیچھے خوار ہوتے، اب پلیز میری خواری کو سکون میں بدل ڈالو۔ مجھ سے شادی کر لو۔" وہ ملتجیانہ سی شکل بنا کر کہہ رہا تھا اور مریم ہنس رہی تھی۔

"پھر بھیجوں گا اور ابا کو اس مقصد کے لیے...؟" وہ فوراً فری ہوا۔ "انکل اور آنٹی تو پہلے ہی رضامند ہیں، کامران اپنا دوست آدمی ہے، کسی کو کچھ اعتراض نہیں اور یہ کام بہت پہلے ہو جاتا، اگر غزالہ نامہ بیچ میں نہ ہوتا۔"

"ہاں بھیج دو، اب مجھے غزالہ کی طرف سے قدرے اطمینان ہوا ہے۔ مگر ایک شرط پر کہ تم مجھے میرے کام سے نہیں روکو گے، خود کو نظرانداز کیے جانے کا بہانہ بنا کر۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"میری توبہ۔" اس نے فوراً کان پکڑے۔ "بلکہ میں تمہارے کام میں تم سے چار قدم آگے ہوں گا۔ مجھے تمہاری خوشنودی جو منظور ہے اور شاہ کی نسبت شاہ کے وفادار چار قدم آگے پائے جاتے ہیں ہر کام میں..." وہ بلند آواز میں ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں پناہ اور پناہ کی ٹیم کی تاعمر احسان مند رہوں گی جنہوں نے مجھے نئی زندگی عطا کی۔ جو اگرچہ اللہ کی طرف سے ہے، مگر اللہ نے پناہ والوں کو میرے لیے

چھین لیا۔" فن کی دنیا کے صفحے پر غزالہ سلطان کے ایک مختصر انٹرویو کے کیپشن نمبر ایک میں لکھا تھا۔

"پناہ میرا گھر ہے اور اگرچہ انہوں نے تصدیق کردی کہ میں ذہنی طور پر صحت مند ہو چکی ہوں لیکن مجھے یہیں رہنا ہے' ان ہی لوگوں کے ساتھ کام کرنا ہے' ان لوگوں کی خدمت کرنی ہے جو اس حالت میں ہیں' جس میں کل میں تھی۔" کیپشن نمبر دو میں لکھا تھا۔

"اگرچہ غزالہ سلطان کو صحت مندی کا سرٹیفکیٹ دیا جاچکا ہے اور یہ سرٹیفکیٹ وزیر اعلا پنجاب کے معاون خصوصی برائے فن و ثقافت نے ایک خصوصی تقریب میں دس لاکھ روپے اور اس گھر کی چابیوں کے ساتھ غزالہ کو پیش کیا جو صوبائی حکومت کی طرف سے فن کے لیے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں دیا گیا' لیکن ان کی ذہنی صحت ابھی بھی قابل رشک قرار نہیں دی جاسکتی۔ وہ کسی بھی موضوع پر روانی سے بات نہیں کرسکتیں اور اکثر جملے مکمل کرنے سے پہلے بھول جاتی ہیں' لیکن یاد رہے کہ غزالہ سلطان ذہنی انتشار کی ایک نہایت خطرناک اسٹیج سے واپس ذہنی صحت کی طرف ایک لمبا سفر طے کرکے پہنچی ہیں' کئی سال قبل وہ شیزو فرینا جیسے مرض میں مبتلا پناہ میں پہنچائی گئی تھیں۔ وہ کسی کو بھی پہچاننے سے قاصر تھیں اور نفسیاتی دوروں کا مسلسل شکار تھیں۔ پناہ کے عملے کی ان تھک کوششوں اور حکومت پنجاب کی خصوصی سرپرستی کی وجہ سے آج غزالہ اس قابل ہیں کہ اپنی زندگی میں ہونے والے حادثوں خصوصاً" اپنے جوان سال بیٹے کی حادثاتی موت کے دکھ کو اللہ کی طرف سے آئی آزمائش قرار دیتے ہوئے انہیں ذہنی طور پر قبول کرچکی ہیں۔ وہ اپنی فنی زندگی کے بارے میں بات کرتی ہیں اور اکثر واقعات کا حوالہ بھی دیتی ہیں' ان کا کہنا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد وہ ٹی وی کے لیے ڈرامہ لکھیں یا کسی بھی شکل میں اپنے تجربے کوئی وی کے لیے استعمال کریں۔ وہ آنے والے دنوں سے اچھی امید کرتی ہیں اور انہوں نے وزیر اعلا کے معاون خصوصی سے اپنے لیے ایک مدد نگی ویژن کے تحفے کی بھی فرمائش کی ہے۔ گمنامی کے اندھیروں میں چلی جانے والی ماضی کی اس عظیم فنکارہ کی ذہنی صحت کی بحالی ایک خوش آئندہ واقعہ ہے اور حکومت وقت کی فن و ثقافت کے سلسلے میں ذاتی دلچسپی کی آئینہ دار بھی۔"

"مریم بلند آواز میں پڑھ رہی تھی۔
"زبردست۔" سرمد نے تالی بجا کر کہا۔
"دکھ سہیں بی فاختہ اور کوے انڈے کھائیں۔ حکومت وقت۔" اس نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "جو اس عرصہ میں کئی بار بدلی کجو ذاتی دلچسپی۔" وہ کہہ رہا تھا "کیا بات ہے بھئی۔"

"چلو کیا فرق پڑتا ہے۔" مریم نے کہا۔ "تمام جس کسی کا بھی ہو کام تو سیدھا ہوا۔ یہ دیکھو غزالہ کی تصویر' آج پہلی مرتبہ یہ مجھے چہرے سے بھی صحت مند نظر آرہی ہے۔" وہ بچی کی پیدائش کی وجہ سے پچھلے کئی ماہ سے پناہ نہ جاسکی تھی اور اس تقریب میں بھی نہ جاسکی تھی۔

"ہمارے وقت میں سہولتیں کم' مگر ڈرامہ ہائی کلاس ہوتا تھا اب سہولتیں زیادہ اور ڈرامہ اپنی کلاس کھو بیٹھا ہے۔"

"ہمارے وقت میں نہ اور چینل ہوتے تھے' نہ ایسے زبردست سیٹس' سب چیزوں کو آواز اور اداکاری سے ہی کور کرنا ہوتا تھا اور کام کرتے تھے' اس میں محنت زیادہ تھی اور معاوضہ کم۔ اب وقت بدل گیا ہے' اب آسانیاں زیادہ ہیں اور محنت کم۔" سرمد نے اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر غزالہ کی باتیں پڑھنا شروع کیں۔

"بہت ممکن ہے کہ کبھی غزالہ سلطان ٹی وی یا ریڈیو کے لیے کوئی ڈراما لکھ لیں مگر ڈرامے میں کام کرنا شاید ناممکن ہو۔ غزالہ کی ذہنی رو ابھی بھی رواں نہیں ہے اور چہرہ اکثر بے تاثر رہتا ہے۔ ایسے میں ڈائیلاگ یاد کرنا اور اداکاری کے دوران چہرے سے تاثرات دینا جو ان کی اداکاری کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا'

اب ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔ اگرچہ وہ ڈرامے میں کام کرنے کی خواہش کا برملا اظہار کرتی ہیں۔"

انٹرویو کرنے والے نے اس انٹرویو کی ابتدائی سطروں میں لکھا تھا۔

"کاش!" مریم نے اخبار سرمد سے لے کر ایک بار پھر غزالہ کی تصویر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

اس انٹرویو کے بعد اکا دکا خبریں غزالہ کے حوالے سے اخبار میں شائع ہوتی ہی رہتی تھیں۔ کچھ ٹی وی کے کچھ چینلز بھی کبھی کبھار اس کے کام کی جھلک دکھا دیا کرتے تھے۔ یوں غزالہ گمنامی سے قدرے باہر نکل رہی تھی۔ پناہ کی انتظامیہ نے اسے اپنے عملہ میں جگہ دے رکھی تھی اور وہ پناہ کے لیے ان تھک کام کررہی تھی۔ اس نے اپنی ذاتی زندگیوں کی ناکامیوں اور فنی زندگی کے حادثوں کو بھی اللہ کی آزمائش قرار دیا تھا۔ اب وہ اللہ کی ذات پر پختہ یقین کرنے لگی تھی۔

"مجھے ایک ٹی وی چینل کی طرف سے نئی فلم میں کام کرنے کی پیش کش ہوئی ہے۔" تین سال بعد غزالہ نے مریم کو بتایا۔

"ویری گڈ!" مریم نے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ "یہ بہت ہی اچھی خبر ہے۔ آپ نے کیا جواب دیا؟"

"میں کشمکش میں ہوں۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "کام کا انداز بدل گیا ہے۔ آج کے ناظر کے لیے میرا چہرہ نیا ہے اور پھر کیا میں کرپاؤں گی؟"

"سب کہتے ہیں کہ میرے ساتھ یادداشت کا مسئلہ ہے' میں بھول جاتی ہوں' سب کہتے ہیں میری آنکھوں میں وہ بات نہیں رہی' سب کہتے ہیں کہ..."

"کون سب کہتے ہیں بھئی؟" مریم نے پوچھا۔ "آپ کو پتا ہے غزالہ آپا کہ یہ وہی سب ہیں جنہوں نے آج سے کئی سال پہلے آپ کو باور کرایا تھا کہ آپ ذہنی ابتری کا شکار ہو کر اپنا فن کھو چکی ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں صرف ان کے چہرے بدل گئے ہیں۔"

"لیکن۔" غزالہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"لیکن کیا؟" مریم نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبایا۔ "اگر اب آپ یقین رکھتی ہیں کہ جو آپ کے ساتھ ہوا وہ آزمائش تھی اور یہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جو آزمائش سے دوچار بھی کرتی ہے اور نکال بھی لیتی ہے تو پھر کیوں نہیں سمجھتیں کہ اسی اللہ نے آپ کو اعلا صلاحیتوں سے نوازا ہے' اب آپ کا کام یہ ہے کہ ان صلاحیتوں پر سے زنگ اتاریں اور ان سے کام لیں۔ آپ کی ذہنی صحت مکمل طور پر بحال ہو جائے گی۔ جب آپ واپس اپنے کام سے جڑ جائیں گی۔"

"مگر وہاں کیا میں بے جگہ نہ لگوں گی' میں نئے طور طریقوں سے واقف نہیں۔"

"ہنر مند کبھی اپنے ہنر کی دنیا میں بے جگہ نہیں ہوتا آپا! چہرے' کام کا انداز' جگہیں بے شک بدل جائیں' ہنر کی بنیاد وہی رہتی ہے' سومت تولیں گھڑیں اور اپنے لیے پیدا ہونے والے موقعوں سے فائدہ اٹھائیں۔" مریم نے اس کو بیک اپ کیا۔

اس نجی چینل کی طرف سے آئی پیش کش کا مثبت جواب ہلچل سی مچا گیا' غزالہ کے فن کے کمال سے سب واقف تھے اور بہت سوں کو افسوس ہونے لگا کہ یہ خیال انہیں کیوں نہیں آیا۔ مریم' غزالہ کے ساتھ

منشن پر جانے لگی غزالہ کو یقینا" ایک معاون کی ضرورت تھی۔ اسے ڈائیلاگز یاد کروانے میں مریم اور رشنا کا بڑا ہاتھ تھا۔ مگر وہ دونوں یہ کرنا چاہتی تھیں، کیونکہ یہ ہی وہ منزل تھی، جس کے لیے اتنا لمبا سفر طے کیا گیا تھا۔

"وقت جتنے لمبے ڈگ بھرلے، آدمی سے آگے نہیں نکل سکتا، کیونکہ آدمی کو اللہ نے شعور اور عقل عطا کر رکھی ہے، جو ہر دور میں صدیوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ سو وقت آدمی کو نہیں ہمیشہ آدمی وقت کو پچھاڑتا ہے۔"

"کٹ!" غزالہ کی ٹیلی فلم کے فائنل ڈائیلاگ ایک ہی ٹیک میں او کے ہوگئے اور مریم مبہوت اس کے کام کی پرفیکشن میں کھو کر رہ گئی تھی۔

اس آخری سین سے پہلے وہ کتنا اٹکی اور کتنا بھولی، کتنے ری ٹیکس کے بعد سین او کے ہوتا تھا، مگر اس آخری سین تک آتے آتے خود کو بے جگہ محسوس کرتی غزالہ سلطان ایک بار پھر سے اپنی دنیا میں جگہ پاچکی تھی۔

یہ ٹیلی فلم اس کے فنی کیریئر کے نئے دور کا نقطہ آغاز ثابت ہونے والی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ایک تھی شہزادی۔" میرب کو کہانی سنانے کا آغاز کرتے ہوئے مریم نے ایک نظر سرمد پر ڈالی جو اپنے کسی دفتری کام میں مصروف تھا۔

"شہزادی ایک میلے میں گئی، میلے میں موجود لوگ سب کے سب شہزادی کو پسند کرتے تھے۔ شہزادی بہت پیاری تھی۔ سارا دن شہزادی میلے میں گھومتی رہی اور کھیلتی رہی، لوگ اس کے لیے تالیاں بجاتے رہے، اس کی تعریف کرتے رہے۔ پھر یوں ہوا کہ میلے میں رات آگئی۔ بتیاں جل اٹھیں، روشنیاں ہی روشنیاں، روشنیوں میں شہزادی اور بھی پیاری لگنے لگی۔"

"پھر؟" میرب محویت سے کہانی سن رہی تھی۔

"پھر ایک طرف سے گرد آلود آندھی اٹھی۔"

"اس آندھی میں جن بھی تھا؟" میرب نے پوچھا۔

"ہاں جن بھی تھا، وقت کا جن، جس کے کالے اور لمبے دانت تھے۔"

"وہ شہزادی کو کھا گیا؟" میرب نے دوسرا سوال کیا۔

"نہیں۔ اس نے شہزادی کو راستہ بھلا دیا۔ میلے کے باقی لوگ کہیں گم گئے اور شہزادی راستہ بھول گئی، اس کی آنکھوں میں ریت چبھنے لگی، اس کے پیروں سے جوتے نکل گئے اور وہ گرتی پڑتی، روتی چیختی ادھر ادھر بھٹکتی رہی۔"

"پھر وہ مرگئی یا کوئی شہزادہ آیا؟"

"وہ مری نہیں، بس بھٹکتی رہی، اور پھر یوں ہوا کہ مہربان وقت کے شہزادے نے نامہربان وقت کے جن کو اپنی تلوار سے مار دیا۔"

"اگلے دن؟" میرب نے ایک اور سوال کیا۔

"ہاں۔ اس رات کے بعد دن ہوا اور روشنی پھیل گئی، نامہربان وقت کا جن مرگیا اور مہربان وقت کے شہزادے نے شہزادی کی انگلی تھام کر اسے اس کے محل تک پہنچا دیا۔"

"ان کی شادی نہیں ہوئی؟"

"وہ ایک مضبوط اور نہ ختم ہونے والے رشتے میں بندھ گئے۔ ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست بن گئے، پیاری شہزادی اور مہربان وقت کا شہزادہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔" مریم نے سرمد کی طرف دیکھا جو اپنا کام چھوڑ کر اب انہی کی کہانی سن رہا تھا۔

"اس کہانی کا نام کیا ہے اماں؟" میرب نے بند ہوتی آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"اس کہانی کا نام ہے 'معجزہ'۔" مریم نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا اور سرمد کی طرف دیکھ کر مسکرادی۔

ٹی وی اسکرین پر غزالہ سلطان کی ٹیلی فلم کا پہلا سین چل رہا تھا۔

☼

کنیز نبوی

کوئی کھا گیا عشق

مسلسل بے خوابی سے بے زار ہو کر اس نے آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا۔ آئینے نے اس کے عکس کو یک دم مسترد کر دیا۔ اسے اپنی گردن پر اس کا چہرہ نظر آیا۔ جس کی یاد میں بائیں آنکھ کے عین نیچے بے خوابی کا پھوڑا اُگ آیا تھا۔ وہ یک ٹک آئینے میں ابھرے اس کے عکس کو دیکھتی رہی۔ آہستہ آہستہ اس کا عکس ہٹا کر اصل چہرہ نمودار ہوا۔ آنکھیں سرخ ہو کر اس کے ہجر کی نشاندہی کرتی رہیں۔

"وعدہ۔ زندگی میں کسی دکھ کو تمہاری قربت نصیب نہیں ہوگی۔"

"قسم۔" اُس کے ہاتھ کی الٹی انگلیوں کا لمس تھوڑی سے کان کے لو تک سرکتا آیا۔ "ساری خوشیاں تم پر نچھاور کردوں گا اور سارے دکھ میں اپنی محبت سے چن لوں گا۔" مضبوط ہاتھ شانوں پر آگئے۔

اس نے سارے وعدے دل کے پلو میں باندھ لیے اس کے لیے بچے کی طرح مقدس تھے۔ اس کے الفاظ جن پر کبھی بھی شک کر کے وہ گناہ کی مرتکب نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی یقین نے سالوں تک اس کا ایمان محکم رکھا۔ بچے کی کمی تو رہی مگر یہ کمی اپنے شریکِ سفر پر اعتماد کو متزلزل نہ کر سکی۔

گزرتے دنوں کے ساتھ جہاں سسرال کی بے چینی بڑھی تھی وہاں شریکِ سفر پر اعتماد بھی۔

"اماں! اللہ جب راضی ہو گا تو اولاد بھی ہو جائے گی۔" وہ ہنس کر ماں کو دلاسا دیتا تو سنبل کے اندر کی توانائی بڑھ جاتی، سعد اس کی چھاؤں تھا اسے ہر کڑی دھوپ سے بچانے والا، اسے چپکے چپکے آنسو بہاتے دیکھ کر وہ پریشان ہو اٹھتا۔

"مت رویا کرو، ہم نے ان آنکھوں سے محبت کے خواب دیکھے اور تعبیریں پائیں، ان آنکھوں کا گریہ دیکھنے کی ہمت نہیں مجھ میں۔"

وہ اس کے رخساروں سے آنسو چنتے ہوئے جذب محبت سے دیکھتا۔

"سعد! ادھورے پن کا طعنہ میری پشت پر سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ میں کہیں بھی جاؤں، وہ میرا کسی آسیب کی طرح پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

"مت کہو ایسا، ہماری تکمیل ہماری محبت ہے سنبل! وہ محبت جو بچپن سے ہمارے ساتھ ایک ہی صحن میں پلی بڑھی۔ جس نے ایک دوسرے سے باندھ کر رکھا ہم نے اک دوسرے کو ہی نہیں اس محبت کو بھی جیتا ہے، ہم بھلا اتنی چھوٹی سی کمی سے کیسے ہار جائیں؟"

وہ کھوکھلی عورت ہمیشہ اس کی محبت کے آگے ہار جاتی تھی۔

ڈاکٹرز اور ہسپتالوں کے چکر لگتے لگتے آٹھ سال بیت گئے، اور اس کی ساس کا صبر جواب دے گیا جب انہوں نے لڑکی پسند کر لی اور رشتہ بھی مانگ لیا۔ سعد کے انکار میں جو شدت پہلے تھی وہ

گزرتے وقت کی دھول میں اٹ گئی، اور شدت ختم ہو جائے تو بہت سارے جذبے بے معنی رہ جاتے ہیں۔

پھر اس کی ماں نے باقاعدہ منگنی کی تقریب بھی منعقد کر لی۔

اس رات وہ اپنے کمرے میں مقید ہو گئی تھی۔ اک بوجھ سا تھا جس نے جسم و جاں کو ہلکان کر دیا تھا۔

"کیا تمہیں مجھ پر یقین نہیں؟" اس نے انہیں انگلیوں سے اس کے آنسو پونچھے جن سے نئی نویلی کو انگوٹھی پہنا کر آیا تھا۔ "تمہاری اہمیت، حیثیت، عزت میں کمی نہیں آئے گی سنبل! میں نے تم سے محبت نہیں عشق کیا ہے۔ اور یاد رکھنا عشق کبھی نہیں مرتا۔"

اس نے اس کی چنری کے پلو میں دلاسوں کے ساتھ ساتھ وعدے بھی باندھ دیے۔

مگر گزرتے وقت نے ثابت کیا کہ اس چنری کے سارے رنگ کچے تھے۔ زندگی کی ساری خوشیاں، رنگینیاں سعد کا پہلو آباد کرنے والی نئی نویلی دلہن چرا کر لے گئی۔

آٹھ دن گزر گئے، وہ شرعی حقوق کی پاس داری کے قرض سمیت سارے وعدے بھی بھلا [illegible] سالہ ازدواجی زندگی اور تیرہ سالہ [illegible] محبت کہیں کھو گئی، کسی طوفان میں ڈوبی [illegible] کی طرح اڑ گئی یا اپنی موت آپ مر گئی اس کا [illegible] بھی سمجھنے سے قاصر و محروم تھا۔

جدائی کی [illegible] وہ اس کا فون اٹھانے سے گریزاں اور [illegible] کا جواب دینے سے بھی عاری تھا۔ [illegible] آنکھوں میں وہ لمحہ پھر سے آسودہ ہوا۔ [illegible] کرتا۔" وہ دولہا بنا پہلے اس کے پاس آیا تھا۔ اس کی سوتی آنکھوں میں کروٹ لیتے اندیشوں کو بھانپ گیا۔

"میری سب کچھ تم ہو، بیوی، محبوبہ، دوست، ہم سفر بھی، وہ تو صرف میرے بچے کی ماں بنے گی۔ صرف بچے کی ماں۔"

اس کا حوصلہ ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ محبوب کوئی کس دل سے کسی اور کے حوالے کرتا ہے۔ یہ کرب محبوب ہی جانتا ہے۔ اذیت سے ریزہ ریزہ ہوتے وجود نے اس کے مہربان شانے پر سر رکھ کر سارے اندیشے، واہمے، آنسوؤں کی صورت اس کے گریبان میں پرو دیے۔

وہ عورت تھی مگر وقت بدلتے حالات کے سامنے مجبور، سوائے صرف محبت کے بندھن سے باندھ سکی۔ اسے پرایا ہوتے دیکھنے کی نہ اس میں ہمت تھی، نہ دم، سو گھر میں موجود رہی۔

اور وہ شادی ہال سے نئی دلہن کے ساتھ نئے اپارٹمنٹ میں منتقل ہوا تو مہندی کی تازہ خوشبو، بدن کی نئی باس نئی عورت کے سحر میں گم ہو کر رہ گیا۔

اور اس کی آنکھوں میں نیند کی جگہ کانٹے اگ آئے۔ صورت کے اک نئے سفر نے دل کے پاؤں چھوڑ دیے وہ کرب کے رہ گزاروں میں اپنی محبت کی تلاش میں بھٹکتی رہی۔ اس بات سے بے خبر کہ اس محبت کے سارے دھاگے کچے وعدوں کے چرخے پر بنے ہوئے تھے۔ جو بٹتے ادھڑتے دیر نہیں لگاتے۔

وہ جو خود کو موکھی سمجھتی تھی اور موکھی کی طرح اپنی محبت میں مست تھی۔ اسے پتا ہی نہ چلا سعد سے اس کا نشہ کب اترا اور کب وہ دوسری کی طلب میں جلا ہوا، اس نے تو یہی سنا تھا، جتنی شراب پرانی اتنا زیادہ نشہ، مگر شاید اس کی محبت کی شراب سارا نشہ ہو چکی تھی۔

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

وہ مسلسل میسجز کے ذریعے رحم کی اپیلیں بھیجتی رہی۔

"آج میں آؤں گا۔"

لاتعداد میسجز پر رحم کی اپیل سماعت کے لیے منظور ہوئی اور وہ خوشیوں کے لیے ترستے کسی ایسے بچے کی مانند کھل اٹھی جس کو اس کا پسندیدہ کھلونا حاصل ہونے کا یقین مل جائے۔

ایک ماہ کے بعد اس کی باری آئی تھی، وہ بہت دنوں کے بعد تیار ہوئی، گلابی لباس میں اس کا وجود گلاب کی طرح مہک اٹھا، پھر دوپہر نے سہ پہر کا چولا بدلا اور شام رات میں ڈھل گئی۔ مگر وہ نہ آیا۔ رات گہری ہونے لگی تھی جب دلہن کو میکے چھوڑ کر وہ اس کے پاس آیا۔

اس نے پھر بھی شکر ادا کر کے کھانا چن دیا، مگر وہ تو کھانا کھا کر آیا تھا سسرال سے۔

"تم کھانا کھا لو، مجھے بالکل بھی طلب نہیں۔" وہ بے پروائی سے کہتے کمرے میں چلا گیا۔

وہ دن بھر کی بھوکی تھی مگر اس کی بھوک ختم ہو گئی، وہ اس کے پیروں کے نقش میں وفا کی لکیریں ڈھونڈتی بیڈ روم تک آئی تو وہ نئے نشے میں مدہوش پڑا خراٹے لے رہا تھا۔

وہ صرف خانہ پری کے لیے آیا تھا، اس کی طلب محبت کہیں اندر ہی سر پٹک کر آنسوؤں پر خاموش ہوئی۔

وہ بند آنکھوں کے دریچوں سے ماضی کے خوشگوار لمحوں کو آواز دیتی رہی، مگر حقیقت کے ناخوشگوار جھونکے اسے ماضی کی اور سے کھینچ کر لے آتے، ایک ہی بیڈ پر سوئے ہوئے اس شخص کے خراٹے صور اسرافیل کی طرح اسے بدصورت حقیقت میں زندہ کرتے رہے۔

وہ ساری رات روتی سسکتی، جاگتی رہی۔

صبح اس کی آنکھیں رت جگے سے لال، آواز دکھ کے بوجھ سے بھاری اور بدن بے انتہائی کی تھکن سے چور چور تھا، مگر وہ ناشتا بنانے میں مگن، ساس کی دعائیں سنتی رہی جو وہ اپنے بیٹے کو دے رہی تھیں باپ بننے کی۔ اس کی ساس ہر دوسرے دن تھوڑی دیر جا کر بیٹے کو دیکھ آتی، سو وہ ناشتا کر کے جلد اٹھ گئی۔ ناشتا تو سعد بھی کر چکا تھا، مگر اب اٹھنے کے لیے پر تولتے کسی

انتہائی جملے کی تلاش میں تھا، بے رخی اور عجلت اس کے رویے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

"تم نے ناشتا نہیں کیا؟"

"بھوک نہیں تھی۔"

"کیوں؟"

سرسری استفسار پر اس نے بہت گہری نگاہ سے اسے دیکھا۔

"بھوک تو تب سے اڑ گئی جب تم نے راستہ الگ کرلیا۔"

"میں نے کوئی راستہ الگ نہیں کیا، نہ تمہیں چھوڑا ہے، نہ طلاق دی۔" وہ بدمزگی سے بولتے حد درجہ بے زار ہوا۔ "شادی کی ہے کوئی گناہ نہیں کیا۔"

اسے لفظوں کی کاٹ سے زیادہ لہجے کی بے زاری نے دکھی کیا۔

"محبوب اگر محب سے بے زار ہو جائے تو بچتا ہی کیا ہے۔ سوائے ہجر و فراق کے۔" گلے میں پھنسے آنسوؤں کے گولے کو بمشکل نگلتے خود کلامی سے گویا ہوئی۔

"محبت کرنے والے اپنا آپ دے کر بدلے میں آپ سے بھی آپ کا وجود، وقت اور توجہ مانگتے ہیں، دراصل وہ اپنا کھویا وجود آپ کے وجود میں تلاش کرتے ہیں۔"

"میں باتوں میں تمہارا مقابلہ نہیں کرسکتا، تم ہمیشہ بہت خوب صورت بولتی ہو۔" وہ بے وجہ ادھر ادھر دیکھتے بولا اس کی باتوں میں نہ امید کی آہٹ تھی نہ دلاسے کا درماں۔

"جو محبت کو برتنا جانتے ہیں، وہ لفظوں کو برتنے کے ہنر سے بھی آگاہ ہو جاتے ہیں۔ لفظ اپنی پہچان آپ بن کر وجدان کی طرح دل سے نکلتے ہیں۔"

اس نے دھندلی نظریں سامنے اٹھائیں تو کرسی خالی تھی، جو اس کی باتوں پر مرتا اور اس کی محبت پر جیتا تھا، وہ اب شاید یکسانیت سے بے زار ہو چکا تھا۔

کیسا المیہ عورت کی ذات سے متصل کردیا گیا ہے کہ جہاں آنکھ کھولے پروان چڑھے وہی گھر رخصتی کے بعد پرایا بن جاتا ہے۔

وہ اب پرائے گھر میں نہیں جاسکتی تھی، سو بے اعتنائی، بے رخی، بے حسی، بے وفائی کے بعد بھی اس کی ماں کی خدمت گار بن کر اسی چوکھٹ سے چپٹی رہی۔

سینے کے داغ، دل کے زخم، روح کا کرب، جاننے والے مسیحا ویسے ہی کم ہیں، مگر عورت کے لیے ناپید، اس نے جب بھی محبت کے ملبے میں دبی ہوئی زخمی ذات کو باہر نکالا، تو خود کو اصلی صورت میں نہ پایا، اصلی صورت تو وہ کھو چکی تھی۔

آٹھ ماہ گزر گئے، دوسری عورت کی گود ہری نہ ہوسکی، اس کی ساس ہر ماہ دن گنتی اور پوچھنے جاتی، مگر مایوس لوٹتی، ان آٹھ ماہ میں وہ دوبارہ نہیں آیا۔

بیوی اس کے پاس تھی، اور ماں جاکر دیکھ آتی، تو مرجھائے ہوئے پھول کے پاس کیوں آتا۔ اور اب تو وہ میسج کرنا بھی بھولتی جارہی تھی، بات کرنا تو پہلے ہی بھول بیٹھی تھی۔ وہ کون سا اس کی آواز سننے کو بے چین اور منتظر تھا۔

اس بار اس کی ساس، بیٹے سے مل کر آئی تو دکھی تھی، "اس نے یقیناً کچھ کہہ دیا ہوگا" ورنہ وہ آٹھ دن بعد لینے کے لیے آنے والے ڈرائیور کو خالی نہ بھیجتی۔

پوچھنے کی عادت نہ اس میں تھی، نہ ہی ساس نے بتایا، جب دوسرے ہفتے بھی گاڑی خالی واپس گئی تو وہ ماں کو دیکھنے چلا آیا۔

"اماں کا خیال رکھا کرو۔" کچن میں اپنے لیے چائے بناتی عورت سے مخاطب ہوا، بیوی کا درجہ تو وہ اب اسے دیتا ہی نہیں تھا۔

اس کی ماں اس کی ذمہ داری نہیں تھی، پھر بھی وہ مکمل ایمان داری سے نبھا رہی تھی اور وہ ہر ذمہ داری سے مبرا اسے احکامات دیتا رہا، اس نے نہ شکوہ کیا، نہ وضاحت دی، خاموشی سے چائے، بسکٹ، سموسے اس کے سامنے رکھے۔

"ایسا لگتا ہے جیسے ہم دونوں ایک دوسرے سے بے زار ہو گئے ہیں۔"

وہ اس کی تھوڑی دیر کی خاموشی بھی برداشت نہ کرپایا۔

کتنے چھوٹے ظرف کا مالک تھا، وہ تو ایک سال سے اس کی خاموشی کی بھٹی میں جل جل کر کوئلہ بن چکی تھی، سعد کا عکس آنکھوں میں چھلکتی نمی میں دھندلا ہوا۔

"ہم دونوں نہیں، صرف تم سعد!" گلے میں آنسوؤں کا گولہ اٹک گیا۔

"میں تو اسی دائرے کے اندر گھوم رہی ہوں، یہ جاننے کے بعد بھی کہ تم اب اس دائرے سے باہر ہو، اندر تو صرف تمہاری پرچھائیاں رہ گئی ہیں۔ مجھے پرچھائیوں کے طواف نے نڈھال ضرور کیا ہے، مگر بے زار نہیں۔" خود کلامی کرتے سعد تک پہنچی۔

"وہم ہے تمہارا! مصروفیت بہت بڑھ گئی ہے، اب ٹینشن میں رہتا ہوں۔"

"نہیں تو سعد! میں تمہاری زندگی کی کتاب کا ایسا ورق رہ گئی ہوں، جس کو پھاڑ بھی دیا جائے تو کتاب میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اثر کم ہوتا ہے، نہ دلچسپی۔"

وہ ماں کو منا کر چلا گیا، اگلے ہفتے سے گاڑی خالی نہیں گئی، مگر وہ مکمل طور پر خالی ہو کر کوری کتاب رہ گئی۔

گزرتے تین سالوں میں دوسری عورت بھی کوئی خوش خبری نہ دے سکی تھی۔ اس کے جسم میں دوڑتے خون کا اک اک قطرہ گہر بنے اور تخلیق کی اعلا صورت میں آنے کے لیے بے قرار تھا، مگر وہ عورت تھی، اس لیے بانجھ نہ ہوتے ہوئے بھی بانجھ بنا دی گئی، اس کے اندر ممتا کی گرمی بدستور موجود تھی، اس کا ساتھی ہی کورا نکلا تو اس کا کیا قصور، مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی سزا کاٹتی رہی۔

وہ کورا مرد کسی اور سے خوشیاں کشید کرنے لگا۔ بالآخر وہ عورت راز آشنا ہوئی، سارے ٹیسٹ خفیہ طریقے سے پہلے ہی معلوم کرتی رہی۔ وہ اس کی طرح نہیں تھی، جس نے صرف اس کی زبان پر اعتبار کیا، کبھی خود ٹیسٹ اور رپورٹس دکھانے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا، محبت اندھا کرتی ہے، وہ اس کی ہر بات پر آنکھ بند کرکے اعتبار کرتی رہی تھی۔

مگر وہ دوسری عورت تھی، اپنی ممتا کو کورے پن پر قربان نہیں کرسکتی تھی، جبکہ پیچھے اک مرد کو منتظر بھی چھوڑ آئی ہو، سو اسی بہانے طلاق لے کر چلی گئی۔

وہ تن من سے کورا مرد اک بار پھر اس کے پاس آگیا، اک محبت کے آسرے پر تو وہ جیون کورے مرد کے ساتھ بتا لیتی، پر اب تو وہ محبت بھی نہ رہی تھی۔

وہ خود بھی کوری کتاب بن گئی تھی، بالکل صاف سفید جس پر اک لفظ کی سیاہی بھی نہ رہی۔ عورت پنسل سے لکھی ہوئی ایسی ہی تحریر ہے، جسے مرد جب چاہے اپنے عمل کے ربڑ سے مٹا سکتا ہے۔ اس کے دل پر کندہ تحریر بھی دھوکہ دغا فریب نے کب کی مٹا دی تھی۔

ساس کو نظریں ملانے کی ہمت نہ پڑتی۔ شرمندگی اور بیٹے کے بے اولاد ہونے کے غم میں بستر سے جا لگی، وہ اس کی خدمت میں جت گئی۔

"میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔" ایک دن اس نے سالوں کی دوریاں پاٹنے کی ناکام کوشش کی۔ "میں نے واقعی تم سے زیادتی کی، مجھے معاف کردو۔"

"اماں کی بیماری کی وجہ سے میرا ان کے پاس رہنا بہت ضروری ہے، آج سے میں ان کے کمرے میں رہوں گی۔ ویسے بھی میں کھوکھلی عورت ہوں، تمہیں بچہ نہیں دے سکتی۔" اپنے شانے سے اس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے کھوکھلی عورت نے فیصلہ سنا دیا۔

اور اس فیصلے کو قبول کرنا اس کی مجبوری تھی کہ اس جیسی خدمت گار اس کی ماں کو نہیں مل سکتی تھی۔ مگر اس کھوکھلی عورت کی محبت کو کھو کر اس کے پاس بھی تو کچھ نہ رہا تھا، اس کے ہاتھ ہی نہیں دل بھی خالی تھا۔

☆

رخ چوہدری

دل دروازہ کھولے

"عماد نے کرن کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا ہے اور منگنی کو ختم کرنے پر اصرار کیا ہے۔"

چند الفاظ پر مشتمل یہ جملہ نہیں بم تھا جس نے اس کی نازک سی ہستی کے پرخچے اڑا کر رکھ دیے تھے۔ ذلت، توہین، ٹھکرائے جانے کا احساس گویا رگوں میں بارود بن کر پھٹنے لگا تھا۔ وہ بے حس و حرکت پلک جھپکائے بنا دریچے میں دیکھے جا رہی تھی باہر تو بہار کا موسم تھا۔ لان کے پھول کھل رہے تھے پھر یک دم آندھیاں کیوں چلنے لگیں؟ جھکڑ کیوں در و دیوار ہلانے لگے تھے۔

"کیوں عماد حسن! کیوں کیا تم نے ایسے؟ نہیں عماد حسن! نہیں تم نے مجھے ریجیکٹ کیا ہے میری انسلٹ کی ہے ہاں، ہاں میں مانتی ہوں محبت کے سفر میں میں اکیلی ہی تھی میرے دل کی بستی میں یک طرفہ محبت کے پھول کھلے تھے۔ پھر بھی عماد حسن! پھر بھی تم نے مجھے قبول کیا تھا ہاں کی تھی تو... تو پھپھو نے بڑے ارمانوں سے ہمیں منگنی کے اس نازک رشتے میں جکڑا تھا اور تم نے تعلق کی اس ڈور کو کس سہولت سے کتنی آسانی سے توڑ ڈالا عماد حسن! کیوں۔ کیوں آخر؟ تمہیں بتانا پڑے گا کیوں کیا تم نے ایسے۔ میں ہرگز کسی اور کو اپنے ارمانوں کی قبر پر خوابوں کا محل بنانے نہیں دوں گی۔ ہرگز نہیں۔"

وہ جنونی انداز میں اٹھی تھی عماد حسن سے اپنا حق چھین لینے کا عزم لے کر۔

"کرن شجاع! کیا تم اتنی گری ہوئی ہو کہ کشکول پھیلا کر محبت کی بھیک مانگو گی؟ تم اتنی کمزور تو کبھی بھی نہیں تھیں کرن! محبت تو انسان کو وقار بخش دیتی ہے اسے بتا دو کہ تم میں اتنی ہمت ہے کہ اس کی بے وفائی کے وار کو برداشت کر سکو۔"

اور وہ جو بڑے عزم کے ساتھ اٹھی تھی پھر بے دم سی ہو کر بستر پر گر گئی ایسی خوشیاں بھاڑ میں جھونک دینے کے لائق ہوتی ہیں جن کی قیمت انا ہوتی ہے' خود داری ہوتی ہے۔

عماد حسن اس کی پھپھو کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ وہ صرف گھر ہی میں بڑا نہیں تھا بلکہ خاندان کے تمام کزنز سے بڑا تھا اور اس بڑے پن کا اسے خوب احساس بھی تھا۔ خوب رعب جھاڑا کرتا تھا۔ عماد حسن اور کرن کی عمر میں پندرہ سال کا فرق تھا جب بچپن کو یاد کرو اس کو ڈانٹ رہا ہوتا تو وہ اپنی سیاہ چمکیلی آنکھوں میں قندیلیں روشن کیے اسے دیکھے جاتی۔ محبت کیا چیز ہوتی ہے! شادی جیسے بندھن کیا اہمیت رکھتے ہیں۔ اسے تو بس اس کی ہر بات ہر ادا اچھی لگتی تھی۔ اسے تو جذبوں کا شعور بھی اب کیا تھا کہ بچپن کی وہ "اچھائی" وہ پسند دراصل محبت کے جذبے کی شروعات تھیں۔ کتنا اول کتنا لطیف احساس تھا کہ وہ جھوم اٹھی تھی۔

عماد اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں امریکہ گیا ہوا تھا اور پھپھو کو دلہن لانے کی پڑ گئی تھی۔ آئے دن منہ بھلائے کہیں نہ کہیں لڑکی دیکھنے جا رہی ہوتیں اور کرن کی جان جل جاتی تھی۔ اس روز بھی پھپھو پھپھا کے ساتھ ان کے کسی دوست کی لڑکی کو دیکھ کر آئی تھیں اور حسب سابق لڑکی پسند نہیں آئی تھی۔ کرن بے حد خوش تھی۔

"بھئی بیگم! تم عورتوں کی کوئی کل ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر کمی کیا تھی اس لڑکی میں؟" پھپھا کو اپنے دوست کا اترا ہوا چہرہ دکھی کر گیا تھا۔

"دیکھیے میاں صاحب! بہو خاندان کی بنیاد ہوتی ہے اور میرا تو ایک ہی بیٹا ہے تو بہو اپنی پسند سے لاؤں گی نا!"

"حد ہو گئی صاحب کہ عورت ہی عورت کی دشمن ہے۔ کبھی کسی مرد کو بھی مرد کی جڑیں کاٹتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"رہنے دیجیے آپ اپنا فلسفہ اپنے پاس۔"

پھپھو خفا ہو کر شاکرہ بیگم کے قریب بیٹھ کر لڑکی اور اس کی فیملی کی باتیں کرنے لگیں۔ کرن پھپھو کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور باتیں سننے لگی۔

"بہت بری بات ہے پھپھو! کسی کی برائی نہیں کرنی چاہیے۔ سب لڑکیاں اچھی ہوتی ہیں بس۔" کرن کو

واقعی برا لگ رہا تھا۔

"ہاں چندا! ہوتی تو اچھی ہیں مگر میں کیا کروں۔"

"آپ کچھ مت کیجیے بس اپنی قریب کی نظر چیک کروائیے۔ خاصی کمزور لگتی ہے۔" وہ شوخی سے بسکٹ دانتوں تلے دبا کر بولی تو آصفہ بیگم تو ایک طرف اس کی ماں بھی بات کی گہرائی تک نہ پہنچ سکیں۔

"مطلب قریب کی چیزیں آپ کو نظر جو نہیں آتیں۔" وہ تو یہ کہہ کر بھاگ گئی۔ دونوں خواتین ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ چچا کا قہقہہ فضا میں گونج گیا۔

"کیا سمجھیں بیگم!" چچا نے بیگم کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرائے۔

"میں تو کچھ نہیں سمجھی۔"

"ارے بیگم! آپ میں سمجھ ہوتی تو بات ہی کیا تھی۔ بھابی! آپ کرن کو ہماری بیٹی بنا دیں۔"

"جی۔" آصفہ کے ساتھ شاکرہ بیگم بھی حیرت سے ان کو دیکھ کر رہ گئیں۔

"جی' جو بات آپ کو خود سمجھنا چاہیے تھی' بچی کو خود سمجھانی پڑی۔"

"ارے یہ بات ہے تو مجھے اپنی کرن سے بڑھ کر کون ہے۔ میرا دھیان اس لیے اس کی طرف نہ گیا کہ عمر میں... بھابی جان آپ... آپ کو تو اعتراض نہیں؟" شاکرہ بیگم خوش تو تھیں لیکن عمر کا اتنا زیادہ فرق ان کو کھٹک رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کس قدر خوش تھی۔ اس نے کتنا شکرانہ ادا کیا تھا خدا کا کوئی نہیں جانتا تھا۔

"میرے پروردگار! میرا اتنا شکرانہ قبول فرما جتنا میں ادا نہیں کر سکتی۔" وہ سجدے میں گری کہہ رہی تھی۔ اسی وقت عماد کے چھوٹے بہن بھائی حماد اور صوفیہ آ گئے خوشی سے ان کے چہرے چمک رہے تھے۔

"کرن باجی! یہ سب کیا ہو گیا۔"

"اچھا ہو بے مروت۔ ... تو کسی کو خیال آیا نہیں۔ خود ہی پھپھو سے میرے بارے میں کہیں پھر بے غیرت بن کر مجھے خود ہی اپنے ہونے کا احساس دلانا پڑا۔" وہ ان دونوں سے خفا ہوتی ہوئی بولی' صوفیہ اس سے لپٹ گئی۔

"قسم سے کرن باجی! آپ ہماری خواہش تھیں مگر ہم سوچا کرتے تھے کہ ایک تو آپ دونوں کے مزاجوں میں زمین آسمان جتنا فرق ہے' دوسرا عمر میں۔ تو ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"نیت صاف اور جذبے صادق ہوں تو سب کچھ ہو جاتا ہے صوفی! جو کام اللہ کو منظور ہوتے ہیں' وہ ہو کر رہتے ہیں۔"

وہ سرشار لہجے میں بولے گئی۔ زندگی کتنی خوب صورت ہو گئی تھی۔ خوابوں کی راہ گزر جگمگا اٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ارے پھپھو جانی! آپ اتنی اداس نہ ہوں۔"

آصفہ بیگم اسے گلے سے لگا کر شدت سے رو دیں۔ آخر کو ان کی لاڈلی بھتیجی تھی۔ جس کو بیٹے نے ریجیکٹ کر دیا تھا۔ ایک تو بچی کے دل ٹوٹنے کا ملال' اوپر سے بھائی بھاوج سے شرمندگی۔

"ارے چندا! اداس کیوں نہ ہوں۔ میں تو اس قدر خوش تھی کہ میری بھتیجی میری بہو بن کر آئے گی مگر میرے اپنے ہی بیٹے نے میرے... ارمانوں پر اوس ڈال دی۔"

"پھپھو جان! آپ ... نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے اسی میں بہتری ہو۔" وہ انہیں تسلی دیتے ہوئے بولی۔ آج کل وہ پھپھو کے گھر رہنے آئی ہوئی تھی۔

اسے اپنا پندار' اپنی انا بہت عزیز تھی۔ وہ عماد حسن پر ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ اسے منگنی ٹوٹنے کی بالکل پروا نہیں ہے' وہ مطمئن ہے۔

"پھپھو! میں آپ کے سر میں تیل لگاتی ہوں۔ آپ کو اچھی نیند آ جائے گی۔" وہ تیل لانے کے لیے اٹھی' جیسے ہی دروازہ کھولا اندر آتے ہوئے عماد کے سر پر زور سے لگا۔ وہ سر تھام کر رہ گیا اور اسے گھورنے لگا۔ وہ جواس ستم گر کو دیکھ کر اندر تک کھل گئی تھی اسے دیکھ کر بے نیازی سے بولی۔

"اوہو' ہم نے تو آپ کا دل ٹوٹنے کی دعا مانگی تھی۔ مگر آپ کا تو سر ٹوٹ گیا۔ چلیے کوئی بات نہیں اور لے آئیں گے بازار سے۔"

"شٹ اپ۔" وہ دھاڑا اور گھورتا ہوا آگے نکل گیا۔ اور ایک کھول چیرتی ہوئی گزر گئی۔

☼ ☼ ☼

"کیا سوچ رہی ہیں پھپھو؟" وہ کچن میں چلی آئی جہاں پھپھو کھانا بناتے ہوئے نجانے کن سوچوں میں گم ہو گئی تھیں۔

"کیا سوچنا ہے۔ میں تو بے فکر ہو گئی تھی کہ میری اپنی بچی گھر سنبھالے گی۔ میری تلاش ختم ہو گئی ہے مگر اس لڑکے نے پھر مجھے چکر میں ڈال دیا ہے۔ جبکہ کسی اور طرف دیکھنے کو بھی میرا دل نہیں چاہتا۔"

"جانے دیجیے پھپھو! زندگی میں سب کچھ ہماری پسند کا تو نہیں ہوتا نا۔ زندگی تو کمپرومائز کا نام ہے۔ ہمیں بہت کچھ نہ چاہنے کے باوجود بھی اپنانا پڑتا ہے۔ میں آپ کو اچھی لڑکیاں دکھاؤں گی۔ یہ بتائیے کہ یہ جو آپ نے سبز رنگ گھول کر رکھا ہوا ہے ضروری نہیں تو گرا دوں؟"

"ہاں چندا! گرا دو۔ اب تو بے کار ہے۔"

وہ جیسے ہی پیالہ لے کر سنک کی طرف بڑھی۔ اسی وقت کچن کا دروازہ کھلا اور عماد ہنگامی انداز میں اندر آیا اور کرن سے ٹکرا گیا۔ اس کی سفید براق شرٹ سبز رنگ میں نہا گئی۔ عماد بھنا گیا۔

"یہ' یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تم انتہائی بدتمیز اور پھوہڑ لڑکی ہو اور نجانے خود کو کیا سمجھتی ہو۔۔۔ کیوں کی ہے تم نے یہ حرکت میرے ساتھ۔" وہ مجسم شعلہ بنا ہوا تھا۔

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے آپ کی شرٹ رنگنے کا۔ اتار دیجیے ابھی دھل کر صاف ہو جائے گی۔"

"خاک صاف ہو گی۔ داغ لگ گئے ہیں کسی نے اتنے خلوص سے تحفہ دیا تھا اور محترمہ نے بیڑا غرق کر دیا۔"

"کپڑوں پر ہی تو لگے ہیں دھل کر صاف ہو جائیں گے۔ انسان کا کردار بے داغ ہونا چاہیے۔"

اس کے لہجے میں گہرائی تھی کہ وہ چونک سا گیا۔ پھر حیرت کے اسی احساس کو لیے وہ باہر نکل گیا۔ شرٹ اتار کر اسے بھجوا دی اور خود فائلیں دیکھنے لگا۔

"یہ لیجیے شرٹ جو آپ کو کسی نے تحفے میں دی تھی۔"

اس نے لفظ "کسی" پر زور دیتے ہوئے شرٹ اس کی طرف بڑھائی تو اسے یقین نہیں آیا۔

"یہ۔۔۔ یہ وہی شرٹ ہے' یہ تم نے دھوئی ہے؟" اسے واقعی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنی خراب شرٹ اتنی صاف بھی ہو سکتی ہے۔

"عماد صاحب! خود کو بہت کچھ اور دوسرے بندے کو حقیر سمجھنا بہت چھوٹی بات ہے۔ یہ شرٹ میں نے ہی دھوئی ہے۔"

وہ گہرے لہجے میں لفظ چبا چبا کر بولتی باہر نکل گئی اور وہ اس کے لفظوں پر غور کرتا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"نہیں یار سوری! سوری اسائنمنٹ تیار نہیں ہوا۔ بتایا تو تھا تمہیں سب کچھ۔"

"ویسے عماد! تمہارے انکار کی وجہ میری تو سمجھ میں نہیں آئی یار! اتنی اچھی لڑکی ہے۔ شوخ ہے ذرا تو کیا ہوا؟"

"یار! ایک تو عمروں میں اتنا فرق ہے۔ اوپر سے اس کا امیچور رویہ۔۔۔ نو نو' میرے ساتھ میری عمر کی دھیمے مزاج کی سوبر سی لڑکی ہونی چاہیے نہ کہ یہ اٹھلاتی بل کھاتی لڑکی۔"

"بڑے ناشکرے ہو' اینی وے اسائنمنٹ جلدی تیار کرو ورنہ یہ ڈیل ہاتھ سے نہ نکل جائے۔"

"ارے نہیں' تم فکر نہ کرو میں رات کو بیٹھ کر مکمل کر لوں گا۔"

ساتھ ہی عماد کرن کو گھورتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔
اور کرن جو چائے لے کر آئی تھی۔ خاموشی سے لوٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

عماد نے کن انکھیوں سے خاموش خاموش سی کرن کو دیکھا جو کچن میں سلاد کاٹ رہی تھی گتنی بڑی بڑی اور سوبر لگ رہی تھی۔ صوفیہ جو کھانے کے برتن میز پر لگا رہی تھی۔ بھائی کی نظروں کا تعاقب کیا تو کرن کو متوجہ کرنے کے لیے زور سے بولی۔

"کرن باجی!"

اور وہ جو سلاد کاٹ رہی تھی چھری اس کے ہاتھ میں لگی اور خون نکلنے لگا۔ عماد تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر دبا دیا۔

"احمق لڑکی! اتنا گہرا زخم ہے اور تمہیں احساس نہیں۔"

وہ پریشانی سے اس کا ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا۔ اک کسک سی اٹھی دل میں۔

"گہرے زخم آپ نے دیکھے ہی نہیں' یہ تو معمولی زخم ہے۔ دو دن میں بھر جائے گا۔"

"احمق ہیں آپ' تو میرے گھر میں۔"

مطلب وہ اتنا کر پٹی باندھ رہا تھا تو اور وہ اسے اپنے لیے یوں پریشان سا دیکھتی رہی۔

"احتیاط کرنا' اب پانی میں ہاتھ نہ ڈالنا۔" وہ اسے ڈاکٹر کی طرح ہدایت دے رہا تھا تو ایک زخمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی۔

"کاش! سارے زخم نظر آتے ہوں۔"

"کیا مطلب؟" وہ پھر اس کے انداز اس کے لہجے پر چونک گیا۔

"ضروری نہیں ہر بات کا مطلب ہو..... ویسے شکریہ اس ہمدردی کا۔"

وہ بھیگتی آنکھیں لیے جلدی سے باہر نکل گئی اور اپنے لہجے کا سوز چھوڑ گئی اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ کتنی ہی دیر اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ شعوری کوشش تھی یا لاشعوری وہ الجھ کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"امی! آج رات کھانے پر میں نے اپنے ایک دوست کو انوائٹ کیا ہے اچھا سا کھانا بنا لیجیے گا۔" ناشتے کے بعد وہ اعلان کر رہا تھا۔

"ارے بیٹا! میں کیا کھانا بناؤں گی۔ خدا کا شکر ہے کرن بیٹی ہے' ایک سے ایک کھانا بنا لیتی ہے۔ میری بچی بنا لے گی یہ۔"

"اور نہیں تو کیا کرن باجی تو ایسے ایسے کھانے بناتی ہیں کہ بندہ انگلیاں چاٹتا رہ جائے۔" صوفیہ نے بھی ٹکڑا لگایا۔

وہ وہاں سے اٹھ کر آ گئی اور عماد اس کی پشت پر لہراتی چوٹی کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا رات کھانے پر عماد کے دو دوست تھے۔ کھانا واقعی بہت اچھا تھا۔ انتہائی سلیقے کے ساتھ پیش کیا گیا تھا کہ عماد حیرت سے اس لاابالی سی لڑکی کو دیکھے گیا اور اندر کہیں پچھتاوے کے احساس کے ساتھ اک منفرد سا احساس بھی جاگا جس کو وہ کوئی نام نہ دے سکا۔

☼ ☼ ☼

دو دن بعد عماد نے اپنی کسی کولیگ مینا کو انوائٹ کیا تو ان تینوں کو یقین ہو گیا کہ اس کہانی کی "ہیروئن" کا کردار ادا کرنے والی مینا ہی ہے۔ [illegible]

"تم لوگ سنو' یہ مینا ہے۔ ... جس نے ان کو شرٹ تحفے میں دی اور..."

"تو ہوا کرے ہم لوگ بھیا کی زندگی میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔"

"چھوڑو تم لوگ' کسی کے گھر میں تو زبردستی بندہ گھس سکتا ہے مگر دل میں نہیں اور مجھے عماد کے دل میں جگہ چاہیے تھی جو کہ نہیں مل سکتی تو زبردستی..... نہیں یہ مجھے گوارا نہیں۔"

"ایک تو آپ بہت بڑی جلدی ہار جاتی ہیں۔ انسان کو کوشش کرکے نتائج خدا پر چھوڑ دینے چاہئیں۔ چلو ہم مینا کے استقبال کی تیاریاں کرتے ہیں۔"

"بس کچن میں آپ لوگ کام کرنا اور میں مینا بیگم کو یہاں سے ٹاک آؤٹ کروں گا۔"

"نہیں عماد! یہ بری بات ہے وہ لڑکی ہے اور ہماری مہمان ہے۔"

"آپ رہنے دیجیے آ گئیں کہیں سے حاتم طائی ہم آپ کی طرح اعلا ظرف نہیں ہیں کہ۔"

اور پھر جب خوب صورت سی اسمارٹ سی مینا عماد کے ساتھ چلتی ہوئی اندر آ رہی تھی تو کھڑکی کی اوٹ میں چھپی کرن ایک دم جو اٹھی تو اس کا سر کھڑکی سے بری طرح ٹکرا گیا کہ دن میں تارے نظر آ گئے۔ عین اسی وقت عماد اور مینا اندر آئے۔ عماد مینا کو کرن کی طرف لے آیا جس کو اس وقت کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

"مینا! ان سے ملو یہ میری کزن ہیں کرن اور..... کرن یہ مینا ہیں میری کولیگ۔"

"میں مینا ہوں' بہت دکھ ہوا آپ سے مل کر' میرا مطلب ہے کہ تارے نظر آتے ہیں سرخ سفید نیلے پیلے۔"

اسے واقعی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے مینا کے بجائے عماد کا ہاتھ پکڑ کر ملایا تو عماد کا مارے خفت کے برا حال ہو گیا۔ مینا کرن کی حالت دیکھ کر افسوس کا اظہار کرنے لگی۔

"ویری سیڈ' عماد! اسے کسی ڈاکٹر کو دکھایا نہیں۔ بے چاری اچھی خاصی لڑکی اور..."

"نہیں مینا! یہ پاگل نہیں ہے ذرا جولی ہے۔"

عماد نے زور سے کرن کا ہاتھ دبایا اور چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ مینا مڑ مڑ کر اسے دیکھتی رہی۔ پھر کھانے کی ٹیبل پر حماد اور صوفیہ کی بد تمیزی' کرن کا خشک رویہ مینا کو برا لگا تھا۔ عماد تو غصے سے پاگل ہو گیا پھر شام کو اب تینوں سر جھکائے اس کی عدالت میں سزا سننے کے منتظر تھے۔

"شرم آنی چاہیے تم لوگوں کو' ایک مہمان کے ساتھ تم لوگوں نے یہ کیا کیا سوچتی ہو گی وہ ہمارے بارے میں اور معلوم بھی ہے کہ وہ ہمارے نئے باس کی بیگم ہے۔"

"کیا... بیگم!" تینوں نے ایک ساتھ ایک دوسرے کو دیکھ کر کہا۔

"جی ہاں وہ ہمارے نئے باس کی بیگم ہے اور ان سے ہی میری میٹنگ ہے مگر اب... اب... آخر کیا تھا تم لوگوں کے ذہن میں؟ کیوں کیا تم لوگوں نے ایسا... میں جانتا ہوں یہ کارنامہ کرن بیگم کے علاوہ کسی کا نہیں ہو سکتا لیکن کرن جو تم چاہتی ہو نا وہ... وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ نفرت ہے مجھے تم جیسی امیچور قسم کی لڑکیوں سے۔"

عماد تو اس وقت غصے میں آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ کرن کی رگوں میں خون ابلنے لگا۔

"شٹ اپ مسٹر عماد! آپ دوسروں سے نفرت کرتے ہیں مگر خود کیا ہیں' کبھی سوچا؟ آپ میں تو کسی کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ میں تو خود شرمندہ ہوں... کہ میں آپ جیسے سطحی مرد کو بچپن سے اب تک چاہتی رہی جس کو اتنا معلوم نہیں کتاب کو پڑھے بغیر اس بارے میں رائے قائم کر لینا انتہائی حماقت ہوتی ہے۔"

وہ جو اتنے عرصے سے پک رہی تھی۔ آج پھٹ پڑی اور دروازہ دھڑ سے بند کر کے باہر نکل گئی۔

"بھائی! یہ جو کچھ بھی ہوا اس میں کرن باجی کا کوئی قصور نہیں۔ نہ ہی وہ کسی بات میں شریک تھیں۔ یہ ہم دونوں نے کیا وہ تو ہمیں منع ہی کرتی رہیں۔"

"آپ بہت برے ہیں بھیا! کرن جیسی لڑکی کو آپ نے ریجیکٹ کر کے اچھا نہیں کیا جو آپ کو اتنا چاہتی ہیں۔"

حماد اور صوفیہ اس کے چھوٹے بہن بھائی اسے سنا کر چلے گئے تھے۔ وہ کھڑا سوچتا رہا۔ کرن کا متضاد روپ اس کی باتیں نظروں میں' سماعتوں میں گھومتی رہیں۔ اپنا رویہ اپنی باتیں بھی یاد آتی رہیں۔ وہ بہت ڈسٹرب ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"عماد بھائی! پیا ہے... کرن باجی کا بہت اچھا

پرپوزل آیا ہوا ہے اور ہو سکتا ہے اس بار کرن باجی ہاں بھی کر دیں۔" صوفیہ نے بتایا تو وہ چونک اسے دیکھنے لگا۔

"ظاہر ہے بھئی کرن باجی میں کمی کس بات کی ہے اتنی حسین، سلیقہ شعار، پڑھی لکھی تو ہیں۔"

"کرن کے علاوہ کوئی موضوع نہیں ہے تم لوگوں کے پاس بات کرنے کو؟" وہ چڑ کر بولا تو دونوں خاموشی سے اٹھ گئے۔

سب لوگ ہی خوش و خرم تھے مگر ایک بے چینی سی تھی تو عماد کی نجانے وہ بے قراری کے کس راستے پر چل پڑا تھا کہ کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا نہ چاہتے ہوئے بھی سوچوں پر کرن کا قبضہ تھا۔

اور اس خبر نے کہ عید کے بعد اس کا رشتہ اس ڈاکٹر سے طے کر دیا جائے گا جس نے اسے اپنے کلینک میں دیکھا تھا۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھا۔

کرن عید کے چاند کو دیکھنے کے لیے ٹیرس پر کھڑی آنکھیں موندے دعا مانگ رہی تھی۔ عماد عین اس کے سامنے آن کھڑا ہوا اس نے دعا کے بعد منہ پر ہاتھ پھیرے تو عماد نے شوخی سے کہا۔

"آمین۔" کرن نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو سامنے وہ ستم گر موجود تھا جو بچپن سے دستِ طلب میں رہا۔ مگر اب۔

"کیا مانگا ہے اللہ تعالیٰ سے۔" وہ اسے دیکھے گیا۔

"کم از کم آپ کو نہیں مانگا۔" ٹھکرائے جانے کا سارا درد اس کی آنکھوں میں اتر آیا۔

"کتنی عجیب بات ہے تم نے مجھے نہیں مانگا اور تم میری دستِ طلب میں آ گئیں آج اس عید کے چاند کے سامنے میں اللہ سے تمہیں مانگتا ہوں۔" اللہ میاں جی یہ عجیب سی لڑکی مجھے عنایت فرما دے۔ تیرا بے حد شکر گزار رہوں گا۔"

وہ آنکھیں موندے صدقِ دل سے دعا مانگ رہا تھا۔ کرن حیرت سے اسے دیکھے گئی۔

پھر آمین کہہ کر اس نے منہ پر ہاتھ پھیرے اور کرن پر پھونک ماری۔ تو وہ جانے لگی عماد نے اس کا نازک سا ہاتھ تھام لیا۔

"کرن! تم نے ٹھیک کہا تھا کتاب کو پڑھے بغیر رائے دے دینا حماقت ہوتی ہے اور میں نے بھی تمہیں سمجھے بغیر۔ خیر یہ بندہ بھی عجیب چیز ہے جو نعمت اسے اللہ تعالیٰ بغیر مانگے دے دیتا ہے ناں اس کی قدر نہیں کرتا۔ تم بھی مجھے طلب کے بغیر مل رہی تھیں تو قدر نہیں تھی اور اب۔ اب تو لگتا ہے تمہارے بغیر ایک سانس بھی محال ہے۔"

"میرا ہاتھ چھوڑیں۔" اس نے ہاتھ کھینچا مگر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔

"اب تو ناممکن ہے محترمہ۔ کرن ایک بار ایک موقع اور دو۔ تمہیں اتنی محبت اتنی عزت دوں گا کہ تمام شکوے مٹ جائیں گے۔"

وہ ڈھیر سے رنگ نکالے کھڑا تھا۔ کرن نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ صوفیہ اور حماد ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور انگوٹھی پہن لینے کی درخواست کر رہے تھے۔ اسے اپنے یہ دوست بے حد عزیز تھے۔ اس نے ہاتھ آگے کر دیا۔ عماد نے رنگ کیا پہنائی ٹیرس مبارک سلامت سے گونج اٹھا۔ بزرگوں سمیت نوکر بھی موجود تھے۔

"میرے اللہ تیرا شکر ہے میری بچوں کی جوڑی کو سلامت رکھنا۔"

آصفہ بیگم نے آگے بڑھ کر کرن اور عماد کے سر پر ہاتھ پھیرا تو دونوں مسکرا دیے۔

☆

نبیلہ عزیز

مائے نی میں کینوں آکھاں

"مومو مر جائے گی معظم! میں جانتی ہوں مومو مر جائے گی۔"

"نہیں ہوگا۔" میراں بیگم نے بہن کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں تسلی دی تھی۔

مسز ملکہ آفاق، معظم جاہ کا گریبان پکڑے چیخ رہی تھیں۔ ان کا انداز ہذیانی سا ہو رہا تھا اور معظم جاہ چپ چاپ کھڑا ان کی یہ چیخ و پکار سن رہا تھا۔ یہاں کون جانتا تھا کہ مومو مرے یا نہ مرے لیکن اندر سے وہ دونوں ہی مر چکے ہیں، مسز ملکہ آفاق بھی اور معظم جاہ بھی۔۔۔!

دکھ دونوں کا ایک ہی تھا بس درد الگ الگ تھے اور الگ الگ درد کی اذیت بھی الگ الگ تھی اتنی کہ وہ چیخے جا رہی تھیں اور وہ چپ کھڑا تھا۔۔۔ اتنا چپ جتنی مومو۔۔۔ اور وہ اتنا چلا رہی تھیں جتنی مومو کبھی نہ چیخی تھی!

"چپ ہو جاؤ ملکہ! اللہ بہتر کرے گا۔ مومو کو کچھ نہیں ہوگا۔" میراں بیگم اندر میری مومو مر رہی ہے 'مومو مر رہی ہے' وہ پھولوں سی نازک ہے وہ کیسے یہ سب سہ پائے گی؟" مسز ملکہ آفاق تڑپ تڑپ کر رو رہی تھیں۔ وہ جان چکی تھیں کہ مومو کو کیا ہوا ہے اور اب کیا ہوگا؟ اور اس ہونے کا درد ہی انہیں رلا رہا تھا۔ چیخنے پہ مجبور کر رہا تھا۔

"اللہ شفا دینے والا ہے 'زندگی بخشنے والا ہے' دعا کرو اس کے لیے 'ناامید کیوں ہو رہی ہو؟" میراں بیگم بار بار ان کی ہمت اور حوصلہ بڑھا رہی تھیں 'تسلیاں دے رہی تھیں۔

"میری دعائیں قبول ہوتیں تو آج وہ اس حال میں نہ ہوتی۔" مسز ملکہ آفاق کو ایک اور دکھ نے رلایا۔

"ہو سکتا ہے آج تمہاری دعاؤں کی قبولیت کا دن ہو۔"

"نہیں آج ہی تو میری دعاؤں کے مسترد ہونے کا دن ہے۔"

وہ روتے روتے فرش پہ بیٹھ گئی تھیں اور معظم جاہ اپنی جگہ پہ پتھر کے مجسمے کی مانند کھڑا تھا۔ وہ بھی تو مومو کے لیے دعا کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس کے

ہاتھ بھی اپنے پہلو میں ساکت تھے اور دل و دماغ اپنی اپنی جگہ پہ مفلوج ہو چکے تھے۔۔۔ خواہشیں 'امنگیں' زندگی سب سو گئے تھے اب یہ پتہ نہیں تھا کہ ہمیشہ کے لیے سوئے ہیں یا پھر وقتی نیند ہے؟

"اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہوتے۔" میراں بیگم نے ایک بار پھر انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں تمہیں اللہ نے ہمیشہ دیا ہے 'بن مانگے دیا ہے' تمہیں بھلا کیوں مایوسی ہوگی؟ مایوسی تو مجھے ہوگی جس کو کبھی مانگنے سے بھی نہیں ملا۔"

مسز ملکہ آفاق روتے روتے یکدم پھٹ پڑی تھیں اور میراں بیگم حیرت اور ناسمجھی سے ہکا بکا رہ گئی تھیں۔

"ملکہ! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" میراں بیگم کے لہجے میں حیرت نمایاں تھی باقی سب کا بھی یہی حال تھا۔

"وہی جو میں اک عمر دل میں چھپا کے پھری ہوں' وہی جو تم اک عمر سینے سے لگا کے بیٹھی ہو۔" مسز ملکہ آفاق کے لفظ لفظ سے زہر ٹپک رہا تھا۔

"ملکہ! تم ہوش میں تو ہو؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟" مقدم جاہ حیرت سے آگے بڑھے۔ کیونکہ ان کی اس دیوانگی پہ ہسپتال کی راہداری سے گزرنے والے لوگ کافی عجیب اور حیران سی نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ملک کی مشہور و معروف ڈریس ڈیزائنر ملکہ آفاق اس وقت بے بسی اور دکھ کے کس موڑ پہ تھیں کوئی جاننے والا دیکھ لیتا تو رو پڑتا۔

"ملکہ۔۔۔!" مقدم جاہ نے دوبارہ انہیں مخاطب کیا۔

"ملکہ مر گئی مقدم بھائی! ملکہ مر گئی' آج ملکہ مر گئی' آج ملکہ کا دل مر گیا' دنیا مر گئی' آج سب کچھ مر گیا۔" ملکہ آفاق پاگلوں کی طرح ایک ہی تکرار کیے جا رہی تھیں۔ ان سب کا دل مٹھی میں آ گیا۔

"ملکہ! پلیز پاگل مت بنو' مومو کو کچھ نہیں ہوا' وہ

ٹھیک ہے' وہ زندہ ہے۔" نشاط بیگم نے آگے بڑھ کے انہیں سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ وہاں موجود تمام افراد میں سے صرف ایک معظم ہی تھا جس کے چہرے پہ کوئی تاثر نہیں تھا وہ مٹی سے بنا اک وجود تھا لیکن اس وقت پتھر نظر آ رہا تھا چپ اور جامد...!

"ڈاکٹر...؟" آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا تو سب سے پہلی نظر معظم کی ہی پڑی تھی اور سب سے پہلے آگے بڑھنے والا بھی معظم ہی تھا...!

☼ ☼ ☼

"گڈ مارننگ پاپا!" مومو تیزی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔

"گڈ مارننگ سویٹ ہارٹ! آج اتنی جلدی کیسے اٹھ گئیں؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ مہر اور معظم کے ساتھ شاپنگ پہ جانا تھا اس لیے معظم نے فون کر کے جگا دیا۔" وہ ان کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے لاڈ سے بولی۔

"اور تمہارا بریک فاسٹ؟"

"معظم کی طرف کروں گی۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"او کے سویٹ ہارٹ اللہ حافظ۔" وہ ان کا رخسار چومتے ہوئے پیچھے ہٹی اور ہاتھ ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

وہ پیدل چلتی ہوئی اپنے گھر سے نکلی اور اپنے ماموں مقدم جاہ کے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اس کا رخ ڈائننگ روم کی طرف تھا۔

"معظم... معظم!" وہ اسے آوازیں دیتی ہوئی آ رہی تھی لیکن ڈائننگ روم خالی پڑا تھا۔

"مومو! بھائی اوپر اپنے کمرے میں ہیں۔" اریبہ نے کچن سے آواز دے کر اسے اطلاع پہنچائی تھی۔

"اوپر کیا کر رہا ہے؟" اسے حیرانی ہوئی۔

"سو رہے ہیں۔"

"واٹ؟ لیکن مجھ سے تو کہہ رہا تھا کہ میں ناشتے کی میز پہ ہوں' تم جلدی آ جاؤ۔" مومو کی بات پہ اریبہ مسکرا دی تھی۔

"انہوں نے تمہارے ساتھ مذاق کیا ہو گا ابھی تو انہوں نے ناشتا کیا ہی نہیں۔"

"پوچھ لیتی ہوں اسے۔" مومو تلملاتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ اسے اپنی قیمتی نیند خراب ہونے پہ غصہ آ رہا تھا۔

"معظم...!" اس نے دھڑام سے اس کے بیڈ روم کا دروازہ کھول دیا تھا لیکن وہ کمرے میں کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ وہ اندر آ گئی تب ہی وہ ڈریسنگ روم سے نمودار ہوتا دکھائی دیا تھا۔

"تم نے مجھے اتنی جلدی کیوں جگایا؟" وہ چیخ کر بولی۔

"شاپنگ پہ جانے کے لیے۔" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"تو خود اتنا لیٹ کیوں تیار ہو رہے ہو؟" اس نے معظم کی تیاری کی سمت اشارہ کیا۔ وہ بالوں میں جیل لگا کر انہیں کوئی اسٹائل دے رہا تھا۔

"شاپنگ پہ جانے کے لیے۔"

"ہیرو سمجھتے ہو اپنے آپ کو؟" مومو نے استہزائیہ پوچھا۔

"ہیروئن سامنے کھڑی ہو تو بندہ اپنے آپ کو ہیرو سمجھ ہی لیتا ہے۔" اس نے مومو کو دیکھتے ہوئے آنکھ دبائی۔

"مہر کہاں ہے؟" مومو بات بدل گئی۔

"ہیروئن سے تمہیں مہر کیوں یاد آ گئی؟" معظم نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"کیونکہ ہیروئن لگتی ہے' پرانی ہیروئن گلیسرین سے پاک نکھری نکھری' سلیقہ مند اور سجی ہوئی۔" مومو نے اس کی تعریف کی۔

"وہ ہیروئن لگتی ہے اور تم واقعی ہیروئن ہو۔" معظم نے شرارت سے کہا۔

"مجھے بہلاؤ مت' جلدی کرو۔" وہ کہتے ہوئے بیڈ پہ بیٹھ گئی۔

"کیا تم بہل جاتی ہو؟"

"ہاں مجھ پہ تو اثر ہوتا ہے' باقیوں کا پتہ نہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔

"تم پہ اثر کیسے ہوتا ہے؟" وہ تیار ہونے کے ساتھ ساتھ اس سے باتیں بھی کر رہا تھا۔

"بالکل ایسے جیسے ابھی ہوا ہے' تم نے مجھے بہلایا ہے اور میں بہل گئی ہوں۔" مومو نے اسے ترجیح کی مثال دی اور معظم یکدم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"اچھا چلو اٹھو ناشتا کرتے ہیں۔" وہ موبائل اٹھا کر اسے اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل آیا تھا۔ مومو بھی اس کے پیچھے لپکی تھی۔

"مہر یہاں آئے گی یا اسے پک کرو گے؟" اس نے سیڑھیاں اترتے ہوئے پوچھا۔

"اسے پک کرنا ہے۔" وہ اطمینان سے کہتا سیڑھیاں اتر کر ڈائننگ روم میں آ گیا تھا۔ اریبہ ناشتا لگا کر خود بھی بیٹھ گئی تھی۔

"امانہ کہاں ہے؟" معظم نے چھوٹی بہن کا پوچھا۔

"سو رہی ہے ابھی۔" اریبہ کے بجائے نشاط بیگم نے جواب دیا تھا۔

"بس سنڈے کو نیند کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا۔" اریبہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اور ہمیں سنڈے کو شاپنگ کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا۔" معظم مومو کو دیکھ کر ہنسا تھا۔

"شاپنگ کرنے کا پروگرام تمہارا ہوتا ہے ورنہ مجھے بھی نیند کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا۔" مومو نے اسے گھور کے کہا تھا۔ گھومنے پھرنے کے پروگرام معظم ہی بناتا تھا۔

"او کے تم نہ جایا کرو شاپنگ پہ میں صرف مہر کو ہی لے جاتا ہوں۔" اس نے کندھے اچکائے۔

"لے جاؤ اور میں آئندہ بھی نہیں جاؤں گی۔" مومو نے دھمکی دی۔

"تم نہ بھی جاؤ تو میں تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گا۔" معظم نے اس کی طرف جھکتے ہوئے آہستگی سے کہا اور مومو کے ساتھ ساتھ اریبہ بھی مسکرا دی تھی۔ وہ دونوں اچھی طرح پیٹ پوجا کرنے کے بعد کھڑے ہو گئے تھے۔

"تم جا کر گاڑی میں بیٹھو میں آ رہا ہوں۔" اس نے مومو سے کہا اور سیڑھیاں چڑھ گیا تھا تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک گفٹ پیک تھا۔

"یہ کیا ہے؟" مومو نے اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی پوچھا۔

"مہر کے لیے گفٹ۔ جب مری گیا تھا تو سب کے لیے لے کر آیا تھا لیکن مہر کا ابھی تک رکھا ہے اسے دیا ہی نہیں۔"

"اتنے دنوں کا اب دے رہے ہو؟"

"ہوں! اتنے دنوں سے نہ وہ میری طرف آئی ہے اور نہ ہی میں اس کی طرف گیا ہوں اسی لیے جوں کا توں رکھا ہے۔" معظم نے گاڑی نکالتے ہوئے کہا تھا۔

"گفٹ کیا ہے؟"

"یہ تو وہی دیکھے گی۔" معظم شرارت سے مسکرایا تھا۔

"کیا چھپا رہے ہو؟"

"سوٹ ہے یار!"

"اب کیوں بتا رہے ہو؟"

"تم سے چھپا بھی تو نہیں سکتا۔"

"تھینکس اتنی عزت افزائی کے لیے۔" وہ سر خم کرتے ہوئے بولی۔

"تم تو اپنی شہزادی ہو یار!" معظم نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا تھا اور جواباً مومو بھی مسکرا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

مہر کے گھر کے سامنے پہنچ کر اس نے گیٹ پہ ہارن دیا تھا۔

اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ چادر اوڑھ کر اپنا پرس لے کر آ گئی تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی معظم نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"کیسی ہو؟" اس نے بیک ویو مرر سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل ٹھیک' آپ سنائیں کیسے ہیں؟" مہر نے اک نظر مرر کی سمت دیکھا اور پھر نظر جھکا لی تھی۔

"آپ کے سامنے ہیں دیکھ لیں کہ ہم کیسے ہیں؟"
اس نے کندھے اچکائے۔
"اچھے بھلے لگ رہے ہیں۔" مہر نے آہستگی سے کہا۔
"لگ نہیں رہا بلکہ اچھا بھلا ہوں۔" وہ مسکرایا۔
"ڈرائیونگ پہ دھیان دیجیے ورنہ ہم میں کوئی بھی اچھا بھلا نہیں رہے گا۔" موموں نے اسے خفگی سے کہا تھا۔

اور پھر باقی کا سفر ان دونوں کی باتوں میں گزرا تھا۔ شاپنگ مال میں داخل ہوتے ہی ان کی مصروفیت شروع ہو گئی تھی۔ مہر نے اپنے لیے ایک سوٹ اور چپل پسند کی تھی البتہ معظم اور موموں نے کافی شاپنگ کی تھی پھر لنچ اور گھومنے پھرنے کے بعد انہیں گھر کا خیال آیا تھا کیونکہ شام گہری ہو چکی تھی۔
"میرا خیال ہے کہ اب ہمیں گھر چلنا چاہیے؟" مہر نے کہا۔
"اتنی جلدی؟" موموں نے بے ساختہ کہا۔
"یہ جلدی ہے؟ ہم دوپہر کے گھر سے نکلے ہوئے ہیں اور اب شام ہو رہی ہے۔" مہر کی سوچ سمجھ دار مشرقی لڑکیوں جیسی سوچ تھی۔ "بابا بھی گھر آچکے ہوں گے۔"
"چلو تمہیں ڈراپ کر دوں۔" معظم ڈرائیونگ سیٹ کی سمت بڑھا تھا اور فرنٹ ڈور کھول دیا۔ مہر نے موموں کی سمت دیکھا۔
"تمہاری باری ہے۔" موموں مسکرا کر کہتی پچھلی سیٹ پہ بیٹھ گئی۔
"تھینک یو۔" مہر آہستگی سے بولی۔
"کس لیے؟" وہ گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔
"میری پرابلم سمجھنے کے لیے۔"
"میں نے تمہاری پرابلم نہیں سمجھی بلکہ اپنے لیے آسانی پیدا کی ہے۔" وہ مسکرایا۔ "آج اگر تمہیں ٹائم پہ گھر ڈراپ کروں گا تو آئندہ تمہیں پک کرنے کا موقع دوبارہ بھی ملے گا ورنہ..."
معظم نے بات ادھوری چھوڑ دی اور موموں یکدم اس کی چالاکی پہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔
"تم چپ رہو۔" معظم نے اسے گردن موڑ کر گھورا۔
"مجھے بعد میں گھورنا پہلے سامنے دھیان دو۔" موموں نے اسے ٹوکا۔
"میرا دھیان تو پتہ نہیں کس کس طرف ہے؟" معظم نے کن اکھیوں سے مہر کو دیکھا تھا وہ چہرہ جھکا گئی تھی معظم کی والہانہ نظریں اسے اکثر نظریں جھکانے پہ مجبور کر دیتی تھیں۔
"اور آپ بھی کمال کے ہیں' میرے گھر سے بھی آگے جا رہے ہیں' بریک لگائیے جناب!" مہر نے اسے ٹوکا تو معظم نے چونک کر اسے دیکھا۔
"شاید میں تمہیں اپنے گھر لے کر جا رہا تھا۔" معظم کے انداز میں معنی خیزی تھی۔
"ابھی وقت نہیں آیا آپ کے گھر جانے کا۔"
مہر بھی اسی کے سے انداز میں مبہم سا جواب دیتی گاڑی سے اتر گئی تھی لیکن جیسے ہی وہ گیٹ تک پہنچی معظم کو کچھ یاد آگیا۔
"مہر! رکو۔" اس نے آواز دی اور تیزی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا پچھلی سیٹ سے بیگ اٹھایا اور اس کے قریب جا پہنچا۔
"یہ تمہارے لیے..." اس نے بیگ اس کی طرف بڑھایا۔
"جب مری گیا تھا تو تمہارے لیے لے کر آیا تھا۔"
"تھینکس۔" وہ آہستگی سے بولی۔
"اب آبھی جاؤ یا پھر اپنے گفٹ کی کوالٹیز بتاتے کھڑے ہو گئے ہو؟" موموں نے ہارن پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بلند آواز سے کہا تھا۔
معظم اپنا سر کھجاتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر پلٹ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مہر!" میراں بیگم مہر کے بالوں میں تیل ڈال کے اس کے سر کا مساج کر رہی تھیں اور مہر آنکھیں بند کیے بیٹھی ان کے ممتا بھرے لمس سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔
"تمہارے بابا کا کوئی اسٹوڈنٹ ہے حنان درانی تمہارے لیے اس کا پرپوزل آیا ہے۔" میراں بیگم نے بے دھیانی میں بیٹی کے دل پہ ہاتھ ڈال دیا تھا۔ مہر چونک کر سیدھی ہوئی۔
"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔
"یہ میں نہیں کہہ رہی' تمہارے بابا کہہ رہے ہیں۔"
"لیکن میں ابھی پڑھ رہی ہوں۔" اس نے احتجاج کیا۔
"ابھی تو صرف انگیجمنٹ کریں گے۔" میراں بیگم اسے تسلی دے رہی تھیں۔
"لیکن میں ابھی اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ پلیز امی آپ ابھی یہ بات نہ کریں۔" مہر پریشانی سے بولی۔
"کیا کہہ کر ٹالوں ان کو؟"
"آپ اس پرپوزل کے لیے منع کر دیں بس۔"
میراں بیگم کچھ کچھ تو سمجھ گئی تھیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ مہر کس کو پسند کرتی ہے۔ لیکن وہ مہر کی پسند شوہر کو تو نہیں بتا سکتی تھیں اور ابھی اس کی پسند کی طرف سے بھی تو کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ خود اپنے منہ سے کس طرح کہتیں۔ بیٹی کی ماں تھیں۔ اور مہر تیل کی شیشی اٹھا کر اندر چلی آئی لیکن اسے دھڑکا سا لگ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اب بس بھی کرو بیٹا! اب تک گیم کھیلتی رہو گی؟" مسز ملک آفاق کا لاؤنج میں یہ تیسرا چکر تھا اور انہوں نے تینوں بار موموں کو ویڈیو گیم کھیلتے پایا تھا۔
"ابھی میرا اسکور کمپلیٹ نہیں ہوا ماما!" وہ مصروف سے انداز میں بولی۔
"تم آج معظم کی طرف نہیں گئیں؟"
"وہ اپنے دوست کی طرف گیا ہوا ہے' گھر پہ نہیں تھا۔"
"تو تم ہی اپنی کسی دوست کی طرف چلی جاتیں؟" انہوں نے خفگی سے کہا۔
"میری کوئی دوست نہیں ہے ماما!"
"تو پھر مہر کیا ہے؟"
"وہ تو کزن ہے ناں' خالہ کی بیٹی' اس سے جو دوستی ہے وہ تو بہنوں جیسی دوستی ہے' اس سے تو روز ملنا ملانا ہوتا ہی رہتا ہے۔" اس نے کندھے اچکائے۔
"بہنوں جیسی دوستی؟" مسز ملک آفاق دہرا کے رہ گئیں ان کا خیال میراں بیگم تک گیا تھا جو ان کی سگی بہن تھی لیکن ان دونوں میں کبھی دوستی نہیں ہوئی تھی ایسی دوستی جس کا ذکر موموں کر رہی تھی۔
"ہیلو موموں!" اچانک لاؤنج میں معظم کی آواز گونجی تھی اور موموں نے چونک کر اس کی سمت دیکھا تھا۔
"تم آگئے؟" وہ خوشگواریت سے بولی۔
"جس کے گھر گیا تھا وہ گھر پہ نہیں تھا۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے اس کے قریب صوفے پہ آکر بیٹھ گیا۔ وہ گیم چھوڑ چھاڑ کے اس کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔
"ملک آنٹی تمہارے لیے ٹائم نکال کر گھر پہ رہتی ہیں اور تم الٹے سیدھے کاموں میں الجھ کر خود کو مصروف کر لیتی ہو۔" معظم نے سرزنش کی تھی۔
"تمہاری طرف گئی تو تم گھر پہ نہیں تھے واپس آئی تو ماما اپنے کسی کلائنٹ سے فون پہ ڈسکشن کر رہی تھیں اس لیے میں گیم کھیلنے بیٹھ گئی۔" اس نے وجہ بتائی۔
"تو پھر اب گیم کیوں ادھوری چھوڑی ہے؟"
"تمہارے لیے۔" وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"کہاں ہو تم؟" مہر نے اس کے نمبر پہ میسج سینڈ کیا تھا۔
"یونیورسٹی۔" اس کا ریپلائی فوراً آیا تھا۔
"یونیورسٹی کے بعد گھر جاؤ گے؟"
"آف کورس گھر ہی جانا ہے' کیوں خیریت؟" وہ بھی شاید کچھ کھٹک چکا تھا۔

"مجھے بھی جانا ہے مجھے پک کر لینا۔" اس نے پھر میسج سینڈ کیا۔
"آج اتنی کرم نوازی کس لیے؟"
"بس مومو وغیرہ سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا۔۔۔" اس نے اسے ٹالا۔
"میرا بھی کسی سے ملنے کو دل چاہ رہا تھا۔" اب کی بار معظم نے لکھ کر بھیجا تھا۔
"کس سے؟" مہر نے بھی بے ساختہ میسج کر دیا۔
"اپنی پھوپھی کی بیٹی سے۔"
"پھوپھی کی بیٹی؟"
"ہاں یار! مومو پھوپھی کی بیٹی ہی تو ہے۔" معظم نے حساب بے باق کر لیا تھا مہر نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی تھی۔
"اب کہاں کھو گئی ہو؟" اس کا ایک اور میسج آیا۔
"کسی خیال میں چلی گئی تھی۔"
"خیال میں جاؤ گی تو خواب ہو جاؤ گی۔"
"پھر اس خواب کو کوئی پورا بھی تو کرے گا؟"
"کوئی کون؟" وہ پوچھ رہا تھا۔
"یہی تو الجھن ہے۔"
"الجھن کیوں؟"
"میسج میں نہیں بتا سکتی۔۔۔"
"اوکے میں تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں۔" اس نے میسج پڑھ کے سیل ایک سائیڈ میں رکھ دیا تھا۔
تھوڑی دیر بعد گیٹ پہ معظم کی گاڑی کا مخصوص ہارن سنائی دیا۔
"امی! میں خالہ کی طرف جا رہی ہوں۔" وہ امی کو بتا کر نکل آئی تھی معظم گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولے انتظار میں کھڑا تھا۔
چند سیکنڈ یونہی خاموشی کی نذر ہو گئے پھر کافی دیر بعد اس نے گردن موڑ کر مہر کی سمت دیکھا تھا۔
"کیسی ہیں آپ؟"
"ٹھیک ہوں۔۔۔"
"لگ تو نہیں رہا۔"
"بیماریاں صرف جسم کو ہی نہیں ہوتیں دل بھی مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔"
"علاج مشکل ہے تو نہیں۔" وہ قدرے مسخی انداز میں بولا۔
"ہاں مگر طبیب کوئی اور بننا چاہتا ہے۔" مہر نے دھیرے سے کہا تھا لیکن معظم کا پاؤں یکدم بریک پہ جا پڑا گاڑی کے ٹائر بری طرح چرچرائے تھے۔
"کوئی اور؟" اس کے لہجے اور انداز سے پریشانی جھلک رہی تھی۔
"میرے لیے ایک پرپوزل آیا ہوا ہے۔"
"پرپوزل؟ لیکن کیوں؟" معظم کی رنگت ہی بدل گئی تھی۔
"پرپوزل کیوں آتے ہیں؟"
"وہ تو ٹھیک ہے لیکن مہر! ہم دونوں تو آل ریڈی۔۔۔"
"یہ بات ہمارے ماں باپ تو نہیں جانتے ناں؟" مہر نے اسے حقیقت سے آگاہ کیا۔
"کس کا پرپوزل ہے؟"
"میرے پاپا کا اسٹوڈنٹ ہے حسان درانی۔"
"اسٹوڈنٹ؟ اس نے تمہیں کہیں دیکھا ہے کیا؟"
"ہاں ایک بار پاپا سے ملنے آیا تھا گاڑی میں جا رہی تھی میں سمجھی کہ آپ ہوں گے میں نے گیٹ کھول دیا۔"
"ذیشان انکل کیا کہتے ہیں؟"
"وہ تو کافی خوش ہیں حسان درانی کی فیملی ان کو پسند ہے۔"
"تو پھر ہمارا کیا ہوگا؟"
"یہی تو سوچنا ہے۔"
"کچھ حوصلہ دو تو میں حل سوچوں ناں؟"
"آپ کو چاہیے کہ آپ مجھے حوصلہ دیں نہ کہ میں آپ کو حوصلہ دوں۔۔۔" مہر نے خفگی سے کہا تھا۔
"اوکے یار! یہ کون سا مشکل کام ہے لاؤ ادھر اپنا ہاتھ دو میں تمہیں حوصلہ تو دوں۔" اس نے مہر کے ہاتھ کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اس نے اپنے ہاتھ پیچھے کھینچ لیے تھے۔
"آپ ہوش میں تو ہیں؟"

"ہاں لیکن بڑی مشکل سے۔" وہ معنی خیزی سے بولا۔

"آئندہ آپ کے ساتھ نہیں آؤں گی۔"

"کیوں کیا اس کام کے لیے حنان درانی کو چن لیا ہے؟" وہ بے ساختہ شرارت سے بولا۔

"معظم ہے۔" مہر تختی سے بولی تھی۔

"تمہارا غصہ بتاتا ہے کہ تم نے معظم جاہ کو چن لیا ہے؟" وہ سرشار ہو رہا تھا۔

"لیکن معظم جاہ کو ابھی کب پتہ چلے گا ابھی پتہ نہیں ہے۔"

"انشاء اللہ بہت جلد۔۔۔ میں پاپا سے بات کروں گا۔"

"پھر؟"

"پھر وہ تمہارے پاپا سے بات کریں گے۔۔۔"

"پھر؟" مہر نے پھر پوچھا۔

"پھر مجھے تمہارا ہاتھ پکڑنے کی اجازت مل جائے گی۔" وہ شرارت سے ہنسا۔

"پھر؟" اب کی بار وہ یکدم فلک شگاف قہقہہ لگا کر ہنسا تھا اور اس کے اس قدر معنی خیز قہقہے پہ مہر خود بخش ہو گئی تھی۔

"کیا میرے جواب کی ضرورت ہے؟"

وہ پوچھ رہا تھا اور وہ مرخ سوڑ گئی تھی اب تو بولنا بھی دشوار ہو گیا تھا۔۔۔ وہ باقی کا تمام راستہ انجوائے کرتے ہوئے گھر آیا تھا۔۔۔!

☼ ☼ ☼

"ارے مہر!" اریبہ معظم کے ساتھ مہر کو دیکھ کر چہک اٹھی تھی۔

"موموکہاں ہے؟"

"ایگزام کی تیاریوں میں مصروف ہے۔۔۔"

"شکر کرو کچھ پل سکون کے میسر ہیں ورنہ ہر طرف معظم معظم کی پکار سننے کو ملتی ہے۔" معظم کچھ پہنچ کر کے وہیں چلا آیا تھا۔

"وہی تو رونق ہے ہمارے گھر میں؟ سب سے چھوٹی بیٹی ہے ہماری۔" نشاط بیگم معظم کی بات سن چکی تھیں۔

"آپ کی رونق ہر وقت میرے کندھوں پہ سوار رہتی ہے نا اس لیے کہہ رہا ہوں' شکر کریں کہ چار دن سکون۔۔۔"

"معظم۔۔۔!" اچانک مومو کی آواز سنائی دی اور معظم کی بات ادھوری رہ گئی۔

"تم کب آئے؟" وہ اسے پکارتے ہوئے آ رہی تھی۔

"تم سے آٹھ سال پہلے۔۔۔"

"وہ تو میں جانتی ہوں لیکن میں ابھی کی بات کر رہی ہوں۔" وہ معظم سے سوال کرتے کرتے آگے بڑھی تو اس کی نظر سائیڈ والے صوفے کی سمت اٹھی۔

"مہر۔۔۔؟" وہ چہکی تھی۔

"کیسی ہو مومو؟" مہر اس کا گال چھوتے ہوئے بولی۔

"میں ٹھیک ہوں تم کب آئیں؟"

"جب معظم آئے تھے۔"

"تم آج میری طرف رکو نا؟" مومو نے خواہش کی۔

"آج کیا خاص بات ہے؟"

"بس دل چاہ رہا ہے۔" مومو لاڈ سے بولی۔

"دل تو پتہ نہیں کیا کیا چاہتا ہے۔" معظم نے مہر کو اچٹتی نظر سے دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا تھا۔

"تم اضافی مت بولو میں نے تو بس اسے آج رات رکنے کا کہا ہے۔"

"میں کون سا مہر رات رکنے کا کہہ رہا ہوں؟" معظم لاپروائی سے بولا مہر سٹپٹائی تھی۔

"کہہ کر تو دیکھو وہ کون سا رک جائے گی؟"

"اگر تمہارے کہنے سے رک سکتی ہے تو میرے کہنے سے بھی رک جائے گی' کیوں مہر؟" معظم نے کہتے ہوئے مہر کو مخاطب کر لیا تھا۔

"میں کسی کے کہنے سے بھی نہیں رکوں گی کیونکہ میری امی گھر پہ اکیلی ہوتی ہیں' پاپا اور حمزہ تو لیٹ گھر آتے ہیں اس لیے شام تک میری واپسی لازمی ہے۔" مہر نے اطمینان سے کہا تھا۔

"روک لو اب؟" معظم نے اسے چڑایا۔

"تو تم ہی روک لو۔" وہ جوابا" اسے چڑا رہی تھی۔

"سوئٹ مومو!" مہر نے اس کے رخسار کو چھوا اسے مومو سے بہت محبت تھی' ایک تو وہ سب سے چھوٹی تھی۔ دوسرے وہ اس کی اکلوتی خالہ کی اکلوتی بیٹی تھی اور تیسرا کہ وہ واقعی اتنی خوب صورت اتنی پیاری تھی کہ بے ساختہ دل پیار کرنے پہ آمادہ ہو اٹھتا۔

"ملکہ آنٹی کہاں ہیں؟" اس نے اپنی خالہ کا پوچھا۔

"ایک میٹنگ تھی ان کی' پھوپھو نے انہوں نے بوتیک بھی جانا تھا کسی کی شادی کے لیے کچھ ڈریس ڈیزائن کر رہی ہیں' اسی لیے زیادہ مصروفیت ہے آج کل۔"

"اف اتنا کام کرتی ہیں' میں تو تھک جاتی ہوں گی۔"

"ملکہ پھوپھو کا حوصلہ بہت بلند ہے' میں ان کی شخصیت کو آئیڈلائز کرتی ہوں۔" اریبہ نے ان کی ہمت و حوصلے کو سراہا تھا۔

"ہوں! یہ تو ہے۔۔۔ اس بے رحم معاشرے میں بڑی جنگ لڑی ہے انہوں نے' یہ ان کی کامیابی ہے کہ لوگ ان کے نام پہ ہی چیز خرید لیتے ہیں۔"

اریبہ کو اپنی پھوپھی ملکہ آفاق بہت اٹریکٹ کرتی تھیں' وہ ان سے بہت متاثر ہوتی تھی' جنہوں نے شوہر کی وفات کے بعد بہت جدوجہد کی تھی۔ اور آج وہ ڈریس اور فیشن کے میدان میں ایک کامیاب خاتون تھیں۔۔۔!

☼ ☼ ☼

"تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟" مقدم جاہ اپنے سامنے بیٹھے بیٹے کو تذبذب کا شکار دیکھ کر خود ہی پوچھ بیٹھے۔۔۔

"پاپا! وہ میں مہر کو۔۔۔" اس نے بمشکل چار پانچ لفظ جوڑے۔

"پسند کرتا ہوں۔۔۔" اس نے بڑی دقت سے جملہ مکمل کیا تھا۔

"صرف پسند کرتے ہو؟" انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں پاپا! صرف پسند نہیں ہے۔" وہ محتاط انداز میں بولا۔ "میں اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔" مقدم جاہ نے اس کے اس صاف اظہار پہ سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور کتنی ہی دیر اسے دیکھتے ہی رہے۔

"ہم جو کچھ سوچتے ہیں وہ کبھی نہیں ہوتا۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا سوچا تھا آپ نے؟" معظم ٹھٹکا۔

"سوچا تھا کہ اس گھر کی بہو مومو بنے گی۔۔۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" وہ حیران رہ گیا۔

"لیکن پاپا! میں نے کبھی مومو کو اس نظر سے نہیں دیکھا۔" معظم نے نفی میں سر ہلایا۔

"تم میرے اکلوتے بیٹے ہو تمہاری پسند مقدم ہے' لیکن میرا خیال تھا کہ تم ملکہ کا ساتھ دو گے۔۔۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ تم اس کے بیٹے بنو گے۔ اسے تھوڑی ڈھارس ہو جائے گی' میراں کا تو ماشاء اللہ اپنا بھی بیٹا ہے اسے کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن ملکہ۔۔۔ وہ واقعی اکیلی ہے' اسے بیٹے کی ضرورت ہے اور مومو بھی تم سے کافی اٹیچ ہے۔"

"آئی ایم سوری پاپا! میرے دل و دماغ میں اس حوالے سے دور دور تک بھی مومو کا گزر نہیں ہے' میں اس کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔ آئی ایم رئیلی سوری۔"

مقدم جاہ چپ ہو گئے' چند ثانیے یونہی خاموشی چھائی رہی پھر معظم بولا۔

"آپ ذیشان انکل سے بات کریں۔۔۔ ان کے کسی اسٹوڈنٹ کا مہر کے لیے پرپوزل آیا ہوا ہے حنان درانی کا۔"

"کیا ذیشان مان جائے گا؟"

"نہ ماننے کی کوئی وجہ بھی تو نہیں ہے۔۔۔؟" معظم کو یقین تھا۔

"اور جو تم نے دوسرا کام شروع کر رکھا ہے؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"وہ تو اس ماہ اوکے ہو جائے گا۔"

"وہ بھی ہو جائے گا تو پھر شادی کب کرو گے؟"

"چار سال بعد۔"

"دیکھو بیٹا! چار سال میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے؟ میں کسی کی بیٹی کو چار سال کے لیے باندھ کے نہیں رکھنا چاہتا' جب تم فارغ ہو جاؤ گے' واپس آؤ گے تو پھر سارے معاملات طے کر لیں گے۔"

"منگنی میں کیا حرج ہے؟" معظم کو اعتراض ہوا...

"تم اگر مہر سے شادی کرنا چاہتے ہو تو تمہاری شادی مہر سے ہی ہو گی' جب تک تم واپس آؤ گے میں مہر کی کہیں شادی نہیں ہونے دوں گا اور اگر تمہارے وہاں قدم ڈگمگا گئے تو پھر مہر کو بھول جانا۔" مقدم جاہ نے گویا معاملہ طے کیا۔

"یعنی مہر میری لاشبہ رہے گی؟" معظم نے یقین پکا کرنا چاہا۔

"بالکل..." انہوں نے اسے یقین دلایا۔

"آپ ذیشان انکل سے بات کریں گے؟"

"یہ اب میرا مسئلہ ہے' تمہارا نہیں' مہر کا اب کوئی پرپوزل نہیں آئے گا بس تم اب کوشش کرو کہ تم نے اپنا کیریئر بنانا ہے اور کامیابی حاصل کرنی ہے۔" انہوں نے اسے تسلی دی تھی اور معظم کے چہرے پہ اطمینان بھری مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"تھینک یو پاپا! تھینک یو سوچ۔" وہ بے ساختہ ان سے لپٹ گیا۔

اور مقدم جاہ بیٹے کی اس قدر خوشی پہ خود بھی مسکرا دیے تھے!

☼ ☼ ☼

"معظم انگلینڈ جا رہا ہے؟" میراں بیگم حیران رہ گئی تھیں۔

"جی آج اس کا ویزا اوکے ہو گیا ہے۔" مہر مسکرا رہی تھی۔

"اس نے پہلے تو ذکر نہیں کیا؟"

"بس وہ چاہتا تھا کہ سب کو سرپرائز دے گا۔"

"تمہیں بھی؟" انہوں نے بیٹی کو دیکھا۔ مقدم جاہ' میراں بیگم اور ذیشان احمد سے مہر اور معظم کے رشتے کی بات کر چکے تھے' معظم ان کا دیکھا بھالا گھر کا بیٹا تھا انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا سو انہوں نے ہامی بھر لی تھی لیکن یہ بات ابھی ان تینوں میں ہی تھی انگیجمنٹ اور شادی کی رسمیں معظم کی واپسی تک ملتوی کر دی تھیں' حالانکہ مقدم جاہ نے اس کے اسٹڈی ویزے کا ذکر کیا تھا ان سے' لیکن اتنی جلدی اس کی تیاری بھی ہو جائے گی میراں بیگم کو اندازہ نہیں تھا۔

"مجھے تو اس نے اسی روز بتا دیا تھا جس روز ویزے کے لیے اپلائی کیا تھا۔" مہر کے لہجے میں محبت کا غرور بول رہا تھا۔

"تم خوش ہو اس کے جانے پہ؟"

"کیوں نہیں؟ یہ اس کی کامیابی کا پہلا قدم ہے اور مجھے خوشی تو ہو گی۔"

"تمہیں ڈر نہیں لگتا مہر؟"

"کس بات سے؟"

"معظم کے بدل جانے سے؟" میراں بیگم نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"وہ آپ کو ایسا لگتا ہے؟" مہر ماں کے خدشے پہ حیرت زدہ ہوئی تھی۔

"وہ ایسا نہیں ہے بیٹا! لیکن موسم بدلتے دیر نہیں لگتی' وہ رنگوں کا دیس ہے اور رنگ انسان کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے ہیں' میں چند حیا دیتے ہیں بیٹا!"

"امی! آپ پریشان نہ ہوں' معظم پہ بھروسہ رکھیں' وہ کمزور کردار کا نہیں ہے۔" مہر نے اپنی ماں کو تسلی دی۔

اور معظم اپنے گھر میں اپنی ماں کو تسلیاں دے رہا تھا۔

"مما پلیز! آپ کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہیں؟ میں ان شاء اللہ ٹھیک چار سال بعد واپس آجاؤں گا' چار سال گزرنے کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔" اس نے ان کے ہاتھ تھام رکھے تھے لیکن نشاط بیگم متذبذب تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے میوزک سن رہی تھی جب ملکہ دروازہ کھول کے اندر داخل ہوئی تھیں۔ موموں نے چونک کر ان کی سمت دیکھا تھا۔

"آج کل تم ہر وقت گھر پہ رہنے لگی ہو' خیریت تو ہے نا؟" انہوں نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔

"جی سب خیریت ہے۔"

"کچھ خبر بھی ہے؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"کیسی خبر؟" موموں نے انہی سے پوچھا۔

"معظم انگلینڈ جا رہا ہے۔"

"واٹ؟" وہ یکدم اچھل کر کھڑی ہو گئی تھی... "معظم انگلینڈ جا رہا ہے؟ مگر کب؟ آپ کو کس نے بتایا؟" موموں کی آواز حیرت اور بے یقینی سے عجیب سی ہو گئی تھی۔

"تمہارا دوست ہے اور تمہیں پتا ہی نہیں؟" ملکہ کو بھی تعجب ہو رہا تھا۔

"میں اتنے دنوں سے اس کی طرف گئی ہی نہیں۔"

"تو کیا وہ بھی اتنے دنوں سے نہیں آیا؟"

"آیا تھا ابھی کل شام کو ہی تو آیا تھا لیکن اس نے تو مجھے کچھ بھی نہیں بتایا؟" موموں سوچ کر ہی پاگل ہونے لگی تھی کہ معظم اس سے دور جا رہا ہے۔

"مجھے تو ابھی مقدم بھائی نے بتایا ہے' اس کا ویزا اور ٹکٹ اوکے ہو گئے ہیں' وہ پرسوں جا رہا ہے۔"

ملکہ کی مزید اطلاع پہ موموں کا حلق بند ہونے لگا تھا۔ وہ آنسوؤں کا پھندا حلق میں لیے چپل پہن کر باہر نکلی تھی۔

"میں پوچھتی ہوں اس سے' اس نے چھپایا کیوں؟" وہ کہتی ہوئی سیڑھیاں اتر گئی تھی۔

"موموں!" ملکہ نے پیچھے سے آواز دی تھی موموں سن کر بھی نہیں رکی تھی لیکن معظم کے گیٹ تک جا کر اس کے تیز قدم سست پڑ گئے چوکیدار نے اس کے لیے دروازہ کھول دیا تھا وہ اندر جانے کے بجائے واپس مڑ گئی' اس کے قدم پھر اپنے گھر کی سمت اٹھ رہے تھے۔ وہ جتنی تیزی سے گئی تھی اتنی ہی سستی سے واپس آئی تھی۔

"کیا ہوا؟" ملکہ آفاق سامنے ہی سیڑھیوں پہ کھڑی تھیں۔

"کیا ہوا اگر اس نے نہیں بتایا؟ ہمیں اتنی اجارہ داری جتانے کی کیا ضرورت ہے؟" موموں استہزائیہ بولی تھی۔

"تم اپنا دل کیوں چھوٹا کر رہی ہو؟ سب کی اپنی اپنی لائف ہے۔ کوئی بھی اپنی لائف میں انٹرفیئر کرنا پسند نہیں کرتا۔" انہوں نے اسے سمجھایا۔

"مگر ماما! اتنی بڑی بات؟" موموں کی آواز بھرا گئی تھی۔

ملکہ آفاق نے چونک کر بیٹی کی طرف دیکھا' انہیں ایک لمحے کے لیے شک گزرا کہ سامنے موموں نہیں ملکہ کھڑی ہو۔

"وہ جا رہا ہے تو تم اتنی اداس کیوں ہو رہی ہو؟" ان کے لہجے میں پتھروں کی سی سختی اتر آئی تھی۔

"آئی ایم سوری موموں!" اس کے عقب سے معظم کی بجھی بجھی سی آواز سنائی دی تھی۔ وہ دونوں ماں بیٹی چونک گئیں۔ معظم نجانے کب وہاں آ رکا تھا۔

"آئی ایم سوری۔ میرا خیال تھا کہ سب کو سرپرائز دوں گا تو سب کو خوشی ہو گی لیکن سب کی آنکھوں میں آنسو ہیں' میں تو سب کی مسکراہٹ اور خوشی دیکھنا چاہتا تھا۔" معظم افسردگی سے بولا۔

"تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ تم ہمیں چھوڑ کر اتنی دور چلے جاؤ گے؟" موموں بے ساختہ بول پڑی تھی۔

"کچھ عرصہ کی بات ہے بھئی' صرف چار سال لگیں گے۔" معظم نے اسے کندھوں سے تھام لیا تھا۔

"چار سال کا بچھڑنا' صرف؟" "نہیں ہوتا معظم!"

"تم کیوں مجھے کمزور کر رہی ہو؟ مہر کو دیکھو اس نے اتنا حوصلہ دیا ہے مجھے۔" اتنی ہمت بندھائی ہے۔" اس نے مثال دی۔

"میرا دل مہر کے دل جیسا بڑا نہیں ہے۔"

"اف! تم سب کیوں میری خواہش کو نہیں سمجھ رہے' گھر میں امی رو رہی ہیں' اریبہ اور املنہ لوگ اداس ہیں' یہاں تم دریا بہا رہی ہو۔۔۔ اور۔۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"اور؟" موموں نے دہرایا۔

"اور میں خود بھی ڈبل مائنڈڈ ہو گیا ہوں۔"

"نہ جاؤ۔" وہ فوراً بولی تھی۔

"مہر تو کہتی ہے' چلے جاؤ۔"

"مہر؟" موموں کو اچنبھا ہوا۔

"ہاں' وہ میری کامیابی اور میری خوشی میں خوش ہے۔۔۔ اور تم نے رونا دھونا مچا رکھا ہے۔"

"میں موئل آفاق ہوں اور وہ مہر ذیشان' بہت فرق ہے ہمارے جذبات اور احساسات میں' وہ سہہ سکتی ہے لیکن میں نہیں سہہ سکتی۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"لگتا ہے امی اور تم ہی مجھ سے زیادہ پیار کرتی ہو' رو رو کر حشر کر رہا ہے۔"

"تمہیں اگر ہمارے پیار کا اندازہ ہو جائے تو تم کبھی بھی جدا ہونے کا نہ سوچو۔"

"ملکہ آنٹی ٹھیک کہتی ہیں' تم واقعی اتنی بڑی ہو کر بھی بچی ہی ہو۔" اس نے موموں کے سر پہ چپت لگائی اور موموں اس کے انداز پہ جھینپ گئی تھی۔

"میں بچی نہیں رہی اب بڑی ہو گئی ہوں۔" اس نے اطمینان سے کہا تھا۔

"اچھا مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ تم بڑی ہو گئی ہو؟" معظم نے اسے شرارت سے چھیڑا تھا اور موموں نہ چاہتے ہوئے بھی ہنس پڑی تھی۔۔۔!

☼ ☼ ☼

مقدم جاہ اور میراں بیگم کی ساری فیملی معظم کو ایئرپورٹ سی آف کرنے گئے تھے' ساس تک کہ ملکہ آفاق بھی۔ لیکن صرف ایک موموں تھی جس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ معظم کو جدا ہوتے دیکھ سکتی۔ اس نے پہلے ہی ایئرپورٹ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ صبح ناشتا معظم کے ساتھ ہی کیا تھا لیکن واپس آکر اپنے کمرے میں بند ہو گئی تھی۔ جب معظم کی روانگی کا وقت ہوا تو وہ اس سے ملنے اس کے گھر بھی آیا تھا لیکن اس نے دروازہ بند کر لیا تھا۔

"میں برداشت نہیں کر سکوں گی معظم! تم چلے جاؤ۔" وہ اندر دروازے سے لگی کھڑی تھی اور دروازے کے باہر وہ کھڑا تھا۔

"موموں! وہ کب سے کھڑا ہے اس سے مل لو۔" ملکہ نے اوپر آتے ہوئے کہا۔

"سوری مام! میں نہیں مل سکتی۔" اس نے انکار کر دیا اور پھر معظم کو مجبوراً "ملے بغیر ہی خدا حافظ کہنا پڑا۔ موموں اس کے قدموں کی آہٹ دور ہوتی محسوس کر کے رو پڑی تھی۔۔۔ وہ چلا گیا تھا!

☼ ☼ ☼

تم میری زندگی ہو یہ سچ ہے
زندگی کا مگر بھروسہ کیا؟

معظم نے انگلینڈ جا کر نیا نمبر لیا تو اس نمبر پہ سب سے پہلے جانے والا میسج موموں کا ہی [illegible] پڑھ کے مسکرا دیا تھا۔ اس نے شاعر [illegible] کر ناشتا کیا اور کچھ دیر کے لیے موبائل [illegible] اسے پتا تھا کہ موموں اس کے جواب کا انتظار کر رہی ہو گی اسی لیے میسج ٹائپ کرنے لگا۔

ہم [illegible] نہیں ہوتی کہ
[illegible] حیات ہوتے ہیں!

معظم نے شعر کا جواب شعر سے دیا تھا اور پھر ٹیبل پر رکھی فریم شدہ تصویر اٹھا کر دیکھنے لگا مہر اور موموں کی یہ تصویر اسی نے بنائی تھی اس تصویر میں وہ دونوں مسکرا رہی تھیں۔ ان کے چہرے' بہت فریش لگ رہے تھے۔۔۔ ہر غم' ہر دکھ سے آزاد چہرے۔۔۔ ان کی تصویر دیکھتے ہوئے معظم کے لبوں پہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔۔۔

اور بیٹھے بیٹھے اس کا مہر سے بات کرنے کو دل چاہنے لگا اس نے موبائل اٹھا کر مہر کا نمبر ڈائل کر لیا۔ کال حمزہ نے ریسیو کی تھی۔

"السلام علیکم معظم بھائی! کیسے ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں' تم سناؤ کیسے ہو؟ کیا ہو رہا ہے؟" معظم کی نظریں مہر کی تصویر پہ تھیں۔

"وہی کچھ ہو رہا ہے جو آج سے ایک [illegible] پہلے ہو رہا تھا۔ آپ کو گئے ہوئے ایک ہفتہ ہوا ہے' اور پاکستان میں ایک ہفتہ کوئی انقلاب نہیں لا سکتا۔" [illegible] کی بات پہ معظم ہنس پڑا تھا۔

"ستائے ہوئے لگ رہے ہو۔"

"ہر پاکستانی ہی ستایا ہوا ہے' یہاں سکون میں بھلا کون ہے؟"

"تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ تم بھی انقلاب لانا چاہتے ہو۔"

"توبہ توبہ معظم بھائی! ہماری آنے والی سات نسلیں بھی انقلاب نہیں لا سکتیں۔" اس نے نخوت سے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ کیوں؟" معظم کو تعجب ہوا تھا۔

"کیونکہ ہم لوگوں میں بدبختی اور بے ایمانی سما گئی ہے' خود غرضی عروج پہ ہے کوئی کسی دوسرے کا بھلا ہوتے نہیں دیکھ سکتا' حکومت عوام کو نگل رہی ہے اور عوام مرغ بسمل کی طرح تڑپ تڑپ کر جان دے رہی ہے۔ انہوں نے اپنے لیے خود اذیت کا طریقہ ڈھونڈ رکھا ہے۔"

حمزہ بولنے پہ آیا تو بولتا چلا گیا تھا اور معظم ہکا بکا سنتا رہ گیا۔

"حمزہ یہ تم ہی ہو ناں؟"

"جی میں ہی ہوں۔"

"اتنے تلخ کیوں ہو رہے ہو؟"

"ابھی ابھی نیوز چینل پہ ایک نیوز سنی ہے۔" حمزہ نے اپنی تلخی کی وجہ بتائی۔

"کیسی نیوز؟"

"ایک بہن نے اپنی بہن کو زہر دے کر مار دیا' تفصیلات جاننے کے بعد پتا چلا کہ وہ دونوں ایک ہی لڑکے پہ فدا تھیں' لیکن اس لڑکے کے ساتھ شادی تو صرف ایک بہن کی ہی ہو سکتی تھی ناں؟ اب وہ لڑکی پولیس کی حراست میں ہے۔ اس نے اقبال جرم بھی کر لیا ہے اور اس وقت وہ اپنی بہن کی موت پہ اشک بار بھی ہے' اسے اب احساس ہو رہا ہے کہ اس نے جنون اور جذبات میں آکر اپنی بہن کی جان لے لی ہے' وہ سزا کی طلب گار ہے۔" حمزہ نے اسے پوری تفصیل بتا ڈالی۔

"اف یار! صبح صبح کیا خبر سنا ڈالی ہے۔" اسے افسوس بھی ہوا اور اس لڑکی پہ غصہ بھی آیا تھا۔

پھر کچھ دیر اور باتیں کرنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا تھا۔ مہر سے بات کرنے کا ارادہ اس نے رات پہ ملتوی کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دو سال یعنی سات سو تیس دن!

لیکن موئل آفاق سات سو تیس دن' چودہ سو ساٹھ دن لگنے۔ دن اتنے لمبے' مہینے اتنے طویل اور سال اتنی صدیوں کا روپ دھار لیں گے یہ کب سوچا تھا اس نے؟ اس نے تو سوچا تھا کہ محبت کو کنارا ابھی مل ہی جائے گا۔ معظم کون سا غیر تھا۔ جب چاہتی اظہار کر لیتی۔۔۔ وہ پہلے بھی اس کا اپنا تھا' وہ اب بھی اس کا اپنا تھا۔ شکر تھا کہ اس کے دل نے اسے کسی اور جگہ خوار نہیں کیا تھا۔ بس مہر کی بات گھر میں رہ گئی تھی اور وہ اسی میں خوش تھی اور اسی خوشی میں جیسے تیسے ہی سہی اس نے دو سال گزر لیے تھے۔

دو سال تو مہر اور معظم نے بھی گزارے تھے' اپنے مستقبل کے خواب دیکھتے ہوئے خوشگوار اور خوش آئند خیالوں کے ہمراہ۔۔۔! معظم نے اگر ثابت قدم رہ کر وقت گزارا تھا تو صرف مہر کی محبت کے سہارے۔۔۔ اپنی اپنی جگہ انتظار تینوں کو ہی تھا چار سال کے گزرنے کا۔

"آج دو سال ہو گئے ہیں معظم کو انگلینڈ گئے

ہوئے۔" موموتے کیلنڈر پہ سرخ مارکر سے پندرہ کے ہندسے پہ سرکل بنا کر نشان لگا دیا تھا۔

"یاد تھا تمہیں؟" مہر نے گردن موڑ کر دیوار کے پاس کھڑی کیلنڈر کو دیکھتی موموسے پوچھا۔

"کیوں؟ کیا تم بھول گئی ہو؟" موموتے مہر کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ مہر نظر چرا گئی تھی۔

"یہ کوئی بھولنے کی بات ہے؟" مہر کا لہجہ دھیما تھا۔

"کیا ہو رہا ہے سویٹی؟" ملکہ آفاق اچانک ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھیں۔

"آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔" موموان کے قریب آ گئی۔

"کوئی خاص بات؟"

"میں نے اور مہر نے شاپنگ پہ جانا تھا میں نے سوچا آپ آجائیں تو پھر جائیں گے۔"

"مہر؟" مسز ملکہ آفاق نے چونک کر دیکھا۔

"السلام علیکم آنٹی!" مہر صوفے سے اٹھ کر سامنے آ گئی۔

"امی آپ کو سلام کہہ رہی تھیں۔" مہر نے میراں بیگم کا سلام ملکہ آفاق تک پہنچایا۔

"وعلیکم السلام' بیٹھو تم لوگ باتیں کرو۔" انہوں نے سلام کا جواب دے کر انہیں بیٹھنے کو کہا۔

مہر نے شروع سے یہ محسوس کیا تھا کہ میراں بیگم ملکہ آفاق سے بہت محبت کرتی ہیں لیکن ملکہ آفاق ہمیشہ ان کے ساتھ سرسری سا پیش آتی ہیں۔ ان دونوں بہنوں میں کبھی بہنوں سی بات نظر نہیں آئی تھی۔ باقی ہر معاملے اور ہر رشتے کے حوالے سے وہ بہت کیئرنگ اور لونگ تھیں لیکن میراں بیگم کے معاملے میں وہ خاصی لاتعلقی اور لاپروائی کا مظاہرہ کرتی تھیں۔

"بیٹھنے کا وقت نہیں ہے ہم اب چلتے ہیں۔" مومو نے نفی میں سر ہلایا۔

"او کے جاؤ' لیکن دھیان سے 'ڈرائیونگ احتیاط سے کیا کرو۔" وہ اپنا بیگ کندھے پہ ... صوفے پہ رکھتے ہوئے بولیں۔ مہراں کو جب ... دیکھتی تھی

متاثر کن نظروں سے دیکھتی تھی۔ ان کی شخصیت ہی اتنی باوقار اور چارمنگ تھی کہ سامنے والا حقیقتاً متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔

وہ دونوں باہر نکل آئی تھیں' پندرہ دن ہوئے تھے جب مومو کو ڈرائیونگ کی اجازت ملی تھی۔۔۔ اور وہ اس چیز کو مکمل کرانجوائے کر رہی تھی۔ آج اسی نے مہر کو شاپنگ پہ چلنے کی آفر کی تھی اور مہر اسے ٹال نہ سکی۔

"معظم کا فون آیا تمہاری طرف؟" موموتے گلاسز بالوں میں اٹکاتے ہوئے پوچھا۔

"تقریباً" روز آتا ہے۔" مہر نے سرسری سا کہا۔

"واپسی کے لیے کیا کہتا ہے؟" وہ گاڑی مین روڈ پہ ڈال چکی تھی۔

"وہی دو سال بعد۔"

"مجھے یاد کرتا ہے؟"

"تمہیں بھولا ہی کب ہے؟" مہر ہنسی تھی۔

"میری آواز تو بھول ہی گیا ہو گا؟" موموتے دو سال ہوئے تھے معظم کو فون نہیں کیا تھا ورنہ ہی اس کا فون سنا تھا بس میسجز پہ بات کرتی تھی یا پھر نیٹ پہ کبھی وہ فارغ ہوتا تو چیٹ ہو جاتی تھی۔

"تمہارے میسجز کو بہت انجوائے کرتا ہے۔ خصوصاً پوئٹری کو۔" مہر نے آگاہ کیا۔

"میری پوئٹری کا جواب وہ پوئٹری سے ہی دیتا ہے۔"

"بتاتا ہے مجھے۔" مہر نے سر ہلایا۔

"چھپاتا کچھ نہیں ہے؟" مومو سوچ کر رہ گئی۔

"اور کیا کہتا ہے؟" اس نے بات جاری رکھی۔

"کہتا ہے ان دو سالوں میں مومو کتنی بڑی ہو گئی ہو گی؟" مہر دلچسپی سے بتا رہی تھی۔

"اسے کہو مومو اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ تم پورے کے پورے اس کے دل میں سما سکتے ہو۔" وہ سوچ کر خود ہی مسکرائی تھی۔

"تم نے کیا کہا پھر؟"

"میں نے کہا کہ مومو جیسی حسینہ تو ہمارے پورے

شہر میں نہیں ہے۔" مومو دلچسپی سے بتا رہی تھی۔

"پھر اس نے کیا کہا؟"

"وہ کہتا ہے مومو کو دیکھنے کے لیے دل مچل گیا ہے۔" مہر نے حرف بہ حرف بتایا اور مومو کا دل دھڑک گیا تھا۔ محبت کے رخساروں پہ سکون کی پھوار برس گئی تھی۔ محبوب نے اسے دیکھنے کی طلب کی تھی۔ وہ مومی سے ہیر بن بیٹھی ہے!

"مومو بریک لگاؤ۔" اس نے اسے متوجہ کیا تو وہ چونک کر ہوش میں آئی تھی۔ وہ شاپنگ مال سے آگے نکل آئی تھی۔۔۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے یوٹرن لیا وہ دونوں گاڑی سے اتر رہی تھیں جب کسی مردانہ آواز پہ ٹھٹک گئیں۔

"السلام علیکم!" کافی خوب صورت اور ہینڈسم نوجوان اپنی گاڑی کے پاس سے ہٹ کے ان کے قریب آیا تھا۔

"وعلیکم السلام، آپ کی تعریف؟" مومو گاڑی لاک کر کے سیدھی ہوئی تھی لیکن اس کی نظریں حیران سے انداز میں دیکھنے والی مہر پہ تھیں۔

"میری تعریف مس مہر ذیشان کو پتا ہو گی۔۔۔؟" اس نے مہر کی طرف اشارہ کیا۔

"مہر ذیشان؟" مومو نے حیرت سے مہر کی طرف دیکھا۔ مہر اسے پہچان چکی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ بابا کے اسٹوڈنٹ رہ چکے ہیں حسان درانی۔" مہر نے بمشکل تعارف کروایا۔

"او اچھا!" مومو نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ غالباً" ڈریس ڈیزائنر مسز ملکہ آفاق کی بیٹی ہیں۔۔۔ ان کے بوتیک کی وال پہ آپ کی پکچر دیکھی تھی۔۔۔؟"

"جی!" مومو نے اثبات میں جواب دیا۔

"مومو ہمیں چلنا چاہیے۔۔۔" مہر کو یوں سر راہ کھڑے ہونا معیوب لگ رہا تھا۔

"میری بات سنے بغیر؟" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کیسی بات؟" اسے حسان درانی کی موجودگی سے الجھن ہوئی۔

"میرا پرپوزل آج بھی وہی ہے۔" اس نے مہر کو سر تا پا نرم نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کے اس سوال کا جواب میرے بابا کے پاس ہو گا۔"

"لیکن میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔"

"آپ کا انتظار فضول ہے۔" وہ سختی سے بولی۔

"یہ تو وقت بتائے گا۔"

"مسٹر حسان درانی ہمارا راستہ چھوڑ دیجئے۔" دل نہیں چاہتا۔

"آپ اپنی حد سے بڑھ رہے ہیں۔"

"شکر کریں کہ میں ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ دو دن پہلے آیا ہوں ارادہ یہی تھا کہ آپ کے گھر جاؤں لیکن آپ سے یہیں ملاقات ہو گئی۔" اس نے جس انداز سے کہا وہ دونوں اندر سے سہم گئی تھیں۔

"ڈونٹ وری آپ پریشان نہ ہوں میں تھرڈ کلاس عاشق نہیں ہوں میرا معیار بہت اعلا ہے آپ اپنے آپ کو ہی دیکھ لیجیے میں کیسی چیز پسند کرتا ہوں خیر آپ میرے استاد کی بیٹی ہیں آپ کی عزت سر آنکھوں پہ جائیے شاپنگ کیجیے لیکن مجھے بھولیے گا مت۔۔۔"

اس نے راستے سے ہٹتے ہوئے انہیں جانے کا اشارہ کیا اور وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتی اندر چلی گئیں مگر وہ دونوں اس حد تک پریشان ہو چکی تھیں کہ ان کا شاپنگ سے دھیان ہٹ چکا تھا سو وہ واپس آ گئی تھیں۔

☆☆☆

بارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے اور وہ اپنا موبائل سامنے رکھے بیٹھی تھی۔ چار سالوں میں پہلی مرتبہ اس نے معظم سے بات کرنے کو دل چاہا تھا۔ آج بارہ بجے کے بعد ان دونوں کا برتھ ڈے تھا اور مومو کا ارادہ تھا کہ پہلے وہ معظم کو وش کرے گی لیکن پانچ منٹ تھے کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہے تھے گھڑی کی ٹک ٹک اس نے انگلیوں پہ گننا شروع کر دی اور جیسے ہی گیارہ بج کے انسٹھ منٹ ہوئے اس نے فوراً اپنا موبائل اٹھا لیا تھا۔ اپنے دل کی بھاگتی دوڑتی دھڑکنوں کو ایک ہی جگہ ٹھہرایا اور نمبر ڈائل کیا۔

کال مل گئی تھی لیکن رنگ نہیں جا رہی تھی۔ دوسری طرف سے نمبر کی بزی ٹیون مل رہی تھی۔۔۔ اس نے ایک منٹ کے وقفے سے پھر ٹرائی کیا لیکن وہی بزی ٹیون دوسری تیسری چوتھی اور پانچویں بار بھی نمبر بزی ہی ملا۔ مومو جھنجلا گئی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو، ہیپی برتھ ڈے ٹو یو، ہیپی برتھ ڈے مائی ڈیئر ڈارلنگ۔" ملکہ آفاق کرسٹل کی چھوٹی سی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھیں۔ ٹرالی کے اوپر چھوٹا سا کیک سجا ہوا تھا اور کیک پہ کینڈل روشن ہو رہی تھی۔۔۔ اپنی ماں کی اتنی محبت پہ اس کی آنکھوں میں مزید آنسو آ گئے تھے وہ ننگے پیر بیڈ سے اتر کر بھاگ کے ان سے لپٹ گئی تھی۔

"تھینک یو ماما۔ تھینک یو سو مچ۔" وہ ان سے لپٹ کر رو رہی تھی۔

"آئی لو یو میری جان، آئی لو یو سو مچ۔" وہ اس کا سر تھپکتے ہوئے اس کی کمر سہلانے لگی تھیں۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔۔۔!" اچانک کھلے دروازے سے اریبہ اور لائبہ زور زور سے گنگناتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھیں۔ مومو ان کی محبت پہ مسکرا دی۔۔۔ رات کے اس پہر وہ اپنے گھر سے اس کے گھر صرف وش کرنے آئی تھیں۔

"تھینکس۔۔۔"

"چلو اب جلدی سے کیک کاٹو میں بس کیک کھانے کے لیے جاگ رہی ہوں۔۔۔" اریبہ شرارت سے بولی۔

"تمہارے بھائی نے تمہیں کیک نہیں کھلایا؟" مومو بے ساختہ کہہ گئی۔

"ارے ان کو تو ابھی وش ہی نہیں کیا انہیں وش کرنے کے لیے کال ملائی تو ان کا نمبر پہلے سے بزی تھا تم سوچو میں ایک بار پھر ٹرائی کرتی ہوں۔" اریبہ نے اپنے نمبر سے پھر اس کا نمبر ڈائل کیا لیکن وہی بزی ٹیون۔۔۔ مومو نے جلتے سلگتے دل کے ساتھ سر جھٹک دیا تھا۔

"چلو چھوڑو میں تمہیں کیک کھلاتی ہوں۔" اس نے چھری تھام لی تھی۔ آج وہ بیس سال کی ہو چکی تھی مسز ملکہ آفاق کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا وہ اتنی سی دیر میں کئی بار اس کی نظر اتار چکی تھیں۔۔۔ اس کا صدقہ بھی دیا تھا۔۔۔ تھوڑی دیر میں اس نے کیک کاٹا اور پھر ان تینوں میں سرو کیا تھا آدھے گھنٹے بعد وہ تینوں چلی گئیں اور مومو اپنے بیڈ روم میں اکیلی رہ گئی۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد مہر کا فون آیا تھا اس نے اسے وش کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ مہر بولتی رہی اور وہ سنتی رہی۔۔۔ دس منٹ بعد اس کا فون بند ہوا تو معظم کے میسجز آنا شروع ہو گئے۔۔۔ وہ بھی اسے وش کر رہا تھا۔

"میں نے تمہیں کال کی تھی تمہارا نمبر بزی تھا۔" مومو نے بے دلی سے لکھا۔

"مہر کی کال آ گئی تھی مجھے وش کرنے کے لیے۔" مومو کو حسب توقع ریپلائی موصول ہوا۔

"میں نے بھی وش کرنے کے لیے کی تھی۔"

"تو یار اب کر لو بہت دل چاہ رہا ہے تمہاری آواز سننے کو۔"

"مگر اب میرا دل نہیں چاہ رہا۔"

"میں کال کر لیتا ہوں۔"

"میں تمہاری کال یا کریڈٹ کی محتاج نہیں ہوں۔"

"ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو؟" معظم کی حیرانی اس کے میسج سے ظاہر ہو رہی تھی۔

"تم کوئی اور بات کرو۔۔۔" مومو نے بات بدلنی چاہی۔

"آئی مس یو۔" معظم نے آئی مس یو کا پکچر میسج سینڈ کیا تھا۔

"تھینکس۔۔۔" اس نے فارمل سا لکھ دیا۔

"تھینکس کس لیے؟"

"مجھے مس کرنے کے لیے۔"

"تم بدل گئی ہو موسو!"

"میں جانتی ہوں اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم بھی بدل گئے ہو۔"

"ہاں یار! وقت بھی تو بدل گیا ہے چار سال واقعی "صرف" نہیں ہوتے۔" معظم نے آج موسو کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

"کب آ رہے ہو؟"

"بس چند دنوں تک۔"

"ٹھیک ہے پھر چند دنوں تک بات ہوگی۔ اللہ حافظ۔"

پھر موسو تکیے پہ سر رکھ کے لیٹ گئی تھی لیکن موبائل ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ چند سیکنڈ دیکھتی رہی پھر ٹائپ کرنے لگی۔

میری وحشتوں کو بڑھا دیا ہے جدائیوں کے عذاب نے
میرے دل پہ ہاتھ رکھو ذرا میری دھڑکنوں کو قرار دو

میسج ٹیگ میں جا کر اس نے معظم کے نمبر پہ میسج سینڈ کر دیا تھا اور خود آنکھیں موند لی تھیں.....!

☼ ☼ ☼

چار سال اور پچیس دن.....!

یعنی چودہ سو پچاسی دن بعد معظم جاہ اپنی کامیابی کی ڈگری لے کر پاکستان پہنچا تھا اور آج بھی اسے ایئرپورٹ سے ریسیو کرنے سب ہی گئے تھے سوائے موسو کے..... بقول اس کے وہ خود پہ اختیار نہیں رکھ سکتی تھی۔ معظم کی واپسی کی اسے اتنی خوشی تھی کہ خوشی کے مارے اپنا دل بند ہونے کا خدشہ تھا..... وہ سب کو بھیج کر اپنے گھر آگئی شاور لیا اور تیار ہو کر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا..... وہ معظم کو ذہن میں رکھ کے تیار ہوتی تھی۔ اسی لیے آئینہ دیکھا تو حیا سے سمٹ گئی۔ سارے رنگ لڑکیوں والے تھے انداز و اطوار سے شرم و حیا تک۔

"چھوٹی بی بی! معظم صاحب آگئے ہیں۔" ملازمہ کی آواز پہ اس کے ہاتھ سے پرفیوم کی شیشی چھوٹ گئی تھی جو ڈریسنگ ٹیبل سے ٹکرا کر نیچے قالین پہ جا گری لیکن ٹوٹنے سے بچ گئی تھی۔ موسو لپک کے دروازے کی سمت آئی۔

"موسو!" عین اسی وقت وہ بھی اندر داخل ہوا تھا دونوں کا تصادم بری طرح ہوا تھا۔

"معظم ہے؟" موسو لڑکھڑا کر سنبھل گئی اور معظم سنبھلتے ہوئے بھی لڑکھڑا گیا۔

"موسو تم؟" وہ سر تا پا اسے بے یقین نظروں سے دیکھ رہا تھا اور موسو اس کی نظر کے لمس سے ہی سمٹ گئی تھی۔

"میں تم سے پوچھ رہا ہوں؟" معظم نے اس کا بازو ہلایا۔

"کوئی شک ہے تمہیں؟" موسو نے نظر اٹھا کر اس کو دیکھا مگر اس کے چہرے پہ اس کی نظر ٹھہر نہیں سکی تھی۔ وہ کتنا خوب صورت کتنا فریش اور صحت مند ہو گیا تھا۔ موسو جی بھر کے دیکھ نہ پائی۔

"شک نہیں ہے شاک لگا ہے کیا موسو ایسی بھی ہو سکتی ہے؟" وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ خوش اور حیران ہو رہے تھے۔

"اور تم اور گڈ لکنگ ہو گئے ہو۔" وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"جانتا ہوں۔" وہ ہنس رہا۔

"میرے ساتھ گھر چلو سب انتظار کر رہے ہوں گے۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے باہر نکل رہا۔

"اوکے چلتی ہوں لیکن میرا ہاتھ تو چھوڑو۔" اس نے اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ نکالنا چاہا۔

"اب کہاں چل کے ہی چھوڑوں گا تم بڑے عرصے سے مبارک ہو مجھے ہر بات کا حساب دینا ہو گا تمہیں۔" معظم اس کی ایک بھی سنے بغیر اسے ساتھ لیے اپنے گھر آگیا تھا۔ موسو کی وجہ سے وہ اپنے گھر جانے کے بجائے سیدھا اس کے گھر آیا تھا اور جیسے ہی اسے لے کر واپس آیا وہ سبھی ہنس دیے تھے۔

"مجرم پکڑ لیا تم نے؟"

"جی بڑی مشکل سے پکڑ کے لایا ہوں۔" معظم اسے ساتھ لیے صوفے پہ بیٹھ گیا۔

"ملکہ ابھی نہیں آئی؟" مقدم جاہ نے موسو سے پوچھا۔

"تھوڑی دیر تک آجائیں گی۔" اس نے ٹائم دیکھ کر کہا۔

"معظم آگیا؟" تب ہی راہداری سے ملکہ آفاق کی آواز سنائی دی تھی۔

"ملکہ آنٹی؟" معظم نے آگے بڑھ کے ان سے ملا تھا۔ ملکہ آفاق نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور گلے لگا تھا۔ پہلی بار وہ کسی سے اس طرح ملی تھیں ورنہ ان کا ملنا ملانا بھی صرف سلام دعا تک یا ہیلو ہائے تک ہوتا تھا۔

"کیسے ہو مائی سن؟" انہوں نے بھی معظم کو توصیفی نظروں سے دیکھا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے آپ کیسی ہیں؟" وہ ان کے گرد بازو پھیلائے ہوئے بولا۔

"مجھ پہ بھی اللہ کا کرم ہے۔" کہتے ہوئے ان کی نظر سامنے صوفے پہ بیٹھی میراں بیگم کی سمت اٹھی تھی جن کے برابر ہی ذرا سے فاصلے پہ ذیشان احمد بیٹھے ہوئے تھے۔ صوفے کے ایک کونے پہ وہ تھے اور ایک کونے پہ میراں بیگم!

"آئیے بیٹھیے نا۔" معظم نے انہیں اپنے ساتھ بیٹھنے کا کہا۔

"تھینک یو۔" وہ کہتے ہوئے اس کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ موسو بھی وہیں بیٹھی ہوئی تھی۔

"سفر کیسا گزرا؟ تمہاری اسٹڈی کیسی رہی؟"

"ایک دم فنٹاسٹک۔"

"اپنے منہ میاں مٹھو؟" حمزہ نے چھیڑا۔

"تم میرا ریکارڈ دیکھ سکتے ہو۔"

"اس ملک میں آگئے ہو تو ریکارڈ دکھانے کی کوشش مت کرنا بلکہ سفارش اور رشوت دکھانے کا بندوبست کرو۔" حمزہ کی وہی جلی کٹی باتیں تھیں۔

"بیٹا! تم دم تو لینے دیا کرو۔" میراں بیگم نے بیٹے کو سرزنش کی تھی اور ذیشان احمد اور مقدم جاہ ہنس پڑے تھے۔

"یہی تو میرا فخر ہے میراں! آج کل دنیا جس احساس سے بے بہرہ ہو گئی ہے حمزہ وہی احساس دل میں لیے پھر رہا ہے۔" ذیشان احمد نے محبت پاش لہجے میں کہتے ہوئے بیٹے کی سمت دیکھا۔ میراں بیگم مسکرا دیں۔ اور ملکہ آفاق سنجیدہ ہو گئی تھیں۔

"ملکہ آنٹی چائے؟" حمزہ نے کپ ان کی طرف بڑھایا۔

"نو تھینکس۔" انہوں نے انکار کر دیا تھا۔

"کیوں آنٹی؟ اتنے مزے کی چائے ہے۔" معظم نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی لنچ کر کے سیدھی یہیں آئی ہوں۔ چائے کا موڈ نہیں ہے۔" انہوں نے نفی میں گردن ہلائی اور حمزہ نے مزید اصرار نہ کیا۔ مسز ملکہ آفاق تقریباً دس منٹ وہاں بیٹھیں اور پھر کھڑی ہو گئی تھیں۔

"کہاں جا رہی ہو ملکہ! اتنی جلدی؟" مقدم جاہ فوراً ذیشان احمد سے گفتگو کا سلسلہ ترک کرتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"مجھے آج فارم ہاؤس جانا تھا لیکن معظم کی وجہ سے تھوڑا لیٹ ہو گئی۔ سوچا پہلے اپنے بیٹے سے مل لوں۔" وہ مسکراتے ہوئے معظم کے بال بکھرا کر بولیں۔

"لیکن ملکہ! کچھ دیر بیٹھو تو سہی اتنے دنوں بعد ملے ہیں "کاموں کا کیا ہے کبھی ختم ہی نہیں ہوتے.....؟" میراں بیگم نے بھی انہیں رکنے کا کہا۔

"لیکن میرے لیے میرے کام اہم ہیں کام نہیں کروں گی تو مسز ملکہ آفاق روڈ پہ آجائے گی" آج کل کے دور میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا نہ ماں باپ نہ بہن بھائی نہ اولاد بس اگر کوئی چیز ساتھ دیتی ہے تو وہ انسان کی اپنی محنت ساتھ دیتی ہے محنت بھوکا نہیں مرنے دیتی اور نہ ہی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے دیتی ہے محنت کرو نام کماؤ اور عیش کرو اور میں بھی یہی کچھ کر رہی ہوں۔"

انہوں نے بڑی تفصیل سے جواب دیا تھا اور پھر جاتے جاتے ایک بار پھر رک گئیں۔

"اور ہاں میں بیوہ ہوں اور میرا بیٹا بھی نہیں ہے'

میں لے آتے ہیں۔ جو کچھ کرتا ہے خود کرتا ہے۔"

"وہ کہہ کر چلی گئیں اور ان کے لہجے میں محسوس کی جانے والی محرومی وہیں رہ گئی۔ وہ سب ہی لمحہ بھر کے لیے چپ ہو گئے تھے۔۔۔ بھری جوانی میں بیوی اور بیٹی کا ساتھ۔۔۔ وقت اور حالات نے انہیں دو ٹوک "لیا دیا سا" اور تلخ بنا دیا تھا۔ ان کی زندگی کا حاصل ان کی بیٹی تھی اور زندگی کا مقصد بیٹی کی خوشیوں کا حصول۔۔۔!

☼ ☼ ☼

معظم کو پاکستان آئے ہوئے ایک مہینہ ہو گیا تھا اور مومو نے محسوس کیا تھا کہ معظم کافی حد تک بدل گیا ہے۔ اس کی وہ شوخی اور شرارتیں کافی کم ہو گئی تھیں۔۔۔ وہ چھیڑ چھاڑ، وہ ہنسی مذاق، وہ لڑائی جھگڑا سب چار سال پیچھے رہ گیا تھا۔۔۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہنے لگا تھا اور مومو اتنے سالوں سے دل میں دبی باتیں دل میں دبا کے رہ گئی۔

وہ تو سوچتی تھی کہ معظم آئے گا تو وہ اپنے دل میں بھرا جدائی کا غبار دل کھول کے نکالے گی۔ کچھ اس کی سنے گی کچھ اپنی سنائے گی، اظہار کرے گی، اقرار کرے گی۔ لیکن۔۔۔! لیکن یہاں تو کچھ بھی اس کی سوچوں کے مطابق نہیں تھا۔ یہاں تو کچھ اور ہی ہو رہا تھا اور وہ اس "کچھ اور" سے بے کل اور بے چین پھر رہی تھی۔

وہ پورا دن اپنے گھر میں بولائی بولائی پھرتی چاہتوں کے پھول سینے سے لگائے تھے تو احساس ہوا تھا کہ بے رخی کی آگ تلوے بھی جلاتی ہے، پاؤں زمین پہ نہیں انگاروں پہ پڑتا ہے اور جلن روح تک ہوتی ہے۔ محبت کی طلب میں جذبات سلگتے ہیں، دل سے گیلی لکڑی کی مانند دھواں نکلتا ہے اور انسان کی پوری ہستی راکھ کا ڈھیر بننے لگتی ہے۔

نجانے کیا بات تھی کہ بہت دنوں سے مومو کا دل خدشوں کی زد میں تھا، ہر لمحہ عجیب سا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ اسے لگتا جیسے کچھ ہونے والا ہے اور یہی وہم اسے انتہائی ڈسٹرب کر رہا تھا۔ وہ بے چین ہو کر گھر سے نکل آئی۔

"مومو!" اریبہ نے اپنے ٹیرس سے اسے آواز دی تھی اس نے چونک کر ان کے ٹیرس کی سمت دیکھا۔

"یار ادھر آ جاؤ ہماری طرف۔ موسم بہت اچھا ہو رہا ہے میں نے پکوڑے بنائے ہیں چائے کے ساتھ۔" اریبہ بلند آواز میں بتا رہی تھی۔ مومو نے سر اٹھا کر دیکھا۔ موسم واقعی اچھا ہو رہا تھا۔ بے حد ابر آلود، ٹھنڈا ٹھنڈا، مومو کے دل کی طرح۔۔۔! وہ اپنے گھر سے نکل کر ان کے گیٹ کی طرف آئی۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔۔۔ وہ سست قدموں سے چلتی ہوئی اوپر ان کے پاس ٹیرس پہ پہنچی۔

"ارے مومو! کیسی ہو؟" معظم اسے دیکھتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

"تم نہیں جانتے کہ میں کیسی ہوں؟" وہ عجیب سے لہجے میں کہتی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔

"میں جانتا ہوں تم بہت اچھی ہو۔" وہ مسکرا کے بولا۔

"کیا تم بھی اتنے ہی اچھے ہو؟" وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی۔

"بالکل بھی نہیں۔"

"ویسے اچھوں کے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوتا۔" اریبہ کے ہاتھ سے کپ تھامتے ہوئے وہ آہستگی سے بولی۔

"تمہارے ساتھ کیا برا ہوا ہے؟" معظم نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔

"وہ بھی تمہیں خود نہیں پتہ۔"

"کیا بات کیوں مومو؟" اس کے سوال پہ مومو نے چونک کر دیکھا۔

"میں جب سے پاکستان آیا ہوں میں نے ایک بات نوٹ کی ہے۔" اس نے کرسی سے تھوڑا آگے جھکتے ہوئے کہا جیسے مومو سے کوئی راز کی بات کرنا چاہتا ہوں۔

"کیا؟" وہ نظر جھکاتے ہوئے بولی۔

"یہی کہ تمہاری آنکھیں بوجھل اور گلابی گلابی لگتی ہیں اور گلابی آنکھیں رتجگے کی سب سے بڑی نشانی ہیں۔" معظم کہتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے ٹھہرا اور مومو اس کی طرف دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔

"اور رت جگا محبت کی پہلی نشانی ہے، جس کو تم جھٹلا نہیں سکتیں!" معظم کے انداز میں یقین بھرا تھا۔

"تم یہ کیسے جانتے ہو؟"

"کیونکہ میں خود اس دور سے گزر چکا ہوں۔" معظم کی بات پہ مومو نے بری طرح چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"یعنی تم بھی محبت کرتے ہو؟" مومو کے سوال پہ وہ یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

"اب تو محبت میں بار ہو چکا ہوں۔" وہ دل کھول کر ہنستے ہوئے مومو کی بات کو انجوائے کر رہا تھا۔

"ویسے یار! ایک بات بتاؤ وہ خوش نصیب کون ہے جس کی چاہ میں معظم آفاق نے اپنی سحر طراز آنکھیں گلابی کر رکھی ہیں۔" وہ بڑی رازداری سے پوچھ رہا تھا۔ آج وہ کافی فریش اور خوشگوار موڈ میں تھا اسی لیے اس کے رنگ ڈھنگ نرالے نظر آ رہے تھے۔

"پہلے تم مجھے بتاؤ کہ وہ کون ہے جس نے تمہیں محبت میں بار کر دیا ہے؟"

مومو کو اپنی ہی آواز اجنبی سی لگی تھی۔ دل تھا کہ کسی بچے کی طرح سہما جا رہا تھا۔

"بتاؤں؟" وہ شرارت سے بولا۔

"ہاں۔" حلق سے بمشکل لفظ نکلا تھا۔

"آؤ۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور وہ سہمے ہوئے دل کے ہمراہ اس کے ساتھ چل پڑی۔

وہ اسے ساتھ لیے اپنے کمرے میں آ گیا۔

"بیٹھو یہاں۔" اس نے مومو کو بیڈ پہ بٹھا دیا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ الماری سے چھوٹی سی مخملی ڈبیا نکال کے لایا تھا۔

"میرا گفٹ ہے۔"

"وہ کیوں نہیں؟ موقع کی مناسبت سے دوں گا۔" معظم نے اس کے سامنے ڈبیا کھول دی۔ اس میں انتہائی خوب صورت انگوٹھی جگمگا رہی تھی اور انگوٹھی پہ نے ڈبل ایم لکھا ہوا تھا۔ اتنے چھوٹے لفظوں میں کہ بغور دیکھنے سے دکھائی دیتا تھا۔

"مومو یہ کس کی بنائی ہے؟"

"ہاں یار! اسی منگنی کے دن۔۔۔" مومو کے گویا سب کچھ بکھرے اور گزشتہ یادوں کے پیچھے جلتے انگارے سینے پہ آ گرے۔

"وہ منگنی؟"

"ہاں! آج امی اور پاپا مہر کے گھر انگیج منٹ کی ڈیٹ طے کرنے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ دو تین دن کی ڈیٹ دے دیں گے۔ پہلے ہی انتظار میں اتنا وقت گزر گیا ہے۔"

معظم جو کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ مومو کے حوصلے سے زیادہ تھا۔ دل کی لاش اٹھا کر واپس آنا مشکل ترین مرحلہ تھا۔

☼ ☼ ☼

بے دم قدموں سے وہ باہر نکلی تو دھواں دھار بارش کو بھی بھول گئی تھی۔ چھاجوں چھاج برستا ساون ایک ہی بوچھاڑ میں اسے بھگو گیا تھا اور وہ اپنے من من بھر کے قدم اٹھاتی روش پہ نکل آئی تھی۔ معظم کی کھڑکی سے اسے اپنے گھر تک جانا تھا۔

وہ تھکے تھکے انداز سے چلتی گیٹ سے نکل آئی۔ بارش اتنی تیز تھی کہ روڈ پہ طوفان اور بارش کی وجہ سے کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف طوفان کا شور تھا اور وہ یونہی دھیمے قدموں سے چلتی اپنے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ چوکیدار چھتری لے کر گیٹ کھولنے آیا تھا اور پورا گیٹ وا کر دیا تھا۔۔۔ وہ اندر تو آ گئی تھی لیکن مزید آگے نہ بڑھ سکی۔

"چھوٹی بی بی!" چوکیدار چیخ اٹھا۔ مومو کھڑے قد سے تیورا کے گری تھی۔ وہ روش کے درمیان بے ہوش پڑی تھی اور موسلادھار بارش برس رہی تھی۔ چوکیدار فوراً اندر بھاگا تھا۔ اتفاقاً ملک آفاق گھر پہ ہی تھے۔ وہ بھی بھاگتی ہوئی باہر نکلیں اور مومو کو اس حال میں دیکھ کر سر تا پا کانپ گئی تھیں۔

"مومو۔۔۔!" انہوں نے اس کا سر اٹھا کر گود میں

رکھا۔

"بیگم صاحبہ! ان کو اندر لے چلیں۔" ملازمہ آگے بڑھی لیکن ملکہ آفاق اسے اندر لے جانے کے بجائے ہسپتال لے گئی تھیں۔۔۔!

☼ ☼ ☼

اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھی اور وہ سب ہی پریشان سے بیٹھے تھے ملکہ آفاق چپ چاپ لب بستہ بیٹھی تھیں سب کو الجھن تھی کہ موموکو آخر ہوا کیا ہے؟

"پلیز آنٹی! آپ پانی پی لیں وہ ٹھیک ہو جائے گی۔" مہر اور اریبہ نے ملکہ کو پانی پلانا چاہا۔ وہ کب سے یونہی بھوکی پیاسی بیٹھی تھیں۔

"پی لوں گی وہ ٹھیک تو ہو جائے۔" انہوں نے انکار کر دیا۔

"ان شاء اللہ جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔ ڈاکٹرز بتا رہے ہیں کہ وہ کچھ دیر تک ہوش میں آجائے گی۔" نشاط بیگم نے بھی ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔۔۔ لیکن انہی تسلیوں میں رات گزر گئی اور صبح فجر کے قریب اس کے جسم میں تھوڑی حرکت ہوئی تھی۔

"معظم! نیم بے ہوشی میں بھی ایک ہی نام لبوں پہ تھا۔

"موموا آنکھیں کھولو۔" معظم نے آگے بڑھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"معظم!" اس نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"میں سن رہا ہوں موموا کیا بات ہے؟ کیا ہوا ہے؟" وہ جی جان سے متوجہ تھا اور موموا سے جی جان سے دیکھنے لگی تھی۔ اتنی محویت سے کہ آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

"تم نے تو ڈرا ہی دیا تھا موموا" مہر کی آواز اس کے دائیں طرف سے سنائی دی تھی اور موموکا ہاتھ معظم کے ہاتھ میں بے دم ہو گیا۔

"مہر۔۔۔؟" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟ دیکھو ملکہ آنٹی کتنی پریشان ہو رہی تھیں تمہارے لیے۔" مہر نے ملکہ آفاق کی سمت اشارہ کیا۔

"یار! تم نے تو ہماری جان ہی نکال دی تھی۔۔۔" حمزہ بھی خفگی سے گویا ہوا۔

"اور جس کی سچ مچ جان نکل گئی ہو؟" موموگم صم سے لہجے میں بولی۔

"اللہ نہ کرے۔" ملکہ آفاق تڑپ گئیں۔

"اللہ نے کر دیا ہے مام!" موموکا دل ہی دل میں تلخی سے ہنسی۔

"آپ لوگ پلیز پیچھے ہٹیں ہمیں چیک اپ کرنے دیں۔۔۔" ڈاکٹر اور نرسیں سرپہ آکھڑے ہوئے تھے۔ وہ بھی پیچھے ہٹ گئے۔

"آپ ہمارے ساتھ آیئے مسز آفاق!" ڈاکٹر چیک اپ کرنے کے بعد انہیں اشارہ کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔ اور ملکہ آفاق نے کسی خدشے کے تحت بے ساختہ مقدم جاہ اور معظم کی طرف دیکھا تھا۔

"ڈونٹ وری کچھ نہیں ہوگا۔ آیئے میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" معظم نے ان کی ہمت بندھائی اور انہیں ساتھ لیے کمرے سے نکل آیا تھا۔

"آیئے بیٹھیے مسز آفاق!" ڈاکٹر نے کرسی کی سمت اشارہ کیا تھا۔

"آپ لوگ جانتے ہیں کہ انہوں نے کس بات کا اثر لیا ہے کہ ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا؟" ڈاکٹر نے معظم سے استفسار کیا تھا۔

"ان فیکٹ ہم نہیں جانتے۔ تقریباً چار سال بعد انگلینڈ سے پاکستان آئی ہوں اور مجھے آئے ہوئے ایک ماہ ہو گیا ہے لیکن میں پچھلے ایک ماہ سے فیل کر رہا ہوں کہ وہ پہلے جیسی شوخ و شنگ سی نہیں رہی بہت الجھی الجھی اور چپ چپ سی رہتی ہے۔ کل بھی میں نے اس سے یہ سب پوچھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا بلکہ کچھ ہی دیر بعد اس کی بے ہوشی کی خبر مل گئی۔" معظم نے نارمل سے انداز میں سب بتایا تھا۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ سب موموکے نہ بتانے کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ معظم کے دیکھنے کی وجہ سے ہوا ہے۔

"اسی وجہ سے میں نے آپ لوگوں کو یہ کہنے کے لیے بلایا ہے کہ موموآفاق کے معاملے میں آپ کو ہمیشہ کافی احتیاط کرنا ہوگی۔ وہ بہت ہی کمزور اعصاب کی مالک ہیں۔ اگر کسی بات پہ ان کا نروس بریک ڈاؤن ہو سکتا ہے تو اسی طرح کسی صدمے یا دھچکے کی وجہ سے ان کا ہارٹ فیل بھی ہو سکتا ہے۔ پلیز ٹیک کیئر۔" ڈاکٹر نے ان کا دماغ آؤٹ کر دیا تھا۔ مسز ملکہ آفاق پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ معظم بھی چکرا کے رہ گیا تھا۔۔۔!

☼

جیسے ہی وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آئی مہر اور معظم کی انگیجمنٹ کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ موموئے ان دونوں کی خوشیاں دیکھتے ہوئے دل پہ پتھر رکھ لیا تھا۔ وہ اپنے غم کو عیاں کر کے ان کی خوشی کے آڑے نہیں آنا چاہتی تھی۔ اس نے کسی کی خوشیوں کو نظر لگانا نہیں سیکھا تھا۔

معظم کو مہر کا نصیب مان کر قدم پیچھے ہٹا لیے تھے اور خود کو بے نیاز ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب بھی رہی تھی لیکن۔۔۔ دل تو دل تھا کسی ذرا سی بات پہ بھی پگھل جاتا تھا۔ آنچ پہ رکھے موم کی طرح۔۔۔!

"ملکہ آنٹی! موموکہاں ہے؟" معظم عجلت میں اندر داخل ہوا تھا۔ وہ آج کل پھر پہلے کی طرح اس کا خیال رکھنے لگا تھا اور ملکہ آفاق اس کے لیے بھانجے کی بہت مشکور تھیں۔

"وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہے۔" انہوں نے اشارہ کیا۔

"موموا!" وہ پکارتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"ہوں؟" اس نے ٹی وی کا والیوم کم کر دیا۔

"تم نے خبریں کب سے سننا شروع کر دی ہیں؟" وہ نیوز چینل دیکھ کر حیرت سے بولا۔

"جب سے اپنی خبر نہیں رہی۔" وہ بے تاثر سے انداز میں بولی۔

"زیادہ فلاسفر بننے کی کوشش مت کرو۔ اور میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟"

"مہر کے لیے انگیجمنٹ ڈریس لینا ہے۔ اریبہ اور امانہ بھی جا رہی ہیں تم بھی چلو۔"

"میرا موڈ نہیں ہے۔"

"سوچ لو۔"

"میں سوچ کر ہی جواب دے رہی ہوں، تم لوگ جاؤ میں نے نہیں جانا۔" اس نے پھر والیوم بڑھا دیا تھا۔

"دیکھتا ہوں تم کیسے نہیں جاتیں؟" معظم نے ریموٹ جھپٹ کر ٹی وی آف کیا اور اس کی کلائی دبوچ کر باہر کی طرف چل پڑا۔

"معظم پلیز!" وہ کہتی رہ گئی لیکن اس نے اسے گاڑی میں بٹھا کر دم لیا تھا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پہ آ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"کیا بات ہے موڈ اتنا آف کیوں ہے؟" اریبہ نے پوچھا۔

"اس کا ہمارے ساتھ آنے کا موڈ ہی نہیں تھا۔" معظم نے بہن کو اطلاع دی۔

"ارے کیوں یار؟ لو مہر وہ مہر ہے کہ آرڈر دے رہی تھی کہ میری انگیجمنٹ کا ڈریس موموپسند کرے گی اور موموا۔۔۔؟" اریبہ نے خفگی سے بات ادھوری چھوڑ دی لیکن موموئے ٹھٹک کے اسے دیکھا۔

"ہاں ذیشان انکل کی وجہ سے مہر نے معظم کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا لیکن ساتھ میں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اس کا ڈریس موموکی پسند کا ہونا چاہیے اسے موموکی پسند پہ اعتماد ہے۔" اریبہ نے مزید بتایا۔

"کیوں اسے معظم کی پسند پہ اعتماد نہیں ہے؟" موموئے عجیب سے انداز میں کہتے ہوئے معظم کو اک نظر دیکھا۔

"وہ کہتی ہے معظم بھائی کی پسند کوئی خاص نہیں ہے۔"

"یعنی مہر کوئی خاص نہیں ہے؟" اس کی بے رخی پہ معظم دفعتاً ہنس پڑا تھا۔
"کیا کمال کی بات ہے یار!"
"کمال کی بات کی ہے نا، کمال تو نہیں کیا نا؟" موموتنی سے ہنسی۔
"بڑی تیز ہو گئی ہو۔"
"اسی لیے تو پیچھے رہ گئی ہوں، سست ہوتی تو شاید آگے نکل جاتی۔ خرگوش اور کچھوے کا قصہ تو تم نے سنا ہی ہو گا؟ میں بھی خرگوش کی طرح تھوڑی دیر ستانے کی غرض سے لیٹ گئی تھی۔"
موموکی باتیں اسے اکثر حیرانی میں ڈال جاتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ کچھ نہ کہہ سکا البتہ اریبہ اور الماس نے اس بات پہ خوب بحث کی تھی۔ موموچپ چاپ سنتی رہی اور مارکیٹ پہنچ کر مہر کے پیغام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں لگ گئی۔ اس نے مہر کا ڈریس پورے دل سے اور ایمان داری سے پسند کیا تھا تب ہی تو وہ ڈریس بہت پسند آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کاش مومو! مجھے تم سے محبت ہوئی ہوتی۔" معظم اسے دیکھ کر آہ بھر کے رہ گیا تھا۔ مسز ملکہ آفاق نے یہ ڈریس اس کے لیے خود ڈیزائن کیا تھا اور مومو نے وہ ڈریس پہن کر اسے چار چاند لگا دیے تھے۔ وائٹ کلر کے سوٹ پہ گولڈن کڑھائی بڑی منفرد اور نفیس سی چھب دکھا رہی تھی۔ دوپٹے کے دونوں پلوؤں پہ بھی گولڈن بارڈر بنا ہوا تھا اور قمیص کی فرنٹ سائیڈ پہ بھی کافی خوب صورت کام کیا گیا تھا۔ میچنگ سینڈل اور جیولری بھی مسز ملکہ آفاق کی اپنی چوائس تھی۔ مومو انہی کے اصرار پہ انہی کی پسند سے تیار ہوئی تھی لیکن جب وہ ان کے ساتھ ہال میں پہنچی تو پہلا سامنا معظم سے ہی ہوا تھا۔ وہ بلیک تھری پیس سوٹ میں ملبوس بہت شاندار لگ رہا تھا۔ اور معظم بھی مومو کی خوب صورتی کی تعریف کیے بنا نہیں رہ سکا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے دل پہ ہاتھ رکھ کے آہ بھری تھی۔

"پھر کیا ہوتا؟" مومو نے اس کے کاش پہ نقطہ اٹھایا تھا۔
"پھر یہ ہوتا کہ میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر وہاں اسٹیج پہ لے جاتا اور اس مرمریں ہاتھ کی انگلی میں انگوٹھی پہنا دیتا۔" اس نے مومو کا ہاتھ تھام کے کہا۔
"آج تمہارے ہاتھ میں یہ ہاتھ اچھا نہیں لگ رہا آج تمہارے ہاتھ میں وہ ہاتھ اچھا لگے گا۔" مومو نے گاڑی سے اترتی مہر کی سمت اشارہ کیا تھا۔ معظم کی نگاہیں مہر کی طرف متوجہ ہوئیں تو وہ وہاں سے ہٹ گئی اور ہاتھ میں پکڑے چھوٹے سے وائٹ پرس سے ٹشو نکال کر آنکھوں کے بھیگے کونے سے نمی جذب کی تھی۔ وہ ایک ٹیبل کے پاس کرسی کھینچ کے بیٹھ گئی۔ مقدم جاہ نے منگنی خاصے وسیع پیمانے پہ ارینج کی تھی لوگوں کی تعداد دیکھ کر شادی کا گمان ہو رہا تھا۔
مہر سے مل کر وہ جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھی رہی۔ مہمان آتے رہے اور رش بڑھتا رہا۔ پروفیسر ذیشان احمد کی طرف سے بھی کافی مہمان انوائیٹڈ تھے دونوں فیملیز بے پناہ خوش تھیں ملکہ آفاق کو ان کے جاننے والوں نے گھیر رکھا تھا اور مومو اکیلی بیٹھی سب کو دیکھ رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد انگوٹھی پہنانے کا وقت آیا اور مومو کا دل کسی نے مٹھی میں لے کر دبا دیا تھا۔ وہ اس کے سامنے مہر کو انگوٹھی پہنا رہا تھا۔ مومو میں دیکھنے کی ہمت نہیں تھی وہ کرسی سے اٹھی تیز تیز قدموں سے چلتی ہال سے نکل گئی۔
"مومو...!" ملکہ آفاق نے اسے ہال سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ لوگ اسٹیج کی طرف متوجہ تھے کسی اور طرف دیکھنے کا کسی کو دھیان ہی نہیں تھا...!
مومو نے پیدل ہی ... دیاتی پارکنگ میں اپنی گاڑی تک پہنچی اور تیزی سے گاڑی نکال لے گئی۔
"مومو... رکو!" وہ پیچھے سے چیخیں لیکن وہ بھلا کب سن رہی تھی۔ انہوں نے اپنے ڈرائیور کو اشارہ کیا اور گاڑی میں بیٹھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

وہ دھواں دھار روتی ہوئی سیدھی گھر پہنچی تھی۔

شکر تھا کہ راستے میں کسی ایکسیڈنٹ سے بچ گئی تھی ورنہ جس حالت میں وہ رش ڈرائیونگ کرتی ہوئی آئی تھی اسے دیکھ کر ملکہ آفاق کو یقین تھا کہ وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچا لے گی۔ ان کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ان کا ڈرائیور بھی مومو کے برابر ہی پہنچا تھا۔ مومو گاڑی سے اتر کر اندر چلی گئی اور اتنی ہی تیزی سے ملکہ آفاق اس کے پیچھے آئی تھیں۔
"مومو!" وہ اس کے بیڈ روم کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول کر اندر داخل ہوئی تھیں۔ مومو کا پرس کہیں تھا جوتے کہیں اور خود کہیں۔ کمرے میں اس کی ہچکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ ملکہ آفاق کے قدم زمین نے جکڑ لیے تھے۔
"مومو...!" ان کے منہ سے بمشکل اس کا نام ادا ہوا تھا۔
"ماما!" مومو تڑپ کے سیدھی ہوئی اور ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئی وہ زمین پہ گری رو رہی تھی۔
"میرا معظم...!"
وہ کچھ اس طرح تڑپ کر روئی کہ ان کا دل پھٹ گیا تھا۔ وقت بہت پیچھے چلا گیا تھا۔ چھبیس سال پیچھے۔ جب ان کی حالت بھی ایسی تھی جب وہ بھی ماہی بے آب کی مانند تڑپی تھیں جب ان کا دل بھی اپنی "جاہ" کے لٹنے پہ ماتم کناں ہوا تھا۔ تب انہیں بھی صبر نہیں آیا تھا۔ اتنے سال لگ گئے تھے... پھر رفتہ رفتہ صبر تو آ گیا پر دل کے داغ نہ گئے تھے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی لو دینے لگتے... اور آج... آج سول آفاق بھی؟ مسز ملکہ آفاق کھڑے کھڑے راکھ کا ڈھیر بن گئی تھیں۔ ان کی بیٹی ان کے قدموں میں بیٹھی تڑپ رہی تھی بلک رہی تھی۔
"اسے میری محبت کا احساس ہی نہیں ہے ماما! اسے پتہ ہی نہیں کہ پچھلے ساڑھے چار سالوں سے مومل آفاق دل کی ہر دھڑکن پہ ورد کر رہی ہے اس کے نام کا۔ اسے مہر کی محبت نظر آ گئی اور مومو...؟ نہ مومو دکھائی دی نہ اس کی محبت؟ اگر وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تو کیا میں اس کے بغیر رہ سکتی ہوں؟ بتایئے ناں ماما!
کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں رہ سکوں گی؟ کیا میں جی لوں گی؟"
مومو ان کی ٹانگوں سے لپٹی انہیں جھنجھوڑ رہی تھی وہ اس کی ماں تھیں اسے تکلیف میں دیکھ کر انہیں خود اذیت ہو رہی تھی۔
"میں اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی ماما! مر جاؤں گی میں۔"
وہ تڑپ تڑپ کے ہلکان ہو رہی تھی۔
"وہ مہر کا نصیب ہے مومو!"
"وہ میرا نصیب کیوں نہیں تھا؟"
"اسے تم سے محبت نہیں ہے۔"
"مجھے تو اس سے محبت ہے نا؟" وہ اس کی بات سے لاجواب ہو گئیں۔
"بھول جاؤ اسے۔"
"بھولتے بھولتے مر جاؤں گی۔"
"مر تو میں گئی ہوں۔" ملکہ آفاق خود کلامی کے سے انداز میں بولی تھیں۔ انہیں مومو کی طرف سے جو خدشے تھے وہ سچ ثابت ہوئے تھے انہیں پہلے بھی کئی بار شک گزرا تھا کہ مومو معظم میں انٹرسٹڈ ہے لیکن پھر وہ اپنا شک سمجھ کر ٹال گئی تھیں۔ مگر آج...
انہوں نے اس کی حالت کے پیش نظر اسے ٹرنکولائزر دے کر سلا دیا تھا اور خود اس کے پاس اس کے سرہانے بیٹھ گئی تھیں۔ مومو کا سر انہوں نے گود میں رکھا ہوا تھا۔ وہ اس کے بال سہلاتے ہوئے اس کے چہرے پہ آنسوؤں کی لکیریں بغور دیکھ رہی تھیں جن کو دیکھ کر خود ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور ان کے آنسو بے اختیار ہو کر مومو کے بالوں میں جذب ہو گئے تھے... وہ ساری رات اسی طرح بیٹھی سوچتی رہی تھیں...!

☼ ☼ ☼

"یار! تم نہیں جانتیں کہ میں یہ دن انگلیوں پہ گن کے گزار رہا ہوں، یہ تین ماہ میرے لیے پہاڑ بن گئے ہیں، وقت گزر ہی نہیں رہا؟" معظم ڈرائیونگ کے

دوران اپنی بے قراریوں کا اظہار کر رہا تھا اور مہر چپ چاپ اس کی چاہتوں کی پھوار میں من کو بھگوتی رہی وہ بھلا کیا کہہ سکتی تھی۔۔۔؟

"کیا جیسی بے قراری مجھے ہے ویسی تمہیں بھی ہے؟" اس نے کہتے کہتے مہر سے اس کے دل کی پوچھ ڈالی۔

"بولو ناں چپ کیوں ہو؟" اس نے اصرار کیا۔

"نہیں۔۔۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں؟" اسے اچنبھا ہوا۔

"کیونکہ میں آپ جیسی بے وقوف نہیں ہوں۔"

"میں بے وقوف ہوں؟"

"لوگ کہتے ہیں کہ سمجھ دار لوگ محبت نہیں کرتے۔" مہر نے لاپروائی سے کہا۔

"تم سمجھ دار نہیں ہو یا تمہیں محبت نہیں ہے؟" معظم نے جان بوجھ کر پوچھا۔

"میں نے کب کہا کہ میں سمجھ دار نہیں ہوں؟"

"اوہ یعنی تمہیں محبت نہیں ہے؟" معظم نے سر ہلایا۔

"کہہ سکتے ہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔

"اس کا مطلب ہوا کہ میں واقعی بے وقوف ہوں؟" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا تھا۔

اور مہر اپنی مسکراہٹ چھپا گئی تھی لیکن اپنے گھر کے گیٹ پہ پہنچ کر اس کی ساری مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی حنان درانی اپنی لینڈ کروزر لیے کھڑا تھا۔ معظم گاڑی پارک کر کے نیچے اتر آیا۔

"السلام علیکم!" معظم نے ہی آگے بڑھ کے اس سے ہاتھ ملایا تھا لیکن اس کی نظر گاڑی سے اترتی مہر پہ تھی۔

"میرا نام معظم ہے میں۔۔۔"

"جانتا ہوں مسٹر معظم جاہ! آپ مرزا ذیشان کے تازہ ترین منگیتر ہیں۔" حنان درانی نے معظم کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔

معظم کی پیشانی پہ بل پڑ گئے تھے۔

"یہ کون سا طریقہ ہے بات کرنے کا؟" اس نے ناگواری سے کہا۔

"مسٹر معظم جاہ! آپ نہیں جانتے میں پچھلے پانچ سال سے طریقے سے ہی بات کرتا آ رہا ہوں لیکن نہ تو پروفیسر صاحب میرے طریقے کو سمجھ رہے ہیں اور نہ ہی پروفیسر صاحب کی بیٹی۔۔۔ سیدھے سیدھے طریقے سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ رشتہ بھیجا تھا منت کی تھی لیکن آخر ایسا کیا ہے جو آپ میں ہے اور مجھ میں نہیں ہے؟ میں یقین کے ساتھ شرطیہ کہتا ہوں کہ میں فیملی بیک گراؤنڈ کے لحاظ سے بھی آپ سے زیادہ اسٹرانگ ہوں پھر بھی۔۔۔ پھر بھی مجھے چھوڑ کر آپ کو کیوں چنا گیا؟"

حنان درانی کے لب و لہجے سے آج جو سرکشی اور ہٹ دھرمی محسوس ہو رہی تھی۔ مہر پریشان ہو گئی۔

"معظم؟" وہ معظم کے تیور بھانپ چکی تھی۔

"تم اندر جاؤ مہر!" اس نے پلٹ کر مہر کو اشارہ کیا۔

"لیکن آپ۔۔۔؟"

"میں کہہ رہا ہوں تم اندر جاؤ۔" معظم غصے سے بلند آواز میں بولا۔

تو مہر کو قدم اندر بڑھانے پڑے لیکن وہ بھاگتی ہوئی میراں بیگم کے پاس پہنچی تھی۔

"میری ہونے والی بیوی۔ ایسی اجارہ داری؟" حنان درانی نے معظم کا گریبان پکڑ لیا تھا اور اس کے منہ سے بیوی کا لفظ سن کر یکدم مشتعل ہو گیا۔ اس نے زوردار گھونسا حنان درانی کے منہ پہ دے مارا اور تھوڑی دیر میں ہی وہاں لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ اندر سے ذیشان احمد اور میراں بیگم بھی بدحواسی میں باہر آئے تھے۔ حنان درانی کے ناک اور منہ سے خون بہہ رہا تھا اور گریبان بھی پھٹ گیا تھا۔ وہ دونوں ہی ذیشان احمد کے قابو سے باہر تھے۔ انہوں نے بہت بیچ بچاؤ کروایا مگر کوئی بھی ٹلنے والا نہیں تھا آخر لوگوں نے مل معظم کو گیٹ کے اندر دھکیلا اور گیٹ بند کر دیا۔ اور کچھ حنان درانی کو اس کی گاڑی کی طرف دھکیلنے لگے۔ بڑی مشکل سے معاملہ ٹھنڈا پڑا اور وہ لوگ اندر آ گئے۔

"بیٹا! تمہیں کیا ضرورت تھی اس کے منہ لگنے کی؟"

ذیشان احمد نے معظم کی کنپٹی سے بہتے خون کو دیکھ کر میراں بیگم کو فرسٹ ایڈ باکس لانے کو کہا۔

"آپ لوگوں نے اتنے عرصے سے اسے ٹھیک طرح سے نہیں سمجھایا، اسی لیے روز منہ اٹھائے چلا آتا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اب سمجھ گیا ہو گا؟"

"بیٹا! میں جان بوجھ کر اس کے ساتھ سختی سے پیش نہیں آتا تھا۔ مجھے پتہ ہے ایسے لوگ زیادہ سخت اور ضدی ہو جاتے ہیں۔ ہماری سختی اور غصہ ان کی ضد کو ہوا دینے کا کام کرتے ہیں اور ویسے بھی اس نے ہمیں کبھی زیادہ تنگ نہیں کیا۔ اس کی فیملی تقریباً دس سال سے کینیڈا شفٹ ہو گئی ہے۔ وہ بھی کینیڈا میں ہی ہوتا ہے بس کبھی کبھار کاروبار کے سلسلے میں پاکستان آتا ہے اسی لیے مجھے اس کی طرف سے زیادہ پریشانی نہیں تھی لیکن آج تو۔۔۔" وہ بات ادھوری چھوڑتے ہوئے خاموش ہو گئے۔

"بہرحال آپ پریشان نہ ہوں میں دیکھ لوں گا اسے۔" معظم کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

"ارے بیٹھو ناں کہاں جا رہے ہو؟ اتنا خون بہہ رہا ہے۔" میراں بیگم اندر آتے ہوئے بولیں۔

"اٹس او کے معمولی سی چوٹ ہے ٹھیک ہو جائے گی میں چلتا ہوں۔" وہ کہہ کے آگے بڑھ گیا۔

"پاپا کیا ہوا ہے؟" حمزہ پریشان سا اندر داخل ہوا تھا۔ شاید کہیں سے اسے بھی اس ہنگامے کی اطلاع مل گئی تھی۔

"کچھ نہیں ہوا۔" معظم نے جواب دیا تھا۔

"لیکن یہ خون؟" حمزہ کی نظر اس کی پیشانی اور شرٹ کی طرف اٹھی جس پہ خون کے سرخ دھبے نظر آ رہے تھے۔

"کہا تو ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ سب خیریت ہے۔" معظم اس کا کندھا تھپک کر باہر نکل آیا تھا لیکن راہداری کے کونے میں کھڑی مہر کا دل تڑپ کے رہ گیا تھا۔

معظم نے اس کی پریشان صورت اور آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کو محض اک نظر دیکھا اور باہر آ گیا۔

"لگتا ہے تم تو اسلام آباد میں ڈیرہ ڈال کے بیٹھ گئی ہو؟" مہر نے شکوہ کیا تھا اور مومو مسکرا دی تھی۔

"کافی پرسکون شہر ہے، واپس آنے کو دل نہیں چاہ رہا۔" مومو ملکہ آفاق کے ساتھ پچھلے ایک ہفتے سے اسلام آباد آئی ہوئی تھی۔ انہوں نے اسلام آباد میں اپنی بوتیک کی نئی برانچ کا افتتاح کرنا تھا۔ اس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مومو کے اکیلے پن کی وجہ سے وہ اسے بھی ساتھ لے گئی تھیں اور مومو خود بھی اس ماحول سے نکلنا چاہتی تھی اس لیے گھومنے پھرنے کی غرض سے آ گئی تھی۔

"یعنی تم شہر کو انجوائے کر رہی ہو تم نے ہمیں مس نہیں کیا؟" مہر خفگی سے بولی۔

"تم بھی یہیں آ جاؤ۔" مومو نے آفر کی۔

"محترمہ میری شادی قریب ہے۔ ہزاروں کام ہیں کرنے والے، تم سے تو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ کچھ ہیلپ ہی کروا دو۔"

"کیسی ہیلپ؟"

"یہی شاپنگ وغیرہ کی، مجھے سب کچھ خود ہی کرنا پڑ رہا ہے۔ ابھی بھی امی کے ساتھ مارکیٹ جا رہی ہوں۔ معظم کی فیملی کے لیے کچھ گفٹس لینے تھے۔ سوچا آج ہی نپٹا لیں۔" مہر نے اپنی دھن میں بتایا۔

"اوہ اچھا!"

"اور ہاں تم یہ بتاؤ کہ تم معظم کی طرف سے ہو گی یا میری طرف سے؟" مہر نے کچھ یاد آنے پہ پوچھا۔

"تمہاری طرف سے۔" مومو نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"واؤ۔۔۔ گویا تم میری طرف ہو لڑکی والوں کی سائیڈ پہ؟"

"ہاں!" اس نے آہستگی سے کہا۔

"تھینک یو سو مچ یار!" مہر خوش ہو گئی تھی۔

"اس کے لیے کیا گفٹ لینا ہے تم نے؟" مومو نے نجانے کیوں پوچھ لیا۔

"معظم کے لیے؟"

"ہاں۔۔۔!"

"کیا میں کم ہوں اس کے لیے؟" مہر اترا کے بولی۔

"ویسے وہ کہتا ہے کہ گفٹ میں دوں گا تم نہیں۔" مہر نے شرماتے ہوئے کہا۔

"کیا دے گا؟"

"اپنا دل، اپنی جاں، اپنی زندگی۔" مہر استحقاق بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"مطلب کہ سب کچھ؟"

"آف کورس یار!"

"اللہ مبارک کرے۔" موموں نے دل سے کہا تھا۔

"تھینک یو۔"

"او کے اللہ حافظ۔" اس نے کہہ کے فون بند کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مہر اغوا ہو گئی؟"

بس اک ہی خبر تھی جو ہر طرف سنسناتی ہوئی پہنچ رہی تھی اور سب کے رونگٹے کھڑے ہوتے جا رہے تھے۔

یہ خبر موموں اور مسز ملکہ آفاق تک بھی پہنچی تھی وہ پہلی فلائٹ سے ہی واپس آ گئی تھیں۔ اپنا کام بھی ادھورا چھوڑ آئی تھیں اور زندگی میں پہلی بار وہ میراں بیگم کے گھر آئی تھیں۔ میراں بیگم کو چھوٹی بہن کی پہلی بار اپنے گھر آمد پہ خوشی کیا ہوتی کہ وہ اپنی بیٹی کی گمشدگی کا غم سینے سے لگائے بیٹھی تھیں۔ باقی سب بھی ان کے گھر پہ ہی تھے۔ سب ہی ان کو تسلیاں دے رہے تھے۔ حمزہ الگ اسے ڈھونڈ رہا تھا۔ معظم اور مقدم جاہ الگ بھاگ دوڑ کر رہے تھے لیکن پچھلے کئی گھنٹوں سے کسی کو بھی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

"یہ سب ہوا کیسے؟" مسز ملکہ آفاق نے میراں بیگم سے پوچھا وہ رو رو کر نڈھال ہوئی جا رہی تھیں۔

"ہم دونوں شاپنگ کرنے گئے تھے۔ شاپنگ کر کے مارکیٹ سے نکلے تو یاد آیا کہ میں کپڑوں کا شاپر اس دکان کے کاؤنٹر پہ ہی رکھ کے بھول آئی ہوں۔ اس پہ میں نے مہر کو سڑک کنارے کھڑا ہونے کو کہا اور اندر چلی گئی پھر پتہ نہیں چلا کہ میری مہر کہاں چلی گئی۔ پوری مارکیٹ اور سڑکیں چھان ماریں لیکن وہ مجھے نظر نہیں آئی، کہیں نہیں ملی۔" وہ تڑپ کر رو پڑی تھیں۔

"میری بیٹی، میری دلہن، ذیشان احمد! میری بچی نجانے کیا بیتی ہے؟ کیا گزری ہے اس پہ؟" وہ بیت سے رو رہی تھیں۔

"پلیز میراں! صبر کرو، وہ جہاں بھی ہو گی ٹھیک ہو گی سب کوشش تو کر رہے ہیں۔" ملکہ آفاق نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

رات کے بارہ بجنے کو ہیں دوسری تاریخ لگنے کو ہے "آج اور کل میں بڑا فرق ہوتا ہے ملکہ! دعا کرو میری مہر آج ہی آ جائے۔" میراں بیگم نے ملکہ آفاق کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔ وہ بہن کے دکھ پہ چپ تھیں اور سر جھکا لیا تھا۔ وہ کیسے انہیں سمجھا کر تسلی دیتیں۔۔۔؟

"یہ سب اس حنان درانی کا کھیل ہے۔ مجھے ایک بار مل جائے میں دوبارہ اس کے گھر جا چکا ہوں لیکن تالا لگا ہوا تھا۔" حمزہ ڈرائنگ روم میں چکر لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میں اب اور انتظار نہیں کر سکتا۔ میں پولیس رپورٹ درج کروانے جا رہا ہوں۔" معظم نے اپنا فیصلہ سنایا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" ذیشان احمد ٹھٹک گئے۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں اب اور کس انتظار میں ہیں آپ لوگ؟" معظم کا غصہ اندر ہی اندر لاوے کی طرح پک رہا تھا۔

"تو کیا اپنی عزت خود اچھال دیں؟ پولیس کو پتہ چلے پھر میڈیا کو پتہ چلے اور پھر پورے پاکستان میں خبر پھیل جائے گی کہ پروفیسر ذیشان احمد کی بیٹی کو ان کے ایک اسٹوڈنٹ حنان درانی نے اغوا کر لیا ہے۔" ذیشان احمد پھٹ پڑے تھے۔

"اور اگر عزت کے اچھالے جانے کے ڈر میں سچ مچ عزت خراب ہو گئی تو پھر؟" معظم کا سوال بھی کسی خنجر کی مانند اترا تھا۔

"ہمیں اپنے طور پہ کچھ کرنا چاہیے۔" مقدم جاہ بھی ذیشان احمد کے حامی تھے۔

"تو پھر سمجھ لیں کہ کچھ بھی نہیں ہو گا۔" معظم کہہ کر خفگی سے باہر نکل گیا تھا۔

"تم کیا کہتے ہو؟" انہوں نے حمزہ کو دیکھا۔

"میں بھی پولیس کو اطلاع دینے کے حق میں نہیں ہوں۔" اس نے کہہ کر سر جھکا لیا تھا۔ وہ خود مقامی اخبار میں بطور صحافی کام کر رہا تھا۔ اسے پتہ تھا کہ میڈیا والے ایسی خبروں کے کیا معنی نکالتے ہیں اور کیسے اس کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ انصاف اور مدد مانگنے والا الٹا ذلیل ہو کے رہ جاتا ہے۔

"پھر خود کچھ کرو۔" وہ تو گاڑی لے کر نکل گیا مقدم جاہ نے حمزہ کو اشارہ کیا تھا۔ وہ بھی باہر نکل گیا۔

موموں کا برا حال تھا۔ وہ ایک کونے میں چپ بیٹھی تھیں۔ خالہ بیگم اور ملکہ آفاق میراں بیگم کے دائیں بائیں بیٹھی انہیں دلاسہ دے رہی تھیں، وہ بیٹی کے لیے تڑپ رہی تھیں۔ انہیں بار بار مہر کا خوشیوں سے دمکتا چہرہ اور شرمیلی سی مسکان یاد آ رہی تھی۔ وہ کتنی خوشی خوشی ان کے ساتھ شاپنگ کرنے گئی تھی اور کتنی جلدی اس کی خوشیاں لٹ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ مہر کو پاگلوں کی طرح ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ پورا ایک دن ہو چکا تھا لیکن نہ مہر مل سکی نہ حنان درانی۔۔۔ اس نے حنان درانی کو ڈھونڈنے کے بہت جتن کیے تھے لیکن ہر جگہ سے یہی جواب ملتا تھا کہ وہ کینیڈا چلا گیا ہے اب پتہ نہیں کہ کام کے سلسلے میں کب واپس آئے گا؟ وہ پچھلے ایک ماہ سے ٹھیک طرح سے سو نہیں پایا تھا۔ اگر سونے کے لیے لیٹ بھی جاتا تو تھوڑی دیر میں ہی تڑپ کے اٹھ بیٹھتا تھا۔ اور اکثر تو رات کے وقت ہی گاڑی لے کر نکل جاتا تھا اور موموں مہر کے لیے جلنے کڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے دل مسوس کے رہ جاتی تھی۔

"چائے لے لو۔" وہ لان میں اِدھر سے اُدھر چکرا رہا تھا۔

"ہوں! نہیں ضرورت نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا۔

"تم نے کھانا بھی نہیں کھایا اور ٹھنڈ میں یونہی گھوم رہے ہو؟ کم از کم چائے تو لے لو۔" موموں نے اصرار کیا۔

"پلیز میرا دل نہیں چاہ رہا تم جاؤ یہاں سے۔"

"لیکن معظم!"

"آئی سے گیٹ لاسٹ فرام ہیئر۔" وہ یکدم چیخ اٹھا تھا۔ وہ اس وقت انتہائی فرسٹریشن کا شکار تھا اور موموں کا یوں مداخلت کرنا اسے زہر لگ رہا تھا۔

موموں بدک کے چار قدم پیچھے ہٹ گئی تھی اور معظم کو بے یقینی سے دیکھتی ہوئی بھاگ کر اندر چلی گئی۔

"معظم! یہ کس لہجے میں بات کر رہے ہو تم؟" مقدم جاہ باہر نکلتے ہوئے سن چکے تھے۔

"آئی ایم سوری۔ میں ٹینشن میں ہوں کوئی مجھ سے بات نہ کرے ورنہ میرا دماغ اسی طرح خراب ہوتا رہے گا۔" اس نے باپ کو بھی ہاتھ اٹھا کے روک دیا تھا۔ اتنے میں اس کے سیل فون پہ رنگ ہونے لگی تھی۔۔۔ پہلے تو نظر انداز کرتا رہا پھر جب رنگ مسلسل بجتی رہی تو اسے کال پک کرنی ہی پڑی۔ نمبر کوئی اجنبی ہی تھا۔

دوسری طرف بھی کوئی مردانہ آواز ہی تھی۔

"آپ کون ہیں؟" معظم نے ناسمجھی سے پوچھا۔

"تمہاری منگیتر کا شوہر۔" اس آدمی نے انتہائی سکون سے کہا تھا۔

"تم۔۔۔ تم حنان درانی ہو ناں؟" معظم نے آواز پہچاننے کی پوری کوشش کی تھی۔

"ویسے اب تم مجھے اپنا بہنوئی بھی کہہ سکتے ہو' وہ میری بیوی بن گئی ہے تو پھر تمہاری بہن ہی ہوئی ناں" اس نے بے حد رسان سے کہا تھا جیسے معظم کی کیفیت سے حظ اٹھا رہا ہو۔

"جسٹ شٹ اپ' میں تمہاری کسی بکواس پہ کان دھرنے والا نہیں ہوں' سیدھی طرح بتادو کہ مہر کہاں ہے اور کیسی ہے وہ؟" معظم کی باتوں سے مقدم جاہ بھی متوجہ ہو چکے تھے۔

"میری باتوں پہ کیوں کان نہیں دھرو گے۔" حنان درانی نے پھر کہا۔

"میں پوچھ رہا ہوں مہر کہاں ہے؟" معظم نے دانت پیس کر کہا۔

"میرے پاس' دل کے قریب' سینے سے لگا کے۔" اس نے سرشار لہجے میں کہا۔

معظم مٹھیاں بھینچتے ہوئے اپنا غصہ ضبط کرنے لگا تھا۔ اس کے دماغ کی رگیں پھٹنے کے قریب ہو گئی تھیں۔

"یہ لو خود بات کرلو' آرام سے اور تسلی سے بات کرنا' جو دل چاہتا ہے پوچھو' مجھے پروا ہے نہ ہی ڈر' بس اپنی محبت پہ یقین ہے۔" حنان درانی نے معظم کو تاکید کرتے ہوئے فون مہر کو تھما دیا تھا۔

"مہر۔۔!" معظم کی تمام تر بے قراریاں اور بے چینیاں آواز میں سمٹ آئی تھیں۔

"آئی ایم سوری معظم!" مہر نے شرمندہ سے انداز میں کہا۔

"مہر۔۔!"

"مجھے اس طرح مت پکارو معظم! اب تمہارا مجھ پہ کوئی حق نہیں رہا۔" مہر کی آواز ٹھہری ہوئی تھی۔

"مہر! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟"

"ہاں معظم! ابھی نہ' کبھی محبت جیت ہی جاتی ہے۔ یوں سمجھ لو حنان کی محبت بھی جیت گئی ہے اور میں ہار گئی ہوں۔۔۔ معظم میں اس کے سامنے ہار گئی ہوں' میں محبت کے سامنے ہار گئی ہوں۔ تمہیں پتہ نہیں ہے معظم! محبت میں ہار جانا کیسا ہوتا ہے؟ اور اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا' ہم دونوں نے شادی کر لی ہے' تمہیں فون اس لیے کیا ہے کہ تم مجھے معاف کر دو' تمہیں تو اور لڑکیاں بھی مل جائیں گی لیکن مجھے حنان جیسا نہیں ملے گا' تم نے آج تک مجھ سے جتنی محبت کی ہے' حنان اس سے ہزار گنا زیادہ محبت ان چند دنوں میں مجھ پہ نچھاور کر چکا ہے' اتنی کہ میری آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور ہاں' میری امی اور پاپا سے سوری بولنا اور کہنا کہ ہمارا طریقہ غلط تھا' ہمیں معاف کر دیں' میرے لیے دعا کرنا اور معاف کر دینا اللہ حافظ۔"

مہر نے فون بند کر دیا تھا اور معظم دم بخود سا کھڑا ہاتھ میں پکڑے موبائل کو دیکھتا رہا۔

"معظم! معظم! مہر نے کیا کہا؟" مقدم جاہ اس کا کندھا ہلا رہے تھے لیکن وہ پتھر ہلنے والا نہیں تھا۔

"بتاؤ ناں مہر نے کیا کہا ہے؟ کہاں ہے وہ؟ کیسی ہے؟"

مقدم جاہ بار بار پوچھ رہے تھے اور بالآخر وہ انہیں بتاتا چلا گیا۔ مقدم جاہ بھی سناٹے میں آگئے تھے۔

☆ ☆ ☆

"شادی کے لیے دیے جانے والے تمام آرڈرز کینسل کر دو۔" مقدم جاہ نے اپنے منیجر کو کہہ دیا ہوا تھا۔

"نہیں! شادی کے لیے دیا جانے والا کوئی آرڈر بھی کینسل نہیں ہوگا' شادی اسی تاریخ کو ہوگی۔" معظم کا فیصلہ اور انداز دونوں ہی اٹل تھے۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" مقدم جاہ تعجب سے دیکھنے لگے۔

"ان تمام آرڈرز میں کہیں بھی نہیں لکھوایا گیا کہ دلہن مہر ذیشان ہی ہوگی؟ دلہن کوئی اور بھی تو ہو سکتی ہے؟" اس نے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے پوچھا تھا۔ وہ ہکا بکا اس کی صورت دیکھتے رہ گئے۔

"کوئی اور؟" ان کے آہستگی سے لب ہلے تھے۔

"جی! کوئی اور' کوئی ایسی لڑکی جو میری دلہن بن کے

اور جس کو بیوی بنا کر میں مہر کا نام بھی بھول جاؤں' کوئی مجھ سے مہر ذیشان کا پوچھے اور میں کہوں' کون مہر؟"

معظم کا لہجہ زخم کی طرح رس رہا تھا لیکن تلخی' غصہ اور نفرت اس قدر تھے کہ مزید کچھ کہنا ہی فضول تھا۔ مقدم جاہ چپ ہو گئے۔

"منیجر صاحب اگر ہو سکے تو ان سارے آرڈرز میں ایک لڑکی کا آرڈر بھی لکھ لیں' آخر لڑکی نہیں ہو گی تو شادی کیسے ہو گی؟" اس نے خود اپنا مذاق اڑایا تھا۔ مقدم جاہ نے منیجر کو جانے کا اشارہ کیا اور خود اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"معظم! تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"جی! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں' میں مقررہ تاریخ پہ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ چاہے کچھ بھی ہو۔"

"اور لڑکی؟"

"یہ کام آپ اور امی مل کر کریں' میرا انتخاب تو غلط نکلا' اب آپ قسمت آزمائی کریں کہ کیا رزلٹ نکلتا ہے؟" وہ ان کو اجازت دے کر چلا گیا اور مقدم جاہ پُرسوچ نظروں سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

"نہیں! میں معظم سے شادی نہیں کروں گی۔" مومو نے اس پرپوزل کو سنتے ہی انکار کر دیا تھا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ معظم مہر کا ہے' وہ مہر سے محبت کرتا ہے۔"

"کرتا تھا اب نہیں کرتا۔"

"آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اب نہیں کرتا؟"

"اس کے انداز اس کے تیور بتاتے ہیں۔"

"اور اس کے تیور یہ بھی بتاتے ہیں کہ وہ مجھ سے بھی محبت نہیں کرتا۔" مومو نے زور دے کر کہا تھا۔

"کرے گا بیٹا! تم سے ہی محبت کرے گا۔"

"پھر بھی میرا دل نہیں مانتا۔ میں پرایا گہنا نہیں پہن سکتی۔"

مومو مسلسل انکاری تھی لیکن وہ مسز ملکہ آفاق ہی کیا جو اپنی بات نہ منوالیں۔۔۔ وہ مومو کو راضی کر کے ہی اٹھی تھیں اور انہوں نے خوشی خوشی مقدم جاہ تک مومو کی رضامندی پہنچادی تھی۔ وہ لوگ بھی سن کر بہت خوش ہوئے تھے لیکن جب معظم کو پتا چلا تو وہ گم صم سا ہو کے رہ گیا تھا۔

"مومو سے شادی؟" وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔

"کیوں؟ مومو اچھی نہیں ہے؟" مقدم جاہ اور شائلہ بیگم بیٹے کو دیکھ رہے تھے۔

"نن نہیں اچھی ہے' بہت اچھی ہے مگر میں۔۔۔ میں کیسے ایڈجسٹ کر پاؤں گا؟ وہ میرے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گی۔"

"لیکن تم تو اس کے ساتھ خوش رہو گے ناں؟"

"مگر پاپا۔۔۔"

"بس بیٹا! اب اور نہیں' ہم نے پہلے بھی ایک بار تم سے مومو کے لیے بات کی تھی لیکن اس وقت تم نے اپنی پسند کو ہماری پسند پہ ترجیح دی اور آج بھی وہی بات کر رہے ہیں' شاید ازل سے تمہارا اور مومو کا ہی ساتھ لکھا گیا تھا' مہر کا نصیب کوئی اور تھا۔" انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مہر کا نصیب۔۔۔!" وہ چبا کے بولا۔ آواز دھیمی تھی اسے رہ رہ کر مہر اور حنان درانی کی باتیں یاد آ رہی تھیں اور خون کھول اٹھتا تھا۔

"بس بیٹا! بھول جاؤ اسے۔"

"بھول گیا ہوں پاپا! بھول کر ہی یہ قدم اٹھا رہا ہوں لیکن میں یہ نہیں بھول سکتا کہ مہر ذیشان زبان کی کچی تھی' جھوٹی تھی' ساتھ نبھانے کی قسمیں کھانے والی ساتھ نبھانے سے پہلے ہی ساتھ چھوڑ گئی' میں اگر یہ بھی مان لوں کہ حنان درانی نے اسے اغوا کیا اور زبردستی نکاح کر لیا لیکن یہ کیسے مان لوں کہ جو کچھ اس نے اتنے آرام سے اتنے سکون سے کہا وہ بھی زبردستی تھا؟ وہ میری خاطر کسی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی تو مجھے فون کر کے سب کیوں بتایا؟ تاکہ میں اس کا انتظار نہ کروں' ہونہہ نہیں کروں گا انتظار' بھول جاؤں گا' سب بھول جاؤں گا۔۔۔ میں مومو سے ہی شادی کروں

"کہ آپ تیاری کریں۔"
معظم غصے اور نفرت سے کہتا وہاں سے چلا گیا تھا۔ نشاط بیگم شوہر کو دیکھنے لگیں وہ سر تھام کے بیٹھے تھے۔

☼ ☼ ☼

ہم بھی شکستہ دل ہیں' پریشان تم بھی ہو
اندر سے ریزہ ریزہ مری جان تم بھی ہو
مل جائیں ہم تو کیا سہانا سفر کٹے!
گھائل ہیں ہم بھی' سوختہ سامان تم بھی ہو

دلہن بنی مومو دل پہ بوجھ لیے بیٹھی اک لاشعوری سے انتظار میں تھی۔ وہ معظم جس کو وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر خدا سے مانگتی رہی لیکن وہ نہ ملا اور آج وہی معظم اسے بن مانگے مل گیا تھا۔ نہ ایڑیاں رگڑیں نہ دعائیں مانگا' بس مہر کا سمجھ کے چھوڑ دیا' لیکن اب مہر ہی اسے چھوڑ گئی تھی تو وہ مومو کی جھولی میں آ گرا تھا۔۔۔ جس پہ مومو حیران بھی تھی' پریشان بھی تھی اور شکستہ دل بھی۔۔۔

وہ ملا بھی تو کس حال میں؟
یہ نہیں تھا کہ اسے معظم سے محبت نہیں رہی تھی' بلکہ بات یہ تھی کہ اسے معظم کی طلب نہیں رہی تھی' وہ اسے پانے کی خواہش کا دامن چھوڑ چکی تھی۔ اور اب یہ کھلنا یہ تھا کہ معظم جانے کیا کچھ چھوڑا تھا؟ طلب' خواہش یا محبت؟ اور وہ اسی انتظار میں بیٹھی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں رات کا ایک بجا رہی تھیں۔ وہ گھنٹے ہو گئے تھے اسے اس بیڈ روم میں آئے اور اس کا انتظار کرتے ہوئے۔۔۔ لیکن وہ تھا کہ اپنے ہی بیڈ روم کا رستہ بھول گیا تھا۔
اس کا دل بھی انہی پھولوں کی طرح سرخ تھا لیکن وہ مہک دینے کے بجائے لو دینے لگا تھا۔ ہلکی ہلکی آنچ پہ رکھا دل تپ رہا تھا سینے میں جلن اور تپش ہونے لگی تھی انتظار کی گھڑی عذاب اور آزمائش کی گھڑی بن گئی۔ سلگتا اور پگھلتا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔
گھڑی کی سوئیاں تین تک پہنچ گئیں۔ رات قطرہ قطرہ بہہ رہی تھی۔ صبح اور رات کے درمیان بس اک اذان کا فرق رہ گیا تھا۔۔۔ وہ بیٹھے بیٹھے پتھر کی ہو گئی تھی کہ اذان ہوئی تو پتا چلا اس کا انتظار لاحاصل تھا۔ وہ اب بھی مہر سے ہی محبت کرتا ہے اور اس ادراک نے اسے مزید سخت بنا دیا تھا وہ اپنا دل کسی بھاری پتھر کے نیچے دبا کے لاتعلق ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں جب اس نے اپنے بیڈ روم میں جانے کا قصد کیا۔۔۔ اور لان کی سیڑھیوں سے اٹھ کر اندر آ گیا تھا۔۔۔ سب ہی گہری نیند سو رہے تھے اور اس سے پہلے کہ کوئی نماز کے لیے اٹھتا وہ اپنے بیڈ روم میں چلے جانا چاہتا تھا' حالانکہ اس کا اپنے بیڈ روم میں جانے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا مگر کبھی نہ کبھی تو جانا ہی تھا؟ وہ آہستگی سے بنا کوئی آہٹ پیدا کیے دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا کہ مومو کی نیند خراب نہ ہو لیکن۔۔۔ بیڈ روم میں روشنیوں کی چکا چوند اور بیڈ کے وسط میں بیٹھی مومو کو دیکھ کر وہ بری طرح چکرا گیا تھا۔ اس کا تو خیال تھا کہ مومو نے تھوڑی دیر اس کا انتظار کیا ہو گا اور سو گئی ہو گی لیکن وہ یوں ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہو گی اسے اندازہ نہیں تھا۔
"مومو۔۔۔؟" وہ زیر لب بڑبڑایا' اسے حیرت اور پچھتاوے نے آ گھیرا تھا' اس کے قدموں میں شکستگی اتر آئی تھی۔ وہ بمشکل بیڈ تک آیا اور مومو کے قریب ہی سر جھکا کر بیٹھ گیا۔
"آئی ایم سوری مومو!" معظم کی آواز بھاری ہو رہی تھی اور مومو کی آنکھیں سرخ۔۔۔
"میری فیلنگز ہی کچھ ایسی تھیں کہ میں تمہارے ساتھ اگر تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتا تھا' میں چاہتا ہوں کہ میرا اور تمہارا تعلق خود بخود بنے اس میں زبردستی کا اور مروت کا کوئی عمل دخل نہ ہو کیونکہ دل سے دل کا رشتہ ہمیشہ خود بخود ہی بنتا ہے۔"
وہ سر جھکائے آہستگی سے کہتا مومو کی طرف گردن موڑ کر بیٹھ گیا۔
"کتنا یاد کر کے آئے ہو اسے؟" اس پتھر کی آواز بھی پتھر تھی۔ اس کے سوال پہ معظم نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔۔۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
"ایک رات تو کم ہو گی اس کی یاد کے لیے؟ آئندہ کتنی راتیں لو گے؟" مومو کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تیکھا اور تلخ ہو گیا تھا۔ شاید رقابت کا زہر رگوں میں چلنے لگا تھا۔ اور معظم کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔
"میں اسے یاد نہیں کر رہا تھا۔" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔
"لیکن میں اسے ہی یاد کر رہی تھی۔"
"مومو پلیز بس کرو' میں پہلے ہی بہت ہارا ہوا ہوں مجھے اور مت مارو' میرے زخم ابھی ہرے نہیں' پلیز میرے زخموں کو ہرا نہ کرو۔" معظم بے اختیار ہو کر مومو کی گود میں چہرا چھپا کر رو پڑا تھا۔ اور مومو ساکت بیٹھی دیکھتی رہ گئی۔
اسے ادراک ہو چکا تھا کہ وہ مہر کا ہے اور اس کا ہی رہے گا!
"معظم۔۔۔" اس نے معظم کے بالوں میں انگلیاں پھنساتے ہوئے آہستگی سے پکارا۔ "پلیز بس کرو' میں تمہاری فیلنگز سمجھ چکی ہوں' تمہیں میری طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"
وہ اس کے بالوں کو سہلاتی اسے تسلیاں دے رہی تھی اور اس کی انہی تسلیوں کے باعث چند لمحوں بعد وہ نیند کی وادی میں اتر گیا تھا۔ اس کے آنسو مومو کی گود میں جذب ہو گئے' وہ اس کا سر تکیے پہ رکھ کے خود بیڈ سے اٹھ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

بیڈ روم میں کھڑبڑ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور انہی آوازوں کی وجہ سے اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ اس نے تکیے سے سر اٹھا کر دیکھا' مومو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تھی اور بے وجہ ہی پرفیومز کو اٹھا اٹھا کر چیک کر رہی تھی۔۔۔ پھر ہیر برش اٹھا کر اپنے بالوں میں پھیرنے لگی اور چند سیکنڈ کے بعد ہیر برش بھی ڈریسنگ ٹیبل پہ ڈال دیا تھا۔
معظم اسے دیکھتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا اسے گزشتہ رات اور فجر کے وقت ہونے والی بات چیت یاد آ گئی اور ساتھ میں شرمندگی کا احساس بھی۔
آخر اس سارے قصے میں مومو کا کیا قصور تھا؟ معظم نے دل سے پوچھا تو قصور اپنا ہی نکلا۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے بیڈ سے کھڑا ہو گیا۔
"تم نے ناشتا نہیں کیا ابھی؟" وہ اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔
"دلہن ہوں' بیڈ روم میں بیٹھ کر فارملٹی نبھا رہی ہوں' باہر جا کر ناشتا کیسے کرتی؟" اس نے کندھے اچکا کر کہا۔
"میں شاور لے لوں' پھر اکٹھے ناشتا کرتے ہیں۔"
وہ پلٹ کر واش روم میں چلا گیا اور دس منٹ بعد شاور لے کر واپس بھی آ گیا۔ سب لوگ ان کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔
حالانکہ پہلے بھی وہ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کئی بار ناشتا کر چکی تھی کئی بار کھانا کھا چکی تھی' تب اپنائیت کا احساس ہوتا تھا اپنا پن لگتا تھا لیکن آج اتنا مضبوط رشتہ ہونے کے باوجود بھی اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اپنا آپ مس فٹ لگ رہا تھا۔
"پراٹھا لو گی یا سلائس؟" نشاط بیگم ناشتا سرو کرتے ہوئے بولیں۔
"چائے۔" اس نے مختصر کہا۔
"ارے نہیں بیٹا! صرف چائے کیوں؟ یہ پراٹھا اور آملیٹ لے لو' یا پھر سلائس اور جوس لے لو۔" وہ ساری چیزیں اس کے سامنے اٹھا اٹھا کر رکھ رہی تھیں۔
"نہیں بھوک نہیں ہے۔" اس نے انکار کر دیا۔
"تو پھر چائے کے ساتھ یہ بوائل انڈے لے لو' رات سے کچھ نہیں کھایا تم نے۔"
وہ اصرار کر رہی تھیں' سو مجبوراً مومو نے جیم اور سلائس لیے اور چائے پی کر کھڑی ہو گئی تھی۔ معظم

نے بھی صرف چائے ہی پی تھی اور ان کے ناشتے سے ہی ان کے رویے کا پتہ چل گیا تھا۔ نشاط بیگم، مقدم جاہ کو دیکھتی رہ گئیں وہ نظر چرا گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

شام کو ولیمہ میں میراں بیگم، ذیشان احمد اور حمزہ بھی آئے ہوئے تھے میراں بیگم موسو کو دیکھ کر دل سے دعائیں دے رہی تھیں اور بے بی پنک کلر کے انتہائی قیمتی اور کامدار لہنگے میں دلہن بنی بجی سنوری موسو گڑیا لگ رہی تھی اور اپنے قریب بیٹھی میراں بیگم کو دیکھ رہی تھی وہ کتنی سادگی، کتنی محبت اور چاہت سے دعائیں دے رہی تھیں، حالانکہ جس جگہ موسو بیٹھی تھی وہ جگہ ان کی بیٹی مہر کی تھی۔

"آپ مہر کو مس کر رہی ہیں نا؟" موسو نے ان کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہ بیٹا! یہ وقت اسے مس کرنے کا نہیں ہے، تمہاری خوشیوں میں خوش ہونے کا ہے، اللہ تمہیں سدا سہاگن رکھے اور اللہ تمہاری جوڑی سلامت رکھے ــــ ہمیشہ خوش رہو۔" انہوں نے موسو کی پیشانی چومی۔

"کیا ہوا ہے بھئی؟ اتنی محبتیں کیوں نچھاور ہو رہی ہیں؟" مسز ملک اسٹیج پہ آتے ہوئے بولیں، ان کی نظریں کب سے موسو اور میراں بیگم پہ ہی تھیں۔

"اپنی بیٹی کو پیار کرنے کے لیے بھی کسی وجہ کا ہونا ضروری ہوتا ہے؟" میراں بیگم نے ملک کو دیکھا۔

"بیٹی کو پیار؟"

"ارے موسو میری بیٹی ہی تو ہے۔" میراں بیگم نے خفگی سے کہا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" ملکہ آفاق مسکرائیں۔

"تمہیں یاد ہے ملکہ! جب موسو پیدا ہوئی تھی تو اس کا نام رکھنے میں کتنا مسئلہ ہوا تھا؟ آفاق بھائی کی ضد تھی کہ وہ بیٹی کا نام عین سے رکھیں گے اور تمہاری ضد تھی کہ تم بیٹی کا نام میم سے رکھو گی کیونکہ تم تینوں بہن بھائی نے وعدہ کیا تھا کہ اپنے پہلے پہلے بچوں کا نام "میم" سے ہی رکھیں گے جیسے میراں، ملکہ اور مقدم ہوئے ہیں "مہر، موسو اور معظم۔"

میراں بیگم وہ وقت یاد کر کے مسکرائی تھیں لیکن مسز ملکہ آفاق کے لب بھینچ گئے تھے وہ گزرا وقت یاد کرتیں تو بہت کچھ یاد آتا تھا۔

"مہر کا پھر کوئی فون آیا؟" انہوں نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

"ہونہہ! اب بدنصیب نے کیوں فون کرنا ہے؟ جو ہو گیا سو ہو گیا، وہ ہمارے لیے مر گئی ہم اس کے لیے مر گئے۔"

"پلیز خالہ! ایسا مت کہیں، دعا کریں وہ جہاں بھی رہے خوش رہے۔" موسو نے بے ساختہ کہتے ہوئے انہیں ٹوک دیا تھا۔ مہر بے شک معظم اور اس کے بیچ ایک دیوار تھی لیکن موسو نے کبھی بھی اس دیوار کو گرانے کا نہیں سوچا تھا۔ مہر اسے ایسی ہی محبت تھی جیسی کسی بہن سے۔

"آمین ــــ!" میراں بیگم کہتی ہوئی اٹھ گئیں۔ آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے۔

"یہ کیا تم منہ لٹکا کے بیٹھی ہوئی ہو؟ کوئی خوشی نظر نہیں آ رہی؟" ملکہ آفاق بیٹی کے پاس بیٹھ کر اپنے دبے لفظوں میں ڈانٹنے لگی تھیں۔

"تو اور کیا کروں مام؟"

"خوش رہو، تمہاری خوشی تمہارے چہرے سے نظر آنی چاہیے، میں تمہاری چپ اور اداس صورت نہیں دیکھ سکتی ــــ یہ سب تمہاری خوشی کے لیے کیا ہے۔" وہ اسے [illegible] رہی تھیں اور موسو چپ چاپ سنتی رہی۔

"ملکہ آنٹی آپ سے کچھ جاننے والے آپ کو یاد کر رہے ہیں۔" معظم نے قریب آتے ہوئے اطلاع دی اور وہ چونک کر اٹھ گئیں۔

"تم اس کے شوہر ہو اب، اسے کہو کہ خوش رہے۔"

وہ جاتے جاتے معظم کو جتا گئیں اور معظم ٹھٹک کر موسو کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ موسو نے رات کا قصہ تو نہیں بتا دیا انہیں؟ لیکن موسو کا چہرا اتنا سپاٹ تھا کہ وہ کوئی بھی نتیجہ اخذ نہ کر سکا البتہ واپسی پہ وہ ڈرائیو کرتے ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم نے ملکہ آنٹی سے کچھ کہا ہے؟" وہ ڈرائیونگ کے دوران پوچھ رہا تھا گاڑی کے اندر مکمل خاموشی تھی اور اس خاموشی کا تسلسل اس نے خود توڑا تھا۔

"کیا مطلب؟" موسو کی نظریں سامنے ونڈ اسکرین پہ تھیں لیکن انداز وہی سرد و سپاٹ سا۔

"مطلب کہ رات کے بارے میں کچھ کہا ہو [illegible]؟"

"رات میں ایسا کیا تھا جو میں ان کو بتاتی؟" موسو کا انداز عجیب تھا۔

"تھینک یو موسو! [illegible] سنبھلنے کے لیے اسی طرح تمہارے ساتھ کی ضرورت ہے۔" معظم نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے دبایا تھا اور موسو سیٹ کی پشت پہ سر ٹکاتے ہوئے پلکیں موند گئی۔

معظم اسے اپنے ساتھ لیے بیڈ روم میں آ گیا۔ رات کے ایک بجے کا ٹائم ہو رہا تھا۔ موسو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آ رکی اور اپنا سجا سنورا روپ دیکھا۔

"آج پھر بھائی آپ کو دیکھ کر چاروں شانے چت گریں گے۔" اریبہ نے اسے پارلر میں تیار ہوتے دیکھ کر معظم کے حوالے سے چھیڑا تھا۔ موسو چپ ہو گئی تھی وہ اسے کیا بتاتی کہ ہاں تمہارا بھائی واقعی چاروں شانے چت گر چکا ہے اور اب اٹھنے کی ہمت بھی نہیں ہے ــــ لیکن اس وقت اپنا آپ دیکھ کر اریبہ کی بات یاد آئی تو اسے آپ ہی ہنسی آ گئی تھی۔ کیا وہ بھی کوئی لڑکی تھی، جس کو اس کے شوہر نے نظر بھر کے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اک نگاہ غلط بھی نہ ڈالی تھی۔ اس کو دیکھ کر ایک بار بھی اس کے قدم ٹھٹکے نہیں تھے، وہ اسے دیکھ کر مبہوت نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اسے دیکھ کر اس کے چہرے پہ کوئی خوشی جاگی تھی ــــ

"کیا دیکھ رہی ہو؟" معظم وارڈ روب سے کپڑے نکال کر ہٹا تو اسے یک ٹک آئینے کے سامنے کھڑے دیکھ کر ٹھہر گیا ــــ

"کچھ نہیں ــــ" اس نے چونک کر نفی میں گردن ہلائی۔

"لیکن نظر تو بہت کچھ آ رہا ہے۔" معظم کی نظریں بھی آئینے میں نظر آتے اس کے عکس پہ تھیں۔

"تم [illegible] سکتے ہو کہ بہت کچھ نظر آ رہا ہے؟" موسو کا انداز تمسخرانہ سا تھا۔

"جس نظر سے میں دیکھ رہا ہوں وہ تم نہیں دیکھ سکتیں۔" معظم نے اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کا رخ اپنی سمت موڑ لیا تھا اور اس کی نظر میں نجانے ایسا کیا تھا کہ موسو نظر اٹھا کر دیکھ نہ سکی۔

"تم کل کی طرح آج بھی بہت خوب صورت لگ رہی ہو، ویری ویری بیوٹی فل۔" معظم نے شوہرانہ مزاج اور موڈ میں کہا تھا۔ موسو نے چونک کر دیکھا اور معظم نے جھک کر اس کی خوب صورتی کو اک انمول سا خراج پیش کیا تھا اور موسو کے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس کے گرم لودیتے ہونٹوں کا لمس اس کی گردن ثبت ہو کے رہ گیا تھا اور وہ موسو کے رخسار تھپک کے پیچھے ہٹ گیا۔

"رات بہت ہو گئی ہے چینج کر کے سو جاؤ۔" وہ اسے کہہ کر خود چینج کرنے چلا گیا تھا لیکن موسو اس کے ایسے لمس سے ہی نیم جان ہو گئی تھی ڈل تھا کہ بجھو تو ڑ دینے کے درپے تھا۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالتی بمشکل چینج کر کے بیڈ تک آئی تھی لیکن اتنے میں معظم اوندھے منہ لیٹا سو چکا تھا۔ اس کے برابر بیڈ پہ لیٹنے کی اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ کل کی رات تو تنہا گزر گئی تھی لیکن آج ــــ! بڑی ہمت کر کے وہ سمٹ کے اس کے برابر لیٹی تھی اور اس کا ہاتھ اپنی گردن کو چھو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہنی مون پہ جاؤ گے تم لوگ؟" مسز ملکہ آفاق نے ان دونوں سے مسکرا کے پوچھا۔ آج وہ دونوں ان کی طرف آئے ہوئے تھے۔

"ابھی تو کوئی ارادہ نہیں ہے ــــ" معظم نے اک

نظر موموکو دیکھ کر نفی میں سر ہلایا۔

"کوئی بات نہیں' ارادہ بنتے کون سا دیر لگتی ہے۔ یہاں بیٹھے بیٹھے ہی ارادہ بنا لو اور اس کے لیے میری طرف سے آپ کے لیے گفٹ بھی ہو گا۔"

"گفٹ؟" مومو نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں تم لوگوں کا ہنی مون میری طرف سے ہو گا۔ چاہے تم لوگ سوئزرلینڈ جاؤ چاہے مال دیپ' میں ٹکٹس کنفرم کروا لیتی ہوں' تم لوگ تیاری کر لو۔" انھوں نے لاپروائی سے کہا۔

"نہیں ماما! میرا کہیں جانے کا بھی موڈ نہیں ہے۔ آپ یہ پروگرام یہیں کینسل کر دیں۔" اس سے پہلے کہ معظم انکار کرتا مومو نے خود منع کر دیا تھا۔

"کیوں موڈ کیوں نہیں ہے؟ معظم کا موڈ تو ہو گا جانے کے لیے؟" انھوں نے معظم کی طرف رخ موڑا۔

"اگر مومو کا موڈ نہیں ہے تو میرا بھی موڈ نہیں ہے' یہ پروگرام پھر کبھی پہ اٹھا رکھتے ہیں۔ اینی وے آنٹی! آپ سے پھر ملاقات ہو گی' میں پاپا کے پاس ذرا آفس تک جا رہا ہوں' میری امانت آپ کے حوالے۔" وہ اسے دیکھ کر چلا گیا اور مومو مزید چپ ہو کے بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے مومو؟ میں تمہارے چہرے پہ جو خوشی دیکھنا چاہتی ہوں مجھے وہ مل ہی نہیں رہی؟" ملکہ آفاق اس کے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔

"ماما! میں خوش تو ہوں؟"

"کیا نئی نویلی دلہنیں اس طرح خوش ہوتی ہیں؟ ان کی تو شرماہٹ اور گھبراہٹ ہی ختم نہیں ہوتی' ان کے چہرے پہ تو گلابیاں بکھری رہتی ہیں۔" ان کا دل پریشان ہو رہا تھا۔

"کیا معظم کی طرف سے کوئی پرابلم ہے؟"

"نہیں ماما! کوئی پرابلم نہیں ہے' وہ بہت اچھا ہے' ایک سمجھ دار اور ذمہ دار شوہر ہے' بہت کیئرنگ ہے۔" اس نے سچائی سے کہا۔

"ایک ہفتہ ہو گیا ہے تمہاری شادی کو لیکن۔" وہ کہتے کہتے چپ ہو گئیں۔

"ڈونٹ وری ماما! اب ٹھیک ہے۔ بس آپ کا وہم ہے' میں کچھ دیر کے لیے اپنے بیڈ روم میں جا رہی ہوں' معظم آ جائے تو بتا دیجیے گا۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور ملکہ آفاق وہیں بیٹھی اسے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھتی رہیں۔

☼ ☼ ☼

وہ کتنی دیر سے سونے کی کوشش کر رہی تھی لیکن سر درد کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی تھی' بیڈ کی دوسری سائیڈ پہ لیٹا معظم اس کی بے چینی محسوس کر چکا تھا۔

"کیا بات ہے' تمہیں نیند نہیں آ رہی؟" اس نے مومو کی طرف کروٹ بدلی۔

"سر میں درد ہو رہا ہے۔"

"ٹیبلٹ لے لو۔" معظم نے کہنی کے بل اونچا ہوتے ہوئے اسے دیکھا۔

"ٹیبلٹ نہیں ہیں۔" وہ اپنی کنپٹیوں کو مسل رہی تھی۔

"لاؤ میں سر دبا دیتا ہوں۔" معظم نے اس کے سر کی سمت ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں' اس کی ضرورت نہیں ہے۔" مومو ذرا پیچھے ہو گئی تھی۔

"کیوں؟" اس نے حیرت سے دیکھا۔

"ٹھیک ہو جائے گا۔"

"بغیر کسی علاج کے؟" اس نے مومو کو کلائی سے پکڑ کر اپنی سمت کھینچا۔ اور مومو کی جان کھنچ گئی۔

"وہ۔۔۔ وہ ٹیبلٹ تو ہیں لیکن لانے والا کوئی نہیں ہے۔"

"کہاں ہیں ٹیبلٹ؟" معظم اس کی کمر میں بازو حمائل کرتے ہوئے بولا اس کا لہجہ بدل رہا تھا اور مومو کی دھڑکنیں سہم رہی تھیں۔

"وہ۔۔۔ وہ میرے۔۔۔ میرے بیڈ روم میں۔۔۔" اس نے بے ربط سے انداز میں کہا۔

"تمہارے گھر میں؟"

"ہوں۔"

"لے آؤں؟" وہ اجازت لے رہا تھا۔

"پھر ٹھیک ہو جاؤ گی؟" وہ معنی خیزی سے بولا۔

"کیا پتہ؟"

"پتا ہونا چاہیے' ہاں' میں رات کے اس وقت اتنی مشکل سے تمہارے گھر ٹیبلٹ لینے جاؤں اور تم پھر بھی ٹھیک نہ ہوئیں تو مجھے کیا فائدہ ہو گا؟" وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

مومو نظر چرا رہی تھی۔۔۔ وہ اک گستاخی کا ارتکاب کرتا ہوا کھڑا ہو گیا تھا۔

"کہاں رکھی ہیں؟" وہ سلیپر پہن کر دروازے کی سمت بڑھتے ہوئے [illegible]۔

"بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ہوں گی یا پھر الماری میں' جہاں میرے کپڑے رکھے ہوئے ہیں۔" اس نے جگہ بتائی اور معظم باہر نکل گیا' باقی سب ابھی سو رہے تھے وہ آہستگی سے چلتا باہر آ گیا۔ چوکیدار اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"صاحب خیریت؟"

"ہوں خیریت ہی ہے ملکہ آنٹی کے گھر تک جا رہا ہوں تم گیٹ بند نہیں کرنا۔ میں بس آ رہا ہوں پانچ منٹ میں۔"

اس نے ہدایت کی اور ملکہ آفاق کے گھر آ گیا۔ ان کے چوکیدار نے بھی معظم سے یہی سوال کیا تھا وہ اسے بھی تسلی دے کر اندر مومو کے بیڈ روم میں آ گیا۔ اس نے دونوں سائیڈ ٹیبل دیکھ لیے لیکن ٹیبلٹ کہیں نہیں تھے بالآخر اس نے الماری کا رخ کیا اور ذرا سی دیر میں اسے ٹیبلٹ تو مل گئیں لیکن ساتھ میں اور بھی بہت کچھ ملا تھا۔ سامنے ایک چھوٹا سا ٹیڈی بیئر رکھا تھا آف وائٹ کلر کے ٹیڈی بیئر نے سرخ رنگ کا دل ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور اس دل پہ "ڈبل ایم" لکھا ہوا تھا' معظم نے ڈبل ایم کو حیرت سے دیکھا اور پھر کئی چیزیں دیکھتا چلا گیا۔

"آئی لو یو معظم!" ایک نوٹ بک پہ جلی حروف لکھا ہوا تھا۔

"آئی مس یو معظم!"

"مومو صرف تمہاری ہے۔"

"کب تک؟" اس کی ہر ڈائری' ہر نوٹ بک اور ہر کتاب پہ معظم کا نام لکھا ہوا تھا اور اس لکھنے میں ایسی دیوانگی اور ایسی شدت تھی کہ معظم ششدر سا پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہ گیا۔ یہ سب اس وقت کی تحریریں تھیں جب وہ انگلینڈ میں تھا۔

"کون چاہتا ہے کہ تمہیں میری طرح؟" یہ عبارت ایک ڈائری کے ٹائٹل پہ لکھی تھی۔

"مومو کس سے محبت کرتی ہے یہ جاننے کی میں نے آج تک کوشش ہی نہ کی؟ میں یہ بھی بھول گیا کہ اکثر رتجگوں سے اس کی آنکھیں گلابی کیوں رہتی ہیں؟ وجہ کون ہے؟ محور کون ہے؟ کیا میری عقل پہ پردہ پڑ گیا تھا؟ وہ بھی میرے برابر جلی اور مجھے پتہ ہی نہ چلا؟"

معظم کے تو جیسے کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والا معاملہ تھا۔۔۔ وہ تینوں ایک ہی تکون میں چکراتے رہے اور اک دوسرے سے چھپاتے رہے' سب کو اپنے ہی غم نے چاٹ ڈالا تھا کوئی کسی دوسرے کے درد کو سمجھ ہی نہ سکا!

وہ اس انکشاف پہ سنبھل ہی نہ پا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے بیٹا! تم ٹھیک تو ہو؟" آفس میں مقدم جاہ اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر ٹھٹک گئے تھے۔

"جی ٹھیک ہوں' آپ یہ فائلز چیک کر لیں' منیجر صاحب آپ کا ہی انتظار کر رہے تھے۔" اس نے ٹیبل پہ رکھی فائلز کی سمت اشارہ کیا اور وہاں سے نکل کر اپنے کیبن میں آ گیا۔

"تم آج گھر چلے جاؤ۔" تھوڑی دیر بعد مقدم جاہ اس کے پیچھے ہی اس کے روم میں آ گئے۔

"تھوڑی دیر تک چلا جاؤں گا بس یہ ضروری کام نپٹا لوں۔" وہ انھیں تسلی دے رہا تھا اور مجبوراً مقدم جاہ کو واپس جانا پڑا اور معظم پورا دن یونہی کام میں لگا رہا۔ واپسی پہ شام کے سات بج گئے تھے۔۔۔ واپس گھر آیا تو

پہلا سامنا موموسے ہی ہوا تھا۔

"السلام علیکم...!" مومونے بے ساختہ سلام کیا۔

وہ سرہلا کر اندر چلا گیا تھا اور موموا اس کی پشت کو دیکھتی رہ گئی۔ اسے اس کے موڈ پہ حیرت ہوئی تھی۔

پھر وہ کھانے کے وقت بھی بیڈ روم سے باہر نہ آیا۔ تو نشاط بیگم نے موموکو بلانے کے لیے بھیجا لیکن وہ سو رہا تھا، ساری رات اس نے آنکھوں میں گزار دی تھی۔ موموتو اس کا انتظار کرتے کرتے سو گئی تھی لیکن وہ نہیں سویا تھا شاید اسی لیے طبیعت میں بوجھل پن محسوس ہو رہا تھا اور بیڈ پہ لیٹتے ہی سو گیا تھا۔ موموا سے دیکھ کر واپس پلٹ آئی۔

"وہ سو رہا ہے۔" اس نے آہستگی سے بتایا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"ہاں وہ آفس میں بھی کچھ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا، شاید اس کی نیند پوری نہیں ہوئی۔" مقدم جاہ نے سر ہلایا۔

وہ پھر وہ بھی ٹھیک سے کھانا نہیں کھا سکی تھی اور چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر بہت جلد بیڈ روم میں آگئی تھی... مگر اتنے میں وہ بیدار ہو چکا تھا۔

"آپ اٹھ گئے؟" موموکو تسلی ہوئی کہ وہ ٹھیک ہے۔

"کیوں خیریت؟"

"میں کھانے کے لیے آپ کو بلانے آئی تھی مگر آپ سو رہے تھے..."

"میں اس وقت بھی جاگ رہا تھا۔"

"اچھا؟ تو پھر آپ اٹھے کیوں نہیں؟"

"میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم مجھے جگاتی ہو یا نہیں؟ لیکن یار! تم تو اتنی صابر ہو کہ راستے سے ہی پلٹ جاتی ہو نیند سے جگانے کی کوشش ہی نہیں کرتیں چاہے بندہ ہمیشہ کی نیند سو جائے۔" معظم عجیب سے لہجے میں بول رہا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" موموکے دل کو کچھ ہوا۔

"ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔" معظم نے اپنے پہلو میں اشارہ کیا۔ وہ بیڈ سے ٹیک لگائے نیم دراز بیٹھا تھا۔

"میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

"ادھر آؤ یار! اپنی خوبیوں سے مجھے بھی کچھ فیض یاب ہونے دو۔" اس نے اصرار کیا۔

"میری خوبیاں؟" اسے حیرانی ہوئی۔

"ادھر آؤ گی تو بتاؤں گا ناں؟" وہ جھنجلا کے بولا اور موموا مجبوراً بیڈ پہ اس کے پہلو میں آ بیٹھی...

"یہاں دل پہ ہاتھ رکھو اور اس دل کو اپنا پابند کرلو، اپنا قیدی بنالو، نادان ہے اشاروں کی باتیں اور دلوں کی باتیں نہیں سمجھتا، اگر سمجھتا تو تمہیں یوں نظر انداز نہ کرتا۔"

اس نے موموکا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پہ رکھ لیا تھا لیکن موموکو تو جیسے کرنٹ چھو گیا تھا اس کے ہاتھ اور جسم آگ کی طرح تپ رہے تھے۔

"آپ کو بخار ہے؟"

"نہیں یار! یہ میرے اندر کی جلن ہے۔"

"آپ ٹھیک نہیں ہیں معظم!"

"میں ٹھیک ہو چکا ہوں موموا!" اس نے موموکا ہاتھ لبوں پہ رکھ لیا۔

"آج کے بعد معظم جاہ کی ذات تمہارے نام آج کے بعد میرے دل سے مہر کا خیال بھی نہیں گزرے گا اگر ایسا ہوا تو سمجھ لینا تمہاری محبت میں کوئی کمی رہ گئی تھی اور میں تمہارے معاملے میں کبھی کوتاہی نہیں کروں گا نہ چاہتوں میں نہ راحتوں میں۔" معظم نے اسے یقین دلایا۔

"یعنی محبت کا مہر سے مقابلہ کر رہے ہو؟" موموا نے چونک کر دیکھا۔

"شاید۔"

"ہار جیت کا پتہ کیسے چلے گا؟"

"اگر تمہارا ہاتھ ہمیشہ اسی طرح میرے ہاتھ میں رہا تو جیت تمہاری اور اگر چھوٹ گیا تو سمجھ لینا کہ مہر میرے دل سے نہیں نکل سکی، وہ جیت گئی۔" اس نے کہتے ہوئے موموکا ہاتھ چوم لیا۔

"چلو یہ بازی بھی منظور ہے۔" موموا نے مان لیا۔

"لیکن موموا اتنا سوچ لینا کہ میں تمہارا ابن کے رہنا چاہتا ہوں۔" معظم نے کہتے ہوئے اسے بانہوں میں بھینچ لیا تھا۔

"آئی لو یو معظم۔۔۔ آئی لو یو سو مچ۔" وہ اس کے سینے میں منہ چھپائے رو پڑی تھی اور معظم کے تپتے جسم پہ اس کے آنسوؤں کی اوس گرنے لگی تھی۔ اس کے اندر کی تپش کم ہو رہی تھی۔

مومو نے اپنا آپ تمام تر رضا مندی اور اعتبار سمیت اسے سونپ دیا تھا اور معظم نے اسے سچے صاف دل سے قبول کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وصال یار کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست!
تیرے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کے اپنے ناخنوں پہ نیل پالش لگا رہی تھی جب وہ ہلکے سے شعر گنگنایا تھا۔

"اچھی لگ رہی ہو۔۔۔" اس نے اور ہی معنی میں تعریف کی تھی۔ اس کا چہرہ جھک گیا تھا۔۔۔ "تمہی سنوری بیوی بہت اٹریکٹ کرتی ہے" "اسی طرح رہا کرو۔" وہ اسے ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ نیل پالش خشک کرنے کے لیے ناخنوں پہ پھونکیں مارتی ہوئی کھڑی ہو گئی تھی۔

"لاؤ میں خشک کرتا ہوں۔" معظم اس کے ہاتھ تھام کے خود پھونکیں مارنے لگا۔

"دیکھ لو اتنی محنت کر رہا ہوں" "انعام تو ملنا چاہیے نا؟" اس نے مومو کو جن نظروں سے دیکھا وہ بدک گئی۔

"پلیز، پلیز، معظم! میری نیل پالش گیلی ہے۔" وہ چیخی۔

"کردوں گا ٹھیک، بلکہ نئی لگا لینا۔" اس کے تیور خطرناک تھے۔

"ایک بات کہوں آپ سے؟" مومو نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہوں! کہو کیا بات ہے؟" وہ ٹھٹک کر رک گیا تھا اور جیسے ہی اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی مومو بیڈ سے اٹھ گئی تھی۔

معظم ہاتھ ملتا رہ گیا اور وہ کھلکھلاتی ہوئی یکدم باہر نکل گئی تھی۔ معظم اس کی چالاکی پہ ہنستا اس کے پیچھے لپکا۔

"ارے بھئی سنبھل کے۔۔۔" مومو نشاط بیگم سے جا ٹکرائی تھی۔

"سوری آنٹی! وہ معظم۔۔۔" اس نے پیچھے دیکھا معظم انہیں دیکھ کر ٹھہر گیا تھا۔

"ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔" ریڈ کلر کے ڈریس میں وہ واقعی جچ رہی تھی۔

"تھینک یو۔" مومو کی شرم کے مارے نظر جھک گئی تھی۔

"کہیں جا رہے ہو تم لوگ؟" انہوں نے تیاری دیکھ کر پوچھا۔

"جی آج بڑی مدت بعد شاپنگ کا موڈ ہوا ہے میں نے کبھی مومو کو اپنی جیب سے شاپنگ نہیں کروائی۔"

"اچھی بات ہے بیٹا! ضرور جاؤ، خوش رہو۔" انہوں نے دل ہی دل میں نظر اتارتے ہوئے کہا اور پھر وہ دونوں گاڑی لے کر نکل گئے تھے۔ آج سب کچھ معظم کی مرضی کے مطابق تھا۔۔۔!

☼ ☼ ☼

معظم اور وہ سب کے درمیان بیٹھے تھے۔ ماموں نے انہیں بلایا تھا۔

"بیٹا! ہماری شروع سے خواہش تھی کہ پہلے بیٹے کی شادی ہو جائے اور بہو کو گھر لے آئیں پھر بیٹیوں کی باری آئے گی۔"

"جی کہیے کیا بات ہے؟" معظم کافی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"وہ دراصل کل شیرازی صاحب کی مسز اریبہ کے لیے ہمارے گھر آنا چاہتی ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے ان کی کال آئی تھی میں نے سوچا پہلے تم دونوں سے مشورہ کر لیا جائے پھر ہاں بھریں گے۔" مقدم جاہ نے ان دونوں کو دیکھا۔

"ابھی ہاں بھرنے کی کیا ضرورت ہے ابھی آپ ان کی پوری فیملی کو انوائیٹ کریں پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے؟"

"کیا مطلب بیٹا؟"

"میرا مطلب ہے کہ کل ہم لوگ آپس میں ملیں گے تو بہت سی چیزوں کا پتہ چلے گا۔ آپ لڑکے کو بھی انوائٹ کریں۔ صرف شیرازی صاحب کی مسز کے آجانے سے تو کام نہیں بنے گا ناں؟" وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

مقدم جاہ کو اس کی بات پسند آئی تھی۔ انہوں نے فون کر کے ساری فیملی کو انوائٹ کر لیا تھا۔

"میں جاؤں اب؟" مومو کھڑی ہو گئی۔

"ہوں جاؤ، تمہارے بیٹ میں اب کیا چوہے دوڑ رہے ہیں، ہم جانتے ہیں۔" مقدم جاہ کو پتہ تھا کہ وہ اریبہ اور امانہ وغیرہ کو گڈ نیوز دینا چاہتی ہے اور معظم مسکرا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شیرازی صاحب کی فیملی اور لڑکا سب ہی کو پسند آیا تھا اور اریبہ کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو اریبہ پسند آئی تھی یوں دونوں گھروں میں بڑے زور و شور سے شادیوں کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ مقدم جاہ نے ملکہ آفاق اور میراں بیگم کو بھی ساری بات بتا کر مشورہ مانگا تھا وہ دونوں بہنیں بھی بھتیجی کے نیک نصیب پہ بہت خوش ہوئی تھیں۔ دو ماہ گزرنے کا پتا ہی نہ چلا اور شادی کے دن قریب آ گئے!

وہ مہندی کی سجی سجائی ہتھیلیوں میں موم بتیاں لگا رہی تھی اور مہندی کی خوشبو سے اس کا دماغ عجیب بوجھل سا ہو رہا تھا بالآخر وہ رہ نہ سکی تو باتھ روم کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ معظم اندر کمرے میں آیا تو باتھ روم سے مومو کی ابکائیاں کرنے کی آواز سن کر ٹھٹک گیا تھا۔ کافی دیر بعد وہ باتھ روم سے برآمد ہوئی تھی۔

"ابھی تھوڑا ریسٹ کر لو مہندی کے فنکشن میں کافی ٹائم ہے۔" معظم نے اسے بیڈ پہ بٹھانا چاہا۔

"نہیں میں اب ٹھیک ہوں، نیچے جا کر چائے لیتی ہوں۔" اس نے معظم کو ٹالنے کی خاطر آپ کو فریش ظاہر کیا اور پھر اس کے ساتھ ہی باہر نکل آئی تھی مگر وہ زیادہ دیر اپنے قدموں پہ قائم نہ رہ سکی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے چکرا گئی وہ لڑکھڑا کے گرنے کو تھی کہ معظم نے یکدم اسے سنبھال لیا۔

"مومو! مومو!" اس نے پریشانی سے اسے پکارا۔

"کیا ہوا مومو کو؟" نشاط بیگم بھی دیکھ چکی تھیں۔

"پتا نہیں سیڑھیاں اترتے چکرا گئی ہے۔" معظم اسے اٹھا کر بیڈ روم میں لے آیا تھا۔ اریبہ تو مہندی کے فنکشن کے لیے تیار ہو رہی تھی اس لیے اسے پتا نہ چلا البتہ امانہ بھاگتی ہوئی آئی تھی اور یہی اطلاع راہداری میں داخل ہونے والی مسز ملکہ آفاق کو ملی تھی۔

"میری مومو کو کیا ہوا؟" وہ لپک جھپک معظم اور مومو کے بیڈ روم میں پہنچی تھیں۔

"چکرا کے گر گئی تھی ڈاکٹر کو فون کر دیا ہے۔" نشاط بیگم نے تسلی دی۔

"مومو! آنکھیں کھولو بیٹا!" ملکہ آفاق اس کے قریب بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے اس کا رخسار تھپکتے ہوئے بولیں۔

پھر مقدم جاہ کے بلانے پر وہ طوعاً کرہاً مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے نیچے آ گیا تھا۔

"مبارک ہو میں دادی بننے والی ہوں۔" نشاط بیگم مٹھائی کی پلیٹ لے کر ان دونوں باپ بیٹے کے قریب آ گئیں۔

"اور میں دادا۔۔" مقدم جاہ قہقہہ لگا کر ہنسے اور معظم حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

"باپ بننے کی مبارک ہو۔" نشاط بیگم نے مٹھائی اس کے منہ میں ٹھونسی، وہ جھینپ گیا تھا۔ اور انہوں نے بے ساختہ پیار سے اس کی پیشانی چوم کر دعائیں دی تھیں۔ آج ان کے لیے دوہری خوشی کا دن تھا۔ ملکہ آفاق کو تو جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی۔ وہ

معظم اور موموکے واری صدقے جارہی تھیں۔ انھوں نے موموکی نظر اتارنے کے لیے اپنا پورا پرس خالی کردیا تھا۔ میراں بیگم اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ وہاں پہنچیں تو یہ خوشخبری ان کی منتظر تھی۔ ان سب کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ مہندی کا فنکشن شروع ہوا تو اریبہ موموکے بیڈ روم میں اس سے مل کر نیچے آئی تھی موموکو ڈاکٹر نے ریسٹ کرنے کی تاکید کی تھی۔۔۔!

☼ ☼ ☼

جب سے اریبہ رخصت ہوئی تھی گھر ایک دم سے خاموش سا ہو گیا تھا۔ اب گھر پہ موموا ور امال ہی ہوتی تھیں۔ معظم ایک بار پھر آفس اور کاروبار میں بزی ہو چکا تھا لیکن موموکا دھیان رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔۔۔ آفس جاکر بھی پورا دن اسے ہی فون کرتا رہتا۔

"کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا میں واپسی پہ لے آؤں گا۔" اس نے لنچ کے بعد کال کی تھی۔

"ہوں ضرورت تو ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"کس چیز کی؟" وہ اپنے دھیان میں تھا۔

"آپ کی۔۔۔" موموکا میٹھا انداز اور لہجہ اس کے کانوں میں رس گھول گیا تھا۔

"آجاؤں؟"

"آجاؤ۔۔۔" وہ بھلا کب انکار کرنے والی تھی۔۔۔ اس نے فون بند کردیا تھا اور موموں نے کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے تھے باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور ہوا کے زور پہ بارش بھی جھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

معظم کی محبت اور توجہ بھی اس کے لیے اس بارش کی طرح ہی ثابت ہوئی تھی۔ جنھوں نے اسے سرتاپا بھگو کے رکھ دیا تھا۔ اور اس کا تن من جل تھل ہو گیا تھا۔ وہ چاہتوں کی بارش میں بھیگ کر مسرور اور سرشار سی رہنے لگی تھی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ معظم اسے اس قدر چاہے گا کہ وہ اپنا آپ بھی بھول جائے گی۔

"گڈ نون۔۔۔" وہ بے قدموں اس کے قریب اس کے عقب میں آکھڑا ہوا تھا۔

"اتنی جلدی آگئے؟"

"تم بلاؤ اور میں دیر کردوں؟" وہ اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"آپ مجھ سے اتنا پیار نہ کیا کریں کہ میں مغرور ہو جاؤں۔"

"تمہارا حق بنتا ہے کہ تم غرور کرو۔" اس نے کہتے کہتے جسارت کرڈالی موموسمٹ گئی تھی۔

"غرور کے ٹوٹنے سے ڈر لگتا ہے۔"

"یہ ڈر دل سے نکال دو یار!"

"معظم۔۔۔؟"

"ہوں؟"

"تم۔۔۔ تم میرے ہو ناں؟" وہ معظم کا ہاتھ اپنے دل پہ رکھے پوچھ رہی تھی۔ موموکے اندر کا خوف اس سوال کے بعد اس کے چہرے پہ سمٹ آیا تھا۔

"ہاں صرف تمہارا۔" اس نے بڑے مضبوط انداز میں جواب دیا تھا اور موموکا رکا ہوا سانس بحال ہوا تھا۔ چہرے پہ ہلکی سی خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پہلا بچہ اپنے میکے میں ہی ہوتا ہے۔ اب وہ میرے ساتھ گھر چلے اور پھر ڈلیوری سے فارغ ہو کر آپ لوگوں کے پاس آجائے گی۔"

ملکہ آفاق آج موموکو لینے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ نشاط بیگم نے معظم کو دیکھا وہ ان کی خواہش پہ کل سمجھا کر گیا تھا۔

"کیا بات ہے کیا ہو رہا ہے؟" موموبھی وہیں چلی آئی تھی۔

"تمہیں لینے کے لیے آئی ہوں بیٹا!" ملکہ آفاق نے فوراً اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔" موموں نے سرہلاتے ہوئے کہا اور معظم کی طرف دیکھا وہ لاتعلق سا بنا بیٹھا تھا۔

"تم اپنی تیاری کرلو میں ویٹ کرتی ہوں۔" مسز

ملکہ آفاق نے اطمینان سے صوفے کی بیک سے سر ٹکاتے ہوئے کہا اور ہاتھ میں پکڑے چائے کے کپ کو ہونٹوں سے لگالیا۔

"لیکن ماما ابھی تو ڈلیوری میں کافی دن ہیں۔" موموں نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ ماما اسے کتنے شوق سے لینے کے لیے آئی ہیں لیکن معظم اتنے دن پہلے اس کے جانے کے حق میں نہیں تھا اسی لیے اس نے بہانا بنایا تھا، وہ خود بھی معظم سے اتنے دن دور نہیں رہ سکتی تھی۔

"ارے تو کیا ہوا؟ تم پندرہ دن میرے پاس نہیں گزار سکتیں؟" "نہیں ایسا ہوا تو۔۔۔"

"ایسی بات نہیں ہے ماما وہ دراصل۔۔۔" موموسے کوئی بہانا نہ بن پڑا۔

"ملکہ! تم خوامخواہ ساتھ ہو نجانے کی کوشش کرو، بچے اک دوسرے سے دور نہیں رہنا چاہتے۔" نشاط بیگم نے ہنستے ہوئے تیزی سے سمجھایا اور وہ دونوں ہی جھینپ سے گئے تھے۔

"ماما پلیز! آپ مائنڈ مت کیجیے گا۔ میں ایک ہفتہ پہلے آجاؤں گی۔" موموں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ موموکی لجاجت پہ ہنس پڑی تھیں، بے ساختہ اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"اب تم کیوں منہ لٹکا کے بیٹھے ہو؟ خوش ہو جاؤ وہ نہیں جا رہی۔" ملکہ آفاق نے معظم کو چھیڑا۔۔۔ وہ ہنس دیا تھا۔

"تم نے میری بیٹی کو اپنے جادو سے قید کرلیا ہے۔"

"آپ کی بیٹی بھی کم نہیں ہے۔ ہر طرح کی زنجیر میرے پاؤں میں ڈال دی ہے اب چاہوں بھی تو آزاد نہیں ہو سکتا۔" اس نے محبت پاش نظروں سے موموکو دیکھا۔ وہ نظر جھکا گئی، ملکہ آفاق اور نشاط بیگم ہنس پڑی تھیں۔۔۔!

☼ ☼ ☼

نواں مہینہ شروع ہوتے ہی معظم شاپنگ پر اصرار کرنے لگا، اور وہ روزانہ اپنی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر اسے ٹال دیتی لیکن آج وہ آفس سے چھٹی بھی کر چکا تھا اس لیے اس کا ٹلنا ناممکن تھا۔ وہ کمبل میں دبکی سو رہی تھی جب معظم نے بیڈ پہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے سے کمبل ہٹایا تھا۔

"ہیلو ڈارلنگ؟" اس نے موموکے چہرے سے بال پیچھے ہٹائے اور گمبھیر آواز میں پکارا۔

"سویٹ ہارٹ! آج کون سا بہانا تیار ہے؟" اس نے موموکو چھیڑا۔

"آج بستر سے اٹھنے کو بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا، دل بھی بہت اداس ہے۔"

"میرے ہوتے ہوئے اداسی؟" اسے تعجب ہوا۔

اب موموا سے کیا بتاتی کہ بہت عرصے بعد اس نے مہر کو خواب میں دیکھا ہے اور اسے روتے ہوئے حال سے بے حال دیکھا ہے۔ اس نے بال سمیٹے اور بیڈ سے اتر آئی۔

"شاپنگ پہ چلو گی؟"

"ہوں۔۔۔!" اس نے اثبات میں سرہلایا۔

"اوکے تو پھر تیار ہو جاؤ۔" وہ اس کا چہرہ تھپک کے باہر چلا گیا۔ موموتیار ہو کر نیچے آئی۔

معظم گاڑی میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"بیٹھیے میڈم! آپ کے انتظار میں آدھا ہو گیا ہوں۔" اس نے دروازہ کھول دیا وہ مسکراتی ہوئی بیٹھ گئی۔

"میں نے چیزوں کی لسٹ بنا رکھی ہے، یہ دیکھو، یہ ساری چیزیں خریدنی ہیں، کوئی کم ہے تو تم لکھ دو۔" اس نے جیب سے ایک لسٹ نکال کر موموکو تھمادی اور موموحیران پریشان دیکھتی رہ گئی۔

"یہ لسٹ کب بنائی آپ نے؟"

"رات ایک بجے، جب تم گہری نیند سو رہی تھیں۔" اس نے فخریہ بتایا۔

"اتنی فکر، اتنا خیال ہے اپنے بچے کا؟" وہ حیرت اور بے یقینی سے پوچھ رہی تھی۔

"اتنی فکر اور اتنا خیال نہیں، بلکہ اتنی محبت ہے اپنے بچے سے۔۔۔" وہ محبت پہ زور دے کر بولا تھا۔

"لیکن مجھے تو بچے سے زیادہ بچے کے باپ سے محبت ہے۔" اتنی زیادہ کہ اس سے بچھڑنے کا ہی تصور کر لوں تو مر جاؤں۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو یار! میرا دل دہل گیا ہے۔" اس نے موسو کا ہاتھ ہونٹوں سے لگا لیا۔

"جوس پینے کو دل چاہ رہا ہے۔" اسے پیاس لگی تھی اسی لیے فوراً" اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور معظم نے ایک ڈرنک کارنر کے سامنے گاڑی پارک کر دی۔

تھوڑی دیر بعد وہ دو گلاس جوس لے آیا۔

ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس کی نظر وائٹ کرولا کا دروازہ کھولتے آدمی پہ جا پڑی۔ اسے اس کا سائیڈ سے چہرا جانا پہچانا سا لگا تھا اور جب وہ سیدھا ہوا تو موسو کی آنکھیں پھیل گئیں۔ حنان درانی۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟" معظم بیک گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

"معظم ۔۔۔ وہ' وہ حنان درانی' اس کا پیچھا کرو' وہ گاڑی نکال رہا ہے۔" موسو نے بدحواسی سے کہا۔

"حنان درانی؟" معظم نے سائیڈ سے نکلتی گاڑی کو دیکھا۔

"معظم کیا دیکھ رہے ہو؟ اس کو فالو کرو' وہ جا رہا ہے۔" اس نے اس کا بازو جھنجھوڑ کے کہا۔

"کس لیے فالو کروں؟" معظم بے تاثر سے انداز میں بولا۔

"وہ مہر۔۔۔ مہر اس کے پاس ہے۔" موسو تڑپ اٹھی تھی۔

"میرا مہر سے کیا تعلق؟"

معظم کا سوال موسو کی ساری تڑپ کو ختم کر گیا۔ وہ چپ ہو گئی تھی لیکن اندر ہول اٹھ رہے تھے۔

"بھول جاؤ اس نام کو۔۔۔" اس نے گاڑی موڑ دی۔ اور وہ اپنے آنسو چپ چاپ پی گئی تھی۔۔۔!

☼ ☼ ☼

وہ کافی گھومنے پھرنے کے بعد واپس آئے تو دونوں کے موڈ دوبارہ سے فریش ہو چکے تھے۔ معظم خوش نہیں تھا اس پہ وہ اپنے دماغ کو کیوں بوجھل کرتی؟ اس لیے جب کھانا کھایا تو اپنے ذہن سے ہر بوجھ جھٹک دیا تھا۔

"آج مام کی طرف چلتے ہیں' آج وہ بھی گھر پہ ہیں۔" اس نے فرمائش کی۔

"چلو جناب آج انہی کی طرف چلتے ہیں جیسے آپ خوش؟" وہ مسکرایا اور موسو ہنس پڑی۔

"مام کہاں ہیں؟" اپنے گھر آ کر اس نے ملازم سے پوچھا۔

"اوپر اپنے بیڈ روم میں۔" ملازمہ نے اشارہ کیا۔

"اوکے۔۔۔" وہ سر ہلا کر سیڑھیوں کی سمت بڑھی ۔۔۔ لیکن معظم نے آگے بڑھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور سیڑھیاں چڑھنے میں اسے مدد دی تھی پھر اسی طرح ہاتھ تھامے اسے ملکہ آفاق کے بیڈ روم تک لے گیا۔

"تم ایسا کرو کہ مہر کو چھوڑ دو۔" اندر سے سنائی دینے والی آواز ملکہ آفاق کی تھی لیکن اس آواز پہ ساکت ہونے والے موسو اور معظم تھے۔

"ہاں میں کہہ رہی ہوں کہ مہر کو چھوڑ دو' اب اس کے ہونے اور نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا' معظم اسے بھول چکا ہے۔ وہ اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ خوش ہے' اب مہر کی واپسی کچھ نہیں بگاڑ سکتی بلکہ اب مہر کی واپسی تمہارے لیے فائدہ مند ہو گی۔" وہ کیا کہہ رہی تھیں اور کس سے بات کر رہی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"دیکھو حنان! میں تمہیں گارنٹی دیتی ہوں کہ مہر تم سے ہی شادی کرے گی۔ اتنے عرصے بعد جب وہ واپس گھر آئے گی تو کوئی بھی اسے قبول نہیں کرے گا اور معظم تو اس روز کی فون کال کے بعد اس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا' سب سے مایوس ہو کر وہ تمہارا ساتھ ضرور قبول کرے گی' لیکن اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اس کی آزادی سے پہلے تمہارا اور اس کا نکاح ہو جائے تو وہ نکاح تو کر لے گی لیکن تمہاری طرف سے اس کا دل صاف نہیں ہو گا جبکہ دوسرے طریقے میں اسے

تمہاری محبت پہ یقین آ جائے گا۔ تم اسے دنیا کی نظر میں معتبر کرو گے تو وہ خوش ہو جائے گی۔ اپنے لیے معظم کی آنکھوں میں نفرت دیکھے گی تو تمہاری محبت کی قدر ہو جائے گی اسے۔" ملکہ آفاق تمسخرانہ انداز میں کہہ رہی تھیں جبکہ موسو اور معظم کے وجود اک دھماکے سے بکھر گئے تھے۔

"اور اس راز کا کبھی بھی زندگی میں کسی کو پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ تمہارے ساتھ اس کھیل میں میں بھی شامل تھی یہاں تک کہ میری بیٹی موسو کو بھی پتہ نہ چلے کہ اس کی ماں نے اس کی محبت میں کیا سے کیا کر ڈالا؟ وہ معظم کے لیے رو رہی تھی اور میں اس کے لیے۔ میں اسے محبت میں تڑپتے ہوئے کیسے دیکھتی؟ بس معظم کو مہر سے چھیننا تھا' سو چھین لیا۔ اب وہ بیمار ہے اسے آزاد کر دیں گے تو وہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

وہ حنان درانی سے گفتگو میں مصروف تھیں اور وہ دونوں پتھر کے بن گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

میراں اور ملکہ ایک تصویر کے دو رخ تھیں ایک بالکل سادہ اور ایک رنگوں سے سجا ہوا رنگین اور شوخ ۔۔۔ ملکہ' میراں سے چھ سال چھوٹی تھی اور میراں کو چھ سال بڑا ہونے کا اعزاز حاصل تھا اور اس اعزاز نے ہمیشہ ہی میراں کا ساتھ دیا اور ہر جگہ قسمت بلند رکھی تھی۔

ماں باپ زیادہ پروٹوکول میراں کو ہی دیتے تھے کیونکہ وہ بڑی بیٹی تھی اور سمجھ دار تھی جبکہ ملکہ جذباتی اور جنونی تھی لیکن ایک فرد ایسا تھا جس کے سامنے وہ بالکل نرم اور مٹی کا مادھو کھائی دیتی تھی۔

وہ تھے اس کے کالج کے ینگ نوجوان اور ہینڈسم سے پروفیسر ذیشان احمد' وہ دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتی تھیں۔

ذیشان احمد' ملکہ کو پڑھاتے تھے لیکن نظر کرم میراں پہ تھی۔ اس چیز سے بے خبر کہ ملکہ محبت کے سفر میں کتنی آگے جا چکی ہے لیکن جب ان کا پرپوزل میراں

کے لیے آیا تو ملکہ خاک ہو گئی۔ دل تھا کہ بھڑ بھڑ جل اٹھا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے ذیشان احمد اپنی خوشی اپنی چاہتوں کی ڈولی سجا کے لائے اور میراں کو رخصت کروا کے لے گئے۔

پروفیسر ذیشان احمد مالی لحاظ سے خاصے کمزور تھے لیکن میراں صابر و شاکر تھی۔ وہ ان کے ساتھ ہر حال میں خوش تھی اور ان کی خوشیاں ملکہ کا خون جلاتی رہیں۔

اور پھر ایک روز مقدم کے دوست آفاق کا پروپوزل ملکہ کے لیے آیا جسے ملکہ نے فوراً قبول کر لیا تھا ملکہ جو کچھ دل پہ سہہ چکی تھی وہ بس وہی جانتی تھی۔ اس نے دل کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کوشش کر لی۔ آفاق انتہائی امیر و کبیر فیملی سے تھا ملکہ اپنی خوشیاں دولت اور جائیداد سے ظاہر کرتی رہی لیکن دل کی آگ نہ بجھی۔

آفاق رضوی نے انہیں بے پناہ محبت دی مگر پھر بھی وہ ذیشان احمد والا داغ دل سے نہ مٹا سکیں مگر موسو کی پیدائش نے کچھ ایسا اثر کیا کہ وہ بہل گئی تھیں ان کی ساری محبتیں موسو کی طرف مڑ گئیں۔ ہر جذبے پہ ممتا کا جذبہ حاوی ہو گیا تھا۔

آفاق رضوی کی ایکسیڈنٹ سے ہونے والی حادثاتی موت نے بھی کافی عرصہ انہیں دھچکے کی سی کیفیت میں رکھا لیکن پھر بیٹی کی خاطر وہ رفتہ رفتہ سنبھل گئی تھیں۔

اپنا گھر بیچ کر مقدم بھائی کے ساتھ والا گھر خرید لیا اور شوہر کے کاروبار کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ تعلیم مکمل کی اور ساتھ میں بوتیک بنا لیا۔ یوں وہ دن بہ دن ترقی کرتی گئیں لیکن اگر کبھی ذرا دیر کے لیے ٹھہر کر دیکھا تو ہر داغ جیسے پہ تازہ ہی لگا اور یہ داغ اس وقت جل اٹھے جب موسو، معظم کے لیے تڑپ تڑپ کے روتی نظر آئی۔

معظم کی انگیجمنٹ کی رات انہوں نے موسو کو ٹرنکولائزر دے کر سلا دیا تھا لیکن خود ساری رات جاگتی رہی تھیں اور رات بھر جاگنے کے دوران ایک

فیصلہ کیا تھا۔۔۔ میراں کی بیٹی کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ اور اس فیصلے کو حنان درانی کے نام نے اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔

جیسے ہی انہیں مہر اور حنان درانی کے قصے کا پتا چلا انہوں نے فوراً حنان سے رابطہ کیا تھا اور اس کے اغوا کا پورا پلان ترتیب دے ڈالا تھا۔ صرف اس شرط پہ کہ وہ کبھی کسی کے سامنے ملکہ آفاق کا نام ظاہر نہیں کرے گا۔ یوں مہر کو اغوا کرنے والا حنان درانی ہی تھا لیکن اسے اغوا کرنے کے بعد ملکہ آفاق کے فارم ہاؤس کے بیس منٹ میں رکھا گیا تھا۔ مہر کو آنکھوں پہ پٹی باندھ کے وہاں لایا گیا اور ملکہ آفاق کے پلان کے مطابق اس سے زبردستی فون کال کروائی تاکہ معظم اس سے بدظن ہو جائے لیکن وہ کال کرنے کو تیار نہیں تھی جس پہ مہر کو بے پناہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا مگر وہ پھر بھی نہیں مانی تھی بالآخر ملکہ آفاق نے حنان درانی کو مشورہ دیا کہ وہ معظم کے قتل کی دھمکی دے۔ جس پہ وہ مان جائے گی اور ایسا ہی ہوا معظم کے قتل کا سن کر وہ رہ نہ سکی اور جو کچھ حنان نے کہا وہ سب فون پہ معظم سے کہہ دیا تاکہ معظم اس کا انتظار نہ کرے اور شادی کر لے۔۔۔ شادی کے لیے آس پاس اور کوئی لڑکی نہیں تھی سوائے موسو کے۔۔۔ اور ان کی سوچ کے مطابق مقدم چاچو اور نشاط بیگم کی نظر انتخاب موسو پہ آ ٹھہری تھی۔

وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھیں لیکن اتنی جلدی مہر کو آزاد نہیں کر سکتی تھیں انہیں پتہ تھا کہ معظم کے دل کی سرزمین پر قدم جمانے کے لیے موسو کو وقت لگے گا اور اسی لیے انہوں نے مہر کو قید کیے رکھا موسو اب بچے کو جنم دینے والی تھی وہ دونوں خوش تھے اور ملکہ آفاق بے فکر۔۔۔ انہیں اب کوئی ڈر نہیں تھا۔

مہر پچھلے کئی دنوں سے بیمار تھی یا اسے بخار رہنے لگا تھا۔ وہ حال سے بے حال ہو گئی تھی اسی لیے اب وہ حنان سے کہہ رہی تھیں کہ اسے آزادی کا پروانہ سونپ دے مگر حنان نہیں مان رہا تھا۔ وہ اپنی شادی کے لیے گارنٹی چاہتا تھا اور ملکہ آفاق اسے گارنٹی دے رہی

تھیں حالانکہ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ سانپ کی بھی گارنٹی نہیں ہے۔۔۔!

✡ ✡ ✡

معظم کے ہاتھ میں دبا موسو کا ہاتھ چھوٹ گیا تھا۔ اس نے تڑپ کے معظم کی طرف دیکھا اس کے چہرے پہ کسی زلزلے کے سے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ موسو کو ایک نظر دیکھا اور موسو قہر کی اک نظر سے ہی مر گئی۔ وہ پلٹ گیا تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ موسو پیچھے نہ آتی حالانکہ اسے بھاری وجود کے ساتھ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا وہ گرتی پڑتی سیڑھیاں اتری تھی اور اس کے پیچھے واپس آگئی۔ راستے میں اسے بیانہ نشاط بیگم نے دیکھا تھا وہ سیدھی بیڈ روم میں آئی تھی۔ معظم بیڈ پہ بیٹھا تھا اور دونوں ہاتھ اپنے بالوں میں پھنسا رکھے تھے۔

موسو کا دل لرز رہا تھا۔ خوف سے جسم بھی کانپ رہا تھا۔ اس کی ماں نے کس قیامت کا کھیل کھیلا تھا۔ موسو کا دل پھٹ رہا تھا۔۔۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھا تھا اور وہ اضطراب کا شکار تھی۔

”معظم۔۔۔!“ اس نے معظم کو پکارا۔

”خاموش۔۔۔!“ اس نے انتہائی چڑچڑے لہجے میں اسے چپ کروا دیا موسو کے قدم لڑکھڑا گئے۔

معظم بیڈ سے اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

”مجھے صرف اتنا بتا دو موسل آفاق کہ میں تمہارا ہوں یا مہر ذیشان کا؟ وہ مہر جس نے میری خاطر ظلم خرید لیا؟ جیتے جی مر گئی؟ اور میں اس پہ لعنت بھیج کر خوشیاں منا رہا ہوں؟ بتاؤ مجھے میں کس کا ہوں؟ کس کا نصیب ہوں؟ مجھے کس کا بنایا گیا ہے؟ جاؤ بتاؤ مجھے نہ سہی اپنی ماں کو بتا دو۔“

وہ چیخ اٹھا تھا۔ موسو کی آنکھوں میں آنسو جم گئے۔

”معظم۔۔۔!“ وہ زیر لب بولی۔

”مر گیا تمہارا معظم۔۔۔!“ وہ دھاڑ اٹھا۔ موسو دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

اس کا سب کچھ لٹ گیا تھا۔ صرف اس کی ماں کی وجہ سے۔۔۔ معظم کمرے سے باہر نکل رہا تھا جب پیچھے دھڑام کی آواز سنائی دی تھی۔۔۔ اس نے یکدم پلٹ کے دیکھا موسو کھڑے قد سے گری تھی۔ وہ معظم کی بے رخی کی تاب کیسے لاتی؟

”موسو۔۔۔!“ معظم نے لپک کے اسے اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

✡ ✡ ✡

”یہ سب کس کے لیے ہے؟“ ملکہ آفاق اپنے کمرے سے باہر آئیں تو ٹرالی میں سارے لوازمات دیکھ کر ٹھہر گئیں۔

”چھوٹی بی بی اور معظم صاحب کے لیے۔“

”کہاں ہیں وہ؟“ انہیں خوشی ہوئی تھی۔

”وہ تو چلے گئے۔“

"چلے گئے مگر کیوں؟" انہیں اچنبھا ہوا تھا۔

"آپ سے ملنے آپ کے بیڈ روم میں گئے لیکن پھر تھوڑی دیر بعد چلے گئے۔"

"میرے بیڈ روم میں؟" وہ ٹھٹک گئیں۔ ان کے دماغ میں خطرے کا الارم بجا تھا۔

"تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔" ان کے ماتھے پہ پسینہ پھوٹ آیا تھا۔

"مجھے کیا پتا تھا کہ آپ کو بتانا ضروری ہے؟" ملازمہ معصومیت سے بولی۔

"اف، جاؤ دفع ہو جاؤ۔" وہ ملازمہ پہ چیخ اٹھیں لیکن اچانک مقدم جاہ کے کمرے سے اٹھنے والا شور ان کی جان نکال گیا تھا۔

"موسو کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے؟ ابھی ابھی ٹھیک ٹھاک گھر آئی تھی۔"

نشاط بیگم رو رہی تھیں۔ معظم اسے ہسپتال لے کر جا چکا تھا۔ پیچھے ہی ان سب کی گاڑیاں بھی روانہ ہو گئی تھیں لیکن ہسپتال پہنچ کر ملک آفاق کو پتا چلا کہ موسو کا دل تو بہت کمزور بہت نازک تھا جو کچھ وہ سن چکی تھی وہ کیسے سہہ پاتا؟ اور اس کی کنڈیشن کا سن کر وہ پاگل ہو گئی تھیں۔ اس کے بچنے کے چانسز بہت کم تھے۔

"معظم تم نے... تم نے اس سے کچھ کہا؟" وہ معظم کا گریبان پکڑ چکی تھیں۔

معظم نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ۔

"کیا میرے کہنے کی کوئی کسر باقی تھی؟"

اس کے بعد وہ چیخ چیخ کر نجانے کیا کیا کہتی رہیں اور وہ چپ چاپ سنتا رہا۔

"موسو مر جائے گی معظم! میں جانتی ہوں میری موسو مر جائے گی۔" انہیں اور اک ہو چکا تھا کہ وہ کیا کچھ سن چکی ہے؟ اور اسی بیٹے کا درد انہیں رلا رہا تھا۔ اور اسی درد کے مارے وہ میراں بیگم سے بھی الجھ پڑی تھیں۔

ان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ساری دنیا کو آگ لگا دیں۔ وہ سب کو گولی مار دیں... لیکن وہ بے بس تھیں فرش پہ بیٹھی رو رہی تھیں بین کر رہی تھیں جب اچانک آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹرز باہر آئے۔ معظم لپک کے ان کے پاس گیا تھا۔

"آپ کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کی وائف کو نہ بچا سکے۔"

ڈاکٹر نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا اور پھر پاس سے گزر گئے۔ وہاں موجود سب لوگ دم بخود رہ گئے۔ صرف ملک آفاق تھیں جو بلند آواز سے رو رہی تھیں۔ معظم دو زانو فرش پہ بیٹھا تھا۔

"موسو...!" اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا تھا۔

☼ ☼ ☼

مہر کی واپسی اور ملک آفاق کا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نجانے کہاں روپوش ہو جانا سب کے لیے حیرانی در حیرانی تھی۔ کوئی اس گتھی کو سلجھا نہیں پایا تھا۔ موسو کا ہارٹ فیل کیوں ہوا؟ یہ بھی اک معمہ تھا جو حل ہو کے نہیں دے رہا تھا۔ اور اس سارے قصے میں اک معظم جاہ تھا جو سب جانتا تھا لیکن پھر بھی گونگے بہرے لوگوں کی طرح دیکھتا اور سنتا رہا۔

ملک آفاق کے دکھ، حسد، جلن اور انتقام کھوتے ہوئے گھر سے میں موسو گر گئی تھی۔ یہ اس نے ہی ملک آفاق کو دربدر کر دیا۔

اور معظم ان کی اذیت کو خوب سمجھتا تھا لیکن ہر چیز سے بے نیاز ہو کر صرف بیٹے میں گم رہتا تھا۔ وہ بالکل اس کی صورت جیسا تھا بھی اور آنکھیں موسو جیسی تھیں۔ لیکن معظم کے چہرے پہ موسو کی آنکھیں تھی

کبھی کبھی اکثر اس کے بیٹے کو دیکھتی رہ جاتی اور پھر بے ساختہ اسے سینے میں بھینچ لیتی تھی۔ بڑی شدت اور محبت کے ساتھ۔

درد آشنا

راشدہ رفعت

شفیق احمد کی عمر پینتیس کا ہندسہ عبور کرنے والی تھی اور وہ ہنوز غیر شادی شدہ تھا تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ وہ کوئی جاہل، نکما، نکھٹو، نشئی یا ایسی ہی کسی اور خامی میں مبتلا شخص ہے۔ وہ بے چارہ تو بہت بھلا مانس شخص تھا۔ بارہ جماعتیں پڑھ کر ایک ٹیکسٹائل مل میں بطور ہیلپر بھرتی ہوا تھا اور ترقی کرتے کرتے

سپروائزر کے عہدے تک جا پہنچا تھا۔ تنخواہ مناسب، شکل و صورت ٹھیک ٹھاک اور عادت و اطوار معقول تھیں۔ نہ پان کی عادت، نہ سگریٹ کی لت، نظریں جھکا کر جب محلے میں سے گزرتا تو کئی بیٹیوں کی ماؤں کے دل سے ہوک سی اٹھتی۔

"کیسا بھلا بندہ ہے شفیق احمد! کاش ہاجرہ بی بی کا بیٹا نہ ہوتا۔"

جی ہاں! اس کی شادی میں واحد رکاوٹ اس کی ماں ہاجرہ بی بی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ ہاجرہ بی بی کو بیٹے کی شادی کا کوئی ارمان نہ تھا۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ وہ بیٹے کی کمائی کے لالچ میں اس کی عمر گزار رہی تھی۔ یہ بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے حور پری ہی چاہتی تھی۔

ہاجرہ کو تو بیٹے کی شادی کا بہت ارمان تھا کیونکہ شفیق احمد اس کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ صرف دو برس کا تھا جب ہاجرہ کا شوہر ایک حادثے کی نذر ہو گیا۔ اس کے شوہر کے نام کچھ زرعی زمین تھی۔ سو گزر بسر تو ہوتی رہی، پھر ایف اے کے بعد شفیق احمد مل میں ملازم ہوا تو گھر کے حالات میں مزید بہتری آنے لگی۔

شفیق احمد پر ذمہ داریوں کا بھی کوئی بوجھ نہ تھا۔ نہ اس نے کوئی بہن بیاہنی تھی، نہ کسی چھوٹے بھائی کو تعلیم دلوانا تھی۔ اتنے سارے پلس پوائنٹ رکھنے والے شفیق احمد کے لیے جہاں بھی اس کی ماں رشتہ لے کر جاتی، لوگ سوچنے کی مہلت لیے بغیر منہ پر ہی انکار کر دیتے اور ہاجرہ بی بی منہ بھر بھر کے کوسنے اور بددعائیں دیتے ہوئے واپس پلٹتی تھی۔

جی ہاں، یہ ہاجرہ بی بی کی زبان ہی تھی کہ اس کے بیٹے کا گھر بسنے میں ہی نہ آ رہا تھا۔ ایسی لڑاکا اور جھگڑالو عورت کہ لوگ اس کا نام سنتے ہی کانوں کو ہاتھ لگانے لگتے۔ مرد، عورت، بچہ، جوان، سبزی فروش، کباڑیے والا غرض ہاجرہ ہر جگہ، ہر وقت، ہر کسی سے الجھنے کو تیار رہتی۔ اب ایسے میں شفیق احمد کا گھر بستا تو کیسے؟ محلے میں شوکت جنرل اسٹور والے کا گھرانہ سب سے کھاتا پیتا تصور ہوتا تھا، تو طفیل نائی کا گھرانہ سب سے کم حیثیت اور ہاجرہ نے شوکت صاحب کے گھر سے لے کر طفیل نائی کے گھر تک تقریباً محلے کے تمام ہی گھروں میں شفیق احمد کا رشتہ مانگ کر دیکھ لیا تھا مگر ہر جگہ سے انکار ہی سننے کو ملا، صرف منو جلد ساز کی بیوی جو اپنی بچی کی سانولی رنگت اور بڑھتے وزن کی وجہ سے پریشان تھی۔ اس نے ہاجرہ بی بی کو فوری انکار کے بجائے سوچنے کی مہلت مانگی تھی، لیکن اس کی بتول ہاجرہ بی بی کے گھر سے نکلتے ہی ماں پر چڑھ دوڑی۔

"ہاجرہ خالہ کے گھر بیاہنے سے بہتر ہے، مجھے کسی کنوئیں میں دھکا دے دو۔"

"ہاجرہ بی بی کا کیا ہے۔ شفیق احمد تو بھلا شخص ہے۔" منو جلد ساز کی بیوی نے بچی کو سمجھانا چاہا۔

"کیوں ہاجرہ خالہ کا کیوں کچھ نہیں ہے۔ مسئلے کی جڑ ہی ہاجرہ خالہ ہے اور پھر ایسی ہٹی کٹی ہے کہ پندرہ بیس سال سے پہلے تو اس کے گزرنے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ میری تو ساری جوانی اس سے لڑتے جھگڑتے ہی گزر جائے گی، بس اگلی بار ہاجرہ خالہ آئے تو صاف انکار کر دینا۔ اس کے علاوہ جہاں بھی میرا رشتہ کرو گی انکار نہیں کروں گی۔"

بتول کے انداز میں اتنی قطعیت تھی کہ چار دن بعد ہاجرہ بی بی جواب لینے آئی تو اس نے سلیقے سے معذرت کر ڈالی، لیکن ہاجرہ بی بی تو انکار سنتے ہی پتے سے اکھڑ گئی۔ گو کہ اس نے کوئی دلیل پیش کرتے کرتے بھی منو جلد ساز کی بیوی کو وہ سنائیں کہ اسے دل ہی دل میں بیٹی کی سمجھ و فراست کا قائل ہونا پڑا۔

محلے کے سارے گھر ختم ہو گئے تو مجبوراً ہاجرہ بی بی کو رشتے کروانے والی بوا کی طرف صلح کا ہاتھ بلند کرنا پڑا، جس سے اس کی گزشتہ کئی برسوں سے لڑائی تھی۔

کب ہر دوسرے، تیسرے دن ہاجرہ بی بی، بوا جی کے ساتھ کہیں رشتہ دیکھنے جا رہی ہوتی یا بوا جی کسی کو لے کر ہاجرہ بی بی کے گھر آ رہی ہوتی۔ دو، چار جگہ بات چل بھی پڑی، لیکن جب لڑکی والے شفیق احمد کے چال چلن کی چھان بین کے لیے آس پڑوس کا رخ کرتے تو شفیق احمد کے متعلق تو ہر کسی کی رائے صحیح ہوتی، لیکن ہاجرہ بی بی کے متعلق محلے کا ہر بندہ کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کرتا۔ یوں کسی بھی جگہ رشتے کی بیل منڈھے نہ چڑھ پاتی۔ پھر ایک دن بوا جی کے ساتھ آٹو رکشے میں بیٹھ کر دو بھاری تن و توش کی خواتین شفیق احمد کے گھر آئیں اور پھر تو ان خواتین کی آمد اکثر ہی ہونے لگی۔ ہاجرہ بی بی کا چہرہ بھی کھلا کھلا رہنے لگا، یوں لگتا تھا شفیق احمد کا رشتہ طے ہوا ہی چاہتا تھا اور اس دن جب یہ دونوں عورتیں شفیق احمد کے گھر سے نکلیں تو سامنے والی آپا صغریٰ نے انہیں بصد اصرار اپنے گھر بلا لیا۔

ہاجرہ بی بی کے سب سے زیادہ ہارے ہوئے معرکے شاید صغریٰ بیگم کے ساتھ ہی ہوئے تھے۔ صغریٰ بیگم ان خواتین کو ہاجرہ بیگم کا اصل چہرہ دکھانا اپنا فرض عین سمجھتی تھیں۔ مگر وہ عورتیں لڑکی کی بھابھیاں تھیں۔ انہوں نے صغریٰ بیگم کے ہاتھ کی بنی چائے پی، سرسری سی بات سنی، کچھ معلومات دینے پر ان کا شکریہ کر کے واپسی کی راہ لی، لیکن صغریٰ بیگم کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی، جب دو دن بعد شفیق احمد کے گھر سے اس کی بات پکی ہونے کی خوشی میں مٹھائی آ گئی۔

صغریٰ بیگم نے بوا جی کو پکڑ کر لڑکی کے بارے میں معلومات لیں تو پتا چلا کہ لڑکی چھ بہن، بھائیوں میں آخری نمبر پر ہے۔ ماں، باپ فوت ہو چکے، باقی سب بہن بھائی شادی شدہ ہیں، یہ آخری ہے جو سب بہن، بھائیوں کی خود غرضی کی نذر ہو رہی تھی۔

بیان کا آخری فقرہ بوا جی نے نہیں کہا تھا، یہ صغریٰ بیگم کا خود سے اخذ کردہ نتیجہ تھا اور انہوں نے محلے کی ساری خواتین میں بھی یہی بات مشہور کر دی تھی۔

"بے چاری بچی گھر میں بھابھیوں کے ظلم و ستم سہتی ہو گی تو یہاں آ کر ہاجرہ بی بی سے پالا پڑے گا، حالانکہ میں نے تو پوری کوشش کی تھی کہ یہ رشتہ نہ ہو مگر بھابھیاں، نند کو بوجھ کی طرح اتار پھینکنا چاہتی ہیں، ان کی بلا سے سسرال جیسا بھی ملے۔"

صغریٰ بیگم کو ان ظالم بھابھیوں پر بھی بھر کر غصہ آ رہا تھا۔ آس پڑوس کی سب ہی عورتیں ان کی ہمنوا تھیں، لیکن شفیق احمد کی ہونے والی دلہن پر دل ہی دل میں ترس کھانے کے سوا کوئی کچھ نہ کر سکتا تھا اور وہ دن بھی آ گیا جب شفیق احمد بینڈ باجوں کے ساتھ دلہن بیاہ لایا۔

محلے کی ساری عورتیں اکٹھی ہو کر دلہن کو سلامی دینے گئیں۔ کھلتی ہوئی گندمی رنگت، دبلا پتلا وجود، غلافی آنکھیں اور بوٹا سا قد، شفیق احمد کی دلہن لاکھوں میں نہیں تو بلاشبہ ہزاروں میں ایک تھی۔

"وہ چچ چچ، کیسی معصوم سی بچی ہے، ہاجرہ بی بی بڑی چالاک ہے، ایسی لڑکی کو بہو بنایا ہے، جس کو ماں، باپ کا آسرا بھی نہیں۔ شکل سے ہی ایسی دبی دبائی اور سہمی ہوئی لگ رہی ہے۔ ہاجرہ بی بی کے سامنے چوں بھی نہ کر سکے گی۔"

ساری عورتیں دلہن کو سلامی دینے کے بعد ایک دوسرے سے چہ میگوئیاں کرتے ہوئے رخصت ہو گئیں اور عورتوں کا خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ شفیق احمد کی شادی کو بمشکل ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ہاجرہ بی بی کی تیز اور کراری آواز محلے میں گونج رہی تھی۔ کبھی کبھار شفیق احمد کی منمناتی آواز بھی سنائی دے جاتی۔ وہ شاید ماں کو سمجھا رہا تھا، اس کا غصہ ٹھنڈا کر رہا تھا، لیکن ہاجرہ بی بی با آواز بلند ہو کے وہ لتے لے رہی تھی کہ الاماں الحفیظ۔

محلے والیاں تصور کی آنکھ سے بے چاری روبینہ کو دیکھ سکتی تھیں۔ ہرنی جیسی سہمی ہوئی لڑکی جس کی بڑی بڑی آنکھیں موٹے موٹے آنسوؤں سے بھری ہوں گی، لیکن چند لمحوں بعد شفیق احمد کے گھر سے ایسی گرج دار آواز سنائی دی، جس کے آگے ہاجرہ بی بی کی کڑک دار آواز بھی دب کر رہ گئی تھی۔ سب محلے والیوں نے دانتوں تلے انگلیاں داب لیں۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ہرنی جیسی لڑکی شیر کی طرح دھاڑ بھی سکتی ہے۔

انہونا بھر کا معرکہ تھا جو ساس، بہو کے درمیان جاری رہا، پھر شفیق احمد کی کوششوں سے ہی سیز فائر ہوا۔ اس کے بعد تو یہ معمول بن گیا۔

ہاجرہ بی بی عادت کے مطابق روبینہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بنیاد بنا کر جھگڑا شروع کرتی اور روبینہ گلے کی ساری توانائیاں خرچ کرکے اس جھگڑے کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتی۔ شفیق احمد درمیان میں پس کر رہ جاتا۔ ماں سے تو کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ بیوی کو پیار محبت سے سمجھاتا کہ اس کی ماں کی باتوں کو نظر انداز کر دیا کرے۔

شفیق احمد، ماں کی قربانیوں کا دل سے معترف تھا۔ وہ زبان کی کڑوی سہی پر اس نے ساری جوانی اکلوتے بیٹے کی پرورش کی نذر کی تھی۔ وہ چاہتی تو شوہر کے انتقال کے بعد دوسرا گھر بسا سکتی تھی۔ جوان تھی، خوب صورت تھی، مگر صرف شفیق احمد کی خاطر اس نے ساری زندگی تیاگ دی تھی۔ روبینہ وقتی طور پر تو شوہر کی بات سمجھ جاتی اور آئندہ اس کی ماں سے نہ لڑنے کا عہد کر لیتی، مگر ہفتہ، دس دن میں ہی اس کی برداشت جواب دے جاتی اور گھر میں ایک بار پھر محاذ کھل جاتا۔

یوں ہی دن گزرتے رہے، شادی کے پانچ مہینوں بعد روبینہ کی طبیعت گری گری رہنے لگی۔ ہاجرہ بی بی کی تجربہ کار نگاہوں نے بھانپ لیا کہ معاملہ کچھ اور ہے، وہ خود بہو کو لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ "خوشخبری" کی تصدیق ہو گئی تو ساس، بہو کے تعلقات میں بھی شادی کے بعد پہلی بار بہتری آگئی۔

شفیق احمد جہاں "خوشخبری" ملنے پر خوش تھا، وہاں گھر کا پرسکون ماحول دیکھ کر خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتا، لیکن تعلقات میں یہ بہتری عارضی ثابت ہوئی۔ مہینہ، ڈیڑھ مہینہ سکون سے گزرا تھا کہ روبینہ اور ہاجرہ بی بی کی ایک زوردار جھڑپ کے ساتھ تعلقات پہلے والی نہج پر آگئے۔

ہاجرہ بی بی کے مزاج کی تیزی تو خیر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئی تھی، لیکن اب روبینہ کا تیکھا پن بھی آسمانوں کو چھونے لگا تھا۔ وہ شفیق احمد کو وارث دینے والی تھی، اس گھر میں اس کے قدم مضبوطی سے جم چکے تھے۔ وہ ہاجرہ بی بی کی جلی کٹی برداشت کرتی تو کیوں کرتی۔ شفیق احمد کی برداشت بھی اب جواب دینے لگی تھی۔ لیکن جب ہونے والے بچے کے متعلق سوچتا تو یوں لگتا ساری ٹینشن اڑنچھو ہو گئی ہے۔

پہلی بار باپ بننے کا احساس کتنا خوش کن اور انوکھا سا تھا۔ روبینہ کی ڈلیوری کے دن قریب آرہے تھے۔ لیکن ہاجرہ بی بی اور روبینہ کے جھگڑے ہی ختم ہونے میں نہ آرہے تھے۔

اس روز بھی دونوں کا زبردست جھگڑا ہوا۔ بیٹھک میں شفیق احمد کا کوئی دوست ملنے آیا ہوا تھا۔ شفیق احمد نے دو، چار بار آکر ماں اور بیوی سے چپ رہنے کی استدعا کی، لیکن دونوں پر مطلق اثر نہ ہوا۔ آج تو لگتا تھا دونوں پرانے جھگڑوں کا ریکارڈ توڑ کر نیا ریکارڈ قائم کرنا چاہتی ہیں۔ شفیق احمد کا دوست اس کی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے خود بھی شرمندہ شرمندہ سا رخصت ہو گیا۔

شفیق احمد غصے سے بیٹھک کا دروازہ بند کرکے گھر کے اندرونی حصے میں آیا اور دونوں سے ایک لفظ بھی بولے بنا اپنے کمرے میں گھس گیا، لیکن دونوں خواتین کو اس کی ناراضی کی بالکل پروا نہ تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے [illegible] رہیں۔ آخر روبینہ کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ [illegible] پٹختی کمرے میں آئی۔ شفیق احمد کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔

"[illegible] کھانا کھا کر سونا۔" اس نے میاں کو مخاطب کیا۔ شفیق احمد نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔

"اب زیادہ نخرے نہ دکھاؤ۔ میرے اندر اتنی ہمت نہیں کہ تمہاری ماں سے معرکہ لڑنے کے بعد تمہیں منانے پر بھی اپنی توانائیاں خرچ کروں۔"

وہ تنگ مزاجی سے بولی۔ شفیق احمد اب بھی

آنکھیں موندے پڑا رہا۔ گزرتے دن کے ساتھ روبینہ بدتمیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ صرف اس کی کنڈیشن کی وجہ سے ضبط سے کام لیتا تھا۔ ورنہ کبھی کبھار تو جی چاہتا کہ اس بدزبان عورت کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارے۔

"نہیں کھانا تو نہ کھاؤ، میری بلا سے۔"

وہ پاؤں پٹختے ہوئے چلی گئی۔ شفیق احمد کو لیٹے لیٹے نیند نے آلیا۔ اسے پتا نہیں چلا کہ کب روبینہ برتن کا کام سمیٹ کر اندر آئی اور کب لائٹ آف کرکے اس کے پہلو میں سونے لیٹی۔

رات ساڑھے گیارہ کا وقت تھا جب روبینہ نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔

"کیا ہے؟ سونے دو۔" شفیق احمد نے ناراضی سے اپنا بازو چھڑوایا۔

"شفیق جی! میرے درد ہو رہا ہے۔" روبینہ کی گھٹی گھٹی آواز کانوں میں پڑی اور وہ اسپرنگ کی سی تیزی سے اچھل کر بیٹھا۔

"کہاں، کہاں درد ہو رہا ہے، میرا مطلب ہے طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" وہ بوکھلا گیا تھا۔

"طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اسی لیے تو آپ کو جگایا۔ تھوڑے تھوڑے درد تو وقفے وقفے سے دو گھنٹوں سے ہو رہے ہیں، لیکن اب تو برداشت سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔"

روبینہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی، موسم میں خنکی تھی، پھر بھی وہ پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں جگایا؟" وہ پریشان ہوا۔

"آپ تو مجھ سے خفا ہو کر منہ موڑے لیٹے پڑے تھے، میں نے سوچا۔ معمولی درد ہے، مجھے بھی نیند آجائے گی، لیکن اب تو..." روبینہ نے بات ادھوری چھوڑ کر تکیے پر گردن پٹخی تھی۔

"اچھا، اچھا حوصلہ کرو، میں اماں کو جگاتا ہوں۔" شفیق احمد بوکھلا کر جلدی سے چپل پاؤں میں ڈال کر ماں کے کمرے کی طرف بھاگا۔

"اماں! اماں!" اس نے تو دروازہ ہی پیٹ ڈالا۔

"کیا مصیبت نازل ہو گئی؟ رات کو بھی چین نہیں۔" ہاجرہ بی بی نے بکتے جھکتے دروازہ کھولا۔

"روبینہ کی طبیعت ٹھیک نہیں، اماں مجھے لگتا ہے...." اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

"پھر میں کیا کروں؟" ہاجرہ بی بی نے تیوریاں چڑھائیں۔

"اماں! وہ تکلیف کی شدت سے تڑپ رہی ہے۔" اس نے ماں کو صورت حال کی سنگینی کا احساس دلایا۔

"پھر میں کیا کروں، میرے کمرے کا دروازہ پیٹنے سے کیا حاصل ہو گا، جا کر رحمت دائی کا دروازہ کھٹکھٹا۔"

ہاجرہ بی بی نے بے مروتی سے جواب دیا۔ ماں کا جواب سن کر شفیق احمد ششدر ہی تو رہ گیا۔ اس صورت حال میں ہاجرہ بی بی سے اس سنگ دلی کی توقع نہ تھی۔

"ایسے دیدے پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہا ہے، تجھے تیری بیوی ہی شام کو کہہ رہی تھی کہ اللہ کرے میں مروں تو اس کی جان چھوٹے تو سمجھ لو تم دونوں کہ مر گئی میں۔ نمٹاؤ اپنا مسئلہ خود۔"

ہاجرہ بیگم، روبینہ کو سنانے کی غرض سے اونچی آواز سے بولی، اس کا خیال تھا شفیق احمد اس کے سامنے گڑگڑائے گا، اس کی منت کرے گا کہ وہ اس کی بیوی کے پاس چلی جائے اور تب بڑا احسان دھرتے ہوئے وہ بہو کی خبر لینے چل پڑے گی مگر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب چند لمحوں تک اسے سرد نگاہوں سے تکنے کے بعد شفیق احمد خاموشی سے واپس پلٹ گیا تھا۔ ہاجرہ بی بی نے اسے آواز دے کر روکنا چاہا، مگر پھر انا آڑے آ گئی۔ کچھ شام کی لڑائی کا غصہ بھی باقی تھا، جب روبینہ اسے جھولیاں بھر بھر کر کوسنے دے رہی تھی تو کیسے کوسنے کا اثر کھا کر وہ کمرے میں بیٹھا رہا تھا۔

"ٹھیک ہے میری بلا سے جئے یا مرے۔"

ہاجرہ بی بی نے دل کی پکار نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ دروازہ بند کر دیا تھا۔ شفیق احمد واپس کمرے میں آیا۔ درد سے نڈھال بیوی کو تسلی دی اور رحمت دائی کے گھر کی طرف دوڑا۔

محلے کی تجربہ کار ترین دائی جو ساٹھ کا ہندسہ عبور کرنے والی تھی، لیکن محلے کی عورتوں کو اس پر اتنا اعتماد تھا کہ سرکاری اسپتالوں میں دھکے کھانے کے بجائے وہ گھر پر رحمت دائی سے کیس کروانے کو ترجیح دیتی تھیں۔

آدھے پونے گھنٹے میں رحمت دائی اپنے ساز و سامان سمیت روبینہ کے پاس پہنچ چکی تھی۔

"بس بیٹا! تم جا کر و، زیادہ دیر کا کام نہیں۔"

اس نے شفیق احمد کو کمرے سے باہر بھیجا۔ شفیق احمد نے کانپتی ٹانگوں کے ساتھ برآمدے سے صحن کے سینکڑوں چکر لگا لیے۔ دل ہی دل میں قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے وہ منتظر تھا کہ دونوں بند کمروں میں سے کسی کا تو دروازہ کھلے، رحمت دائی جلد از جلد کوئی خوشخبری سنائے یا ہاجرہ بی بی اس کٹھن وقت میں اس کے پاس آ کر تسلی کے دو بول بول دے۔

اس مشکل وقت میں اکیلے پن کا احساس بہت تکلیف دہ تھا۔ کوئی بھی ڈھارس بندھانے والا نہ تھا۔ کیسی سنگدل ماں تھی ہاجرہ بی بی۔ اسے بیٹے کی خوشی کا کوئی ارمان تھا نہ اس کی پریشانی سے کوئی سروکار، وہ تو شاید اندر لمبی تان کر سو رہی تھی۔

شفیق احمد کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے تھے اور وقت بھی جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ شفیق احمد بار بار کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتا اور دوبارہ ٹہلنے لگتا، اندر کمرے سے روبینہ کی گھٹی گھٹی چیخوں کی آواز آتی تو اس کا دل ترپ جاتا، نہ جانے کتنے گھنٹے بیت گئے کہ جان کنی کا عالم ختم ہوا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور رحمت دائی کا مسکراتا ہوا چہرہ باہر نکلا۔

"مبارک ہو، بیٹا ہوا ہے۔" اس نے خوشخبری سنائی اور شفیق احمد کو تو جیسے اپنی سماعتوں پر اعتبار نہ آیا۔

"بہت مشکل کیس تھا۔ شکرانے کے نفل پڑھنا کہ اللہ نے زچہ اور بچہ دونوں کو بخیریت رکھا۔" رحمت دائی کے کہنے پر وہ صرف سر ہلا کر رہ گیا۔

آدھے پونے گھنٹے میں رحمت دائی رخصت ہوئی تو وہ خوشی سے دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ روبینہ کے پہلو میں لیٹا گل گوتھنا سا وجود۔

"کتنا پیارا ہے نا ہمارا بیٹا۔" اس نے احتیاط سے بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کیا تھا، روبینہ مسکرا دی۔

"تم ٹھیک ہے نا!" اس نے روبینہ کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ چند گھنٹوں میں ہی اس کی گلابی رنگت میں کیسی زردیاں سی گھل گئی تھیں۔ نقاہت زدہ ہو کر بھی چہرے پر ممتا کا انوکھا سا روپ، اسے روبینہ پر بے حد پیار آیا۔ اس نے خون جگر سے شفیق احمد کا بیٹا سینچا تھا، پھر زندگی موت کی جنگ لڑ کر اسے جنم دیا تھا۔

"ہاں اب تو ٹھیک ہوں، مشکل وقت تو بیت گیا۔" روبینہ ہولے سے مسکرا دی تھی۔

اتنے میں ہی باہر سے کھٹر پٹر کی آوازیں آنے لگیں۔ ہاجرہ بی بی کمرے سے باہر آ گئی تھی۔ دور مسجدوں سے فجر کی اذانیں بھی بلند ہونے لگی تھیں۔

"میں وضو کر کے نماز پڑھ آؤں روبینہ! ابھر منے کے کان میں اذان بھی تو دینی ہے۔"

وہ نماز پڑھنے مسجد چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو ہاجرہ بی بی صحن میں بچھے تخت پر بیٹھی تسبیح پڑھنے میں مصروف تھی۔ وہ شفیق احمد کو پکارنا چاہتی تھی۔ مگر شفیق احمد کے چہرے پر ایسی لاتعلقی چھائی تھی کہ وہ اسے پکار نہ پائی۔ شفیق احمد خود ہی چھوٹے موٹے کام نمٹاتا پھر رہا تھا۔ خود ہی روبینہ کو ہلکا پھلکا ناشتا بنا کر دیا۔ بچے کے دو لنگوٹ بھی خود ہی دھو ڈالے۔ ہاجرہ بی بی بلاوجہ کمرے کے باہر چکر کاٹ رہی تھی۔ شفیق احمد جانتا تھا کہ پوتا دیکھنے کو اس کا جی ہمک رہا ہو گا۔ مگر وہ رات کا کٹھن وقت کیسے بھلاتا، سو ماں کو نظر انداز کرتے ہوئے پھر کمرے میں گھس گیا۔

"اماں کہاں ہیں شفیق؟" روبینہ نے بیٹے کو دودھ پلا کر احتیاط سے اپنے پہلو میں لٹاتے ہوئے پوچھا۔

"باہر ٹہل رہی ہیں، اس انتظار میں ہیں کہ میں خود پکار کر کہوں گا کہ آ کر اپنا پوتا دیکھ لے، لیکن اماں کا انتظار انتظار ہی رہے گا۔"

وہ طنزیہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ روبینہ نے حیرت سے شوہر کو دیکھا۔ آج سے پہلے اس نے ماں کے لیے یہ لہجہ استعمال نہیں کیا تھا۔ کچھ لمحوں تک وہ پرسوچ انداز میں شوہر کو تکتی رہی، پھر پہلو میں لیٹے وجود پر نگاہ ڈالی۔

"شفیق احمد! بات سنو میری۔" بہت لمحے گزر گئے تھے جب اس نے شوہر کو مخاطب کیا۔

"ہاں کیا؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے بیوی کو دیکھا۔

"اماں کو آواز دے لو، پوتا دیکھنے کو بہت جی کر رہا ہو گا اس کا۔"

اس نے شوہر کو مخاطب کیا۔ شفیق احمد نے حیران ہو کر اسے دیکھا، وہ کم از کم روبینہ سے اس بات کی توقع نہ کر رہا تھا۔

"رہنے دے روبینہ! اماں کے رویے پر میرا جی بہت دکھا ہوا ہے، ایسے موقع پر تو بے گانے بھی کام آ جاتے ہیں، تجھے کیا پتا رات کو جب میں اسے بلانے گیا تو کیسا صاف انکار...."

"چھوڑ پچھلی باتیں شفیق!" روبینہ نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"آخر ماں ہے تیری، تجھے جنم دینے والی، تجھے کیا پتا ماں بننا کتنا اوکھا (مشکل) کام ہے۔ بہت حق ہوتا ہے ماں کا، تو بلا لا اسے، بچہ دیکھنے کو اتاولی ہو رہی ہو گی۔"

روبینہ دھیمے سے لہجے میں مسکراتے ہوئے بولی تھی اور شفیق احمد حیران پریشان اٹھ کھڑا ہوا۔

ماں کو بلانے کے بعد اس نے ایک نگاہ آسمان کی طرف ڈال کر یہ بھی تو دیکھنا تھا کہ آج سورج کہاں سے نکلا ہے۔

مکمل ناول

مریم ساجد

"دل تو کرتا ہے کہ جوتے لگاؤں پچاس اور گنوں ایک۔" اس نے دانت کچکچائے مگر وہ ڈھٹائی سے ہنس دیا اور پھر اپنے لہجے میں مصنوعی حیرت سمو کر بولا۔

"بسمہ! تمہارا حساب اتنا خراب ہے؟ چچ چچ چچ شام میں اگر کبھی فارغ ہو تو مجھ سے حساب پڑھنے آجایا کرو نا!"

"تمہیں جوتے لگانے نہ آجایا کروں؟" بسمہ نے منہ تھا جن پہاڑوں لتھا "اس کے تو سر پہ لگی اور تلوؤں پہ بجھی" میتھس کی اتنی اچھی ٹیچر کو یہ دو ٹکے کا انسان کیا کہہ رہا تھا۔
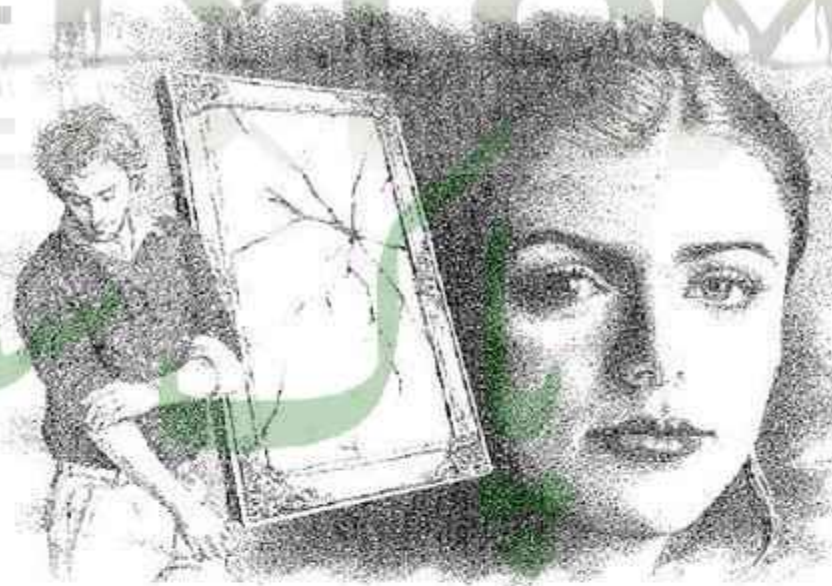
"ہونہہ! حساب پڑھنے آجایا کرو۔" اس نے اختیار کی نقل اتاری۔

"خود تو شکل سے لگتا ہے کبھی اسکول کا منہ تک نہیں دیکھا افریقہ کے جنگلوں کے مفرور بندر۔"

"ہاں وہ ہی بندر یا جو گم ہو گئی تھی تو..." وہ کہہ کر فوراً سیڑھیاں چڑھ کر یہ جا وہ جا ہو گیا یوں تک بسمہ سے کوئی تعبیر نہ تھا کہ وہ اپنے کہے پر عمل بھی کروا لیتی۔

"ہاں! ہاں۔۔۔ دیکھ لیں آپ اپنے اس پے انگ گیسٹ کو، یہ میرے لیے "چین" بنا جا رہا ہے، نہ ہو کسی دن۔۔۔" وہ اونچی آواز میں اپنی بھڑاس نکالنے لگی

تاکہ وہ یہ عزت افزائی با آسانی سن لے۔
اماں اسے چپ کراتی رہ گئیں۔
بات تو کچھ بھی نہیں تھی۔ بسمہ نے کپڑے دھو کر تار پر ڈالے تھے اور یہ افتخار کی کم بختی تھی کہ اس نے بسمہ کے دوپٹے کو ذرا سا سمیٹ کر اپنے تولیے کے لیے جگہ بنائی تھی اور بسمہ کو تو موقع چاہیے تھا۔ ادھر افتخار کون سا کسی سے کم تھا۔ دونوں طرف سے توپیں داغی گئیں۔ میزائل فائر کیے گئے اور آخر میں افتخار آخری حملہ کر کے چلا گیا اور بسمہ وہیں کھڑی اسے کوستی رہی۔
افتخار سے اس کی دشمنی تو پہلے دن سے ہی شروع ہو گئی تھی جب وہ سال پنڈی جاب کے سلسلے میں آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ارے..... میں کہتی ہوں نیچے اترتی ہے یا نہیں۔" اماں جوتا ہاتھ میں لیے اسے للکار بلکہ دھمکا رہی تھیں اور وہ..... مزے سے جامن کے درخت پر بیٹھی جامنیں توڑ توڑ کر کھا رہی تھی۔ اماں کتنی دیر سے اسے نیچے اتر کر سالن کے لیے سبزی کاٹنے کا کہہ رہی تھیں۔
"اماں! قسم سے' اس دفعہ بہت میٹھی جامنیں ہیں' ذرا چیک تو کریں۔"
"تو چیک کرنے کے لیے چھوڑتی ہے؟ اری کم بخت! ادھر پھل پکتا ہے اور ادھر تو پیڑ پر ہی ختم کر دیتی ہے۔ کبھی چھوڑ بھی دیا کر کچھ' اس پڑوس میں بھجوانے کے لیے....." تھک ہار کر وہ وہیں جامن کے پیڑ کے نیچے بچھی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔
"ارے واہ!" وہ چہک کر بولی۔
"ہمیں تو کوئی اور دھیلا بھی نہیں دیتا اور ہم خوامخواہ کے حاتم طائی بنتے پھریں' ہونہہ۔" اسے اس پیڑ سے بے حد محبت تھی۔ کسی کو بھی اس پیڑ سے ایک جامن بھی توڑنے کی اجازت نہ تھی ہاں اگر موڈ ہو تو سب بچوں کو بلا کر مٹھی بھر جامن پکڑا دیتی اور اگر کوئی بغیر اجازت چوری چھپے جامن توڑنے کی جسارت کر بیٹھتا تو وہ اس کے گھر تک جا پہنچتی اور ساری کی ساری چوری شدہ جامنیں برآمد کرواتی۔
"ارے ارے..... چھوٹے بہن بھائیوں اور اسکول کے بچوں کو کیا سکھائے گی تو۔" اماں نے اپنا سر پیٹ لیا۔
"انہیں بھی اپنے جیسا بنائے گی نہیں! تو چند جامنیں دینے سے کون سا تیرے خزانے میں کمی آ جائے گی۔" اماں کا اشارہ پیڑ کی طرف تھا اور وہ پتا نہیں کیا' بس ایک منٹ کے لیے اس کا چلتا ہوا منہ رکا۔
"پہلے کون سے خزانے ہیں..... ہمارے پاس جو کمی آ جائے گی۔" وہ تلخی سے بولی مگر صرف ایک سیکنڈ بعد وہ پھر پہلے والے موڈ میں آ گئی۔
"اوہو! اماں چھوڑیں سب کو' مٹی ڈالیں' ذرا اپنے گھر کا فروٹ تو چیک کریں۔" اس نے کچھ جامنیں اماں کی طرف پھینکیں' جو ان کے کپڑوں پر گل بوٹے بنا گئیں۔
"ارے کم بخت' اور اترو دھیان کیا کر۔"
"اوہو اماں! سوری۔"
"اب خود ہی ہانڈی چڑھا لینا' میں خالدہ کے گھر جا رہی ہوں۔" انہوں نے..... دوپٹا اس پر ڈالا اور پھر گیٹ.....
"آج خالدہ خالہ کو ہی پکڑ لیا۔" اس نے سوچا۔ آج صبح..... کا موڈ تو بستر سے نکلی ہی نہیں لیکن اب..... ہو رہی تھی۔
"اف کتنی خاموشی ہے۔" تھوڑی ہی دیر میں وہ اکتا گئی۔ باہر گلی بالکل خالی تھی کیونکہ سارے بچے اس وقت اسکول گئے ہوئے تھے اور آج تو شاید ریڑھی ٹھیلے والوں کی بھی ہڑتال تھی' کوئی نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ یونہی باہر دیکھ رہی تھی کہ اسے گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔
"ہائیں! اماں اتنی جلدی واپس آ گئیں۔" اس نے سوچا۔
"کہیں اس موٹی خالدہ نے اماں سے لڑائی تو نہیں کی؟" یہ سوچ ہی اسے اشتعال دلانے کے لیے کافی تھی۔ ابھی پرسوں ہی تو وہ خالدہ بھابھی کے چھوٹے کو ان کے گھر جا کر چپیٹی لگا کر آئی تھی اور وجہ وہی..... جامن چوری۔
"آج اس موٹی کی خیر نہیں..... اگر اماں کو اس نے کچھ کہا تو....." اس نے آستینیں چڑھا لیں۔
مگر یہ کیا؟
ان کے چھوٹے سے صحن بلکہ بقول اماں ڈیڑھ فٹ کے صحن میں کوئی اجنبی بڑی مشکوک حرکات کر رہا تھا' آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا..... کبھی اندر جھانکنے کی کوشش کرتا اور کبھی..... ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔
"..... کون ہو تم؟" اس نے کڑک آواز میں پوچھا۔
اور وہ اجنبی بے چارہ..... ایسا ہڑبڑایا کہ ہاتھ میں پکڑا گلاس جو اس نے پانی پینے کی نیت سے اٹھایا تھا نیچے گر گیا۔
"جی..... جی وہ..... میں....." ادھر ادھر سر گھما کر وہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ آواز کہاں سے آ رہی ہے مگر اسے کوئی نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔
"کیا میں میں لگا رکھی ہے بکرے کہیں کے' سیدھی طرح بول بھی چکو کون ہو اور کیا کرنے آئے ہو؟"
اسے بھوت پریت پر یقین نہیں تھا مگر اس لمحے تھوڑا خوف محسوس ہوا' بالکل سنسان' ویران گھر اور اس میں تفتیش کرتی ہوئی زنانہ آواز۔
"جی..... میں افتخار ہوں!" اس کی گردن مسلسل آواز کے محرک کو کھوجنے میں مصروف تھی۔
"کون افتخار؟..... آ..... آ....."
پیٹھ کے بل وہ اسی اجنبی کے قدموں میں گری تھی'
افتخار کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔
"ہائے اماں..... ہائے!" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بمشکل اٹھی۔
"آپ..... آپ....." اس سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا کہ یہ لڑکی کہاں سے اچانک ٹپکی ہے۔
"آپ کہاں سے آئی ہیں؟" آخر اس نے پوچھ ہی لیا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کا انٹرویو کرنے والی "انسان" ہی تھی۔
"نظر نہیں آیا' درخت سے گری ہوں' اچھی بھلی جامنیں کھا رہی تھی کہ تم ٹپک پڑے' کون ہو تم؟" گرنے سے اسے کوئی خاص چوٹ تو نہیں آئی تھی مگر پورا وجود ہل گیا تھا اور اوپر سے یہ بندہ۔
"میں جو کوئی بھی ہوں' پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم درخت پر جامنیں چوری کر رہی تھیں؟" اس نے پوچھا۔
"تمہارا سر کر رہی تھی اور تمہیں تو میں ابھی بتاتی ہوں۔" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔
افتخار نے اطمینان سے چارپائی پر بیٹھ کر گھر کا جائزہ لیا۔
گھر چھوٹا تھا مگر صاف ستھرا' ایک کمرہ' ایک اسٹور اور ایک کچن اور صحن کے بائیں جانب سیڑھیاں

تمھیں جن کے بچے ساتھ روم تھا شاید۔

کمال ہے۔ گھر والے نجانے کہاں چلے گئے ہیں اس طرح پورا گھر کھلا چھوڑ کر۔ پورا گھر بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

تب ہی ایک بزرگ خاتون اندر داخل ہوئیں۔ بسمہ انہیں دیکھ کر چیخ پڑی۔ "کہاں رہ گئی تھیں آپ؟ اور ان صاحب کو دیکھیں ذرا۔"

"بیٹا! کون ہو تم؟" اماں نے بسمہ کی شکایت کو لفٹ ہی نہیں کرائی تو وہ پیر پٹختی اندر چلی گئی۔

"ایک تو اماں ناں۔۔۔ ہر کسی سے رشتہ داری گانٹھ لیتی ہیں چاہے کوئی چور اچکا ہی کیوں نہ ہو۔" کچن میں وہ برتن پٹخ رہی تھی۔

"جی میں افتخار ہوں! عشرت بیگم کا بیٹا۔" اس دفعہ اس نے اپنی ماں کا بھی حوالہ دیا۔

"ارے! تم۔۔۔ تم عشو کے بیٹے ہو؟" وہ ذرا قریب آکر اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگیں۔

"عشو کیسی ہے؟ اسے بھی ساتھ لے آتے۔"

"جی، جی وہ بھی آئیں گی، پہلے میں سیٹ ہولوں، پھر انہیں بھی بلوا لوں گا۔"

"ارے۔۔۔ تم ابھی تک کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھو بیٹھو۔" اماں کو اچانک یاد آیا تھا۔

"بسمہ۔۔۔ بسمہ ذرا جلدی سے شربت تو بناؤ۔" انہوں نے کچن کی طرف منہ کر کے آواز لگائی اور وہاں سے جواب آنے میں ذرا دیر نہیں لگی۔

"اماں! شربت ختم ہے۔" اماں ذرا شرمندہ ہوئیں۔ پھر بولیں۔

"تو سکنجبین بنا لاؤ۔"

"اماں! چینی بھی ختم ہو گئی ہے۔" اب انہیں حیرت ہوئی کہ ابھی کل ہی تو۔۔۔

"چلو نمک والی ہی بنا لو۔" انہوں نے ہار نہ مانی۔

"اماں! لیموں نہیں ہیں۔" یعنی اس کے لیے کچھ بھی نہیں بن سکتا تھا۔ اس کی حرکتوں سے ظاہر تھا۔ اماں کا دل تو چاہا کہ وہ چار لگا دیں جا کر مگر فی الحال وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھیں۔ ان کا عزیز سہیلی کا بیٹا

پہلی دفعہ ان کے گھر آیا تھا اور یہ۔۔۔ اس لڑکی کا اخلاق۔۔۔ انہوں نے بڑی مشکل سے خود پر کنٹرول کیا ہوا تھا۔

"بیٹا! تم برا نہ ماننا۔ میری بیٹی ذرا الٹے دماغ کی ہے، کبھی کبھی اس طرح کی حرکتیں کرنے لگتی ہے۔" وہ شرمندہ شرمندہ سی وضاحتیں دیتے ہوئے اٹھیں۔

"ارے خالہ جی!" اس نے فوراً ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔ "پلیز، تکلف کی ضرورت نہیں، مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھیے۔ اب تو ادھر ہی رہنا ہے، یہ سب پھر کبھی سہی۔" اس نے انہیں شرمندگی سے نکالنا چاہا۔

"کیا؟۔۔۔ کیا مطلب؟" وہ تیر کی طرح کچن سے برآمد ہوئی۔

"بس افتخار اب یہیں رہے گا اوپر والے پورشن میں۔" ادھر اماں کی بات مکمل ہوئی اور ادھر بسمہ کو گویا کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ اچھل ہی تو پڑی۔

"یہیں رہے گا۔۔۔ اوپر والے پورشن میں۔ اماں! آپ نے اوپر والا پورشن کرائے پر دے دیا اور مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ آپ۔۔۔" اماں نے اس کی بات مکمل ہونے نہیں دی تھی۔

"اے ہائے! اس لڑکی کی زبان کے آگے تو خندق ہے، کس نے کہا ہے کہ کرائے پر دے رہی ہوں، اپنا بچہ ہے، اس سے کرایہ تھوڑی لوں گی۔"

"ارے نہیں۔۔۔ پلیز خالہ میں کرایہ دیے بغیر یہاں نہیں رہوں گا۔" وہ ان دونوں کی بحث میں پہلی دفعہ بولا۔

"کیوں بیٹا! اس طرح کیسے؟"

"خالہ پلیز! میں نے کہا ناں۔۔۔ میں کرایہ ادا کیے بغیر یہاں نہیں رہ سکتا، اگر آپ کو منظور ہے تو ٹھیک، ورنہ میں اپنا کہیں اور بندوبست کر لیتا ہوں۔" وہ اپنا بیگ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے بھئی تم کس کی باتوں میں آرہے ہو، اب تم سے کرایہ لیتے ہوئے اچھی لگوں گی اور عشرت کیا سوچے گی؟" اماں شرمندہ شرمندہ لہجے میں بولیں۔

"خالہ! امی نے ہی تو کہہ کر بھیجا تھا۔" انہوں نے کہا

ہو جاتا ہے۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر اماں کو تسلی دی اور ایک نظر لاتعلق کھڑی بسمہ کو دیکھا۔ اور یہ تھا افتخار کا پہلا دن۔

☼ ☼ ☼

وہ جیسے ہی اپنی گلی میں داخل ہوئی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے گلی کے بچے اسے دیکھ کر مسکرا رہے ہیں، چھپ چھپ کر ہنس رہے ہیں یا اپنی ہنسی روکنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس نے نظر بچا کر اس کی طرف اشارے کر رہے ہیں۔ اگر وہ ذرا فارغ ہوتی تو یقیناً ان میں کھڑے کھڑے دو ہاتھ لگا کر ان سے اگلوا ہی لیتی کہ کس خوشی میں ہنسے جا رہے ہیں۔ مگر فی الحال اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ مگر آنکھیں تو اس کی تب پھٹیں جب اس نے گھر میں قدم رکھا۔

صحن میں بچھی اکلوتی چارپائی پر چھوٹی چھوٹی تھیلیاں جا بجا رکھی تھیں اور اماں گن گن کر انہیں ایک طرف رکھتی جا رہی تھیں۔

"یہ بھابھی کا، یہ منور بھائی، یہ خالدہ کا۔۔۔" ہر تھیلی کے ساتھ وہ ایک نام لے کر سائیڈ پر رکھتی جاتیں اور چارپائی کے پاس ہی کہنیوں تک آستین فولڈ کیے ہوئے ٹھنڈے میں شرابور افتخار کھڑا تھا۔

"اماں!" دکھ اور صدمے کی زیادتی کی وجہ سے اس کے منہ سے بمشکل نکلا۔

"اماں۔۔۔ یہ سب؟" وہ تیزی سے آگے بڑھی اور افتخار صاحب اس کی تیزی دیکھ کر بوکھلا گئے۔ مگر اماں نے اسے کوئی لفٹ نہیں کروائی۔

"اماں! میں پوچھ رہی ہوں یہ سب کیا ہے؟" غصے کی انتہا پر پہنچ کر اس نے اپنا سوال دہرایا اور ساتھ ہی ان کا کندھا ہلایا۔

"ارے چپ کر۔۔۔ چپ۔۔۔ سارا حساب ذہن سے نکل دیا۔"

انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور نئے سرے سے اپنی گنتی شروع کی۔ بسمہ کا پارہ ہائی ہونے لگا۔

"اچھا خالہ! میں چلتا ہوں!" افتخار نے ماحول کشیدہ

ہوتے دیکھا تو وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت جانی۔

"ہاں بیٹا! بہت بہت شکریہ، آج تمہیں کافی تکلیف دی، اب تم آرام کرو۔"

اماں کے اس جملے نے بسمہ کو یہ سمجھنے میں ایک لمحہ نہ لگا کہ یہ ساری کارستانی کس کی ہے، ظاہر تھا کہ اماں تو درخت پر چڑھنے سے رہیں اور اس کے بہن بھائیوں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کر سکیں۔

"تم۔۔۔" وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھا ہی تھا کہ وہ لپک کر اس کے سامنے آگئی اور غرا کر پوچھا۔

"تو یہ تمہاری کارستانی ہے، تم۔۔۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس پیڑ پر چڑھنے کی؟"

"ارے اس میں ہمت کی کیا بات ہے، اتنے آرام سے چڑھا اور پھر اتر بھی آیا۔" وہ اسے کل والی بات کا طعنہ دے رہا تھا۔

"قسم سے پرفیکٹ کام کیا ہے۔ ایک دانہ جو رہ گیا ہو درخت پر، پوری چھانٹی کر دی ہے، آپ خود دیکھ سکتی ہیں۔"

اس کے تاثرات جانچے بغیر وہ اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا مگر اسے رکنا پڑا، بسمہ چیخی ہی اتنے زور سے تھی۔

"کیا؟ پورا آگا پورا پیڑ کھنگال ڈالا؟" صدمے سے اس کی آواز ہی بیٹھ گئی۔

"تم کس کی اجازت سے اس پیڑ پر چڑھے، یہ میرا گھر ہے، تم کون ہوتے ہو اس سے پھل اتارنے والے؟"

"بس!" اماں نے پیچھے سے ایک زوردار دھموکا رسید کیا۔

"بند کر اپنی بکواس، تجھے کسی سے بات کرنے کی تمیز نہیں! آخر اسکول میں بچوں کو کیا سکھاتی ہے، چل معافی مانگ افتخار سے۔" اماں نے آنکھیں نکالیں۔

"بیٹا! اس کی باتوں کا خیال نہ کرنا، یہ تو ہے ہی ایسی۔"

"ہاں میں ایسی ہی ہوں، ایسی ہی ہوں ہمیشہ سے اور ہمیشہ ایسی ہی رہوں گی۔" وہ بالکل اچانک ہی زور سے

چلائی تھی۔ افتخار نے ایک بار پھر حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کی لال تکی تکی خفا خفا آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری تھیں۔ مگر چہرے پر وہی کرختگی تھی۔ اپنا پرس وہیں پھینک کر وہ بھاگتی ہوئی اندر چلی گئی تھی۔

"اس کا کیا کروں میں؟" اماں نے جھک کر اس کے پرس سے گرنے والی اشیاء اٹھائیں۔

"زبان کی کڑوی ہے مگر دل کی بہت اچھی ہے۔ لیکن دل کی بھی کبھی ہی مانتی ہے اور اس کا دل تو کسی نے دیکھا ہی کب ہے۔" اماں چارپائی پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ کہنے لگیں۔ افتخار نے ایک نظر انہیں دیکھا اور اوپر چلا آیا۔

☼ ☼ ☼

آج اسکول میں بہت دیر ہو گئی تھی۔ پیرنٹس ٹیچر میٹنگ کے سلسلے میں پرنسپل کی ہدایات کوئی ڈیڑھ گھنٹے پر مشتمل تھیں۔

کپڑے بدل کر وہ سستانے کے لیے ابھی لیٹی ہی تھی کہ اچانک ہی بے ہنگم موسیقی کا شور بلند ہوا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور آواز کا تعین کرتے سلیپر گھسیٹتی ہوئی باہر آ گئی۔

"اماں! اپنی اس منہ بولے بھانجے صاحب کو اچھی طرح یہ سمجھا دیں اگر یہاں رہنا ہے تو اپنے حد میں رہے۔" برآمدے میں مشین رکھے اماں دھڑا دھڑ سلائی کر رہی تھیں جب وہ دھپ دھپ کرتی ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ "اتنی اونچی آواز میں گانے لگائے ہوئے ہیں پتہ نہیں کہاں کہاں تک آواز جا رہی ہو گی!"

"اوہو! وہ تو اوپر ہے ہی نہیں، ابھی ابھی میرے سامنے گیا ہے باہر۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بالی گیا تھا اوپر، یقیناً" اسی نے لگائے ہوں گے۔"

"بالی؟" اچانک ہی موضوع بدل گیا۔

"حد کرتی ہیں آپ بھی!" اب اسے ایک نئی فکر نے آن گھیرا۔

"اتنی جلدی لوگوں پر اعتبار کر لیتی ہیں۔ اب پتہ نہیں کیسا بندہ ہے اور آپ نے بالی کو اوپر بھیج دیا۔" وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"بی بی! تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے میں نے، ایسے ہی نہیں تم لوگوں کو اکیلے پال لیا، ویسے بھی بالی کوئی بچہ نہیں جو تم اس کے لیے یوں پریشان ہو رہی ہو، ماشاء اللہ میٹرک کا طالب علم ہے۔ اب اگلے سال کالج میں ہو گا۔"

وہ اس کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بحث کرنے اور خواہ مخواہ ہر کسی پر شک کرنے کی عادت سے عاجز آئی ہوئی تھیں۔

"اف... اماں کیسے سمجھاؤں آپ کو، دنیا کیسے کیسے بھیس بدلتی ہے۔"

وہ با آواز بلند اپنے خیالات کا اظہار کرتی اندر چلی گئی اور دروازے سے اندر آتا افتخار دانت پیس کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ اماں کو اپنا دکھ سکھ کہنے کو ایک اچھا سامع میسر آ گیا تھا۔ آفس سے واپس آ کر وہ سارا وقت اماں کے پاس بیٹھا رہتا۔ بسمہ سے اس کی ملاقات اس دن کے بعد ہوئی ہی نہیں تھی اور وہ کب گھر میں رہتی تھی۔ اسکول سے واپس آ کر تھوڑی دیر آرام کرتی اور پھر تیار ہو کر نکل جاتی اور پھر شام کو دیر سے اس کی واپسی ہوتی۔

بسمہ کے ابا کے بعد تو جیسے اماں کی زندگی تھم ہی گئی مگر چار بچوں کا ساتھ تھا لہٰذا شوہر کا غم بھلانا پڑا۔ بہت ہی کڑے دن تھے [illegible] بیت چکے ہیں۔"

وہ اپنی کہانی افتخار کو سنا رہی تھیں مگر باہر سے آتے شور نے انہیں رکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ تیزی سے اٹھیں اور چپل پہن کر باہر بھاگیں۔

"یا اللہ خیر!" افتخار نے بھی ان کی تقلید کی۔

پوری گلی میں جیسے میلہ لگا ہوا تھا اور جو باہر نہیں تھے وہ اپنے گھروں کی کھڑکیوں اور چھتوں سے جھانک نہیں بلکہ لٹکے ہوئے تھے۔

"بے غیرت، بے حیا، خبیث انسان! گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں؟" مین مجمع کے بیچوں بیچ بسمہ اپنی جوتی اتارے کھڑی تھی اور سارا محلہ اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا جیسے کوئی ڈراما لائیو ٹیلی کاسٹ ہو رہا ہو۔

"بسمہ!" اماں مجمع کو چیرتی ہوئی آگے بڑھیں "بس کر، چل گھر چل۔" اماں نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

"اماں چھوڑیں مجھے! آج میں اسے مزا چکھا کر آتی ہوں۔"

"بسمہ! چلو۔" اماں اسے کھینچنے لگیں تو وہ ایک ہاتھ میں جوتی پکڑے ان کے ساتھ کھنچتی چلی گئی۔

"توبہ! توبہ! بڑی ہی بدلحاظ لڑکی ہے۔" مجمع میں کسی نے بلند آواز میں سرگوشی کی تو بسمہ نے ایک دفعہ پھر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن اماں کی گرفت کافی سخت تھی۔

اس کی زبان سے ابھی تک اس لڑکے کی شان میں قصیدے نکل رہے تھے۔

افتخار ڈھیلے ڈھالے قدموں سے چلتا ہوا ان کے پیچھے ہی تھا۔

"توبہ کیسی مردمار لڑکی ہے، اگر اس لڑکے کی غلطی تھی بھی تو اسے درگزر کرنا چاہیے تھا۔ اب پورے محلے میں چرچے ہوں گے، اس لڑکے کو تو کوئی فرق نہیں پڑے گا مگر......"

یہی باتیں سوچتے ہوئے وہ گھر میں داخل ہوا۔ اماں شاید اسے کچھ کہہ رہی تھیں مگر اسے دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ لیکن بسمہ ایک دفعہ پھر شروع ہو گئی۔

"اماں! میں کیوں اسے معاف کر دیتی، غلطی ایک دفعہ ہوتی ہے روز نہیں، اور اگر آج میں اسے معاف کر دیتی ناں تو کل وہ گھر بھی آنا شروع کر دیتا، ایسے بے غیرتوں کی اپنی عزت تو ہوتی نہیں اور لوگوں نے اسے تو کچھ نہیں کہنا تھا، سب یہی کہتے کہ لڑکی نے چھوٹ دی ہے تو لڑکا اس حد تک آیا ہے ناں۔" وہ بولتے بولتے تھک چکی تھی۔ سو چارپائی پر بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

"محترمہ خاصا بڑا معرکہ سر کر کے آئی ہیں، تھکن تو ہونی ہے ناں۔"

اس کا انداز دیکھ کر افتخار نے جل کر سوچا۔ اب یہاں سے شفٹ ہونے کے بارے میں اس نے سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ابھی اس نے پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔ وہ اچھل ہی تو پڑا۔

"ارے کہاں ہے وہ بے حیا، ہتھ چھٹ لڑکی؟" پنجابی فلموں کی ٹیپکل چلنے والی کوئی بوڑھی ہیروئن ہی تو تھی۔ بمشکل اپنے کپڑوں میں پوری سمائی ہوئی خونخوار تیوروں کے ساتھ کمر پر دونوں ہاتھ ٹکائے وہ اندر داخل ہوئی۔ شاید کافی تیزی میں آئی تھی سو دونوں پاؤں میں الگ الگ رنگ کی جوتیاں تھیں۔

اتنی دیر میں بسمہ کو بھی تیاری کا موقع مل گیا سو وہ بھی خم ٹھونک کر میدان میں اتری۔

"بسمہ! تم اندر چلو، میں بات کرتی ہوں۔" اماں نے دنگل سے پہلے ہی اسے اندر بھیجنا چاہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

"ارے اب کہاں اندر بھیج رہی ہو، پہلے ہی اندر بٹھانا تھا ناں، بے حیا پتہ نہیں کہاں کہاں منہ مار کر کے آتی ہے اور اب یہاں سب کے سامنے نیک بی بی بنتی ہے، پتہ نہیں لوگوں کے گھروں میں پڑھانے جاتی ہے یا......"

"خبردار!" وہ اپنا پورا زور لگا کر چلائی کہ اس عورت کی بولتی ہی بند ہو گئی۔

"پہلے اپنے گریبان میں جھانکو، پھر دوسروں پر کیچڑ اچھالنا، تمہارے اس اوباش لڑکے کے کارنامے پورا محلہ جانتا ہے۔"

"ارے وہ تو لڑکا ہے، لڑکے تو ایسی دل لگی کرتے ہی رہتے ہیں مگر تجھے تو غیرت ہونی چاہیے۔ اس نے کچھ کہہ ہی دیا تھا تو ایسی کون سی قیامت آ گئی کہ سڑک پر مارنا شروع کر دیا۔"

اس عورت کی بات پر بسمہ اور اماں تو چھوڑ افتخار کی آنکھیں بھی پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بے حیائی، دیدہ دلیری اور جہالت کی کوئی حد تھی۔

"اچھا!" سب سے پہلے بسمہ ہوش میں آئی، کافی معنی خیز "اچھا" تھا۔

"وہ لڑکا ہے اور اسے حق ہے یہ سب کہنے اور کرنے کا۔" وہ تولتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

"بالکل!" اپنا ڈیڑھ من کا مٹکا ہلا کر اس عورت نے تائید کی۔

"ٹھیک! کل کو جب مانی بڑا ہو گا، وہ بھی تو لڑکا ہے ناں! اسے بھی یہ سب کرنے کا پورا حق ہو گا ناں تو جب وہ آپ کی بیٹیوں کو۔۔۔"

"ارے رے! زبان کو لگام دے، خبردار جو میری بیٹیوں کا نام لیا۔۔۔" اس عورت نے اچھلنے کی ناکام کوشش کی۔

"ارے خالہ! برا کیوں مان رہی ہو، لڑکوں کو تو حق ہوتا ہے ناں۔۔۔" وہ بے تکلفانہ انداز میں بولی۔

"ارے میں کہتی ہوں بند کر اپنی بکواس۔" وہ عورت ہاتھ نچا کر بولی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بسمہ کو اپنے وجود تلے روند ڈالے۔ "ارے ابھی ان کا باپ زندہ ہے، بھائی زندہ ہیں، ہڈی پسلی ایک کر دے گا اس کی جو ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے گا۔" اور بالکل اسی لمحے افتخار نے دیکھا کہ اس لڑکی کے، جو تن کر کھڑی ہوئی تھی، کندھے ڈھیلے پڑ گئے، چہرے کی رنگت جو پہلے غصے سے سرخ ہو رہی تھی یکدم زردی میں بدل گئی۔ آگ اگلتی آنکھیں یکدم سرد پڑ گئیں، تاثرات منجمد ہو گئے اور لہجہ برفیلا ہو گیا۔

"تو جن کے سر پہ باپ کا سایہ نہ ہو۔۔۔ ان کی کوئی عزت نہیں ہوتی؟ کوئی بھی راہ چلتا ان کی عزت پہ ہاتھ ڈال دے؟ بتاؤ خالہ!"

اور خالہ اس کی بات کے جواب میں آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔

"ہاں تو انہیں کس نے کہا ہے کہ گھر سے باہر نکلیں۔" وہ کہہ کر چلی گئیں۔ اب انہیں کون سمجھاتا کہ ان کے گھروں میں من و سلویٰ بھی نہیں اترتا۔

☼ ☼ ☼

رات کو نجانے کیسی آواز پر اس کی آنکھ کھلی، وہ تیزی سے اٹھ کر باہر نکلا۔ چھت کے کونے پر کوئی ہیولا جھکا ہوا تھا۔ وہ دبے پاؤں اس کے سر پر جا پہنچا اور اسے دبوچ لیا۔

"ک۔۔۔ کک۔۔۔ کون ہے، چھوڑو مجھے۔" بسمہ کی دبی دبی آواز پر فوراً ہی اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور بسمہ اس کے حصار سے نکل گئی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" اسے حیرت ہو رہی تھی کہ رات کے اس پہر وہ چھت پر کیا کر رہی ہے۔

"تمہیں اس سے کیا؟۔۔۔ میں جو بھی کروں، میرا اپنا گھر ہے یہ۔" وہ نیچے جانے لگی مگر افتخار راستے میں کھڑا تھا۔

"مجھے معلوم ہے یہ تمہارا گھر ہے اور یہ بار بار دہرانے کی ضرورت نہیں، لیکن میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ رات کے اندھیرے میں تم کیا کر رہی ہو چھت پر۔" چاند کی دھیمی دھیمی روشنی میں افتخار کو اس کا وجود [illegible] محسوس ہوا۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ یہ لڑکی دوسروں کو تو رلا سکتی تھی مگر خود۔۔۔

"اور تم رو رہی تھیں؟" اس نے جھجکتے ہوئے پوچھ لیا۔

"تمہیں اس سے مطلب؟ ہٹو آگے سے۔" لہجہ سخت مگر نمی لیے ہوئے تھا۔

وہ دیوار کی طرح تن کر کھڑا رہا اور اب وہ اس کے سامنے [illegible] پوری چھپ گئی تھی۔ "میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر تم اتنی بہادر لڑکی ہو، اس طرح کیوں رو رہی ہو؟" اور اس کی آخری بات پر وہ ضبط نہ کر سکی اور پھٹ پڑی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں ہوں میں بہادر۔۔۔ میں بہت کمزور ہوں، لڑکی ہوں ناں اس لیے بہت کوشش کرتی ہوں، بہت کوشش کرتی ہوں بہادر بننے کی مگر یہ لوگ۔۔۔ یہ لوگ میری ہر ہر کوشش پر پانی پھیر دیتے ہیں۔" وہ چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر پھر سے رونے لگی۔ اور افتخار حیران پریشان اسے دیکھتا رہ گیا۔ آخر کیا چیز ہے یہ؟ کتنے رنگ، کتنے روپ ہیں اس کے؟

اس نے ہاتھ چہرے سے ہٹائے اور پھر بولی۔ "پتا ہے۔۔۔ جب ابا زندہ تھے تو میں بہت ڈرپوک ہوتی تھی، ذرا ذرا سی بات پر ڈر جایا کرتی تھی۔ میں کبھی اکیلی گھر سے نہیں نکلتی تھی۔ کوئی مجھے تھوڑی دیر کے لیے بھی گھور کر دیکھتا تو میں تھر تھر کانپنے لگتی تھی۔ ہمیشہ ابا کے سائے میں چلتی تھی تاکہ [illegible]۔۔۔ اور پھر۔۔۔ پھر وہ سایہ، وہ چھاؤں، وہ سائبان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو گیا۔ ان دنوں میں آٹھویں جماعت میں تھی اور مجھے لگتا تھا کہ اب ہمارے جینے کے دن بھی تھوڑے رہ گئے ہیں۔۔۔ لیکن اماں نے ہمیں سنبھال لیا، لیکن اماں بے چاری ایک کمانے والی اور ہم کھانے والے چار، میں اسکول چھوڑ کر گھر بیٹھ کر اماں کا ہاتھ بٹاتی۔ اماں نے کپڑے سینے شروع کیے تو میں بہن بھائیوں کو سنبھالتی۔ اب ہم دونوں ماں بیٹی زیادہ سے زیادہ محنت کرتیں تاکہ میرے چھوٹے بہن بھائیوں کو باپ کی کمی محسوس نہ ہو، وہ کسی چیز کے لیے ترسیں نا۔ ساتھ ساتھ میں نے پرائیویٹ میٹرک اور ایف اے کر لیا، لیکن یہ سب کافی نہیں تھا اور اس کا اندازہ ہمیں اس طرح ہوا کہ ایک دفعہ مانی کو فیس جمع کروانی تھی مگر ہمارے پاس سلائی کا کوئی کام نہیں تھا۔ اس دن ہمارے گھر کا چولہا نہیں جلا تھا اور تمہیں معلوم یہ پیڑ مجھے کیوں عزیز ہے؟ کیونکہ اس دن ہمارے پورے خاندان نے اس کے پھل پر گزارا کیا تھا۔ اس دن جب مانی اسکول سے واپس آیا تو اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا، گالوں پر انگلیوں کے نشان ثبت تھے اور شرٹ کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے۔ ماسٹر صاحب نے اسے فیس نہ لانے پر مارا تھا اور اسکول سے نکال دیا تھا۔ ایک مانی ہی تو ہمارا واحد سہارا تھا، ہماری امید۔۔۔"

وہ یک دم سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"میں گھر سے نکلنے کے لیے تیار نہیں تھی مگر بڑھتی ہوئی مہنگائی اور مانی کے مستقبل نے مجھے مجبور کیا۔۔۔ اور اس رات میں بہت روئی اور آخری دفعہ روئی، میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب مجھے ابا کی جگہ سنبھالنا ہو گی، خود دھوپ میں کھڑے ہو کر اپنے بہن بھائیوں کو چھاؤں دینی ہو گی، انہیں زمانے کے سرد و گرم ہوا سے بچانا ہو گا۔ شروع شروع میں جب میں باہر نکلتی تو میری ٹانگیں کانپنے لگتیں، کسی اجنبی سے بات کرتی تو میرا حلق سوکھ جاتا لیکن ہر دفعہ میری نظروں کے آگے میرے بہن بھائیوں کی شکلیں پھر جاتیں اور میں نئے سرے سے حوصلہ پکڑنے لگتی۔۔۔ اور پھر رفتہ رفتہ میں نے اس زمانے کے چال چلن سیکھ لیے اور اس طرح وہ بسمہ وجود میں آئی جو لوگوں کی نظروں میں بے حیا، منہ پھٹ، بدلحاظ، بداخلاق اور ہتھ چھٹ تھی۔ مانی کی پڑھائی کے لیے مجھے اور رقم جمع کرنی تھی اور پھر چھوٹی دونوں بہنوں کی شادی کے لیے بھی تو کچھ بچا کر رکھنا تھا لہٰذا اسکول کے بعد میں نے شام کو گھر گھر جا کر ٹیوشن دینی شروع کر دی۔ اماں دن کو جتنی سلائی کر سکتیں وہ کر لیتیں اور رات کو باقی میں کرتی۔ اور شام کو دیر سے گھر آنے پر محلے والوں کی نظروں میں اور بھی مشکوک ہو گئی مگر ان سب کو یہ یاد نہیں جب میں نے گھر گھر جا کر ان سے درخواست کی تھی کہ یہ اپنے بچوں کو اکیڈمیوں کے بجائے میرے پاس بھیج دیا کریں تو کیسے کیسے طعنے نہ دیے ان ہی لوگوں نے اور اب۔۔۔ باتیں بنانے میں سب سے آگے۔"

اب وہ پھر اپنا وہ مشہور زمانہ روپ دھار چکی تھی۔

"اور آج۔۔۔ وہ غلیظ انسان گلی میں کھڑے ہو کر مجھ پر آوازیں کس رہا تھا۔ اگر میں چپ رہتی تو وہ اور شیر ہوتا اور کل کو ہو سکتا تھا وہ میرا ہاتھ بھی پکڑ لیتا۔ لیکن آج مجھے احساس ہوا کہ میں جو مرضی کر لوں، رہوں گی تو ایک لڑکی ہی ناں۔۔۔ بے آسرا اور اوپر سے یتیم بھی۔۔۔ سب سے آسان شکار۔"

وہ اٹھ کر چلی بھی گئی اور افتخار کتنی دیر وہیں بیٹھ کر اس کے بارے میں سوچتا رہا۔۔۔ کوئی ایک بات بھی جو

اس نے اپنے بارے میں کی ہو؟
اپنے فائدے، اپنی خواہش، اپنی ضرورت۔۔۔ اس کی ہر بات اس کی ماں اور بہن بھائیوں سے شروع ہوتی اور انہیں پر ختم ہوئی تھی۔
آخر یہ بسمہ کا کون سا روپ تھا، انتہائی خوب صورت، پُرخلوص۔
اسے معلوم بھی نہ ہوا کہ اسے سوچتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک دلفریب مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی اور ایک ننھی منی سی کونپل دھیرے دھیرے اپنی آنکھیں اس کے دل میں کھول رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

"اف۔" اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنا سر دیوار سے دے مارے۔
"آخر رات کو مجھے کیا ہو گیا تھا جو پوری الف لیلیٰ اسے سنا آئی۔" اس نے خود کو ڈپٹا۔
صبح اٹھتے جیسے ہی اسے اپنا رات والا کارنامہ یاد آیا اس وقت سے لے کر اب تک وہ اپنے آپ کو کوئی سو دفعہ برا بھلا کہہ چکی تھی۔
"کیا سوچتا ہو گا وہ، کیسی لڑکی ہے، ہر کسی کو اپنی قربانیوں کے قصے سنانے بیٹھ جاتی ہے۔ اب اسے کیا معلوم کہ پہلی مرتبہ میں نے کسی سے اپنے احساسات شیئر کیے ہیں۔" اس نے سوچا۔
"لیکن۔۔۔ اسی سے کیوں؟" تیز گرم چائے اس کے ہونٹ جلا گئی۔ "بھاڑ میں جائے وہ اور اس کی سوچ، میری بلا سے۔۔۔ جو بھی سوچتا رہے۔" اس نے جھنجلا کر خود کو مطمئن کیا۔
"اور بھئی۔۔۔ کیا ہو رہا ہے؟" وہ جلدی جلدی ناشتہ کر رہی تھی جب اس کی آواز آئی، اس نے سر جھٹکے سے اٹھا کر اس کی طرف دیکھا مگر وہ مانی سے مخاطب تھا۔ البتہ اس کی دبی دبی مسکراہٹ بسمہ کی نگاہوں میں نہیں آ سکی۔
"تو بسمہ بی بی۔۔۔! آخر ثابت ہوا کہ آپ بھی ایک معصوم سی، نازک سی لڑکی کا دل رکھتی ہیں۔" اس نے سوچا۔
"کچھ نہیں بھائی! بس پڑھائیاں ہو رہی ہیں اور کیا۔" مانی جواب دے کر اٹھ کھڑا ہوا اسے دیر ہو رہی تھی۔
"شاباش! دل لگا کر پڑھو۔" مانی سر ہلاتا باہر نکل گیا۔
وہ کچھ دیر وہیں کھڑا رہا اور پھر گنگناتا ہوا باہر نکل گیا۔
"ارے افتخار چلا بھی گیا۔۔۔؟" اماں کچن سے نکلیں۔
"ہوں۔" وہ اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے بولی۔
"ناشتہ کیے بغیر ہی چلا گیا۔۔۔ اور تو نے بھی نہیں پوچھا ناشتے کا، بسمہ! اتنی بد اخلاق تو نہ تھی۔" اماں کو افتخار کا اس طرح بغیر ناشتے کے چلے جانا بہت برا لگا تھا۔
"اماں! خدا کے لیے! بھول جائیں جو میں "تھی" اب جو ہوں "وہی یاد رکھیں۔" وہ جلدی سے چادر اوڑھ کر باہر نکل گئی۔ اس کا اپنا ناشتہ بھی تقریباً جوں کا توں پڑا ہوا تھا۔ پورا دن اسکول میں بھی اس کا دماغ رات والی بات پر اٹکا رہا۔
شام کو وہ گھر آیا تو سوگواری کا احساس فضا میں رچا بسا تھا۔
"ارے بھئی! یہ آج اتنی خاموشی کیوں ہے۔" وہ کہتا ہوا اندر ہی چلا آیا کیونکہ اس کے اندازے اور بسمہ کی روٹین کے مطابق اسے اس وقت گھر نہیں ہونا چاہیے تھا مگر وہ خلاف معمول گھر موجود تھی بلکہ منہ سر لپیٹے کونے والی چارپائی پر پڑی تھی۔ خدیجہ اور فاطمہ دونوں بیچ میں بیٹھی ہوم ورک کر رہی تھیں جبکہ خلاف معمول مانی بھی منہ لٹکائے دوسری چارپائی پر بیٹھا تھا۔ صرف اماں تھیں جو اپنے معمول کے مطابق [illegible] کی سلائی میں مصروف تھیں۔
"ریکھا مر گئی ہے۔" مانی نے اطلاع دی۔
"کیا؟ لیکن کب؟ صبح تک تو کوئی اطلاع نہیں تھی؟" اسے حیرت ہوئی اتنی بڑی خبر اور اتنی خاموشی، یہ میڈیا والوں کو کیا ہو گیا ہے۔
"صبح کہاں سے اطلاع آتی، ابھی شام کو مری ہے۔"

"مگر کیسے؟ وہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔" اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔
"سوزوکی کے نیچے آ گئی تھی ناں!" خدیجہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔
"ہیں!" وہ اچھل پڑا۔ "ریکھا۔۔۔ اور سوزوکی کے نیچے آ گئی، یہ کیسے ہو سکتا ہے اور وہ روڈ پر کر کیا رہی تھی۔۔۔ اور تم لوگوں کو کیسے اطلاعات ملیں؟"
"مودی بتانے آیا تھا کہ ریکھا سوزوکی کے نیچے آ کر مر گئی ہے۔" مانی نے افسردہ سے لہجے میں بتایا۔
"اور اسے کس نے بتایا؟"
"بھئی وہ وہیں موجود تھا۔"
"کیوں؟ وہ کوئی اس کا سیکرٹری تھا؟"
"نہیں بھائی! وہ [illegible] گھر چھوڑ کر سبز اور سرخ گیٹ والے گھر میں رہتا ہے جسے سب تربوز والا گیٹ کہتے ہیں۔"
"لیکن یار! یہ ریکھا بے چاری روڈ پر کر کیا رہی تھی اور پھر سوزوکی والے کو بھی اتنی بڑی اسٹار نظر نہیں آئی، دیکھا نہ ہوئی کوئی مرغی ہو گئی جو نظر ہی نہیں آئی۔" اس نے افسوس سے سر ہلایا۔
"تو مرغی ہی تو تھی۔" مانی نے آرام سے بتایا جیسے مرغی کا نام ریکھا ہونا بڑی عام سی بات ہو۔
"کیا مطلب؟" وہ آنکھیں پھاڑ کر ایک ایک کو دیکھنے لگا۔
"مطلب وطلب کچھ نہیں بیٹا!" اماں نے بے زاری سے کہا۔
"اس نگوڑی کو شوق ہے مرغیاں پالنے کا، ابھی ہفتہ ہوا تھا ریکھا نے انڈے، میرا مطلب ہے اس مرغی نے انڈے دینا شروع کیے تھے لیکن آج سوزوکی کے نیچے آ کر مر گئی۔"
"لیکن ریکھا؟" ابھی بھی کنفیوژن تھی۔
"اوہو بیٹا! اس نے مرغیوں کے نام بھی رکھے ہوئے ہیں۔ جیسے ریکھا، رانی، جوہی۔ آج تو بس یہ اسی کا غم منانے کی، ٹیوشن پڑھانے بھی نہیں گئی بھلا جانے والی چیز کے لیے رونا کیسا؟" وہ سلائی کا کام سمیٹ کر اٹھنے لگیں۔
"آج تو رات کا کھانا بھی پکانا پڑے گا، یہ تو آج نہیں اٹھنے کی۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں اور اب اسے معلوم ہوا کہ کچن کا بھی زیادہ تر کام بسمہ ہی سنبھالتی تھی۔ ہر روز ہی اس پر بسمہ کی نئی شخصیت آشکار ہو رہی تھی۔
"کیا چیز ہے یہ لڑکی!" وہ باہر نکل آیا۔
"بیٹا! چائے پی لو۔" اماں نے آواز دی۔
"جی خالہ! میں ذرا چینج کر کے آتا ہوں!" وہ دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر چلا گیا۔

✲ ✲ ✲

"بسمہ! ذرا بہن بھائیوں کو روٹی ڈال دینا اور افتخار کو اوپر بھجوا دینا، میں ذرا نسرین کی طرف ہو آؤں، پرسوں اس کی لڑکی مایوں ہے، کوئی کام وغیرہ نہ ہو۔" اماں اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر باہر نکل گئیں۔
"ایک تو اماں بھی نا!" وہ روٹیاں پکاتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔
"پتا نہیں کیوں ہر وقت دوسروں سے ہمدردی کا بخار چڑھا رہتا ہے انہیں۔" اس نے سر جھٹکا اور روٹی اتار کر چنگیر میں رکھی۔
"ادھر ہم پر کبھی کوئی مشکل آئی ہے تو سب کوسوں دور جا کھڑے ہوتے ہیں جیسے ہمیں کوئی چھوت کی بیماری ہو۔ ہونہہ!" روٹیاں پکا کر اس نے چنگیر میں رکھیں اور کپڑے سے ڈھانپ دیں۔ ابھی سالن نکالنے ہی والی تھی کہ باہر دستک ہوئی۔
"تم بیٹھو میں خود دیکھتی ہوں۔" مانی کو ہوم ورک چھوڑ کر اٹھتا دیکھ کر اس نے کہا۔
"کک۔۔۔؟" ابھی اس کے منہ سے لفظ پورے ادا بھی نہ ہوئے تھے کہ وہ سامنے والے کی شکل دیکھ کر اپنے الفاظ ہی بھول گئی۔
"ارشد! اس دن سڑک پر اس کی جوتی سے مار کھانے والا لڑکا، آج اس کے دروازے پر تن کر کھڑا تھا اور اس کی نیت اور مقصد اس کی آنکھوں سے ہی

عیاں تھے۔

"تم! تمہاری ہمت کیسے ہوئی یہاں آنے کی؟" اپنے حواس کو سنبھال کر وہ چلائی۔ اس کی کمزوری اس کی عمر بھر کی سزا بھی بن سکتی تھی۔ وہ بڑے اسٹائل سے مسکرایا۔

"اجی ہماری ہمت کے کیا کہنے! اپنی طاقت کا مظاہرہ تو آپ نے کر دیا' اب ہمیں خدمت کا موقع دیں' آپ بتائیں ہم کب اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے آپ کے در پر تشریف لائیں۔" ایک ہاتھ چوکھٹ پر اور دوسرا کمر پر رکھے وہ لوفرانہ انداز میں گویا ہوا۔

"اور مجھے لگتا ہے تمہیں وہ سین ایک دفعہ پھر دہرانا پڑے گا' بے غیرت انسان دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" وہ دانت پیس کر بولی۔

ارشد کے تاثرات اچانک ہی بدلے' اسے محسوس ہوا جیسے اس کے پیچھے کوئی آکر کھڑا ہوا ہے۔

"کیا بات ہے بسمہ؟ اپنی پرابلم؟" ارشد کو نظر انداز کر کے اس نے بسمہ سے پوچھا مگر وہ کیا بتاتی۔

"یہ۔۔۔ وہ۔۔۔" اور وہ سمجھ گیا۔

"ٹھیک ہے' تم اندر جاؤ۔" وہ چپ چاپ اندر چلی گئی۔

"جی فرمایئے! آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیسے کی؟" افتخار نے سخت اور کھردرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ مم۔۔۔ میں۔۔۔" وہ اس قسم کی صورت حال کے لیے تیار نہیں تھا اور اوپر سے افتخار کا لہجہ اور بسمہ سے استحقاق والا رویہ۔

"اگر آئندہ تم مجھے اس گھر کے یا بسمہ کے قریب بھی نظر آئے نا' تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ کر تمہارے ہاتھوں میں دے دوں گا' او کے' ناؤ ڈاٹ۔" اس نے انگلی اس کے ماتھے پر بجائی۔

"جی۔۔۔ جی بالکل۔"

"ناؤ گیٹ لاسٹ فرام ہیئر۔" افتخار نے اشارہ کیا تو وہ فوراً' خاموشی سے رفوچکر ہو گیا۔ دروازہ بند کر کے وہ اندر آ گیا' بسمہ اسے دیکھ کر اندر چلی گئی اور اس کا یہ طرز عمل افتخار کو حیران کر گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی اس حرکت پر غصہ کرے گی کہ اس نے اس کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی ہمت بھی کیسے کی لیکن وہ تو۔۔۔

☼ ☼ ☼

"دو سال چھوٹی ہے میری بسمہ سے مگر اس کا بھی بیاہ ہو گیا۔" شادی سے واپس آکر اماں نے اپنا من پسند موضوع چھیڑ دیا اور آج اماں کو افتخار بھی "میسر" آگیا تھا۔

"نہ جانے میری بسمہ کے نصیب۔۔۔" اچانک بسمہ نے کچن سے نکل کر ان کی بات کاٹ دی۔

"اماں! نصیب کھولنے کے لیے بھی ٹرک بھر کے جہیز آپ کے دروازے پر کھڑا ہونا چاہیے۔"

"ضروری نہیں ہمیشہ ایسا ہو' اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین ہو تو معجزے بھی ہو سکتے ہیں۔"

"ہونہہ! افتخار صاحب! کون سی دنیا میں بستے ہیں آپ؟ معجزے ہم جیسے غریبوں کے گھر نہیں ہوتے۔"

اور اس کی اس بات پر اماں نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

"ہائے ہائے! پتھر پڑ گئے ہیں اس لڑکی کی عقل پر' بھلا اللہ بھی امیری غریبی دیکھتا ہے' ارے معجزے تو اللہ کی قدرت سے ہوتے ہیں۔ حق ہا' پڑھ لکھ کر بھی ناں تو گنوا ہی رہی ہے۔" اماں نے تاسف سے کہا۔

"یہ۔۔۔ لیں ذرا یہ سلائی کر دیں' ایک کام سیدھی کر لوں۔"

اماں اٹھ کر اندر چلی گئیں اور افتخار نے اخبار اٹھا لیا جو وہ روزانہ اپنے ساتھ لاتا تھا۔

"مصروف ہو تم اور یہ دل مسکرا لیا۔" وہ ہلکے ہلکے گنگنانے لگا تو بسمہ سلائی چھوڑ کر مشکوک نظروں سے اسے گھورنے لگی۔

"سنو!"

وہ ایسے ہڑبڑایا جیسے کہیں اپنے ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔

یوں چپکے چپکے گنگنانا شریف لڑکوں کو زیب نہیں

دیتا۔" اس بات پر وہ منہ کھول کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"اگر کسی لڑکی وڑکی کا معاملہ ہے تو اپنی اماں کو اس کے گھر بھیجو' اس طرح حرکتیں کرنا اچھی بات نہیں ہوتی۔"

اس نے بڑی مشکل سے اپنے قہقہے کا گلا گھونٹ کر اس کو دیکھا جو بڑی بی بی اس کو نصیحت کرنے کے ساتھ ساتھ مشین پر کپڑے سلائی کرنے میں مصروف تھی۔

"ہاں! یہ تو تم نے بڑے پتے کی بات بتائی ہے' میں کچھ ہی روز میں اماں سے بات کرتا ہوں۔" اس کی الجھن کو وہ ایک دم سے سمجھ گئی تھی۔ وہ ہلکا پھلکا سا ہو کر اٹھا اور سرشاری کے عالم میں سیڑھیاں چڑھتا اوپر چلا گیا۔

"ارے اس نے تو تکا مارا تھا اور وہ لگ بھی گیا' واہ!" وہ دوبارہ مشین پر جھکی۔ وہ تھوڑی ہی دیر بعد سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اب وہ تیار تھا کہیں جانے کے لیے۔

"اس جہاں کی نہیں ہیں تمہاری آنکھیں۔"

وہ دھڑا دھڑ سیڑھیاں اتر رہا تھا مگر اسے اچانک ہی بریک لگانے پڑے' شعلے اگلتی آنکھیں لیے وہ سامنے کھڑی تھی۔

"ایک دفعہ کا کہا تمہاری سمجھ میں نہیں آتا؟ ایک دفعہ کہہ دیا ہے ناں' اپنا یہ گانے کا شوق اپنی "اس" کے گھر کے سامنے پورا کیا کرو' مگر تمہیں سمجھ نہیں آتا شاید۔۔۔"

اس نے چبا کر "اس" کہا تھا اور افتخار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا' کیا تھا اس کے لہجے میں؟ حسد یعنی جیلسی! وہ جیلسی فیل کر رہی تھی؟" اور جیلسی وہاں ہوتی ہے جہاں آپ کسی پر اپنا حق سمجھ رہے ہوں' تو کیا بسمہ؟

"کیا سو گئے ہو؟ میں اتنی دیر سے بک بک کر رہی ہوں مگر تم اونٹ کی طرح منہ اٹھائے کھڑے ہو' کچھ سمجھ شریف میں بھی آیا ہے؟" اس نے ہاتھ اس کی آنکھوں کے آگے لہرایا۔

"کیا ہوا؟" اس نے جھنک کر پوچھا تو وہ جل ہی تو گئی۔

"تمہارا سر۔" پیر پٹختی ہوئی وہ اندر چلی گئی۔

"تیری نظریں ہیں تلوار
کس کا دل ہے روکے وار
توبہ توبہ استغفار۔
ہائے میرا معصوم دل!" وہ ہنستا ہوا باہر چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

صبح تک تو موسم ٹھیک تھا مگر بریک کے وقت بادلوں نے اکٹھا ہونا شروع کیا اور چھٹی تک کھل کر برسنے لگے۔

"اف! اب کیا ہو گا۔" وہ اسکول سے باہر نکلی تو پتہ چلا کہ بارش اتنی تیز ہے کہ وہ اسٹاپ تک بھی نہیں جا سکتی کیونکہ اس کے پاس کوئی چھتری بھی نہیں تھی' وہ گیٹ پر کھڑی پریشان ہو رہی تھی کہ گیٹ کے پاس ایک گاڑی رکی اور کوئی اس میں سے نکلا۔

ہیلو میڈم! آج کیا یہیں رہنے کا ارادہ ہے؟"

"تم۔۔۔" اس نے ایک نظر افتخار کو اور ایک نظر نئی چمکتی گاڑی کو دیکھا۔

اس کی نظروں کا مفہوم بھانپ کر وہ بولا۔

"قسم سے چوری کی نہیں ہے! آج ہی پروموشن ہوئی ہے اور ساتھ یہ گاڑی بھی ملی ہے۔ اچھا اب چلو بھی' جلدی کرو' بارش میں بھیگ گیا ہوں سارا۔" وہ جلدی سے اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"ایک منٹ!" اس نے راستے میں گاڑی روکی۔

"سوچا مٹھائی بھی لے لیتا ہوں' گھر میں سب کا منہ میٹھا کرواؤں گا۔" وہ تھوڑی دیر بعد واپس آکر بولا۔

"ویسے آج گھر جا کر تم شکرانے کے نفل ادا کرنا کہ وہ بلا کے لیے بلا ٹلی۔" اس نے مسکراتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"کیا مطلب؟ کون سی بلا؟" وہ نا سمجھی سے اس کی شکل دیکھنے لگی۔ صورت چاہے جیسی بھی ہو' اگر

آپ کی سیرت اچھی ہو تو اس کا عکس آپ کے چہرے پر بھی نظر آتا ہے اور اس لمحے بسمہ کو اس کے چہرے پر پرخلوص اور شرارتی سی مسکان نظر آئی جس نے اس کے پورے چہرے کو روشن کر دیا تھا۔

"تمہیں اور کون؟"

"تم!"

"ہاں میں! یہ پروموشن ایسے ہی نہیں ہوئی' پہلے دو ماہ کی ٹریننگ ہوگی اور اس کے لیے مجھے کراچی جانا ہوگا۔"

"ہوں اچھا! جانا کب ہے؟" اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"کل صبح۔"

"اچھا!" وہ چپ ہوگئی مگر پھر کچھ یاد آنے پر بولی۔

"اور جو تم کہہ رہے تھے کہ تمہاری اماں چند دنوں تک آنے والی ہیں وہ؟"

"ارے ہاں! شکر ہے یاد کروا دیا' ابھی چھوٹی کے سالانہ امتحانات ہو رہے ہیں ناں' تو اس لیے ہو سکتا ہے کہ اماں کو ایک ماہ لگ جائے اور ویسے بھی مجھے لگتا ہے اتنا ویٹ تو وہ کر ہی لے گی۔" اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اچھا! یہ ہے کون؟ کوئی کولیگ؟" وہ نجانے کیوں کرید رہی تھی۔

"نہیں بھئی! تمہارے ہی محلے کی ہے۔" اس کی بات پر وہ ایکدم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

"اچھا!" اس نے اچھا کو لمبا کھینچا۔ "لیکن کون؟"

"بھئی پتا چل جائے گا ناں! اتنی جلدی کیا ہے تمہیں' جب چاند چڑھے گا تو ساری دنیا دیکھے گی۔" وہ جیسے اترایا۔

"در فٹے منہ! اب میری جوتی پوچھتی ہے۔" وہ سلگ ہی تو گئی اور رخ موڑ کر بیٹھ گئی۔ مگر اس کا ذہن مسلسل ایک ہی سوچ میں تھا۔

"آخر کون ہوگی؟ ارے...." اسے کچھ یاد آیا۔

"کہیں وہ شکیلہ تو نہیں.... سو فیصد وہی ہوگی' اسے ہی زیادہ مروڑ اٹھ رہے تھے جب افتخار ہمارے گھر آیا تھا اور جب بھی افتخار گھر پر ہوتا ہے بہانے بہانے سے ہزار چکر تو یہ لگاتی ہے۔ اوئی اللہ ہمارے ہی گھر.... ہماری ہی ناک تلے یہ کیا کھیل کھیلا جا رہا تھا اور ہمیں خبر ہی نہیں تھی.... اور اس چھچھوری کو تو میں ٹھیک کروں گی ناں شکل دیکھی ہے اپنی.... سڑا ہوا شلجم نہیں بلکہ مولی اور اس کو...."

اس نے ایک نظر افتخار کو دیکھا جو بڑی احتیاط سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

"اور اس کو بھی وہ ہی ملی تھی عشق فرمانے کے لیے۔" وہ انہیں سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ گھر بھی آ گیا۔

"اللہ تمہارا بھلا کرے بیٹا! میں تو بڑی ہی فکر مند تھی اتنی تیز بارش میں یہ کیسے گھر پہنچے گی!" اماں بہت شکر گزار ہو رہی تھیں۔

"چھوڑیں بھی خالہ! کیوں شرمندہ کرتی ہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ بسمہ کپڑے بدلنے اندر چلی گئی تھی۔

"اب اس گھر میں رہتا ہوں اور اتنا بھی نہیں کر سکتا۔" اس نے اپنے سر اور کپڑوں سے پانی جھاڑا اور مٹھائی کا ڈبہ اماں کی طرف بڑھایا۔

"یہ لیں! منہ میٹھا کریں آپ کی دعاؤں سے میری ترقی ہو گئی ہے اور ساتھ میں گاڑی بھی ملی ہے۔" اس نے مٹھائی کا ڈبہ کھولا۔ اتنی دیر میں وہ بھی کپڑے بدل کر آ گئی۔

"بہت بہت مبارک ہو بیٹا! اللہ نے چاہا تو اور ترقی کرو گے۔" اماں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"ان شاء اللہ! ورنہ یہاں تو لوگوں کو توفیق ہی نہیں ہوئی کسی کی خوشی پر دو بول مبارک باد کے ہی کہہ دیں۔" اس نے منہ بنایا۔

"ارے چھوڑو بیٹا! آج کل کے لوگوں سے دوسروں کی خوشیاں ہضم ہی نہیں ہوتیں۔ بس میرا بیٹا تم دل پر نہ لو۔"

خالہ کے اس جواب پر اس نے بڑی مشکل سے اپنا قہقہہ روکا اور بسمہ کا چہرہ دیکھا جو کہ غصے سے سرخ ہو

رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ بڑی مشکل سے برداشت کر رہی ہے۔

"اپنی ماں کو بتایا ہے؟" اماں کو اپنی سہیلی کا خیال آیا۔

"جی خالہ! میں نے انہیں بتا دیا تھا بلکہ کل میں گھر جا رہا ہوں اور پھر وہاں سے کراچی جاؤں گا ٹریننگ کے لیے۔"

"کون سی ٹریننگ بیٹا؟"

"خالہ! ایسے ہی تو نہیں ترقی ہوتی ناں! اب دو ماہ کے لیے ایک کورس کرنا ہو گا، پھر واپس آ کر اپنی نئی پوسٹ سنبھالوں گا۔" وہ کہہ کر اٹھا۔

"اچھا خالہ! میں ذرا باہر جا رہا ہوں، ایک دو کام نمٹانے ہیں۔"

"بسمہ! تم نے ٹیوشن کے لیے نہیں جانا، میں چھوڑ دیتا ہوں۔" اس نے بسمہ سے پوچھا جو بھٹکی ہوئی روح کی طرح ادھر ادھر پھر رہی تھی۔

"نہیں آج نہیں جاؤں گی۔" وہ خوامخواہ ہی ہر چیز سے الجھ رہی تھی۔

"اوکے ایز یو وش۔" وہ کندھے اچکا کر باہر نکلنے لگا تو دروازہ باہر کی طرف سے کھلا۔

"ہائے آپ! آپ آ گئے۔"

بندہ پوچھے اگر وہ تمہیں نظر آ رہا ہے تو ظاہر ہے آ گیا ہے اب یونہی تو نظر نہیں آ رہا ناں!

"وہ خالہ جی! میں ناں! آپ کے لیے پکوڑے لے کر آئی تھی۔ سنیے آپ بھی کھا کر بتایئے گا کیسے ہیں؟" بسمہ تیر کی طرح آگے بڑھی اور اس کے اور افتخار کے بیچ کھڑی ہو گئی۔

"بہت بہت شکریہ تمہارا شکیلہ!" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"تو پھر میں جاؤں ..." وہ شرماتے ہوئے بار بار دزدیدہ نظروں سے افتخار کو دیکھ رہی تھی۔

"ہوں!" وہ ڈٹی رہی۔

"تو پھر میں چلتی ہوں ... ٹھیک ہے پھر ..." [illegible] سے کہتی وہ پلٹی اور باہر نکل گئی۔

"ایک تو لوگوں کو بارش میں بھی چین نہیں آتا۔" وہ پکوڑے چکھتے ہوئے بولی تو اماں اور افتخار دونوں حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

☆ ☆ ☆

ابھی افتخار کو گئے ہفتہ ہی گزرا تھا جب اماں نے خوشی خوشی بتایا کہ اسے دیکھنے کے لیے کچھ عورتیں آ رہی ہیں۔

"لیکن اماں! میں اسکول سے چھٹی نہیں کر سکتی۔" نجانے کیوں وہ جھنجلائی ہوئی تھی۔

"تو میں نے کب کہا ہے اسکول سے چھٹی کرو، ٹیوشن مت جانا وہ لوگ شام میں آئیں گے۔" اماں کو اس کے ٹالنے اور جھنجلانے پر کوفت ہو رہی تھی۔

"لیکن اماں! ابھی ... ملی اور یہ دونوں ابھی چھوٹی ہیں۔" شاید اس نے خود کو مطمئن کرنے کے لیے یہ بہانہ گھڑا تھا۔

"ابھی نہیں کرے گی تو کب کرے گی ... ارے وہ نسرین کی لڑکی تیرے سے دو سال چھوٹی ہے مگر اس کا بیاہ بھی ہو گیا ہے اور تیری عمر کی لڑکیاں تو دو دو کاکے گود میں لے کر پھرتی ہیں۔" اماں کی آخری بات پر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"تو اماں ... آپ کو اعتراض کس بات پر ہے؟ ان کے دو، دو کاکے لے کر پھرنے پر یا صرف میری ہم عمر ہونے پر، یا پھر میرا ان میں شامل نہ ہونے پر ...." وہ ہنس کر بات ٹالنا چاہ رہی تھی مگر اماں اس دفعہ ٹلنے والی نہیں تھیں۔

"مجھے کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں۔ بس تو شام کو کہیں نہیں جا رہی اور بہن بھائیوں کی فکر نہ کر تو جیسے تجھے پال لیا ہے ویسے ہی انہیں بھی پال لوں گی۔" اپنا فرمان سنا کر وہ باہر نکل گئیں اور وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ نہ اسے شادی کرنے پر اعتراض تھا اور نہ ابھی شادی کرنے پر تو پھر؟ کیا چیز اسے ڈسٹرب کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہائے بسمہ! تیری ساس، اُف کیا بتاؤں میں، اتنی بڑی ہے اتنی بڑی ہے اتنی کہ ...." محلے کی چند لڑکیاں اسے گھیرے میں لیے بیٹھی تھیں۔

"اور وہ جب تجھ سے لڑے گی ناں تو تم اس سے بچ کر ہی رہنا۔ ایک دفعہ تیرے اوپر بیٹھ گئی ناں تو ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی تیری۔"

"بلکہ ہڈیوں کا سرمہ بن جائے گا۔" ایک اور بولی۔

"دفع دور، بُرے مرو، تم لوگ تو ہو ہی شودی، بے عقل کہیں کی، ناں! ابھی سے اسے ڈرا رہی ہو، کیا تک بنتی ہے ہیں؟ وہ کوئی اس سے کشتی لڑ رہی ہے؟" ایک سینئر شادی شدہ نے باقی سب کو پھٹکارا۔

"ناں آپا ناں! ایک بات تو مجھے بھی سمجھ نہیں آئی، ہیں نہ کوئی سسر، نہ ساس، نہ نند، نہ دیور، تو لڑے تو کس سے لڑے اس بے چاری کا تو یہ بھرا پرا سسرال ہے، آٹھ نندیں، ایک جیٹھ اور تین دیور اور سارے کے سارے سیلوں ...." اس بات پر سب ہنسنے لگیں۔

وہ لوگ آئے اور دو دن میں ہاں بھی ہو گئی تھی۔ اماں کو جانے کس بات کی جلدی تھی اور ویسے بھی اس کا کون سا کوئی لگا تھا جو چھان بین کرواتا۔ ملی تو اماں کی نظروں میں چھوٹا تھا۔ اسے بھلا ایسے معاملات کا کیا پتہ مگر اس کا اپنا دل کسی ضدی بچے کی مانند اینٹھا ہوا تھا، نہ اپنی ضد بتاتا تھا نہ ضد چھوڑتا تھا، بس منہ بسورے بیٹھا تھا۔

"ہوں! بات پکی ہونے کی خوشی میں محترمہ مغرور ہو گئی ہیں۔" یہ کہہ کر ساری لڑکیاں آہستہ آہستہ کھسکنے لگیں۔

اس کی ساس کا اگلا پھیرا بڑا ہی دھماکہ خیز ثابت ہوا۔ اس کی آٹھ نندیں، ایک جھکی سی دادی اور ایک جیٹھانی کے ساتھ دو درجن بچے، جن کی وجہ سے ان کا چھوٹا سا گھر تنگ پڑنے لگا تھا۔ ہر کونے کھدرے میں بچہ گھسا ہوا تھا اور دولہا کی دادی الگ اپنی ہانکے جا رہی تھیں۔ نہ جانے اپنے خاندان کی کون سی پشتیں کھنگال رہی تھیں۔ اپنے خاندان میں گزرے ہوئے نوابوں کے قصے چھیڑے ہوئے تھیں کہ اگر کسی کو ان کی ذہنی حالت کا نہ پتہ ہوتا تو ان کی باتیں سن کر وہ ان کے خاندان پر رشک کر سکتا تھا اور اصل دھماکہ تو تب ہوا جب بسمہ کی ساس نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔ وہ لوگ شادی کی تاریخ لینے آئی تھیں۔

"بہن جی! ہمیں تو آپ کی بیٹی چاہیے۔" انکساری ہی انکساری تھی۔

"لیکن ... اس طرح اچانک اتنی جلدی ...." اماں تو بوکھلا ہی گئیں۔ یہ لوگ اتنی جلدی کریں گے یہ تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

"ارے بھئی! آپ نے بیٹی کی شادی تو کرنی ہے ناں ... ابھی یا بعد میں ... تو پھر ابھی کیوں نہیں۔" ان کی ٹون ذرا بدلی تھی مگر اماں کو اپنی بوکھلاہٹ میں محسوس ہی نہ ہوئی۔

"خالہ! چھوڑیں ناں! آپ کے کون سے رشتہ دار ہیں جن کو بلانے میں وقت لگے گا، بس آپ تاریخ طے کریں جلدی سے۔" اس کی بڑی نند نے کہا۔

"بس خالہ! ہمیں ایک دو ماہ کے اندر اندر کی تاریخ دے دیں۔ یہ جولائی کی دس تک، دس کو بارات لے آئیں گے ہم، مہندی اپنے اپنے گھر اور ولیمہ تو پھر ہم اپنی سہولت دیکھ کر ہی کریں گے۔" چھوٹی نند نے تو آناً فاناً تاریخ طے بھی کر دی۔

"چلو بھئی منہ میٹھا کرو۔" جیٹھانی جو تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے بچوں کی مردم شماری میں مصروف ہو جاتی تھی، فوراً اپنے بچوں کے منہ میں ایک ایک مٹھائی کا ٹکڑا ڈال کر بولی۔

اور یوں شادی کی تاریخ طے ہو گئی۔ اس دوران نہ انہوں نے بسمہ کا پوچھا نہ اماں نے بتایا۔ ہاں جاتے ہوئے دروازے پر ساس صاحبہ کو خیال آ ہی گیا۔

"جی! وہ تو اس وقت اسکول میں ہوتی ہے!" اماں نے شرمندگی سے بتایا اور ساتھ ہی وضاحت دے دی۔

"لیکن کہتی ہے کہ شادی کے بعد چھوڑ دے گی۔"

اور اماں کی اس بات پر ساس صاحبہ کا رنگ تیزی سے بدلا اور ساتھ آئی خواتین کے چہروں کے زاویوں میں

بھی تبدیلی آگئی۔

"ارے سو وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔"

"اوچنو! سواری لے آئے۔" بڑی نند نے اپنے بڑے بیٹے کو آواز دی۔

"جی اماں! باہر کھڑی ہے اور جلدی کرو ورنہ وہ چلا جائے گا۔ اتنی عورتیں دیکھ..."

اماں کے کھپڑ نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔

"ارے کمبخت! ایسے ہی چلا جائے گا' تو روک اسے' جا کر بیٹھ۔"

تب اماں کو بھی اشتیاق ہوا کہ نجانے کون سی سواری آئی ہے باہر۔ کچھ کچھ خبطی دادی کی باتوں کا اثر بھی تھا۔ کوئی شاہی سواری... مگر باہر تو...

ایک ننھی منی سی' معصوم سی نازک سی چنگ چی کھڑی تھی۔

"چلو چلو جلدی کرو! بیٹھو۔" ساس صاحبہ ایک طرف بیٹھیں تو چنگ چی دہائیاں دیتا ہوا اس طرف جھک گیا۔

"اوہائی! خدا کا خوف کرو! اتنی فوج کو کہاں بٹھانے لگی ہو' یہ چنگ چی ہے ہوائی جہاز یا بس نہیں۔" جنگ چی کے بے چارے مالک نے دہائی دی۔

"ارے چپ کرو! ابھی سب کے لیے جگہ بن جائے گی۔"

"او خدا کو مانو خالہ! یہ ریل گاڑی نہیں' کوئی ایکسٹرا بوگی لگوا لو گی کیا؟" وہ بے چارہ دہائیاں دیتا رہا اور پورے محلے نے اس بے چارے کی دہائیاں سنیں مگر بسمہ کی ساس کو روکنے کی ہمت کسی کی بھی نہ ہوئی اور آخر کار انہوں نے سب کو کہیں نہ کہیں اٹکا ہی دیا اور خدا خدا کر کے چنگ چی اسٹارٹ ہوئی اور سارے محلے والوں نے اپنے کھڑکیوں اور دروازوں سے اپنی اپنی گردنیں اندر کیں لیکن ابھی بند نہ کر پائے تھے کہ ایک زور دار دھماکے اور ہولناک شور کی وجہ سے پہلے سے کہیں زیادہ تیزی سے وہی گردنیں باہر آگئیں۔

چنگ چی کا اگلا ٹائر ہوا میں بلند تھا اور ڈرائیور بے چارہ دونوں ہینڈل پکڑے ہوا میں معلق تھا۔ پیچھے والے سڑک پر اور آگے والے لوگ ان پر اوندھے پڑے تھے۔ عجیب چیخ و پکار مچ گئی تھی پوری گلی میں۔ اور محلے والوں کے لیے تو ایک نیا تماشا ہاتھ آگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بسمہ جیسے ہی گلی میں داخل ہوئی۔ خالدہ بھابھی اپنے گھر سے ایسے باہر نکلیں جیسے اس کی منتظر ہوں۔

"ہائے بسمہ! کیا بتاؤں؟ تیرے سوہرے تو بڑے ہی تھولے ہیں۔" انہوں نے ہنس ہنس کر پوری بات بتائی۔ اور وہ ایک لفظ بھی کہے بغیر اطمینان سے ان کی پوری بات سن کر آگے بڑھ گئی اور خالدہ بھابھی بڑی دیر تک اسے حیران سی دیکھتی رہیں۔ نہ کوئی طنز نہ طعنہ نہ کوئی بد کلامی!

بسمہ تو جب تک ایک کے بدلے دس نہ سنا لیتی اسے چین ہی نہ پڑتا تھا مگر آج! بات کچھ ہضم نہیں ہو رہی تھی وہ بے حد بدمزہ ہوئی تھیں۔

"اماں! آخر ان لوگوں کو جلدی کس بات کی ہے۔ میں کوئی بھاگی تو نہیں جا رہی۔" گھر میں داخل ہو کر اس نے ہینڈ بیگ اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی کتابیں چارپائی پر ڈالیں اور خود بھی وہیں نیم دراز ہو گئی۔

"لیکن بیٹا! جب کرنی ہی ہے تو پھر اتنا جلدی کس بات کی پھر تمہیں ان ہی کے ساتھ گزارا کرنا ہے تو پھر ہر کام ان کی مرضی سے ہو جائے تو کیا برائی ہے۔" اگرچہ وہ اماں کی بات سے اتفاق نہیں کرتی تھی تاہم پھر بھی چپ ہی رہی۔ لیکن اماں بھی اس کے چارپائی پر بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

"ٹھیک ہے اماں! جیسے آپ کی مرضی۔" اور اس کے اس طرزِ عمل پر ایک لمحے کے لیے تو اماں حیران رہ گئیں۔

"بسمہ! ادھر دیکھو' میری طرف۔" بسمہ نے فوراً آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھا جہاں اسے اپنے لیے فکر ہی فکر نظر آئی۔

"بیٹا! کوئی پریشانی ہے' اتنی چپ چپ کیوں ہو؟"

"نہیں اماں! پریشانی کیا ہونی ہے' وہ تو آج کل میں ذرا زیادہ تھک جاتی ہوں ورنہ تو کوئی بات نہیں۔" اب وہ کیا بتاتی اسے تو خود معلوم نہیں تھا کہ اس کی افسردگی کی وجہ کیا ہے۔

"اچھا چل آج پھر ایک دو ٹیوشنوں سے چھٹی کر لے۔"

"ہوں! دیکھتی ہوں۔" وہ اٹھ کر اندر جانے لگی۔

"اچھا سنو۔" اماں کی آواز پر وہ پلٹی۔

"جی۔"

"بیٹا! ذرا وقت نکالو' خریداری کے لیے میرے ساتھ چلو۔ اپنی پسند کی دو چار چیزیں لے لو۔" وہ دوبارہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"ویسے بھی بری تو موسم نے ہی ہیں نال!"

"لیکن اماں! آپ کو تو معلوم ہے کہ مجھے خریداری وغیرہ کا کوئی شوق نہیں۔" اس نے بے زاری سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! مگر میں اکیلی کیا کچھ دیکھوں گی۔"

"تو محلے میں سے کسی کو ساتھ لگا لیں' ویسے بھی یہاں سب کو گلہ ہے کہ بسمہ کسی کو پوچھتی نہیں' اس بہانے سب کا گلہ بھی جاتا رہے گا۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں یہ بھی ہے۔" انہوں نے کچھ سوچ کر کہا۔

"چلو میں دیکھتی ہوں۔"

اور بسمہ اس وقت حیرت کے سمندر میں ڈوب گئی جب اس نے دیکھا کہ اماں کے ایک دفعہ کہنے پر تمام محلے داروں نے اپنی اپنی خدمات پیش کر دیں۔ جبکہ اس کا خیال تھا کہ جو سلوک اس نے تمام اہل محلہ کے ساتھ روا رکھا ہے اس کے بعد اسے کم از کم اس حد تک تعاون کی امید نہیں تھی۔ اب ان کا گھر ہر وقت مچھلی منڈی بنا رہتا تھا۔ ہر ایک نے خود سے ہی کوئی نہ کوئی کام سنبھال لیا تھا کوئی کپڑے ٹانک رہا ہے کوئی دوپٹوں پر کرن لگا رہا ہے کوئی سب کے کھانے پینے کا بندوبست کر رہا ہے۔

دن بھاگے جا رہے تھے اور اب اس کی شادی میں صرف تین دن رہ گئے تھے جب اچانک عشرت خالہ اپنے تینوں بچوں کے ساتھ وہاں پہنچ گئیں اور یہاں پہنچ انتہائی شدید صدمہ کا شکار ہوگئیں۔

"وحیدہ! مجھے تجھ سے یہ امید نہیں تھی' تو نے تو مجھے صرف اس کے بات پکی ہونے کا بتایا تھا اور یہاں تو نے شادی کی تاریخ بھی طے کر دی ہے اور ہوا بھی نہیں لگنے دی۔" عشرت خالہ نے فوراً گلہ کیا۔ گھر میں مچی ہلچل سے انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ شادی کی تیاریاں عروج پر ہیں مگر وہ پھر بھی ایک دفعہ اپنے بیٹے کی خاطر بات ضرور کرنا چاہتی تھیں۔

"ارے میں نے سوچا تھا کہ چلو بات ہی تو پکی ہوئی ہے' میں تو بسمہ کے لیے اپنے افتخار کا سوچے بیٹھی تھی' میں نے سوچا چلو جا کر بات کروں گی آمنے سامنے مگر... لیکن اگر... تم مناسب... سمجھو تو۔" وہ کچھ ہچکچائیں۔

آخر میں ان کا لہجہ منت بھرا ہو گیا اور اماں کی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کیا کریں۔ خوشی سے ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"لیکن... اب تو...!" انہیں یاد آیا کہ وہ شادی کی تاریخ طے کر چکی ہیں۔

"خیر میں بسمہ سے بات کرتی ہوں اگر وہ راضی ہوئی تو پھر مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" انہوں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

اب انہیں پچھتاوا ہو رہا تھا کہ انہوں نے اتنی جلدی کی۔ انہیں یقین تھا کہ بسمہ انکار نہیں کرے گی مگر اس نے انکار کر دیا۔

"اماں پلیز! آپ اس بات کو تو بھول جایئے کہ یہ رشتہ کبھی آیا بھی تھا۔" وہ بھاگتی ہوئی باہر نکلی تھی۔ عشرت خالہ انکار سن کر بجھ سی گئیں مگر پھر فوراً بسمہ کو گلے لگا کر بولیں۔

"چل بیٹا! جو تیری خوشی... بس اللہ نصیب اچھے کرے۔"

☼ ☼ ☼

مسلسل بارشوں نے سارا انتظام الٹ پلٹ کر دیا تھا۔

بارات کے لیے میدان میں انتظام تھا مگر اب تو وہاں بقول مانی کے۔
"ڈوڈوس کی بارات آئی ہوئی ہے بغیر کسی ایڈوانس بکنگ کے۔"
"کوئی بات نہیں، اس کی ساس بھی تو..." شکیلہ اپنے دیدے گھما کر بولی تو اسے نہ چاہتے ہوئے بھی ہنسی آ گئی۔
"اماں! آپ یہاں آ گئی ہیں۔ کم از کم مجھے تو بتا دیا ہوتا۔" افتخار کی آواز سن کر اس کی ہنسی تھم گئی۔ تو کیا وہ ماہ اتنی جلدی گزر گئے۔
"میں پہلے گھر گیا تھا وہاں سے پتہ چلا کہ آپ لوگ پنڈی کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔"
وہ صحن میں بچھی چارپائی پر نیم دراز ہو گیا۔
"ارے افتخار بیٹا! تم کب آئے؟" اماں کچن سے نکلیں اور حیرت سے پوچھنے لگیں۔
"بس خالہ! ابھی ابھی آیا ہوں، آپ سنائیں کیسی ہیں اور باقی سب کا کیا حال ہے؟" اس کی نگاہیں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔
"میں بھی ٹھیک ہوں اور باقی سب بھی، تم بتاؤ تمہارا کورس کیسا رہا؟" اماں بھی ایک موڑھے پر بیٹھ گئیں۔
"بالکل ٹھیک... فرسٹ کلاس۔"
"بسمہ او بسمہ! ذرا شربت تو بنا لاؤ۔" انہوں نے اندر کی طرف رخ کر کے بسمہ کو آواز دی اور افتخار کو حیرت ہوئی کہ بسمہ گھر میں موجود تھی اور پھر بھی اتنا سکون۔
"ارے کیا کرتی ہو حمیدہ! تم بھی... یہ بھلا اس کے کام کرنے کے دن ہیں۔" عشرت خالہ نے اماں کو منع کر دیا۔
"شکیلہ! جاؤ تم شربت بنا دو پلیز۔" بسمہ نے اندر سے شکیلہ کو بھیج دیا۔ چلو افتخار صاحب کی آنکھوں کی پیاس تو بجھے گی اور تب اسے خیال آیا کہ اس نے شاید اسی وجہ سے رشتے سے انکار کیا تھا بھلا وہ خوامخواہ ہی دو دلوں کے بیچ کیوں آئے... چاہے وہ...

باہر کے منظر کا تصور کر کے وہ کڑھنے لگی۔
کیسی چمک اٹھی ہوں گی اس کی آنکھیں اپنی "ہیروئن" کو سامنے دیکھ کر... ہونہہ۔
تھوڑی دیر سب کے ساتھ بیٹھنے کے بعد افتخار اوپر آرام کرنے چلا گیا۔ اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی بسمہ کی دو نندیں اور جیٹھانی آ گئیں۔
"بھئی آپ لوگ تو عید کا چاند ہی ہو گئے! ابھی آتے ہی نہیں ہماری طرف، بس ہم ہی اپنی جوتیاں گھسیٹتے رہتے ہیں۔" اس کی بڑی نند نے بڑی محبت سے گلہ کیا لیکن کوئی ان سے پوچھتا کہ بھئی آپ لوگ مو نہ بھی تو دیں ہر دوسرے روز سارا ٹبر ٹپک پڑتا ہے "معید کا چاند" دیکھنے کے لیے۔
"ارے یہ کیا ہے؟" انہوں نے پاس پڑے شاپر کھول کر دیکھنا شروع کیے جو ابھی ابھی مانی نے لا کر رکھے تھے۔ عشرت خالہ اور اماں کو ان کی اس حد تک بے تکلفی ناگوار تو گزاری مگر...
"وہ مانی کہہ رہا تھا کہ آپا کی مہندی ضرور کرنی ہے تو اس لیے کچھ سامان..." اماں نے ابھی بات مکمل نہیں کی تھی کہ چھوٹی نند فوراً بولیں۔
"ہائے خالہ! یہ کیسا رواج ہے، لڑکی کی مہندی سسرال والوں کو نہیں بلائیں گے۔" حالانکہ کل وہ خود لڑکے کی مہندی کر چکی تھیں، اس وقت تو انہیں ایسا کوئی رواج یاد نہیں آیا تھا۔
"حالانکہ ہمارے ہاں تو سب سے پہلا دعوت نامہ سسرال والوں کو ہی دیا جاتا ہے۔" اب اگر اماں اتنی ہی تیز ہوتیں تو ان کو یاد دلاتیں کہ اس نے خود ہی کہا تھا "مہندی آپ کی" تو اب ان باتوں کا کیا مطلب تھا... وہ اور اماں کی سادگی۔
"ارے... وہ... نہیں تو... میں تو بس کہنے آنے ہی والی تھی مگر تم لوگ آ گئے۔ چلو میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتی ہوں۔" اماں اٹھنے لگیں تو بڑی نند نے فوراً روک دیا۔
"ارے خالہ! کیسی غیروں جیسی باتیں کرتی ہو، یہ چھوٹی بھی ناں۔" اس نے اماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "میں

نے کہہ دیا ہاں، ہم آ جائیں گے، آج تو بس ادھر سے گزر رہے تھے کہ خیال آیا کہ بسمہ کو ذرا دیکھ آئیں اور ساتھ آپ کی تیاریاں بھی۔" اب جا کر انہیں بسمہ کا خیال آیا تھا۔
"ہاں ہاں! کیوں نہیں تیاری تو بس مکمل ہی سمجھو اب تو دن ہی کتنے ہیں۔" اماں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے حالانکہ ہر چیز انہوں نے اپنی بساط سے بڑھ کر تیار کی تھی مگر ابھی بھی انہیں کمی ہی لگ رہا تھا۔
"آپ نے ابھی تک فرنیچر نہیں بھجوایا؟" دونوں نندیں بغور ہر چیز کا معائنہ کر رہی تھیں جبکہ جیٹھانی صاحبہ منہ پر بے زاری سجائے ان کے تبصرے سن رہی تھیں۔
"ارے یہ والا سوٹ تو میں نے راجہ بازار میں دیکھا تھا سیل لگی ہوئی تھی اس پر۔"
"ارے خالہ! اس جوڑے کا کام تو ابھی سے ماند پڑنے لگا ہے، ابھی تو پہنا بھی نہیں گیا۔"
"یہ کڑھائی تو کسی ست ہی ہلکی پھیکی سی لگتی ہے۔" اماں جو پہلے ہی مطمئن نہیں تھیں اب تو انہیں اپنی تیاری بالکل ہی بے کار لگنے لگی۔ اماں کا اطمینان رخصت کر کے اب انہیں جانے کی ہوئی۔
"اچھا خالہ! اب ہم چلتے ہیں، اب رات کو ہی ملاقات ہوگی۔" دونوں نندیں گیٹ سے باہر نکل گئیں، جبکہ جیٹھانی کا دوپٹہ چارپائی کی کسی ادوائن میں پھنس گیا تو وہ پیچھے رہ گئی اور اماں کے پاس جا کر آہستہ سے بولی۔
"لگتا ہے آپ کو اپنی بیٹی سے ذرا بھی محبت نہیں ورنہ یوں..."
"اری غزالہ! کدھر رہ گئی؟" چھوٹی نند نے بڑی دلیری سے بڑی بھابھی کا نام لے کر پکارا بلکہ درحقیقت ڈپٹا تھا اور اماں صحن میں کھڑی کی کھڑی رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"افتخار بھائی! افتخار بھائی! اٹھیں ناں... آپ تو بہت بور ہو گئے ہیں، پتہ نہیں کیسا کورس کر کے آئے

ہیں۔" مانی اس کے سر پر کھڑا چلا رہا تھا۔
اس نے تھوڑی سی آنکھیں کھول کر وقت دیکھا شام کے چھ بج رہے تھے۔
"کیوں، کیا ہوا؟" اس نے بڑی مشکلوں سے آنکھیں کھول کر پوچھا۔
"بس اٹھیں، جلدی کریں ناں..." مانی اسے بازو سے پکڑ کر کھینچ رہا تھا اور اسے تھکاوٹ اتنی ہو رہی تھی کہ اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔
"نیچے آئیں ناں... کوئی ہلا گلا کرتے ہیں، گانوں کا مقابلہ کرتے ہیں..."
"کیوں بھئی خیریت تو ہے ناں... اپنی آپا سے جوتے کھانے اور کھلوانے کا ارادہ ہے۔" وہ آخر اٹھ کر بیٹھ ہی گیا۔
"آپا کچھ نہیں کہیں گی۔"
"کیوں؟" وہ چلتا ہوا آئینے کے پاس آیا اور اپنے بال درست کرنے لگا۔
"ویسے تمہاری آپا صبح سے نظر نہیں آئیں، کہیں مایوں تو نہیں بیٹھ گئیں۔" اس نے مذاق اڑایا۔
"بھائی! کیوں مذاق کر رہے ہیں؟ آپ کو جیسے پتہ ہی نہیں۔ آج آپا کی مہندی ہے۔" وہ جھٹکا کھا کر پلٹا۔
"کیا؟ کیا مطلب ہے تمہارا، ہم... میں تو مذاق کر رہا تھا۔"
"لیکن میں تو مذاق نہیں کر رہا شاید آپ کو کسی نے بتایا نہیں کہ آپا کی شادی ہو رہی ہے۔ آج مہندی اور کل رخصتی۔" وہ پیر
"واٹ؟" وہ زور سے چلایا مگر اگلے ہی لمحے اس نے خود پر کنٹرول کر لیا۔
"لل... لیکن... ی... یہ..." اس سے کوئی بات نہیں ہو پا رہی تھی۔
"تت... تم پلیز... ایسا کرو کہ ای کو... ای کو اوپر بھیج دو، جلدی پلیز۔" وہ سر پکڑ کر دوبارہ بیڈ پر بیٹھ گیا اور مانی اسے حیرت سے تکتا ہوا باہر چلا گیا۔
"آئے ہائے... کیا افتاد آن پڑی ہے... پتہ بھی ہے مجھ سے سیڑھیاں نہیں چڑھی جاتیں مگر پھر..."

اسے دیکھ کر وہ چپ ہو گئیں۔

"امی! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" وہ تیر کی طرح ان کی طرف بڑھا مگر انہوں نے سر جھکا لیا۔

"امی پلیز... پلیز مجھے بتائیں... یہ سب کیا ہو رہا ہے۔" اس نے لب بھینچ کر خود پر قابو پایا ہوا تھا اور عشرت بیگم اپنے بیٹے کا جنونی انداز دیکھ کر ہول رہی تھیں۔

"جب تم گئے تھے تو وہ چار دن بعد..." انہوں نے اسے بتانا شروع کیا۔

"او میرے خدا!... امی آپ مجھے بتاتیں تو سہی میں خالہ کی منت کر لیتا مگر اب... اب تو بہت دیر ہو گئی ہے۔" وہ بے قراری سے ٹہل رہا تھا۔

"بیٹا! مسئلہ خالہ کا نہیں تھا... انکار بسمہ نے کیا تھا۔"

"بسمہ نے!" وہ رکا۔ "اس نے کیوں انکار کیا؟"

"معلوم نہیں مگر اب تمہیں اس کی خوشی میں خوش ہونا چاہیے۔" عشرت بیگم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"خوشی؟" اس نے چونک کر عشرت بیگم کی طرف دیکھا۔

"بسمہ کی خوشی... چلیں کوشش کرتا ہوں۔" بے تاثر لہجے میں کہہ کر وہ باتھ روم میں گھس گیا۔

جب وہ نیچے گیا تو رسمیں شروع ہو چکی تھیں۔ چھوٹے سے صحن میں پاؤں رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔

"ارے یہ کون ہے؟" کسی نے پوچھا۔

"یہ عشرت کا بیٹا ہے۔"

"اچھا!" اس اچھا میں کافی اشتیاق تھا۔

وہ زرد کپڑوں میں بیٹھی بسمہ بالکل بھی خوش نہیں لگ رہی تھی۔ اس نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا حالانکہ وہ اپنی ہم جولیوں کی نوک جھونک کا جواب بھی دے رہی تھی اور اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکان بھی تھی مگر اس مسکان کے اندر چھپی ہوئی افسردگی صرف اسے ہی دکھائی دی۔

"لیکن وہ اپنی مرضی اور خوشی سے یہ شادی کر رہی ہے تو پھر یہ افسردگی!" اس نے سوچا۔

چار پلیٹ بریانی ڈکارنے کے بعد بسمہ کے دیور صاحب فرمار ہے تھے۔

"کہاں سے بنوائی تھی یہ بریانی... بالکل بھی اچھی نہیں تھی یقین کرو اس سے زیادہ بدذائقہ بریانی تو میں نے کبھی کھائی ہی نہیں۔" افتخار کا دل چاہا کہ اس موٹے کو اٹھا کر ٹینٹ سے باہر پھینک دے۔

"ارے بھائی صاحب! اگر بدذائقہ بریانی کی چار پلیٹیں کھائی ہیں تو اگر یہ ذائقہ دار ہوتی تو پھر چار دیگیں ختم ہو جاتیں، ہیں ناں؟" افتخار کے چھوٹے بھائی نے بظاہر ہنستے ہوئے طنز کیا تو وہ وہاں سے واک آؤٹ کر گیا۔

"اف! یہ خالہ نے کہاں پھنسا دیا بسمہ کو۔" ایک نظر میں اس نے انہیں پرکھ لیا تھا۔ سب کے سب بدتہذیب، غیر تعلیم یافتہ اور عورت کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھنے والے جاہل...

اسے رہ رہ کر خود پر غصہ آرہا تھا۔

مہندی کی تقریب ختم ہو چکی تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے گھر جا چکے تھے۔ باہر کے کچھ کام نبٹا کر جیسے ہی اندر آیا خالہ نے فوراً اسے گلے سے لگا لیا۔

"شکر ہے میرا بیٹا آگیا ہے اب مجھے کسی بات کی کوئی فکر نہیں... بالی تو ابھی بچہ ہے، اسے اتنی سمجھ بوجھ کہاں، اب تم آگئے ہو تو خود ہی دیکھنا سب کچھ...."

"بالکل خالہ... ضرور۔" وہ صحن میں بچھی کرسیوں پر بیٹھ گیا۔

"تم نے کھانا وغیرہ کھا لیا؟" انہوں نے فکرمندی سے پوچھا تو عشرت بیگم اور افتخار دونوں ہی ہنس پڑے۔

"بالکل! کھا لیا ہے کھانا۔ اب بس ایک کپ چائے پلوا دیں۔" وہ اپنا سر ماں کی گود میں رکھ کر بولا۔

"ہاں ہاں... میں لے کر آتی ہوں۔" وہ فوراً اٹھیں اور کچن میں چلی گئیں۔

"ارے تو؟ تو یہاں کیا کر رہی ہے؟" وہ بسمہ کو دیکھ کر بولیں۔

"وہ میں چائے بنا رہی تھی۔" وہ چائے بنا کر کپ میں ڈال بھی چکی تھی۔

"میں نے تجھے منع بھی کیا تھا کہ کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانا، ساری عمر کام ہی تو کیا ہے تو نے... اب دو گھڑی آرام کر لے... پھر آگے اللہ جانے۔" ان کی آواز بھرا گئی۔ اس کی ساس اور نندوں کے تیور کچھ عجیب ہو رہے تھے پتہ نہیں دل کچھ کھٹک سا گیا تھا ان کا۔

"افوہ! اماں آپ بھی ناں! آپ چائے پینے آئی تھیں ناں... یہ لیں میں تو ویسے بھی اب سونے لگی ہوں اب چائے پی تو نیند نہیں آئے گی۔"

وہ کہہ کر جھپاک سے کچن سے نکل کر کمرے میں گھس گئی۔ کچن کوئی زیادہ دور تو نہ تھا اور پھر کھڑکی سے ساری آوازیں باہر آرہی تھیں۔ اماں باہر آئیں تو ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ عشرت بیگم نے انہیں اپنے ساتھ لگا لیا۔

"بس اب تو دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ نصیب اچھا کرے بسمہ کا۔" افتخار کے منہ سے بے اختیار "آمین" نکلا۔

وہ اوپر آیا تو ابرار اس کے بیڈ پر سو رہا تھا۔ اس کے کمرے میں سامان ہی کتنا تھا، چھوٹا سا کمرہ اور تھوڑا سا سامان، بیڈ کے علاوہ ایک رائٹنگ ٹیبل اور ایک کرسی اور بس... اس نے بیڈ کی ایک طرف کچھ بچھا کر سونے کے بارے میں سوچا مگر پھر سر جھٹک کر باہر نکل آیا۔

باہر ستاروں سے جھلملاتا آنچل اوڑھے اکیلی رات اس کی منتظر تھی بالکل اسی کی طرح اکیلی اور تنہا۔

"لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں، جب کوئی چیز ہمارے پاس ہوتی ہے تو ہمیں اس کی قدر نہیں ہوتی۔" وہ عین اسی جگہ کھڑا تھا جہاں اس نے پہلی دفعہ بسمہ کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔

"مگر جب وہ دور چلی جائے تو پھر اس کی قدر آتی ہے۔ میں جو بسمہ سے اپنا لگاؤ محض پسندیدگی سمجھ رہا تھا وہ تو شاید محبت کی حدوں کو بھی پار کر چکا ہے۔"

اس نے اپنی آنکھیں زور سے رگڑیں پھر اپنی پیشانی مسلنے لگا، یہ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ اتنی دیر سے جو وہ کر رہا تھا، تمام کاموں میں ہنسی خوشی حصہ لینا، بسمہ کو دلہن کے روپ میں دیکھنا اسے لگا جیسے ایک ڈراما تھا جس میں وہ اپنا کردار ادا کر آیا تھا۔ لیکن وہ سب ڈراما نہیں تھا اس کا دماغ مسلسل اسے باور کروا رہا تھا۔ وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا مگر اس کا دل کسی طور نہیں مان رہا تھا۔ "تو بھلا آنکھیں بے وفا ہو سکتی ہیں؟"

ساری رات اس نے چھت پر چکر کاٹتے ہوئے گزار دی۔

☼ ☼ ☼

"یہ... یہ سامان آیا ہے وہاں سے؟" عشرت بیگم نے حیرت سے پوچھا تو اماں قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی خود سے نظریں چرانے لگیں۔

سرخ چیختے ہوئے رنگ کا لہنگا، جو پہلی ہی نظر میں اپنی قیمت بتا رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہ اسے پہلے بھی بے دردی کے ساتھ استعمال کیا جا چکا ہے۔ اس کے ساتھ سستی سی آرٹیفیشل جیولری اور سرخ رنگ کے کورٹ شوز۔

"ہائے ہائے! یہاں تو کتنی باتیں بنا کر گئی تھیں اور خود..." عشرت بیگم نے جل کر کہا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ یہ ساری چیزیں وہ ان کے منہ پر مار آئیں۔

"اس کو پہننے سے تو اچھا ہے بسمہ اپنے جہیز والے کپڑوں میں سے کوئی جوڑا پہن لے۔"

"ارے نہیں... نہیں، وہ لوگ برا مان جائیں گے۔" اماں کا دل تو پہلے ہی بہت سے وسوسوں کا شکار تھا، وہ ان لوگوں کو مزید باتیں بنانے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھیں۔ وہ بولائی بولائی سی اندر باہر ہو رہی تھیں۔

بسمہ کو تو اس کی ایک کولیگ خالہ نسرین کے گھر

تیار کرنے کے لیے لگ گئی تھی۔ خالدہ بھابھی کے گھر کے پیچھے کافی بڑا پلاٹ تھا وہیں پر باراتی عورتوں کو کھلانے کا انتظام تھا۔

"بھابھی! خالدہ بھابھی! یہاں اور کرسیوں کی ضرورت تو نہیں۔"

وہ خالدہ بھابھی سے پوچھنے آیا تھا مگر اسٹیج پر بیٹھی بسمہ پر اس کی نظر جم گئی۔ ہمیشہ عام سے حلیے میں رہنے والی عام سی شکل کی بسمہ اس وقت کتنی مختلف لگ رہی تھی۔

نظریں جھکائے، ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھی وہ بسمہ کا کوئی انوکھا ہی روپ تھا۔ نہایت ہی دلفریب اور پیارا مگر... اس نے فوراً ہی نگاہ پھیر لی۔

"پیاری لگ رہی ہے ناں! سب کہہ رہے ہیں بچی پر بہت روپ آیا ہے۔" خالدہ بھابھی نے کہا۔

"جی بہت۔" وہ بڑی دقت سے مسکرایا تھا۔

"ہاں بھئی! جہاں جہاں کرسیاں لگ سکتی ہیں اور لگا دو، بڑے ہی شوخے لوگ ہیں، کہا تو سو بندوں کا ہے مگر لائیں گے ڈھائی سو۔" وہ کہہ کر آگے بڑھ گئیں۔ کرسیاں لگوانے کے لیے اگلے صحن میں آیا تو وہاں اسے خدیجہ مل گئی۔

"افتخار بھائی! آپ نے آپا کو دیکھا ہے۔ پیاری لگ رہی ہیں ناں؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہوں۔" وہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

"بھائی! آپ اندر سے آ رہے ہیں؟" ابرار نے پوچھا۔

"ہوں۔" اس نے دوسرے لڑکوں کو اشارہ کیا تو وہ کرسیاں لے کر اندر کی طرف چلے گئے۔

"بسمہ آپی کو دیکھا ہے، شی از لکنگ ویری پریٹی۔" ابرار بھی کرسیاں اٹھاتے ہوئے بولا۔

"بس۔" وہ دھاڑا۔

"کیا سب لوگوں نے بسمہ بسمہ لگائی ہوئی ہے۔ وہ جیسی تھی ویسی ہی لگ رہی ہے، پھیکی سی، تنہا اور اکیلی۔" آخری جملہ اس نے اپنے لبوں میں ہی روک لیا تھا۔ اس کے دھاڑنے پر ابرار نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ شکر ہے ان کے نزدیک کوئی نہیں تھا۔

"بھائی! آر یو اوکے۔" ابرار نے فکرمندی سے پوچھا تو افتخار کو اپنے رویے کا احساس ہوا۔

"ہوں! آئم سوری۔" وہ کہہ کر چلا گیا۔ اندر سے اماں کا بلاوا آیا تھا۔

"جی!" وہ اماں کے پاس جا کر کھڑا ہوا مگر نظریں بسمہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

"بیٹا! میں نے پوچھا تھا کہ قاضی وغیرہ کا بندوبست ہو گیا ہے ناں؟ اور کھانا جو ہے ناں وہ نکاح کے فوراً بعد ہی کھلوا دینا، پہلے ہی اتنی گرمی ہو رہی ہے اور اب تم خود بھی تیار ہو جاؤ، جاؤ شاباش۔"

آخر میں انہوں نے اس کے سراپے پر نظر ڈالی تو تاکید کی، مگر وہ تو بسمہ کو اپنی نظروں کے حصار میں قید کیے ہوئے تھا۔ اچانک دل سے جو دعا نکلی تو وہ خود بھی سٹپٹا گیا اور فوراً باہر نکل گیا اور پھر بارات بھی آ گئی مگر وہ اندر نہیں آیا۔

دولہا کو دیکھ کر اس کے دل نے پھر سے شکوہ کیا، فریاد کی۔

"یا خدا! یہ شخص... یہ تو بسمہ جیسی لڑکی کے قابل نہیں تھا۔"

اپنے بھائیوں میں سب سے کم صورت اور [illegible] میں سب سے آگے۔ اگر یہ شخص [illegible] بسمہ کے قابل ہوتا تو وہ اپنے دل کو سمجھا لیتا مگر یہ تو کسی بھی طرح...

نکاح ہونے سے پہلے دولہا کے بھائی اور ماموں اندر چلے گئے، پھر دولہا بھی ان کے پیچھے پیچھے چلا آیا مگر اندر تو منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ خالدہ بھابھی نے ٹھیک کہا تھا، پورا پلاٹ مچھلی منڈی بنا ہوا تھا۔ اسٹیج پر الگ ہنگامہ ہو رہا تھا۔

"دیکھو بھئی حمیدہ بیگم! اگر تم نے اپنی بیٹی کا نکاح کرنا ہے تو اس پر دستخط کرو۔" بسمہ کی ساس نے اکڑ کر کہا اور ایک کاغذ اماں کے سامنے کر دیا۔

"لیکن بہن! یہ کیسے ہو سکتا ہے، یہ مکان تو ہمارا واحد ٹھکانہ ہے۔" اماں ٹھٹکیں، آگے کنواں تو پیچھے کھائی تھی۔

"تو ٹھیک ہے تم اپنے ٹھکانے پر بیٹی کو سنبھال کر بیٹھی رہو، ہم بارات لے کر واپس جا رہے ہیں۔" وہ کاغذ واپس جھپٹ کر بولیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر سب چکرا کر رہ گئے۔

"بہن! میری بات تو سنو!" اماں نے منت کی۔

"خالہ! اب سننے سنانے کو کچھ باقی نہیں، سنبھالیے اپنی بیٹی کو، ہمیں کوئی شوق نہیں [illegible] جمع کرنے کا۔" یہ طنز کسی نند نے بڑی بے باکی سے کیا تھا، وہ تلملا کر رہ گئیں۔

"آئے ہائے! بہن! خدا کا خوف کرو! تمہاری اپنی بچیاں ہیں، کچھ ان کا بھی سوچو۔" خالدہ بھابھی نے انہیں "خوفِ خدا" یاد دلایا۔

"امی جی! چھوڑیں بند کریں یہ ڈرامہ! چلیں یہاں سے۔" دولہا راجہ بھی آن پہنچا تھا، باہر سے اور لوگ بھی اندر آنے لگے تھے۔ افتخار کی نظر بسمہ پر پڑی جس کے سر پر کھڑے ہو کر وہ سب یہ بحث کر رہے تھے۔ اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ آنسو ایک قطار میں اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

"بیٹے! آرام سے تحمل سے حل کر لیتے ہیں معاملہ۔" عشرت خالہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی مگر اس نے بڑی بری طرح ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

افتخار کو غصہ تو آیا مگر اس نے ضبط کر لیا۔

"کوئی معاملہ حل ول نہیں کرنا، بس ادھر دستخط کرو تب ہی اگلی بات ہو گی۔" وہ بدتمیزی سے بولا۔

"لیکن یہ مکان تو مانی کے نام ہے۔" اماں نے کہا تو ایک لمحے کے لیے سب چپ ہو گئے مگر پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ کی طرح اپنا مطالبہ دہرانے لگے۔

"اوئے لڑکے! اگر بہن کو رخصت کروانا ہے تو چپ چاپ اس کاغذ پر دستخط کر دے ورنہ تیری بہن ساری عمر اسی گھر میں بیٹھی رہے گی۔"

دولہا کے بڑے بھائی نے وہ کاغذ مانی کے آگے لہرایا۔ مانی گم صم سا کھڑا تھا۔ اگر وہ دستخط کر دیتا تو ماں، بہنوں کو لے کر وہ کہاں جاتا؟ اور اگر نہ کرتا تو....

"چلو بھئی چلو! ان لوگوں نے نہیں کرنی شادی وادی۔" دولہا کے ماموں ہر تھوڑی دیر بعد یہ نعرہ لگاتے اور دولہا کی دادی جو بے چاری گٹھیا کی مریض تھیں، اس اٹھک بیٹھک سے تنگ آ کر بولیں۔

"آئے ہائے! اللہ کی مار ان لوگوں پر۔" وہ اسٹیج سے نیچے لگی کرسیوں کی پہلی قطار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ "اس اکمل کی ہر شادی پر یہی ڈرامہ ہوتا ہے۔"

"جی! کیا مطلب؟" اردگرد بیٹھی دلہن والیاں ٹھٹک گئیں۔

"او جی مطلب وطلب تو کچھ نہیں۔" اکمل کے گھر والوں کے لیے وہ بظاہر بے کار تھیں کیونکہ ان کی یادداشت کام نہیں کرتی تھی مگر انہیں نہیں معلوم تھا کہ ان کی یادداشت کبھی کبھی کام کرنے بھی لگ جاتی ہے اور آج بالکل غلط موقع پر ان کی یادداشت نے کام دکھایا تھا۔

"میں کہہ رہی ہوں! یہ اکمل بھی ناں بالکل اپنے پردادا جیسے نصیب لے کر آیا ہے، ہائے بے چارے کی ہر شادی پر یہی ہوتا ہے۔" وہ بے وجہ ہنسیں۔

"دوسری شادی پر بھی بالکل یہی میلہ لگایا تھا اور پھر تیسری میں بھی، پتہ نہیں اس کی بال (گلی) ٹھکتی نہیں۔ اب دیکھو ذرا بے چارے کی چوتھی شادی بھی خراب کرنے پر تلی ہے۔" وہ صورت حال کو سمجھے بغیر اپنی ہانکے جا رہی تھیں۔

"تو اس کی پہلی بیویاں کہاں ہیں؟" کسی نے سوال کیا۔

"پہلی دو کو تو طلاق دے چکا ہے اور تیسری... وہ..." وہ سوچنے لگیں۔

"ارے وہ ساتھ آئی تھی ہمارے ساتھ... ہائے بے چاری... نمانی اپنی نندوں اور اس ڈائن سے ڈرتی بہت ہے، بے چاری شریف ہے۔" وہ اس کے قصیدے پڑھنے لگیں۔

مانی خاموش کھڑا تھا اور بسمہ کی ساس اس پر مزید دباؤ ڈالنے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

”چل اکمل چل! یہ لوگ تو نہیں کروانے والے اپنی لڑکی کی شادی! ہمیں لڑکیوں کی کمی نہیں۔“ بسمہ کی ساس نے بیٹے کا ہاتھ تھاما اور پلٹیں مگر پیچھے خالہ نسرین کھڑی تھیں۔

”نانی پتر! چھوڑو! یہ صحیح کہہ رہی ہیں‘ انہیں بھلا لڑکیوں کی کیا کمی‘ جیسے پہلے تین ملی تھیں ویسے ہی چوتھی بھی مل جائے گی۔“ انہوں نے بسمہ کی ساس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”کک۔۔۔ کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ بوکھلا کر سنبھلیں۔

”الزام لگاتی ہو ہم پر۔“

”الزام! یہ ہے الزام!“ انہوں نے تیسری والی کو تین بچوں سمیت آگے کیا‘ پورے پنڈال کو سانپ سونگھ گیا۔ بازی پلٹ گئی تھی۔ اسٹیج پر کھڑے باراتیوں کے رنگ فق ہو گئے۔

خالہ نے پوری بات باآواز بلند سنائی۔ باہر مردانے میں بیٹھے سارے محلے دار لڑکے اور مرد اندر آ گئے تھے۔

”چلیں جی۔۔۔ بات کو ختم کریں! ہمیں کچھ نہیں چاہیے‘ نکاح شروع کریں مولوی صاحب۔“ اکمل صاحب کوئی خاص قسم کی ڈھیٹ ہڈی تھے۔

”نہیں بیٹا! ایسے کیسے بات ختم کریں‘ اب تو تجھے بہت کچھ ملے گا۔“ افتخار نے اسے گریبان سے پکڑ لیا۔

”بہت شوق ہے ناں تجھے شادیوں کا۔۔۔ چل تیری شادی کروائیں۔“ ابرار بھی آگے بڑھا اور اس کے ساتھ محلے کے لڑکے بھی آستین چڑھا کر آگے آ گئے۔

پورے پنڈال میں گھمسان کا رن پڑا تھا۔ ادھر اسٹیج پر بسمہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ اماں اور خالہ عشرت اسے ہوش میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

باراتیوں کی اچھی خاصی اور دل بھر کر ”عزت افزائی“ کرنے کے بعد پولیس بلوائی گئی اور دولہا سمیت اس کے تمام باراتیوں کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔

”ہائے! میری بچی کی خوشیوں کو کس کی نظر لگ گئی۔“ بسمہ ہوش میں آئی تو میدان صاف ہو چکا تھا۔ اماں نے روتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا اور افتخار جو باہر سے آ رہا تھا خود سے بھی نظر نہ ملا پایا۔

”بس خالہ! سارے قسمت کے کھیل ہیں۔“ خالدہ بھابھی اپنے بازو پر آئی ہوئی خراشوں کو سہلاتے ہوئے بولیں۔

”بس حمیدہ! بس کر‘ اللہ کا شکر ادا کر کہ بسمہ بچ گئی‘ توبہ توبہ کتنے کمینے لوگ تھے‘ کم بختوں نے لاوارث سمجھا ہوا تھا بچی کو۔“ عشرت خالہ نے اماں کو دلاسا دیا۔

”لیکن عشرت۔۔۔!“ اماں غم سے نڈھال تھیں۔

”میری معصوم بچی پر داغ تو لگ گیا ناں۔۔۔ اب کون کرے گا اس سے شادی۔“

”میں کروں گا شادی۔“ ارشد آگے بڑھ کر بولا اماں پر جیسے شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی‘ نانی نے بھی فوراً سر اٹھا کر دیکھا۔

”ہاں خالہ! میں کروں گا شادی بسمہ سے۔“

افتخار کا دل چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے‘ حد ہوتی ہے سستی کی۔

”ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں“ کی تفسیر بنا وہ پھر سے صرف تماشا دیکھتا رہ گیا۔ اور بسمہ۔۔۔ وہ بے چاری تو ارشد کی شکل دیکھ کر ہی دوبارہ سے بے ہوش ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک صدمے کے بعد دوسرا صدمہ!

وہ کافی دیر بعد ہوش میں آئی۔ اس کا نکاح ہوا اور پھر اسے اس کے سسرال پہنچا دیا گیا۔ ایک دو رسموں کے بعد اسے کمرے میں دولہا کے کمرے میں پہنچا دیا گیا اور وہ جیسے آنکھیں بند کر کے ہر مرحلے سے گزری تھی۔ تمام عرصے میں اس کی ذہنی حالت ابتر تھی۔ وہ سوئی ہوئی کیفیت میں ہر حکم کی تعمیل کر رہی تھی کوئی حس جیسے باقی ہی نہ رہی ہو۔

”بسمہ! بیڈ پر بیٹھو۔“ وہ بیٹھ گئی۔

”پاؤں اوپر کر لو بسمہ!“ اس نے پاؤں اوپر کر لیے۔

”بسمہ! دودھ پی لو۔“

دودھ پی لیا نہ اس سے چہرے پہچانے جا رہے تھے نہ آواز اور پہچان کر کرنا بھی کیا تھا۔

”بسمہ! تھوڑی دیر آرام کر لو۔“ اس نے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور جیسے ہی آنکھیں بند ہوئیں‘ کچھ دیر قبل رونما ہونے والے پے در پے واقعات ایک فلم کی طرح اس کے دماغ میں چلنے لگے۔

”زندگی حادثات کا مجموعہ ہے!“ اس نے کہیں پڑھا تھا۔

”کبھی برے اور کبھی خوشگوار حادثات۔۔۔ جو آپ کی زندگی کو نئے رنگوں نئے موڑ پر لاتے ہیں۔ مگر اس کی۔۔۔ اس کی اپنی زندگی کیسی تھی؟“ اس نے اذیت سے سوچا۔

”محض پریشانیاں۔۔۔ غم اور فکریں۔۔۔ میری زندگی تو ناخوشگوار حادثوں کا مجموعہ ہے‘ ابو کے بعد کوئی ایک لمحہ۔۔۔ کوئی ایک لمحہ۔۔۔ خوشی کا کوئی ایک پل۔۔۔ بے فکری کا تو نہیں آیا میری زندگی میں‘ لڑکپن کی بے فکریاں اور جوانی کی شوخیاں۔۔۔ کچھ بھی تو میرے حصے میں نہیں آیا۔۔۔ اور پھر جوان ہوئی تو میں نے خود ہی۔۔۔ خود ہی اپنی خواہشات پر پہرے بٹھا لیے۔۔۔ خود پر ایک تجربہ کار عورت کا سا خول چڑھا لیا۔۔۔ قدم قدم پر اپنے کردار کی حفاظت کی‘ کسی کانچ کی مانند مگر آج کیا ہوا؟ لوگ کیا کہیں گے۔۔۔ ایسی سے شادی کرنی تھی تو پھر سڑک پر۔۔۔ ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔۔۔ کب تک۔۔۔ کب تک اور کس طرح صفائیاں دوں گی۔۔۔ لوگوں کی نظروں میں کیا رہ گیا میرا کردار۔۔۔ چور چور ہو گیا۔۔۔ اب یہ کرچیاں کیسے سمیٹوں گی۔“

اور یہی باتیں سوچتے سوچتے جانے کب اس کی آنکھیں بند ہوئیں اور وہ سو گئی۔

کوئی چیز اس کی گردن میں چبھ رہی تھی جب اس کی آنکھ کھلی۔

جانے رات کا کون سا پہر تھا۔ اس نے اندازہ لگانا چاہا مگر کوئی اندازہ نہ ہوا۔ وہ چھت کو گھورتی رہی گردن میں مسلسل کچھ چبھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ لگا کر دیکھنا چاہا تو کلائیوں میں پڑی چوڑیاں کھنکنا اٹھیں۔ اس کے دماغ میں ایک جھماکا سا ہوا جیسے اچانک کھوئی ہوئی یادداشت واپس آئی ہو وہ یک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

چھوٹا سا کمرہ تھا ایک طرف شاید باتھ روم تھا۔ اس کے جہیز کا بیڈ ڈالنے کے بعد کمرے میں صرف ایک چھوٹا صوفہ رکھنے کی گنجائش تھی۔ ایک طرف چھوٹا سا ڈائننگ ٹیبل پڑا تھا۔ اس کا سوٹ کیس ایک طرف دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ ایک سائیڈ ٹیبل پر کھانے کی ٹرے پڑی تھی جیسے ابھی ابھی لا کر رکھی ہو۔ اس نے گھڑی کی تلاش میں نظر ادھر ادھر دوڑائی تو اسے ایک چھوٹا سا ٹائم پیس دوسری سائیڈ ٹیبل پر نظر آیا۔ ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ کچھ مانوس اور کچھ نامانوس سا کمرہ تھا۔ کچھ آواز آئی تھی۔ شاید پانی گرنے کی۔۔۔ اس نے غور سے سنا تو معلوم ہو کہ یہ باتھ روم سے آواز آ رہی تھی شاید اندر کوئی تھا اور اس وقت۔۔۔ اس کمرے میں اس کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔۔۔ ارشد!

اس نے سوچا اور آنسو ایک دفعہ پھر بے اختیار ہو کر اس کی آنکھوں سے رواں ہو گئے۔

”اچھی ہمت کے کیا کہنے! اپنی طاقت کا مظاہرہ تو آپ نے کر دیا‘ اب ہمیں خدمت کا موقع دیں۔ آپ بتائیں ہم کب اپنی قوت کا مظاہرہ کرنے آپ کے در پر تشریف لائیں۔“

اسے ارشد کا جملہ یاد آیا تو ایک لمحے کے لیے جیسے اس کی سانس ہی بند ہو گئی۔

”یا اللہ! یہ کیا ہو گیا؟ اماں ٹھیک ہی کہتی تھیں مجھے اتنا بے لگام نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اب اس شخص کے ساتھ پوری زندگی کیسے گزرے گی۔۔۔ کیا حیثیت ہو گی میری اس کی زندگی اور گھر میں۔۔۔“ لمحہ بہ لمحہ اس کی آنکھوں سے بہتے پانی میں روانی آ رہی تھی۔ وہ قصوروار نہیں تھی مگر اب دنیا کی نظر میں قصوروار گردانی جائے گی‘ یہی سوچ اسے اردگرد سے بے پروا کر گئی تھی۔

اتنی دیر میں باتھ روم کا دروازہ کھل گیا اور کوئی باہر آیا۔ اس کی روح جیسے نکلنے لگی مگر رونا بند نہیں ہوا۔

"پتا نہیں اب یہ کیسے انتقام لے گا؟"

پہلے کی بات اور تھی مگر آج کی تاریخ میں جو واقعات ہوئے تھے اور جو کچھ اس پر بیتا تھا اس سے حوصلے اور ہمت جواب دے گئی تھی اور مزید کوئی وار سہنے کی طاقت اس میں نہیں تھی۔

"محترمہ! اگر آپ اپنا رونا بند کریں تو میں بھی کچھ عرض کروں۔" وہ بولا مگر اسے ہوش کہاں تھا وہ تو اپنی سوچوں میں گم بس روئے جا رہی تھی۔

"کیا ہوا بھئی! پہلوان کو کھونے کا دکھ ہے یا ارشد سے شادی نہ ہونے کا غم؟" کیدم آنکھیں پھاڑے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا اور وہ شخص، جو اس کے سر کے اٹھانے کا انتظار کر رہا تھا اس کی شکل دیکھ کر فوراً اس پر سے ہٹا لیں اور پھر گہرا سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔

"تت... تم؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" وہ بدک کر پیچھے ہٹی اور وہ جو اسے رومال لے پکڑا رہا تھا اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

"ہاں۔" وہ گہرا سانس لے کر پیچھے ہٹا۔

"میں بے چارہ! دنیا کا بدقسمت ترین دولہا ہوں جس نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی بارات کی دیگیں پکوائیں، لوگوں کو کھلائیں، پھر کرسیاں اٹھوائیں اور جب دلہن کے کمرے میں گیا تو... دلہن صاحبہ کو سراپا انتظار کے بجائے محو خواب پایا اور پھر دلہن صاحبہ بڑی دیدہ دلیری سے فرماتی ہیں کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو... اف یہ بات سننے سے پہلے... ہائے دنیا والو! مجھے بتاؤ کہ آج کی رات دلہا دلہن کے کمرے میں نہ جائے تو کہاں جائے... ظلم کی انتہا۔" اس کا افسوس عروج پہ تھا۔

"لیکن وہاں تو ارشد..." اس سے بات مکمل ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ جھجکتے پہ جھکا... مگر اس کے اعصاب اب ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

"ارے ہاں... یاد آیا۔" وہ ہنسنے لگا۔

"اس الو کے... کے ساتھ بھی آج خوب ہوئی۔" مشکل سے اپنی ہنسی روک کر وہ بولا۔

"کیا ہوا؟" اس نے تجسس سے پوچھا۔

"بھئی ہونا کیا ہے! تم تو اس کا اعلان سنتے ہی بے ہوش ہو گئیں مگر اس کی پھپھو اور ماسی ہوش میں آ گئیں۔" اسے پھر سے ہنسی آ رہی تھی۔

"کیا مطلب؟" بسمہ کے خاک بھی پلے نہیں پڑا تھا۔

"مطلب یہ کہ ہیرو صاحب نے اپنی پھپھی کی لڑکی اور ماسی کی بیٹی سے بھی شادی کے وعدے کیے ہوئے تھے۔ اب بھلا اتنی آسانی سے وہ بچ کر جا سکتا تھا۔ دونوں خواتین نے خوب خوب عاشقی جھاڑی محترم کی اور پھر دونوں نے مل کر ارشد صاحب کی والدہ ماجدہ سے جنگ کی اور آخر میں حسب معمول بلکہ حسب روایت آپس میں تو پیں داغیں اور ایک دوسرے کو در فٹے منہ کہہ کر اپنا لاؤ لشکر لے کر چلی گئیں۔"

"اچھا ہوا... بہت اچھا ہوا اس کمینے کے ساتھ۔" بسمہ کے دل میں تو جیسے ٹھنڈک پڑ گئی تھی۔

"اور پتہ ہے یہ سب دیکھ کر مجھے ایک بات یاد آ گئی تھی، یعنی آج کے تمام واقعات دیکھ کر میں یہ سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اب ہماری قوم میں اتفاق نہیں ہے، اب ہمارے اندر وہ بات نہیں رہی جو ان لوگوں میں تھی جنہوں نے پاکستان بنایا، بے شک میں یہ بات مانتا ہوں کہ وہ لوگ کوئی اور ہی تھے، ارادوں کے سچے اور عزم کے پکے، لیکن اب بھی ہماری قوم میں اتفاق کی کمی نہیں، ابھی بھی ہم میں کمی نہیں اگر آج بھی خدانخواستہ کوئی ایسا وقت آ جائے تو اجتماعی مفاد کے لیے ہم پھر سے ایک قوت، ایک طاقت بن جائیں... بلکہ حکمرانوں کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

اس کی اس تقریر پر بسمہ نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر کچھ سوچنے لگی۔

"ارے! اب کیا سوچنے لگیں... لگتا ہے پوری رات سوچنے میں گزارنی ہے۔" وہ اپنی مسکراہٹ دبا کر اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرانے لگا۔

"میں سوچ رہی ہوں کہ اگر تم دوسری شادی کرنا چاہو تو میں خالہ سے بات کر کے ضرور تمہارا ساتھ دوں

گی۔" وہ بیڈ سے اچھل کر کھڑا ہوا۔

"دو... سری... شادی؟" حیرت سے اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور وہ حیران تھا کہ اس کے دماغ میں اس وقت بطور خاص یہ بات کیسے نازل ہوئی۔ مگر وہ اس کے تاثرات سے بے خبر اپنی کہہ رہی تھی۔

"ہاں دوسری شادی! جسے تم پسند کرتے ہو اس سے دوسری شادی... اب تم نے مجھ پر احسان کیا ہے تو کیا میں... تم پر احسان نہیں کر سکتی... اتنی بھی احسان فراموش نہیں ہوں۔" دھیمی آواز میں بولی۔

"میں... میں کس سے محبت کرتا تھا؟" شاید اس کے دماغ میں اپنی پچھلی باتیں نہیں تھیں۔

"وہی... ہمارے... شکیلہ..." اب کے جھٹکا اتنا شدید تھا کہ وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔

"دیکھا میرا اندازہ درست ہے ناں...؟" وہ ہلکے سے مسکرائی مگر آنکھوں میں آنسو کا قطرہ گر اٹھا۔

"ایک منٹ!" افتخار نے ایک ہاتھ اٹھا کر اس کو مزید گوہر افشانی سے روکا اور تیزی سے اس کے پاس آیا اور پھر دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"میں نے پہلے دوسری، تیسری جو تھی شادی تم سے ہی کرنی تھی... اٹز کلیئر؟ وہ تو امی کو ہی دیر ہو گئی تھی لیکن پھر بھی امی نے بات تو کی تھی... ہاں ایک بات تو بتاؤ؟" اسے کچھ یاد آیا تھا۔

"تم نے انکار کیوں کیا تھا... جہاں تک میرا اندازہ تھا بلکہ یقین تھا کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتی تھیں پھر...؟" وہ اپنی نظریں اس پر جماتے ہوئے بولا۔

"شکیلہ کی وجہ سے۔" اس کے منہ سے پھسلا۔

"اچھا... تو تم شکیلہ کی خاطر اپنی محبت سے دستبردار ہو گئیں اور میرے بارے میں کچھ نہ سوچا۔" اس نے شکوہ کیا تو وہ منہ بسور کر بولی۔

"تمہارا ہی تو سوچا تھا... تم بھی تو شکیلہ سے...؟"

"لو خدا کی بندی! بند کرو شکیلہ نامہ۔" اس نے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

"میں پہلے بھی تم سے محبت کرتا تھا اور اب بھی تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"کئی لو یو..." وہ کمرے کے بیچ کھڑا ہو کر زور سے چلایا۔

بسمہ اس کے انداز دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔

"ٹھک ٹھک۔" تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون؟" افتخار نے پوچھا۔ بھلا اس وقت کون ہو سکتا تھا۔

"میں ہوں بھائی! ابرار!" اس نے دروازہ کھولا، ابرار جمائیوں پہ جمائیاں لیتا باہر کھڑا تھا آج وہ باہر سویا تھا۔

"وہ ساتھ والے رشید چاچا کہہ رہے ہیں کہ ان کی بیوی ان سے روٹھ کر میکے چلی گئی ہیں ان کی نیند اڑ گئی ہے۔"

افتخار "تو میں کیا کروں" کی تفسیر بنا کھڑا تھا۔

"چاچی کہتی ہیں کہ تیس سال ہو گئے شادی کو مگر ایسا اظہار محبت کبھی تم نے نہیں کیا جیسا افتخار نے اپنی دلہن سے کیا ہے۔" اس کی بات پر افتخار اسے مارنے کے لیے دوڑا اور بسمہ جھینپ گئی۔ واپس آ کر افتخار نے دروازہ بند کر دیا اور بیڈ کے قریب آ کر جھجکتے ہوئے کہنے لگا۔

"ایک بات کہنی تھی تم سے؟"

"اب کچھ رہ گیا ہے اور؟"

"ہاں وہ پلیز تم ذرا اپنا منہ دھو لو... قسم سے کتنی ہی دفعہ آیت الکرسی پڑھ کر پھونک چکا ہوں خود پر۔" افتخار نے کہہ کر چھلانگ لگا دی تھی کیونکہ ایک لمحے بعد ہی ٹھیک اسی جگہ بسمہ کا پرس ٹکرایا تھا۔

معجزے اسی دنیا میں اور غریبوں کے گھر بھی رونما ہوتے ہیں۔ بسمہ کو یقین آ گیا تھا کیونکہ اس کا اور افتخار کا ملن کسی معجزے سے کم تو نہیں تھا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ناولٹ

جامِ جم سے میرا جامِ سفال اچھا ہے

انسان مخصوص ارتقا کے ابتدائی ادوار میں "گیلی مٹی" کی مانند ہوتے ہیں۔ جنہیں معاشرے کا "کمہار" تربیت کے "چاک" پر دھرتا ہے اور بازارِ حیات کی "مانگ" کو نظر رکھ کر اپنی نیت اور چاہت کے ہاتھوں سے ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اس قالب سازی کے دوران اس کی "انگلیاں" ہر "برتن" کے بدن پر رشتوں، رواجوں، مذہب، سیاست، جذبوں، خوابوں اور سرابوں کی ان گنت پیچیدہ تحریریں رقم کرتی ہیں۔

گیلی مٹی کے یہ "سانچے" حالات کے "آوے" میں ڈھلتے ہیں۔ ان مراحل سے گزرتے ہوئے ہر برتن کا "ظرف" اور "نصیب" اس کی ہیئت کا تعین کرتا ہے۔ کچھ "سفال گر" کی بے توجہی کا شکار ہو جاتے ہیں، کچھ اس کے اناڑی پن کی نذر ہوتے ہیں۔ کچھ "آوے" کی "دہک" برداشت نہیں کر پاتے اور تڑخ جاتے ہیں، کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بازار تک تو پہنچتے ہیں مگر انہیں کوئی "خریدار" میسر نہیں آتا۔ ان کا نصیب اور بازار کا اسلوب ہر "ظرف" کا مقام طے کرتا ہے۔ گل دان اور پیک دان میں ساخت کا فرق بھلے نہ ہو مگر نصیب کا فرق ضرور ہوتا ہے۔

یہی میرے ناول کی تھیم ہے۔

محض چند واقعات کو اپنے انداز میں آپ کے سامنے پیش کر رہی ہوں۔ کرداروں کے ساتھ انصاف کرنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی کیونکہ میرا فہم و ادراک ناقص اور نامکمل ہے۔ میں یہ کام آپ پر چھوڑ رہی ہوں میں آپ کو خود سے بہتر منصف پاتی ہوں۔ میں اپنی رائے بھی نہیں دے رہی۔ صرف آپ کی رائے مانگ رہی ہوں۔

آپ اس ناول کو جس بھی تناظر میں دیکھیں، ٹھکرائے مٹی کے بے جان برتنوں کی کہانی مت سمجھیے گا۔

یہ جیتے جاگتے وجود رکھنے والے اور جد و جہد کرنے والے انسانوں کی داستان ہے۔

بشریٰ سعید

بشریٰ سعید

سفال گر

صوفیہ بچپن سے ناسازگار حالات سے گزر رہی ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ اس کا باپ کون ہے۔ جبکہ اس کی ماں البا گرانٹ کے عشق میں پاگل تھی۔ ماں کے انتقال کے بعد گرانٹ نے اس کی پرورش کی ہے۔ صوفیہ کو نہ اپنے والدین سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ہی مذہب سے۔ وہ پابندیوں سے آزاد زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ کلاس میں جیسیکا اور کیلی کو مستقبل کے حوالے سے وہ بتاتی ہے کہ وہ غلط راستے پر چلنا چاہتی ہے۔ میل صوفیہ کے پڑوس میں رہتا ہے۔ وہ صوفیہ کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ گرانٹ صوفیہ کو پوسٹ آفس خط ڈالنے کو دیتا ہے۔ جسے وہ ہر مرتبہ کی طرح لاپروائی سے ہوا برد کر دیتی ہے۔ کارل میکارتھی کالج کا سب سے ہینڈسم اور فلرٹ لڑکا ہے۔ لیکن صوفیہ اس پر توجہ نہیں دیتی۔ وہ کارل کے لیے ٹیڑھی کھیر ثابت ہو رہی ہے۔

عمر کی پرورش حکیم بیگم کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ جن کا خمیر محبت اور جفاکشی سے اٹھا ہے۔ انہوں نے عمر کی گھٹی میں "اللہ" سے محبت بھر دی ہے۔ حکیم بیگم کو اللہ سے عشق ہے۔ عمر کی خواہش ہے کہ بے جی (حکیم بیگم) کو اس کی ذات سے دکھ نہ پہنچے لیکن ہر مرتبہ کچھ نہ کچھ غلط ہو ہی جاتا ہے۔ عمر کو حکیم بیگم نے ایک عیسائی عورت سے گود لیا تھا۔ عمر کو اپنی ماں کے بارے میں جاننے کا تجسس ہے۔ ماسٹر صاحب کا قلم اٹھانے پر حکیم بیگم عمر پر سورۃ الناس اور سورۃ الفلق پڑھ کر پھونکتی ہیں تاکہ وہ آئندہ کوئی غلط حرکت نہ کر پائے۔ ان کی ایک بیٹی آمنہ امریکہ میں رہتی ہے۔ شادی کے بارہ برس گزرنے کے باوجود وہ بے اولاد ہے۔ حکیم بیگم ہر وقت اس کے لیے اولاد کی دعا مانگتی ہیں۔ عمر کو بے جی کی لگن حیران رکھتی ہے۔

پرنیاں آزرک کو پارک میں ایک اجنبی gloxinia کا پھول دے کر پرپوز کرتا ہے تو وہ ششدر رہ جاتی ہے۔ بعد میں وہ صرف اسی شناسا اجنبی سے ملنے پارک جاتی ہے۔ اس ملاقات میں پرنیاں پر کھلتا ہے اجنبی (گرانٹ) کو اداکاری کا جنون ہے۔ وہ اپنے آپ کو مستقبل کا عظیم اداکار سمجھتا ہے۔ وہ اپنے کردار کی ریہرسل کے لیے پارک میں موجود لڑکیوں کو پرپوز کرنے کی اداکاری کرتا ہے۔ یہ جان کر پرنیاں کو دھچکا لگتا ہے۔

گرانٹ اس سے ملاقات کا وعدہ کر کے اپنی دوست البا مارسیلو کے ساتھ چلا جاتا ہے۔

ابراہیم چالیس کی دہائی میں اپنے تایا کے پاس امریکہ چلا آیا۔ جو وہاں فرنیچر کا کاروبار کرتے تھے۔ تایا کی بیٹی ماریہ سے شادی کر کے اس کی لاٹری نکل آتی ہے۔ وہ ان کی جائیداد کا وارث بھی بن جاتا ہے ماریہ کی رفاقت ہر پل اسے اپنی خوش بختی کا احساس دلاتی ہے۔ بدقسمتی اس وقت ابراہیم کے دروازے پر دستک دیتی ہے۔ جب ماریہ اسے ایک بچے کا تحفہ دے کر اپنے رب سے جا ملتی ہے۔ اسپتال جلدی پہنچنے کے لیے وہ اشون کی بیش قیمت کار ادھار لیتا ہے۔ جو اس کی بداحتیاطی سے تباہ ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی دو ملین کی رقم بھی آگ کی نذر ہو جاتی ہے۔ اس کی قیمت اسے اپنی تمام جائیداد اور تین انگلیاں اشون کے ہاتھوں کٹوا کر چکانی پڑتی ہے۔ وہ اکلوتے بیٹے احمد سمیت سڑک پر آجاتا ہے۔

احمد کی وجہ سے اسے کئی جگہ نوکری سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ ہر مرتبہ اس کا دل احمد کو [illegible] کرنے کو چاہتا ہے۔ آخرکار وہ کتابوں کی اپنی دکان کھول کر زندگی کی گاڑی کھینچنے لگتا ہے۔ اس کا رجحان مذہب کی جانب [illegible] ہے۔ جبکہ احمد کا دل تمام تر کوششوں کے باوجود اللہ کی جانب مائل ہونے سے انکاری ہے۔

احمد جتنا اللہ سے بھاگتا ہے۔ ابراہیم زبردستی اسے دین کی جانب لانے کی کوشش کرتا ہے۔ ہالی وڈ اسٹار بننے کا خواب احمد کو بے چین رکھتا ہے۔ باپ کی سختی اور مار پیٹ اسے اور شدت سے شوق کی تکمیل کے لیے اکساتی ہیں۔ اسکول میں وہ لڑکیوں کی "پسندیدہ" ہستی ہے۔ ایک یتیمی شو کے عوض وہ کسی بھی لڑکی کو اچھا وقت دے سکتا ہے۔ وہ اداکاروں کا زبردست نقال ہے۔ کیری گرانٹ اس کا پسندیدہ اداکار ہے۔ اپنے خواب کی تکمیل کے لیے گھر سے بھاگنے کا فیصلہ کرتا ہے عین اس وقت جب وہ دہلیز سے باہر قدم رکھ رہا تھا۔ ابراہیم کو فالج ہو جاتا ہے اور اس کا جسم ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ دن رات کی خدمت سے تنگ آکر وہ ابراہیم کو مار ڈالتا ہے۔ احمد کو یقین ہے کہ اب قسمت اس پر اپنی مہربانی ضرور کرے گی۔ اس کے خواب اس وقت چکنا چور ہو جاتے ہیں جب پولیس اہلکار گرفتار کر کے اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پرنیاں گرانٹ کو فون کرتی ہے تو وہ اس کا خیر مقدم کرتا ہے۔ دونوں کے درمیان دوستی پروان چڑھنے لگتی ہے۔ گرانٹ کی ساری گفتگو اداکاری کے گرد گھومتی ہے جو کہ اس کا پہلا عشق بھی ہے۔ پرنیاں گرانٹ کو متاثر کرنے کے لیے کیری گرانٹ کے متعلق معلومات اکٹھی کرتی ہے۔ داؤد اسے ان مشکوک سرگرمیوں پر ٹوکتا ہے۔ کچھ ہی

دنوں میں گرانٹ کے سامنے تمام اصلیت آجاتی ہے۔ وہ پرنیاں کے جذبے کی پذیرائی کرتا ہے۔ ہوٹل میں دعوت پر گرانٹ اپنی دوست البا کو لاتا ہے تو البا ہسپانوی زبان میں اسے "کتیا" کہتی ہے۔ پرنیاں کو البا کی حرکات ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

صوفیہ پروم نائٹ پر کارل میکارتھی کی ساتھی بننے کی پیش کش قبول کر لیتی ہے۔ جو کے لیے ڈریس تک وہ کارل کے پیسوں سے خریدتی ہے۔ کارل اس پر تلملانے کے علاوہ کچھ نہیں کر پاتا۔ کارل صوفیہ کے ساتھ چند لمحات قربت میں بتانا چاہتا ہے جس کے لیے وہ صوفیہ کو اضافی رقم دیتا ہے۔ صوفیہ اس پیش کش کا جواب بھی مثبت دیتی ہے۔ کارل اپنے دوست کے ساتھ مل کر صوفیہ کی نازیبا ویڈیو بنانا چاہتا ہے تاکہ صوفیہ کو بلیک میل کر سکے۔

عمر کو اس کی ماں حکیم بیگم سے واپس مانگنے اٹھارہ سال بعد آجاتی ہے۔ لامحالہ حکیم بیگم کو عمر کو لوٹانا ہی پڑتا ہے۔ عمر کی ماں (آپا) عیسائی ہے اور ایک مقامی اسکول میں ٹیچر ہے۔ وہ شدومد سے عمر کو عیسائی بنانے کی کوششیں کرتی ہے لیکن عمر دین اسلام سے اپنا قلبی تعلق ختم نہیں کرتا۔ وہ ہر پل حکیم بیگم کو یاد کرتا رہتا ہے۔ آپا عمر کو اس کے حال پر چھوڑ دیتی ہے۔ آپا کے لیے شوکت صاحب کا التفات عمر کو ناگوار گزرتا ہے جو ان کے اسکول کا پرنسپل بھی ہے آپا اسے غیر ضروری ڈھیل دیتی ہیں جو عمر کو گراں گزرتی ہے۔ لیکن وہ بظاہر اس کا اظہار نہیں کرتا۔

آپا نازیبا فلمیں خریدنے کے لیے مارکیٹ جاتی ہے تو عمر شرم سے گڑ کر رہ جاتا ہے۔ اس کی رائے ماں کے کردار کے متعلق — خراب ہو جاتی ہے۔

پروم نائٹ پر رقص کے دوران اچانک گرانٹ پہنچ کر کارل کا منصوبہ خاک میں ملا دیتا ہے۔ گرانٹ صوفیہ کو مارتے پیٹتے ہوئے گھر لے جاتا ہے۔ اس بے عزتی پر وہ کسی سے نظریں ملا نہیں پاتی۔

لولی گرانٹ [illegible] کو لاش کی بے حرمتی پر گرفتار کر لیا جاتا ہے تو وہ خوف کے مارے سچ اگلنے کو تیار ہو جاتا ہے جسے سن کر سب کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

احمد باہر نکلتا ہے تو اسے پولیس پکڑ لیتی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسے ابراہیم کے قتل پر پولیس نے پکڑا ہے جبکہ اسے مسز [illegible] کی شکایت پر پکڑا گیا ہے۔ پکڑے جانے پر احمد بھاگنے کی کوشش میں کانسٹیبل کو قتل کر دیتا ہے۔ عدالت اس قتل پر اسے سات سال قید سناتی ہے اس دوران اسے خدا ٹوٹ کر یاد آتا ہے۔ ساتھ ہی ابراہیم کے ساتھ کیے سلوک پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔

پرنیاں گرانٹ کے عشق میں ڈوب چکی ہے۔ اسی اثناء میں اس پر انکشاف ہوتا ہے کہ گرانٹ نیوڈ ماڈلنگ کرتا ہے۔ یہ بات اسے ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ تب بھی وہ گرانٹ سے بے اعتنائی نہیں برتتی۔ گرانٹ اس سے محبت کا اظہار کرتے ہوئے پروپوز کر دیتا ہے۔ ساتھ یہ انکشاف بھی کرتا ہے کہ احمد گرانٹ اس کا اسکرین نیم ہے اس کا اصل نام احمد ابراہیم ہے۔ وہ مسلمان ہے یہ چیز پرنیاں کو ساکت کر دیتی ہے۔ وہ احمد کو بتا دیتی ہے کہ وہ اپنا مذہب تبدیل نہیں کرے گی اس لیے احمد اس سے شادی کا ارادہ دل سے نکال دے۔

ہالی وڈ میں حالات احمد کو بری طرح پسپا کرتے ہیں۔ اسے تھرڈ کلاس جگہ پر رہائش اختیار کرنا پڑتی ہے۔ تمام بڑی ایجنٹ کمپنیاں اسے بری طرح ریجیکٹ کرتے ہوئے mocking bird (نقال پرندہ) قرار دیتی ہیں۔ وہ اپنے مالک مکان سے کسی جاب کی بات کرتا ہے۔ سب ادارے احمد کو ایکسٹرا کا کردار قبول کرنے کا مشورہ دیتے ہیں جو اسے قبول نہیں ہے۔ ایک ادارے کا اشتہار پڑھ کر احمد آڈیشن دینے جاتا ہے۔

حکیم بیگم کی دعائیں رنگ لاتی ہیں اور شادی کے 20 سال بعد آمنہ کے یہاں اولاد کی خوش خبری سننے کو ملتی ہے۔ لڑکا اسے صرف حکیم بیگم کی مستقل تلقین قرار دیتا ہے۔ حکیم بیگم کے داماد یوسف اسے پڑھائی کے لیے امریکہ بلوانے کا کہتے ہیں تو وہ انہیں اپنی رضامندی دیتا ہے۔

پرنیاں کو اطلاع ملتی ہے کہ پاکستان میں اس کے والد آزرک کی طبیعت بے حد ناساز ہے اور اسے جلد پاکستان جانا ہوگا۔ آناً فاناً پرنیاں اور داؤد کا رشتہ طے کر دیا جاتا ہے۔ جس پر پرنیاں گم صم رہ جاتی ہے۔ وہ داؤد سے کہتی ہے کہ وہ رشتے سے انکار کر دے۔ داؤد اس سے وجہ پوچھتا ہے تو وہ اسے سچ بتا دیتی ہے۔ وہ پرنیاں کی بات ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔ پرنیاں دل

کے ہاتھوں مجبور ہو کر مسلمان ہونے کے باوجود احمد اسے شادی کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ احمد کو "ایشیائی ہونے" کی بنیاد پر بری طرح مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اسے ایک بار میں ذلت آمیز نوکری کرنا پڑتی ہے۔ رائن کے گھر میں رہائش اس کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ ایک حادثہ احمد کی ملاقات البا سے کرواتا ہے۔ جو اس کے یک طرفہ عشق میں مبتلا ہے۔ ناپسندیدگی کے باوجود وہ البا سے قطع تعلق نہیں کرتا۔ اسے البا کی حرکتیں بعض مرتبہ مشکوک بھی کرتی ہیں۔ البا احمد کی ایک نظر التفات کے لیے اپنی بھانجی صوفیہ کو گھر چھوڑ آتی ہے۔ ایک ہی کلاس فلم میں احمد کو ایک لائن کا کردار ملتا ہے تو وہ اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھتا ہے۔ وہ اس اطالوی جملے کی ریہرسل کے لیے پارک میں ہر لڑکی کو gloxinia کا پھول پیش کرتا ہے۔ وہیں اس کی ریٖنیاں آزک سے ملاقات ہوتی ہے۔ اس کی خوب صورتی احمد کو متاثر کرتی ہے۔

رائن اپنے سامان سمیت بغیر بتائے اپارٹمنٹ سے غائب ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی احمد گرانٹ کی جمع کی گئی رقم بھی لے جاتا ہے۔ مالک مکان سے اسے سننے کو ملتا ہے کہ چھ مہینے سے اس نے کرایہ نہیں دیا۔ یہ صورت حال اسے چکرا کر رکھ دیتی ہے۔ البا اسے ایک غیر معروف میگزین کے فوٹوگرافر سے ملواتی ہے۔ جو اسے نیوڈ ماڈلنگ کی پیش کش کرتا ہے۔ وہ اس پیش کش کو مسترد کرتے ہوئے البا سے بھی شدید ناراض ہو جاتا ہے۔ لیکن پے در پے ناکامیوں اور بار سے نوکری ختم ہونے پر اسے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ پیش کش قبول کرنا پڑتی ہے۔ اس دوران ریٖنیاں اس سے دوبارہ رابطہ کرتی ہے تو اس کی دل کی کلی کھل اٹھتی ہے۔ البا کو کسی کا بھی گرانٹ کے قریب آنا پسند نہیں ہے۔ رامین اپنی گرل فرینڈ کی بے وفائی کے بعد دوبارہ اپارٹمنٹ لوٹ آتا ہے اور کہتا ہے کہ جلد ہی وہ سالومن سوریل کی فلم میں ایکسٹرا کے کردار اسے اور البا کو دلوا دے گا۔ فلم میں چھوٹا سا کردار ہی اسے بہت اہم محسوس ہوتا ہے۔ رائن سب کے سامنے یہ انکشاف کرتا ہے کہ البا نیوڈ ماڈل ہے۔ جس پر اسے فلم سے نکال دیا جاتا ہے۔ سوریل اپنی کاسٹ میں کسی بدنام اداکار کو رکھنا توہین سمجھتا ہے۔ اس کے کچھ دنوں بعد ہی رائن کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے وہ کچھ مہینوں کے لیے اسپتال میں رہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک چھوٹے سے واقعے سے احمد گرانٹ سالومن کی نظر میں آ جاتا ہے اور اسے ایک ہجول پر مبنی فلم میں اہم کردار مل جاتا ہے۔ احمد گرانٹ کو اپنی خوش بختی کا یقین نہیں آتا۔

ریٖنیاں اور احمد فوری طور پر شادی کر لیتے ہیں۔ ریٖنیاں اس وقت محبت کے علاوہ کچھ نہیں سوچنا چاہتی۔ اس کے لیے احمد کے ساتھ گزارے لمحات زندگی کا حاصل ہیں۔ وہ گرانٹ کو اپنا پاکستان کا مکمل پتہ اور فون نمبر دیتی ہے۔ یہ احمد اسے آزک کی خرابی صحت کا صحیح طور سے پتا چلتا ہے۔ وہ مرنے سے پہلے ریٖنیاں کو دلہن بنا دیکھنا چاہتا ہے۔ ریٖنیاں کو حالات کی سنگینی کا احساس ہوتا ہے اور وہ احمد گرانٹ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن ہر بار اسے ناکامی ہوتی ہے وہ آفس رنگ کشتین پر اس کے نام پیغام بھی چھوڑتی ہے اور اسے رابطے کے لیے دو دن کی مہلت دیتی ہے۔

احمد گرانٹ ریٖنیاں سے رابطہ کر کے اسے ــــ تسلیاں دے کر فون رکھ دیتا ہے۔ ریٖنیاں ایک مرتبہ پھر اس کی باتوں میں آ کر اعتبار کر بیٹھتی ہے، لیکن انتظار، انتظار ہی رہتا ہے۔ وہ اپنی ماں ڈینس کو اپنی شادی کا بتاتی ہے تو وہ اسے تسلیم کرنے سے ہی انکاری ہو جاتی ہے۔ اس کی نظر میں مسلمان سے شادی کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ اسے خدا کا واسطہ دے کر داؤد سے شادی کا کہتی ہے۔ وہ اپنی ماں کو یہ بتا نہیں پائی کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ ریٖنیاں ان حالات میں گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرتی ہے۔

تایا عمر کو بھی دورے پر شوکت صاحب کے ساتھ اسلام آباد جانے کا بتاتی ہے تو وہ ساتھ چلنے کو کہتا ہے۔ وہ عمر کو لے جانے سے صاف منع کر دیتی ہے۔ جس پر عمر ششدر رہ جاتا ہے۔ اس کا اکیلے شوکت صاحب کے ساتھ اتنی دور جانا اسے ناگوار گزرتا ہے۔ عمر کو سردی سے بخار ہو جاتا ہے۔ مینی چادر کی تلاش کے دوران اسے تایا کے صندوق سے ایکس ریٹڈ فلموں کی کیسٹس، پورنوگرافک میگزین کے ساتھ ہی ایک خط بھی ملتا ہے، جسے پڑھ کر عمر کی رائے ماں کے متعلق مزید خراب ہو جاتی ہے، وہ ماں سے اصل حقیقت جاننے کا فیصلہ کرتا ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

ساتویں قسط

آسمان کی کوکھ سے اجالے کا جنم ہوئے ابھی زیادہ دیر نہ بیتا تھا۔ مکانوں کی کھڑکیاں نیند بھری آنکھیں تھیں، جو اب تک مندی ہوئی تھیں۔ ان بند آنکھوں کے پیچھے مکین اب تک بستروں کے گداز میں دھنسے ہوئے تھے۔ سرمئی سنگریزوں سے تعمیر سڑک ابھی انسانی قدموں اور گاڑیوں کے پہیوں کی آہٹوں سے دامن بچائے سکوت میں ڈوبی تھی۔ جو اسے بہت کم میسر آئے تھے۔ وہ کسی بے عکس سرمئی قالین کی طرح بچھی تھی۔ اور ان خوابیدہ گھڑیوں میں سبک لیا کے فلک بوس پیڑ تلے راکنڈ سے چلنے والا ایک بوڑھا شخص سر جھکائے کھڑا کسی سوچ میں گم تھا۔ حقیقت میں اس کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ ظاہری حالت کی بنا پر اندازہ لگایا جاتا تو وہ ستر اسی سال کا بھی نظر آ سکتا تھا۔

وقت سب پر ایک طرز پر نہیں برتتا۔ کسی کو تو وہ ہتھیلی پر بٹھا کر منزلوں منازل طے کرا دیتا ہے اور کچھ کو وہ اپنے قدموں کے روندتا ہوا زندگی کی شاہراہ پر گھسیٹتا ہوا لے جاتا ہے۔

وقت نے اسے پامال کیا تھا اور جی بھر کر کیا تھا۔ اس کی کھال پر جھریوں کی تعداد تو اتنی زیادہ نہیں تھی مگر چمگادڑ کے مہیب پروں جیسے سائے جن کی تاریکی نے اس کی آنکھوں اور چہرے کو دھندلا رکھا تھا، اسے بے حد بوڑھا دکھاتے تھے۔

اس کا نام ایڈم گرانٹ تھا اور غنیمت تھا کہ اس وقت اسے اپنا نام یاد تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے وہ بہت سی چیزیں بھولنے لگا تھا۔ جیسے گزشتہ روز یا شاید اس سے پچھلے دن وہ اپنا گھر بھول گیا تھا اور کئی گھنٹے فٹ پاتھ پر کھڑا راہ گیروں اور گزرتی ہوئی گاڑیوں کو امید بھری نظروں سے دیکھتا رہا تھا کہ شاید کوئی شناسا چہرہ دکھائی دے جائے تو اس سے معلوم کرے کہ اس کا گھر کہاں ہے؟ وہ گھر جس میں وہ پچھلے انیس، بیس سالوں سے رہتا آ رہا تھا۔ اس کا پتا اسے کیسے بھول گیا تھا؟ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو اس کی بے بسی اور خوف آخری حد سے تجاوز کرنے لگے۔ وہ ایک ہی جگہ پر ٹھہرا انسونی کی دہشت سے کانپ رہا تھا۔ وہ اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس ڈر سے کہ کسی بالکل ہی اجنبی علاقے میں نہ جا نکلے۔

اپنے قیام کی جگہ کے بارے میں کم از کم اسے اتنا یقین ضرور تھا کہ وہ پہلے بھی وہاں آتا رہا تھا۔ وہ راستہ اور گردو پیش کے مناظر اسے دیکھے بھالے محسوس ہوئے تھے۔

اس نے ایک، دو لوگوں کو روک کر ان سے دریافت کرنے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن وہ شاید اسے پاگل سمجھے تھے، تب ہی کوئی توجہ دیے بنا چلے گئے تھے۔ اس نے ایک جانے پہچانے مکان کے دروازے پر دستک بھی دی تھی، مگر دس منٹ تک کال بیل بجانے کے بعد اس کا دھیان اس تشہیری بورڈ کی جانب مبذول ہوا، جس پر لکھا تھا کہ وہ مکان برائے فروخت تھا۔ وہ واپس اسی جگہ جا کر فٹ پاتھ پر کھڑا ہو گیا تھا اور قریب تھا کہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا کہ اس کی نگاہ بائیک چلاتے ہوئے ایک نوجوان لڑکے پر پڑی۔ اس نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا۔ جس سے اس کے چہرے کا بیشتر حصہ چھپا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود گرانٹ نے اس کے گزر جانے سے قبل اسے پہچان لیا تھا۔ وہ مارک تھا جو اس کے گھر سے چند گلیاں چھوڑ کر رہائش پذیر تھا اور کبھی کبھار سر راہ ان کے درمیان چھوٹے موٹے رسمی فقروں کا تبادلہ ہو جایا کرتا تھا۔ گرانٹ نے چیخ کر اسے رکنے پر مجبور کیا اور اس کے قریب جاتے ہوئے آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔

"مجھے یاد نہیں آ رہا کہ میں کہاں رہتا ہوں، مجھے میرے گھر پہنچا دو۔"

مارک نے پہلے تو اس کی بات کو مذاق سمجھا تھا، پھر اس کی بے چارگی کو محسوس کر کے سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں، لیکن اپنے سیل فون پر کسی سے رابطہ تو کر سکتے تھے، کیا تم اسے بھی کہیں بھول آئے ہو؟"

مارک کے کہنے پر گرانٹ کو جھٹکا لگا تھا۔ یہ تو بالکل سامنے کی بات تھی۔ اس کا سیل فون اس کی جیب میں موجود تھا، لیکن ایک بار بھی اسے اس کا خیال نہیں آیا تھا اور بھی طریقے تھے جن سے وہ با آسانی اپنا گھر

ڈھونڈ سکتا تھا۔ اس کی شناخت کے کاغذات اس کے پاس تھے۔ ان پر لکھا ہوا اب وہ پڑھ سکتا تھا اور اگر کاغذات نہ بھی ہوتے تو وہ کسی پولیس والے کو اپنا نام' تاریخ پیدائش اور سوشل سیکورٹی نمبر وغیرہ بتا کر یہ مسئلہ حل کر سکتا تھا۔ لیکن یہ سب اسے اب سجھائی دے رہا تھا۔ جب اس کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔

نہ جانے اسے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ اس سے کچھ روز پہلے کا قصہ تھا کہ وہ فلم کے سیٹ پر کچھ بھول گیا تھا۔ جس کی وجہ سے اسے بہت تذلیل کا سامنا کرنا پڑا تھا" لیکن وہ کیا بھولا تھا؟ اب اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ ایک ایکسٹرا تھا۔ ڈیڑھ' دو گھنٹے دورانیے کی فلم میں لمحہ بھر یا اس سے کچھ زیادہ وقت کے لیے کیمرے کی آنکھ اسے پردے پر مرتسم کر دیتی تھی۔ کبھی کانفرنس میز پر بیٹھا ہوا ایک ڈائریکٹر کبھی آفس کی لابی پار کرتا ہوا ایک بزنس مین یا فلم کے کسی ایکٹر کے پیچھے جہاز سے اترتا ہوا مسافر۔ کبھی وہ فٹ بال اسٹیڈیم میں ہونے والی گریجویشن کی تقریب میں شریک سو لوگوں میں سے ایک ہوتا تو کبھی تھیٹر میں بیٹھے ہوئے پانچ سو سے زائد لوگوں کے مجمع میں نظر آتا اور بعض اوقات تو نظر ہی نہیں آتا تھا۔

وہ کئی سالوں سے ہالی ووڈ میں اسی حیثیت سے کام کرتا آ رہا تھا۔ اسی غیر مستقل آمدنی پر اس کی گزر اوقات ہو رہی تھی۔ وہ اس کام سے متنفر تھا' مگر اسے کیے چلے جانے پر مجبور تھا۔

جب وہ اسپرنگ فیلڈ سے ہالی ووڈ آیا تھا تو اس کی آنکھیں خوابوں سے بھری تھیں اور بدن کمان کی تانت سا تنا ہوا تھا۔ اب اتنے سال لاحاصل جدوجہد کی نذر کرنے کے بعد اس کے جسم کے کسی عضو میں موزونیت باقی نہ رہی تھی اور بینائی دھندلانے لگی تھی۔ وہ آئینہ دیکھنے سے حتی المقدور گریز کرتا تھا اور جو شخص آئینہ دیکھنے سے کتراتا ہو' وہ خواب نہیں دیکھ سکتا۔ اس کی نیندوں میں کابوس ہوتے تھے۔ یہ گرانٹ کی زندگی بھی ایک غیر مختتم ڈراؤنا خواب تھی۔

میگنولیا کی شاخ سے جدا ہو کر ایک بڑا سفید پھول پٹ سے سڑک پر گرا جیسے کوئی تارا آسمان سے ٹوٹا ہو۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ سورج کی اولین کرنیں درختوں کی اوپری شاخوں کو نرمی سے چوم رہی تھیں اور پتوں میں سے چھن کر آتی روشنی سفید اور ٹھنڈی تھی۔ وہ ایک بے حد اجلی صبح تھی۔ عموماً اس وقت وہ سو رہا ہوتا تھا۔ آج جانے کیسے اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اپنے کمرے کی گھٹن زدہ فضا سے گھبرا کر باہر سڑک پر نکل آیا تھا۔ روشنی اب درختوں کے تنوں سے نیچے رینگ رہی تھی اور اس کے شکن آلود لباس پر روشنی کی آڑی ترچھی لکیریں بننے مٹنے لگی تھیں۔ اس نے گردن اٹھا کر میگنولیا کی اونچی ڈالیوں پر کھلے ہوئے دودھیا سفید شگوفوں اور ان پر اترتے ہوئے ملائم اجالے کو دیکھا۔ اسے بڑی شدت سے کوئی یاد آیا تھا۔ اس صبح اور اس لڑکی میں بھی ایسی ہی مماثلت تھی۔ اس کا تن بھی اس صبح کی طرح اجلا تھا۔ وہ چاند کے نور سے بنی ہوئی مورت تھی۔ کاش وہ اسے بھی بھول گیا ہوتا' جیسے وہ کئی دوسری باتیں بھول جاتا تھا۔ لیکن وہ تو آنکھ میں پڑ جانے والا ریت کا ذرہ تھی۔ جو نکلتا نہیں اور جتنی بار آنکھ ملو پہلے سے بڑھ کر تکلیف دہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جو بے چین رکھتا ہے۔ اس کا خیال آنے پر گرانٹ کے اندر ایک ٹیس اٹھتی اور کاٹتی ہوئی سارے بدن میں پھیل گئی۔

وہ بوجھل قدموں سے چل کر اپنے گھر میں لوٹ آیا تھا۔ اسے اس لڑکی کے نام خط لکھنا تھا۔ وہ کئی سالوں سے خطوط لکھتا آ رہا تھا۔ اسے کسی ایک خط کا بھی جواب نہیں ملا تھا اور شاید کوئی ایک خط بھی اس تک پہنچا ہی نہیں لیکن اس کے باوجود وہ رکے بغیر' اکتائے بغیر خط لکھے چلا جاتا تھا۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے رائٹنگ ٹیبل کی اوپر والی دراز باہر کھینچی' لیٹر پیڈ' قلم اور ایک ضخیم لغت نکالی اور خاصی دیر سوچتے رہنے کے بعد خط کا آغاز کیا۔ اس نے ذہن میں جو فقرہ منتخب کیا تھا اس کے ایک' ایک لفظ کا ترجمہ لغت میں تلاش کرنے اور اسے کاغذ پر منتقل کرنے میں اسے کم و بیش دس منٹ لگ گئے تھے۔

خط کو وہ۔ جس زبان میں تحریر کر رہا تھا' کئی سالوں کی مشق کے بعد بھی وہ اسے روانی سے لکھنے پر قادر نہیں ہو پایا تھا۔

لغت کے اوراق کو بے بسی سے الٹتے پلٹتے ہوئے اسے اپنی دائیں بغل میں درد کا احساس ہوا۔ قمیص کے اوپر کی دو بٹن کھول کر اس نے بازو اٹھاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے بغل کی جلد کو سہلایا اور ایک ابھری ہوئی جگہ کو انگلیوں سے دبایا۔ جلتے ہوئے درد نے اس کے اعصاب کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

اس نے قمیص کے بٹن بند کیے اور ایک کورا کاغذ لے کر خط کو [illegible] لکھنے لگا۔ ایسے ہی گھناؤنے چھالے اس کے جسم کے کئی حصوں پر تیزی سے نمودار ہو رہے تھے۔ اس کا ایک دوست جس سے اس کی ملاقات ہوئے دو تین سال بیت چکے تھے' بے حد اچھا ڈاکٹر تھا اور گرانٹ سوچ رہا تھا کہ آج شام وہ اس سے ملنے ضرور جائے گا۔ بھول جانے کے ڈر سے اس نے ایک نوٹ لکھا اور میز پر رکھ دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ خط مکمل کرنے کے بعد وہ اسے کمرے کے دروازے پر چسپاں کر دے گا' تاکہ نظر پڑنے پر یاد دہانی ہو جائے۔ پھر وہ لکھنے میں مگن ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد اس نے اختتامی جملہ تحریر کیا اور کاغذ کو تہہ کر کے دراز میں رکھتے ہوئے دراز بند کر دی۔ ابھی اسے خط میں رکھنے کے لیے کوئی پھول بھی چننا تھا۔

میز کے کنارے پر ایک اور کاغذ بھی دھرا تھا جس میں کسی ڈاکٹر کا نام لکھا تھا۔ اور نیچے ایک مختصر جملہ تھا۔ "آج شام کو ملنا ہے" وہ اس کی اپنی تحریر تھی۔ لیکن اس نے کب لکھا تھا اور لکھنے کا مقصد کیا تھا۔ ذہن پر بہت زور دینے کے بعد بھی اسے یاد نہ آ سکا۔ تنگ آ کر اس نے وہ کاغذ بھی ایک طرف اچھال دیا۔

اسے ساتھ والے کمرے سے آہٹ سنائی دی۔ اس نے باتھ روم کا دروازہ کھول کر کمرے میں جھانکا۔ وہ جاگ چکی تھی اور بستر کے کنارے آنکھیں موندے بیٹھی جھول رہی تھی۔ شاید اسے باتھ روم میں جانا تھا اور وہ اس کے نکلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اس گھر کی دوسری مکین تھی۔ اس کی ماں ایک بے حد غلیظ اور گھناؤنے کردار کی مالک عورت تھی۔ اس کے گناہوں سے نکل کر گرانٹ کا دھیان اس کی بیٹی کی جانب منتقل ہو گیا تھا۔ گناہ کی گندگی میں لت پت عورت کی بچی کو وہ گناہ سے باز رکھنے میں کامیاب ہو جائے تو خدا کی ناراضی کم ہو سکتی تھی۔

گرانٹ سے کئی غلطیاں سرزد ہوئی تھیں اور خدا کا غضب اس کی پشت پر تھا۔ وہ لڑکی اس کے گناہوں کا کفارہ بننے والی تھی۔ اسے عذاب سے نجات دلانے والی تھی۔ اس کی پرورش کرتے ہوئے گرانٹ نے اس پر ہر طرح کی سختی کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اس سے نفرت کرتی تھی۔ وہ اس کی نفرت' برداشت کر سکتا تھا۔ مگر خدا کی ناراضی برداشت کرنا اس کے بس میں کہاں تھا؟ اچھا ہی ہوا تھا جو اس کی ماں مر گئی تھی۔ اگر وہ عورت اب تک اپنی بچی کے ساتھ ہوتی تو یقیناً" اسے گناہ کی راہ پر دھکیل چکی ہوتی۔

گرانٹ نے اسے نیند میں جھکولے کھاتے دیکھا اور کہنا چاہا کہ باتھ روم فارغ ہے۔ تم اب اسے استعمال کر سکتی ہو۔ مگر ایک ایسی بات ہوئی کہ اس کی آواز ہی نہ نکل سکی۔ وہ اس لڑکی کا نام بھول گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگر گھر چھوڑنے سے پہلے اسے کچھ پیش بندی کرنے کا موقع ملا ہوتا تو شاید وہ اتنی خوف زدہ نہ ہوتی۔ جس عجلت میں اس سے یہ عمل سرزد ہوا تھا' اس کی بوکھلاہٹ کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ آخر وقت تک وہ آنکھیں بند کیے یہ ہی سوچتی رہی کہ کسی بھی لمحے گرانٹ آ پہنچے گا اور سب درست ہو جائے گا۔ اسی بدحواسی کا نتیجہ تھا کہ گھر سے باہر رکھے گئے اولین قدم پر ہی وہ پچھتانے لگی۔ اسے خبر نہ تھی کہ گرانٹ سے رابطہ جڑنے میں کتنی مدت لگ جائے گی۔ یہ عرصہ گزارنے کے لیے اسے رقم کی ضرورت تھی۔ اس کے پاس جو نقدی تھی' وہ بمشکل چند دن چل سکتی تھی۔ زیورات یا دوسری قیمتی اشیاء کی جانب ہاتھ

بڑھاتے ہوئے اسے ایسی شرم آئی تھی کہ وہ اس ارادے پر عمل نہ کر پائی، حالانکہ سب سے زیادہ شرمناک کام تو وہ کر گزری تھی۔ اس کے اکاؤنٹ میں جتنی بھی رقم پڑی تھی، وہ چند روز قبل ونیس نے شادی کے اخراجات کے لیے نکلوالی تھی۔ اور اس وقت وہ تقریباً "خالی ہاتھ" تھی۔

اپنے سامان میں سے اسے اپنا پاسپورٹ نہیں ملا تھا۔ جانے وہ بے دھیانی میں کہیں آگے پیچھے ہو گیا تھا یا کسی نے جان بوجھ کر نکال لیا تھا۔ اور اگر وہ "ارادتاً" نکالا گیا تھا تو ونیس کے سوا ایسا کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ پرنیاں کے علاوہ الماری کی چابی صرف ونیس کے پاس تھی۔ شاید اس کے دل میں پہلے ہی یہ خدشہ موجود ہو کہ اس کی بیٹی گھر سے جانے کی کوشش کرے گی۔ اگر وہ پہلے سے ایسا سوچ رہی تھی تو اب اپنے خدشات کو سچ ہوتا پا کر اس پر کیا گزری ہوگی۔ اس وقت وہ رو رہی ہوگی مگر آواز کو اونچا ہونے سے روکتی ہوگی، اس ڈر سے کہ گھر کا کوئی اور فرد نہ سن پائے اور جب آرزک اپنے بستر سے پکارے گا۔

"پرنیاں کہاں ہے؟ اب تک میرے پاس کیوں نہیں آئی تو اور کوئی۔" وہ ایک بار رونا شروع کرتا تو کئی گھنٹے روتا ہی چلا جاتا تھا، کسی حیلے سے بہلتا ہی نہ تھا۔ اسے کون سمجھائے گا کہ پرنیاں اچانک کہاں چلی گئی تھی۔ وہ اس کی شادی کے لیے بننے والے ملبوسات دیکھ کر کتنا خوش ہوتا تھا اور جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ داؤد متوقع دولہا تھا تو داؤد کے سامنے آنے پر بے طرح گھبرا جاتا اور چھپنے کو کونے کھدرے تلاشنے لگتا تھا۔ اور داؤد وہ کیا محسوس کر رہا ہوگا؟

قریب سے گزرتی عورت کی حیران نظروں کو خود پر جمے پا کر پرنیاں کو احساس ہوا کہ وہ بلند آواز میں خود کلامی کر رہی تھی۔ اس نے عورت کو رکنے کا کہا اور اس سے اس مکان کی بابت معلوم کیا جو وہ پچھلے ایک گھنٹے سے ان گلیوں میں ڈھونڈ رہی تھی۔ اس سے قبل وہ دو اور لوگوں سے پتا پوچھ چکی تھی۔ اس بار اسے کامیابی ہوئی۔ اس عورت نے گلی کے موڑ کی جانب انگلی سیدھی کی۔

"وہ ہرے دروازے والا آخری مکان، وہاں رہتے ہیں قربان صاحب۔"

"قربان صاحب؟" وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ رک گئی۔ اسے بروقت خیال آیا تھا کہ مریم کے والد صاحب کا نام قربان ہی تھا۔

"جی اچھا، شکریہ۔" وہ تیز قدموں سے گلی پار کر گئی۔

مریم اسکول کے ابتدائی دور سے اس کی دوست تھی۔ میٹرک تک وہ دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھی تھیں اور اس تمام عرصے میں شاید ہی کوئی دن ایسا آیا ہو جب وہ اکٹھی نہ دیکھی گئی ہوں۔ اسکول کے بعد بھی ان کے درمیان خط و کتابت کے ذریعے ربط جاری رہا تھا۔ چند ماہ پہلے جب پرنیاں تعلیم کے سلسلے میں امریکہ جانے لگی تو اس نے مریم کے نام خط لکھا تھا، جس میں لاس اینجلس والا پتا بھی بھیجا تھا۔ مگر مریم کا کوئی جوابی خط اسے امریکہ میں نہیں ملا۔ واپس آنے پر اسے معلوم ہوا کہ مریم کے دونوں بھائیوں کو کسی جاننے والے کے توسط سے دوسرے شہر میں ملازمت مل گئی تھی۔ جس کے باعث انہیں گھر تبدیل کرنا پڑا۔ نئے پتے سے مریم نے اسے چند خطوط بھی ارسال کیے تھے۔ جو ونیس نے بنا کھولے رکھ چھوڑے تھے۔ ان ہی خطوط سے پرنیاں کو مریم کے گھر والوں کی دوسرے شہر منتقلی کے متعلق معلوم ہوا تھا اور گھر سے نکلتے ہوئے اس کے ذہن میں جو واحد نام آیا تھا وہ مریم کا تھا۔

ہرے رنگ والا اونچا دروازہ کھلا تھا۔ وہ بنا دستک دیے اندر چلی گئی۔ رات بھر برسنے والی بارش نے صحن کی [illegible] اینٹوں کو دھو کر نکھار دیا تھا اور چھت کے جالی دار پردے سے جھانکتی سرمئی زرد دھوپ کے تکونے ٹکڑے فرش پر ترتیب سے دھرے تھے۔ اس کے جوتوں پر لگی کیچڑ جو سوکھ کر بھربھری ہو گئی تھی، گیلے فرش پر بدنما نشان چھوڑ رہی تھی۔ برآمدے میں کھلنے والے دروازے سے مریم باہر آئی۔ وہ آٹا گوندھتے ہوئے اٹھ کر آئی تھی۔

"ہائے اللہ پرنیاں! تم، تم کیسے آگئیں یہاں؟ مجھے یقین نہیں آرہا۔ میرے خطوں کا جواب بھی تو نہیں دیا تم نے۔ نہ خیر نہ خبر۔ بڑے دنوں سے صحن پر کوا بول رہا تھا۔ دل کہتا تھا کوئی مہمان آنے والا ہے۔ پر تم آؤ گی، میرے وہم و گمان میں نہیں تھا۔"

اس نے آگے بڑھ کر بھرے ہاتھوں پرنیاں کے [illegible] سے گزار کر گلے سے لپٹایا اور بلند آواز میں [illegible] لگا، پھر جھک کر پیچھے ہٹی اور اس کا [illegible]

"تم اکیلی آئی ہو؟"

"ہاں۔" پرنیاں نے کندھے سے لٹکا بیگ جس کے بوجھ سے اس کا بازو شل ہو گیا تھا، اتار کر فرش پر رکھ دیا۔

"تمہیں [illegible] تم اکیلی کیسے آسکتی ہو۔ مطلب؟"

"میں اکیلی ہی آئی ہوں۔"

"وہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ اکیلی کیسے آگئیں، کوئی ساتھ کیوں نہیں آیا؟"

"میں کسی کو بتا کر نہیں آئی۔ میں گھر سے چوری چھپے نکلی ہوں۔"

مریم کے ہونٹ نیم وا ہوئے اور آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔

"پرنیاں! تم کیا کہہ رہی ہو؟ چوری چھپے کیوں نکلی ہو، کیا ہوا ہے؟"

پرنیاں نے بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ تلاش کرنے کی خاطر سارے صحن اور برآمدے میں نگاہ گھمائی۔ تھکن سے دکھتا ہوا جسم اسے مزید ایک لمحہ بھی کھڑے رہنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ مگر مریم کو پوری بات بتائے بغیر کہیں بیٹھ جانا شاید ممکن نہیں تھا۔ وہ نقاہت زدہ آواز میں اسے بتانے لگی تھی۔

مریم کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑتا جا رہا تھا، حتیٰ کہ وہ لٹھا پھیکا ہو گیا کہ صحن میں بکھری دھوپ اس کے مقابلے میں زیادہ رنگین لگنے لگی۔ پرنیاں کے خاموش ہو جانے کے بہت دیر بعد تک وہ کچھ نہیں بولی۔ اپنے ہاتھوں پر لگے آٹے کو دیکھتی رہی، پھر خاموشی سے فرش پر پھیلے ان دھبوں کو گھورنے لگی جو پرنیاں کے قدموں سے بنے تھے۔

"[illegible] کیا ہے؟ میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں، یہ سوچ کر تم میرے پاس آگئی ہو۔"

پرنیاں خاموش رہی۔ آخر اس نے سوچا ہوتا تو وہ ایسا کرتی ہی کیوں۔

"میں ایک عزت دار آدمی کی بیٹی ہوں۔ ہمیں اس محلے میں آئے ہوئے بہت کم عرصہ ہوا ہے، مگر ہم یہاں گمنام نہیں ہیں، لوگ میرے باپ کا نام عزت سے لیتے ہیں۔ جب تمہارے گھر والے تمہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچیں گے تو تم ہی بتاؤ اس کے بعد لوگ ہمیں اس محلے میں جینے دیں گے۔"

مریم پر جوں جوں پرنیاں کی آمد سے پیدا ہونے والے متوقع حالات عیاں ہو رہے تھے، اس کے اوسان خطا ہوتے جا رہے تھے۔

"وہ لوگ یہاں نہیں آئیں گے۔"

"تم کیسے کہہ سکتی ہو وہ یہاں نہیں آئیں گے۔ وہ سب سے پہلے یہیں آئیں گے اور ممکن ہے کچھ ہی دیر میں پہنچنے والے ہوں۔" مریم نے بلا ارادہ بیرونی دروازے کی سمت دیکھا تھا۔

"انہیں یہاں کا پتا معلوم نہیں ہے۔ وہ مجھے نہیں ڈھونڈ پائیں گے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو تم، میں نے تمہیں اسی پتے سے خط بھجوائے۔ تم تو امریکہ میں تھیں، وہ خط تمہاری ممی نے ہی وصول کیے ہوں گے۔"

"لیکن انہوں نے وہ خطوط دیکھے بغیر ہی سنبھال لیے تھے۔ پتے وغیرہ کی طرف انہوں نے بالکل دھیان نہیں دیا ہوگا اور میں وہ خط ساتھ ہی لے آئی ہوں۔"

پرنیاں نے بوجھل جوتوں میں پیروں کے پنجوں کو بے چینی سے حرکت دی۔ اس کے پیروں میں اتنا درد تھا کہ وہ ان کے علاوہ کچھ بھی اور سوچ نہیں پا رہی تھی۔

"یہ بس تمہارا قیاس ہے اور اگر یہ درست بھی ہے

تو وہ تمہارے پرانے گھر سے چار معلوم کر سکتے ہیں۔ یہ گھر ڈھونڈنا ان کے لیے کوئی مشکل نہیں ہوگا۔"

"وہ تمہارے پرانے گھر کے بارے میں کب جانتے ہیں۔ وہاں تو میں بھی کبھی نہیں آئی۔ امی ابو کو تو تمہارے متعلق یاد تک نہیں ہوگا۔ میرے پیچھے یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

مریم جو کچھ کہنے کے لیے منہ کھول رہی تھی' چند لمحے سوچ میں ڈوب گئی۔ ان کے ہاتھوں پر لگا آٹا نیم خشک ہو کر جھڑنے لگا تھا۔

"مریم! میں بیٹھنا چاہتی ہوں' ہم اندر چل کر بیٹھ جائیں' میں بہت تھک گئی ہوں۔"

"میری ایک بات مانو پرنیاں! تم واپس چلی جاؤ۔"

"کہاں واپس چلی جاؤں؟"

"اپنے گھر چلی جاؤ۔" ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر آٹے کا آمیزہ اتارتے ہوئے وہ ایک قدم آگے آئی۔

"وہ تمہارے گھر والے ہیں' وہ تمہارے سب سے بڑھ کر سگے ہیں۔ تم واپس جا کر ان سے معافی مانگ لو' وہ ناراض ہوں گے لیکن مان جائیں گے۔ تمہارے اس طرح گھر چھوڑ آنے کی وجہ سے ان کو بڑا دھچکا لگا ہوگا۔ اب اگر تم واپس چلی جاؤ تو وہ تم پر پہلے کی طرح سختی نہیں کر سکیں گے۔ تمہاری مرضی کے بغیر تمہاری شادی نہیں کریں گے۔"

پرنیاں نے بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ "میں پریگننٹ ہوں۔ میرا شوہر مسلمان ہے' کوئی ماننے والی بات ہوتی تو وہ مان بھی جاتے۔ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔"

مریم کے ہاتھوں کی جنبش رک گئی۔ "تم پریگننٹ ہو؟ یہ تم نے کیا کر دیا۔"

وہ اس درجہ ساکت تھی کہ اس کے ہاتھوں سے جھڑنے والے آٹے کے ذرات چگتی ہوئی چڑیا کو اس کے قریب آتے ہوئے ڈر نہیں لگا۔

"جو بھی ہے' تم چلی جاؤ۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں' تم واپس چلی جاؤ' وہ تمہارے ماں باپ ہیں۔ وہ تمہیں دکھ نہیں دیں گے۔ تم تو ابو اور ان سے انکل

آزر کی محبت کے قصے سنایا کرتی تھیں۔ میرا دماغ چاٹ جاتی تھیں۔ وہ محبت اب کہاں چلی گئی؟ تم انھیں ایک موقع تو دو۔ وہ تمہارے ساتھ کچھ بھی برا نہیں کریں گے۔"

پرنیاں کو لگا کہ مریم رو دے گی۔ وہ نظریں پھیر کر فرش پر بچھی کوریا کو دیکھنے لگی۔

"کسی نے کچھ برا نہیں کیا۔ غلطی میں نے کی ہے اور مجھے ہی اس کو بھگتنا ہے۔ میرا جیسے ہی اپنے شوہر سے رابطہ ہو گیا' میں تمہارے گھر سے چلی جاؤں گی لیکن تب تک میرے پاس کوئی دوسرا ٹھکانا نہیں ہے۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی تو کبھی انکار نہ کرتی مگر میں بے بس ہوں۔ میں اپنے گھر والوں کو کیا جواب دوں گی۔ انہیں کیا بتاؤں گی کہ تم کون ہو اور اچانک یہاں رہنے کیوں آ گئی ہو۔ میرے ابا اور اماں دونوں کراچی گئے ہیں بڑی آپا کے پاس۔ شکر ہے کہ اس وقت وہ گھر میں نہیں ہیں ورنہ تو... لیکن میرے بھائی شام کو فیکٹری سے لوٹیں گے۔ میں انہیں کیسے مطمئن کروں گی۔" مریم نے فوراً جواب دیا۔

"مریم! مجھ سے اب کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔ مجھے کہیں بیٹھ جانے دو' مجھے لگتا ہے میں گر جاؤں گی۔"

مریم نے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ "تمہارا شوہر تمہیں کیسے ڈھونڈے گا؟ وہ تمہیں تمہارے گھر چلا گیا اور وہاں تم نہ ملیں تو شاید وہ واپس چلا جائے۔ اسے کیسے خبر ہوگی کہ تم کہاں ہو۔"

بہت سے دوسرے سوالوں کی طرح اس سوال کا جواب بھی پرنیاں کے پاس نہیں تھا مگر وہ یہ بات مریم سے نہیں کہہ سکتی تھی۔

"نہیں۔ وہ پاکستان آیا ہی نہیں۔ کسی وجہ سے اسے رکنا پڑا ہوگا۔ میں اسے فون کروں گی۔ وہ آ کر مجھے لے جائے گا۔ مجھے زیادہ دن یہاں رکنا نہیں پڑے گا۔ کیا تمہارے گھر ٹیلی فون ہے؟"

"نہیں۔ ہمارے مالک مکان کے گھر میں ہے لیکن وہ استعمال کرنے دیں یا نہیں پتا نہیں۔ وہ مجھے

بے لوگ ہیں۔ شام کو علی آ جائے تو اس کو تمہارے ساتھ دیکھوں گی تو وہ تمہیں خون کروا لائے گا اور کسی کے سامنے یہ بات منہ سے نہ نکالنا کہ تم اکیلی آئی ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں پرنیاں' تم میری اکلوتی سہیلی ہو۔ مجھے بہت عزیز ہو' تم میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں مگر تمہیں سمجھنا چاہیے کہ میرے پاس کوئی وسیلہ نہیں ہے۔"

وہ تیز قدموں سے بیرونی دروازے تک گئی۔ "تم اندر چل کر بیٹھو' کمرے میں... میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔ برسوں سے کہہ رہی ہوں علی سے... ہو گی۔ وہ خود چائے نہیں پیتا... تم پہلی بار میرے گھر آئی ہو اور ایسے اچانک... وہی تو مجھ میں نہیں آ رہا' ساری کیا خاطر کروں۔ مجھے پتا ہوتا تو کوئی اچھی چیز ہی پکا لیتی۔ چاہے پالک کا ساگ۔ تمہیں پسند بھی ہے۔"

دروازہ بند کر کے کنڈا لگانے کے بعد وہ پلٹی تو پرنیاں نے اسے شدت سے روتے ہوئے دیکھا۔

☆ ☆ ☆

جان کنی کے کرب میں مبتلا جاڑے کی شام درد بھری آنکھوں سے سرمئی آسمان کو تکتی تھی۔ ایڑیاں رگڑتی ہوئی اس شام پر ٹھٹھری بدن والی رات جھکتی چلی آ رہی تھی۔ رات اس حد تک جھک آئی کہ اس کے بوجھ کے نیچے شام کا وجود چھپ گیا۔ رات نے جھک کر اس کے ہونٹوں پر اپنے سرد لب رکھ دیے اور ایک سانس میں اس کی روح کھینچ لی۔ اس بوسے میں شام کا بدن تحلیل ہو گیا تھا' وہ فنا ہو گئی تھی یا رات میں مدغم ہو کر امر ہو گئی۔ کوئی بھی اس بھید کو پا نہ سکا۔

پرنیاں باورچی خانے کے دروازے کی اوٹ میں گھٹنوں پر گردن گرائے پیڑھی پر بیٹھی تھی اور مریم مٹی کے تیل والے چولہے پر بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی۔ چولہے سے اٹھتے دھوئیں کی کڑواہٹ بھری بو' بھنتے ہوئے بیسن کی مہک' سرسوں کے تیل کی خوشبو سارے میں پھیلی تھی۔ مریم کے دونوں بھائی عبدالعلی اور ابوسعید اندر کمرے میں کانوں میں لیڈ لگائے ریڈیو پر خبریں سن رہے تھے۔ ریڈیو سے شور کے ساتھ نشر ہوتی آوازیں ساتھ ان دونوں کے باتیں کرنے کی غیر واضح آوازیں اس کے کانوں میں آ رہی تھیں۔

اسے مریم کے گھر آئے ہوئے ایک ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دوران اس نے جتنی بار بھی گرانٹ کے اپارٹمنٹ والے نمبر پر ٹیلی فون کیا تھا' وہاں سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا تھا۔ جانے کوئی تکنیکی خرابی تھی یا اب وہاں کوئی رہتا ہی نہیں تھا۔

اس کے قیام کی طوالت بڑھنے کے ساتھ ساتھ مریم کے اندر بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ پرنیاں اس معاملے میں اسے ہرگز قصوروار نہیں ٹھہراتی تھی۔ وہ اتنی ہی بے بس اور بے یار و مددگار تھی جتنی خود پرنیاں۔ اگر کسی کو پرنیاں کی حقیقت کی بھنک بھی پڑ جاتی تو مریم کی حیثیت کیا ہو جائے گی' یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔

اس نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا کہ پرنیاں اس کی اسکول کے زمانے کی دوست تھی' جس کی شادی کچھ عرصہ قبل اپنے خالہ زاد سے ہوئی تھی جو امریکہ میں کسی ادارے میں ملازم تھا۔ ساس' نند' جیٹھ' دیور سب وہیں مقیم تھے۔ صرف شادی کی غرض سے وہ لوگ پاکستان آئے تھے اور ارادہ تھا کہ اس کے کاغذات بن جائیں تو اسے بھی ساتھ لیتے جائیں مگر دفتری معاملات میں کسی الجھن کے سبب ایسا ہونے میں تاخیر در پیش تھی۔ ان لوگوں کو واپس پہنچنا تھا کہ پرنیاں کے میاں کی چھٹیاں ختم ہو گئی تھیں۔ اسے ساتھ لے جا نہ سکتے تھے اور میکے چھوڑ جانا یوں ممکن نہ تھا کہ میکے میں ایک اندھی نانی کے سوا کوئی تھا ہی نہیں اور وہ بھی پچھلے سال چل بسی تھیں۔

اس مسئلے کا اور کوئی حل نہ نکلا تو پرنیاں نے سمجھایا کہ اسے کچھ دن اس کی پرانی سہیلی کے ہاں رہنے دیا جائے۔ وہ برسوں سے نہیں ملی تھیں اور اب تقدیر نے خود ہی راہ نکالی تھی۔ سسرال والوں نے کچھ پس و پیش کے بعد یہ تجویز مان لی تھی اور پرنیاں کا شوہر اپنی ماں اور

بڑی بہن کے ساتھ اسے یہاں چھوڑنے آیا تھا۔ اسی رات ان لوگوں کو جہاز میں سوار ہونا تھا۔ اس لیے عبدالعلی اور ابوسعد کے لوٹ آنے تک رک نہ پائے تھے۔

اس بودی کہانی پر اس لیے اعتبار کرلیا گیا کہ مریم نے اپنی سابقہ زندگی میں گھر والوں کو کبھی دھوکا نہیں دیا تھا۔ اگر پہلے ان لوگوں نے مریم کے ہاتھوں فریب کھایا ہوتا تو شاید وہ اس کہانی کے جھول ہضم نہ کرپاتے۔

محلے سے کوئی عورت آجاتی تو مریم اسے پیش منظر سے اوجھل کردیتی اور اگر سامنا ناگزیر ہوجاتا تو خود سے کچھ بتانے کے بجائے صرف ان ہی سوالوں کے مختصر جواب دیے جاتے جن کے جواب نہ دینے سے شکوک پیدا ہونے کا احتمال ہوتا۔ ہردم یہی فکر اسے گھلاتی رہتی کہ پرنیاں کی اصلیت ظاہر ہوگئی تو کیا ہوگا۔ اس اعصاب شکن معمول نے مریم کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ پرنیاں کے سامنے اپنی ناگواری چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کرتی تھی۔

”آج ابا کی چٹھی آئی ہے کراچی سے‘ سعدی بھیا کے نام۔ فیکٹری والے پتے پر بھجوائی تھی انہوں نے۔ لکھا ہے کہ اماں کو کراچی کا موسم راس نہیں آیا۔ جوڑوں کی تکلیف بڑھ گئی ہے اور پیٹ بھی ٹھیک نہیں رہتا۔ ہوسکتا ہے ایک دو ہفتے میں وہ لوگ لوٹ آئیں۔ ان کے آنے تک اگر تم یہیں ہوئیں تو ہمارا جھوٹ اور نہیں چلے گا۔ اماں بھائیوں جیسی بھولی نہیں کہ جو کہا جائے گا‘ آنکھ بند کرکے ایمان لے آئیں گی۔ تمہیں دیکھتے ہی وہ بھانپ جائیں گی کہ معاملہ کچھ اور ہے۔“

مریم نے بیسن کی روٹی پر گھی کی پتلی دھار گراتے ہوئے کہا۔

”بس کچھ دن اور مریم! تھوڑے دن اور مجھے یہاں رہنے دو۔“

”کتنے دن؟ اور کتنے دن؟ اگر تمہارے شوہر کے آنے کی کوئی تاریخ مقرر ہوتی تو ہم انتظار بھی کرتے مگر اس کی تو کوئی خبر ہی نہیں ہے۔ ایک مہینہ ہوگیا نہیں

کوشش کرتے ہوئے۔ وہ ٹیلی فون نمبر تو شاید کسی کے استعمال میں ہی نہیں ہے۔ ہر دوسرے دن تم فون ملاتی ہو‘ کبھی کوئی جواب ملا؟ تم اس کی امید چھوڑ دو‘ اب کوئی دوسرا راستہ ڈھونڈو۔“

کوئی دوسرا راستہ تھا ہی کب؟ وہ جس دھند بھری راہ پر چل رہی تھی‘ وہاں اسے اپنے قدموں تلے کی زمین دکھائی نہ دیتی تھی۔ اور اب تو محسوس ہونا بھی بند ہوگئی تھی۔ کئی بار وہ سوچنے لگتی کہ اس کے پیروں کے نیچے زمین ہے بھی یا نہیں۔

اندھیرا رینگتا ہوا آتا اور باورچی خانے کے دروازے میں لٹکتی پیلی روشنی کو چھو کر بدکتا اور پسپا ہوجاتا۔ پرنیاں پلکیں جھپکائے بنا باہر پھیلی رات کو گھورتی رہی پھر کڑوے دھوئیں نے آنکھوں میں گھس کر اسے پلکیں بند کرنے پر مجبور کردیا۔

”گلی محلوں میں بنے گھر ایک دوسرے کے اندر گھسے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان میں فاصلہ نہیں ہوتا۔ دیوار سے دیوار ملی ہوتی ہے۔ کھڑکی سے کھڑکی جڑی ہوتی ہے۔ ایک چھت پر چڑھ کر سب صحنوں کے اندر جھانکا جاسکتا ہے۔ یہاں کسی راز کو راز رکھنا بہت مشکل ہے۔ پرسوں جب تم حلیمہ کی ماں کے سامنے دو مرتبہ الٹی کرنے لیٹرین میں گئیں تو وہ پوچھنے لگی ”تمہاری سہیلی پیٹ سے ہے کیا؟“ تمہیں پتا ہے اس سے تمہارے شادی شدہ ہونے کی بات پہلے ہی کردی تھی۔ اگر میں نے بچے اور کہانی سنائی ہوتی تو بات سنبھلنی تھی بھلا۔ اس جھوٹ نے تو کتنا کھینچوں‘ کتنی بار مجھے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ اب تو مجھے یہ بھی بھولنے لگا ہے کہ کس سے میں نے کیا جھوٹ بولا تھا۔“

مریم نے اپنی آواز سرگوشی کی حد تک دھیمی کرلی۔ عبدالعلی اور ابوسعد کے کمرے سے ریڈیو کی آواز آنا بند ہوگئی تھی اور ابوسعد اسے کھانا دینے کے لیے پکار رہا تھا۔

”ابھی آرہی ہوں بھیا! بس دو گھڑی اور رکو۔“ روٹی کو توے سے اتار کر تازگی چنگیری میں رکھتے ہوئے وہ

دوبارہ اس سے مخاطب ہوئی۔

”خدا کے لیے میرے حال پر رحم کرو۔ یہاں بیٹھ کر اپنے شوہر کا انتظار کرنا۔ تمہارا پاگل پن ہے۔ جب اسے خبر ہی نہیں کہ تم کہاں ہو تو اس کا پاکستان آنا نہ آنا ایک برابر ہے۔ تمہارے گھر سے کوئی تمہیں ڈھونڈتا ہوا یہاں تک آگیا تو میں۔ میرے لیے خودکشی کرنے کے علاوہ کوئی رستہ نہیں بچے گا۔ میرے اماں ابا کے لوٹنے سے پہلے تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اپنے گھر جاؤ یا کہیں بھی اور چلی جاؤ مگر مجھے اور نہ آزماؤ۔ میرے پاس صرف ایک عزت ہی تو ہے۔ وہ بھی نہ رہی تو میں زندہ کیسے رہوں گی۔“

وہ پیڑھی سے اٹھی اور کیل سے ٹنگی لالٹین اتار کر باہر نکل گئی۔ دہلیز پر ٹھٹک کر رکا ہوا اندھیرا چھلانگ کر باورچی خانے کے اندر گھس آیا اور کچھ اندھیرا مریم کے پیچھے دبے قدموں برآمدے کی اور سرکنے لگا۔ چولہے میں جلتے مٹی کے تیل کا کڑوا دھواں اس کی پلکوں کو سلگاتا رہا اور وہ پلکیں جھپک جھپک کر آنکھوں کی جلن کو ہضم کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

مریم واپس آئی تو ریڈیو ایک بار پھر بجنے لگا تھا۔ اختری بائی فیض آبادی کی سحر طراز آواز ہر سو بکھر گئی تھی۔

”آئے بلم کرم مورے جاگے۔“

آگ کی لپٹیں توے کے سروں سے باہر پھیل کر لہرا رہی تھیں۔ بیسن کے جلے ہوئے ٹکڑوں سے گاڑھے دھوئیں کے مرغولے اٹھ کر سرکنڈوں کی چھت سے ٹکراتے اور پھیل جاتے۔ ٹھمری کے بول ناچتے ٹھمکتے ہوئے کوٹھری میں گھستے اور اس کے سر پر ٹنگی ہوئی لالٹین کے روشن زرد شیشے کے گرد پروانوں کی طرح جھمگھٹ بنالیتے۔

”آئے بلم آئے بلم
کرم مورے جاگے۔ کرم مورے جاگے۔
آئے بلم کرم مورے۔“

”پرنیاں! میرے اعصاب جواب دے چکے ہیں۔ مجھ میں اور برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے۔

تمہارے شوہر کے مل جانے کی ذرا سی بھی امید ہوتی تو میں تمہیں کچھ دن اور یہاں رکھنے پر آمادہ ہوجاتی۔ تمہارے رخصت ہونے کا کوئی وقت مقرر ہوتا۔ میں انتظار کرلیتی۔ مگر کچھ بھی واضح نہیں ہے۔ تمہارے ایک ہفتہ اور یہاں رکنے سے بات بن جائے گی؟ کیا دس دن کافی رہیں گے؟ مہینہ؟ دو مہینے؟ سال؟ نہیں پرنیاں! ایسے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ تم جتنی بھی دیر سر چھپا کر یہاں پڑی رہو۔ آخر تمہیں سچائی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کل صبح جب علی اور سعدی بھیا فیکٹری کے لیے نکل جائیں تو تم خاموشی سے اپنے گھر روانہ ہوجانا۔ مجھے معلوم ہے‘ تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس کا بندوبست میں کردوں گی۔ کرایے کے پیسے...“

پرنیاں نے بے چینی سے اس کی بات کاٹی۔ ”بس تھوڑے دن اور ٹھہر جاؤ۔“

”خاموشی سے میری بات سنو۔ تم اپنے ماں باپ کے پیروں میں گر کر ان سے معافی مانگ لینا۔ وہ مان جائیں گے۔ مجھ پر یقین کرو‘ وہ تمہیں قبول کرلیں گے۔ وہ لوگ تم سے اتنا پیار کرتے ہیں۔ تمہارے اس طرح روپوش ہوجانے سے وہ کتنے دکھی ہوں گے۔ تم سامنے جاؤ گی تو سارے شکوے خود ہی دھل جائیں گے لیکن اور دیر نہ کرو۔ اپنے لیے اور میرے لیے مزید مشکلات پیدا نہ کرو۔ سمجھو کہ میں اس گھر کی مالک نہیں ہوں۔ ایک خودمختار فرد نہیں ہوں۔ میں بہت سے لوگوں کے سامنے جواب دہ ہوں۔“

وہ کچھ بولنے کا ارادہ کررہی تھی کہ مریم نے ٹوک دیا۔ ”تم پریگننٹ ہو۔ یہی کہنے والی ہو ناں تم۔ تم نے یہ سب کرنے سے پہلے ایک لمحہ بھی نہیں سوچا یا تو تم حد سے زیادہ بے وقوف ہو یا کردار کی اس قدر ہلکی ہو کہ تمہیں اپنے آپ پر قابو ہی نہیں ہے۔ میں اتنے سالوں سے تمہیں جانتی ہوں۔ مگر مجھے تمہارے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے میں دشواری ہورہی ہے۔“

مریم کے الفاظ آنکھوں کو کاٹتے ہوئے دھوئیں

سے زیادہ تکلیف دہ تھے۔ پرنیاں کے لیے وہاں بیٹھے رہنا دوبھر ہو گیا۔

"تمہیں میری بات سے تکلیف ہوئی ہے نا۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ تکلیف تمہیں تب ہوگی جب تم اس بچے کو پیدا کرو گی اور لوگ تم سے اس کی ولدیت کے بارے میں سوال کریں گے۔ تب تمہارے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ نہ تمہارے آنسو کسی پر اثر کریں گے اور نہ ہی تمہاری خاموشی کسی کو مطمئن کرے گی۔ سنجیدگی سے سوچو تم کہاں کھڑی ہو۔ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ تمہاری ہمدرد ہوں۔ کوئی غلط مشورہ نہیں دوں گی تمہیں۔ اس بگڑی ہوئی بات کو سدھارا جا سکتا ہے اگر تم چاہو اور تمہیں یہ کرنا ہی ہوگا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" مریم نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "تم اسے ختم کر دو۔"

پرنیاں نے چیخ کر "نہیں" کہنا چاہا لیکن وہ خاموش بیٹھی سنتی رہی۔

"تم کسی ڈاکٹر کے پاس اس کام کے لیے نہیں جا سکتیں۔ جانے وہ کتنے روپے مانگے اور ممکن ہے وہ پولیس کو ملوث کرے۔ یہ خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا۔ میں نے تم سے پہلے ذکر نہیں کیا لیکن اس پہلو پر بہت سوچا ہے میں نے۔ تمہیں آمنہ یاد ہے؟ ہم سے ایک جماعت آگے تھی۔"

پرنیاں نے نفی میں سر ہلایا۔

"پکا رنگ تھا۔ بڑ کاٹھ کھلے تھے اور کمہاروں کے خاندان سے تھی۔ اس وجہ سے اسکول کی لڑکیوں نے اس کا نام "ٹھیکری" رکھ دیا تھا۔ پڑھائی میں بڑی تیز تھی۔ تقریری مقابلے میں بھی ہمیشہ اول انعام لیتی تھی۔ آئی ذہن میں وہ؟ میری کافی اچھی دوستی تھی اس سے۔"

پرنیاں کے ذہن میں آمنہ نامی اس گہری سانولی لڑکی کا دھندلا سا عکس آیا تھا۔ لیکن اس بے موقع تذکرے کا مقصد کیا تھا۔

"پچھلے سال ہی اس کی شادی ہوئی ہے۔ میں گئی تھی اماں اور علی کے ساتھ۔ اس کی اپنی پھپھو کے بیٹے سے شادی ہوئی ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ امریکہ لے گیا ہے۔ وہیں ملازمت کرتا ہے وہ۔ بڑی اچھی قسمت پائی ہے اس نے۔ اسکول میں سب لڑکیاں کالی اور کمی ہونے کی وجہ سے حقارت سے دیکھتی تھیں۔ خیر اللہ خوش رکھے اسے۔ اس کا ذکر اس لیے کر رہی ہوں کہ تمہیں اس کی ماں کے بارے میں بتانا تھا۔ وہ تین بار ملی ہوں آمنہ کی ماں سے بہت ہی نیک عورت ہے۔ بڑا بھلا سا نام ہے۔ جانے کیوں ذہن سے نکل گیا۔ شاید حلیمہ یا... حکیم۔ ہاں بالکل یہی نام ہے۔ حکیم بیگم۔ بڑی پیار محبت والی سادہ سی عورت ہے۔ وہ دائی کا کام بھی کرتی ہے۔ اگر تم اس کے پاس جاؤ اور آمنہ کا حوالہ دو کہ تم آمنہ کے ساتھ اسکول میں پڑھتی رہی ہو تو وہ لازماً تمہاری مدد کرے گی۔ اور جیسی طبیعت ہے اس کی۔ اس بات کا چرچا بھی نہیں کرے گی۔ مجھے یقین ہے وہ اس کام کا کوئی معاوضہ بھی نہیں مانگے گی لیکن تم میرا ذکر ہرگز نہ کرنا۔ تم وہاں خاموشی سے اس بچے سے چھٹکارا پا سکتی ہو۔ پھر تم اپنے گھر چلی جانا اور جیسے بھی بن پڑے انہیں منا لینا۔ وقت پہلے ہی بہت ضائع ہو چکا ہے۔ تم نے اور انتظار کیا تو یہ حل بھی قابل عمل نہیں رہے گا۔ تم کہو تو میں علی سے بات کروں۔ میں کوئی بہانا بنا کر اسے تمہارے ساتھ بھیجنے پر رضامند کر لیتی ہوں۔ وہ تمہیں [illegible] کے کنارے تک چھوڑ آئے گا۔ وہاں سے تمہیں بیڑی مل جائے گی [illegible] پار جانے کے لیے۔ گاؤں کی مسجد کے [illegible] چھوڑ کر آمنہ کا گھر ہے۔ [illegible] لوگی۔ میری بات مان لو۔ یہ [illegible] میں اچھا ہوگا۔"

پرنیاں بولی تو [illegible] پہلی مرتبہ مریم نے اس کے لہجے میں [illegible] محسوس کی۔

"[illegible] میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ جس کے [illegible] مٹانے کی ضرورت پیش آئے۔ میرے پیٹ میں جو پل رہا ہے۔ وہ میری محبت کا نتیجہ ہے۔ میں محبت پر شرمندہ نہیں ہوں۔ ایڈم گرانٹ کسی اجنبی کا نہیں میرے شوہر کا نام ہے تم لو اگر وہ مجھ سے سوال کرے گا کہ پرنیاں تم چند دن بھی میرا

انتظار نہ کر سکیں تو میرے پاس کیا جواب ہوگا۔ میں نہیں چاہتی مجھے اس کے سامنے شرم سے سر جھکانا پڑے۔ میں ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"تم تو کچھ بھی سوچ نہیں سکتیں۔" مریم نے غصے سے کہا۔ "تم خود کو اور اپنے ساتھ مجھے بھی تباہ کرنے پر تلی ہو۔ میں تمہارے لیے جتنا کر چکی ہوں اسے بہت سمجھو۔ اس سے زیادہ کرنے کی میری اوقات نہیں ہے۔ میرے حال پر رحم کھاؤ۔"

اس نے مریم کے چہرے سے نظر [illegible]

ریڈیو کی آواز اونچی کر دی گئی [illegible] اب [illegible] تھا۔ بھوج پوری کھوری [illegible] رہی

"جلوہ پھولوں [illegible] یہاں نہیں آئے
یہاں [illegible] یہاں نہیں آئے
[illegible]"

ٹھنڈی سانسوں والی ماگھ کی رات اس سے لپٹ کر [illegible] رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

دوسری طرف سے آتی آواز سن کر اس کی دھڑکن بے ترتیب ہوئی تھی۔

"ہیلو رائن سدرلینڈ۔ تم کو کس سے بات کرنا ہے؟ لیکن ٹھہرو۔ یہ سوال غیر ضروری ہے۔ میرے اپارٹمنٹ میں فون کیا ہے تو ظاہر ہے مجھ سے ہی بات کرنا ہوگی۔ خیر اپنا نام بتاؤ۔" وہ مایوس ہو کر فون بند کرنے لگی تھی کہ اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ اس باتونی لڑکے رائن کے ساتھ وہ پہلے بھی دو چار مرتبہ فون پر بات کر چکی تھی وہ گرانٹ کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا اور ان کی شادی سے چند روز قبل سڑک پر پیش آنے والے ایک حادثے میں شدید زخمی ہو گیا تھا جس کے بارے میں اسے گرانٹ نے بتایا تھا۔ پرنیاں کی اس سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ البتہ وہ اس کی آواز پہچانتی تھی۔

"رائن! میں پرنیاں بات کر رہی ہوں پاکستان سے، گرانٹ کی بیوی۔ تم جانتے ہو نا مجھے۔" "اتنے دنوں بعد اس نے گرانٹ سے متعلق کسی شخص کی آواز سنی تھی۔ وہ [illegible] ادوں تک غائب رہی تھی۔ سامنے بیٹھی ہوتی تو اس کے چہرے پر بھی رونق آ گئی تھی۔

"اوہو [illegible] نیاں! تم پاکستان کب گئیں۔ میں کل ہی ہسپتال سے فارغ ہو کر اپارٹمنٹ میں آیا ہوں اور سب سے پہلا فون تمہارا ہی آیا ہے۔ مجھے تم سے شکایت ہے۔ تم ایک بار بھی ہسپتال میں مجھے دیکھنے نہیں آئیں۔ چاہے میں کبھی تم سے ملا نہیں۔ اپنے دل میں تمہیں دوست ہی سمجھتا ہوں۔ تمہارے اور گرانٹ کے درمیان جو بھی اختلافات ہوں، مجھ سے تو تمہاری کوئی ناراضی نہیں تھی۔ مجھے دیکھنے تمہیں ضرور آنا چاہیے تھا۔ میں تو تقریباً مر ہی چکا تھا۔ خدا کی پناہ! بہت برا حادثہ تھا۔"

وہ جانے کیا کہے جا رہا تھا۔ پرنیاں کو اس کی بات سمجھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

"پہلے میری بات سنو رائن! میری گرانٹ سے بات کرواؤ۔ ابھی۔"

"تو تمہیں اس کا خیال آ ہی گیا۔ تم پچھتا رہی ہو نا۔ مجھے پہلے ہی لگ رہا تھا کہ تم ضرور پچھتاؤ گی۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو۔ گرانٹ کہاں ہے۔ جلدی بلاؤ اسے۔"

"تمہیں اسے چھوڑنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ بہت شاندار لڑکا ہے۔ میں بھی اسے نہیں چھوڑوں گا۔ کل کو وہ مشہور اداکار بن جائے گا تو اس کے توسط سے مجھے بھی کام ملے گا۔ میں ابھی سے مستقبل...."

"رائن! میری بات سمجھو۔ میں پاکستان سے فون کر رہی ہوں۔ یہاں سے امریکہ بات کرنے میں بہت زیادہ رقم خرچ ہوتی ہے۔ تم فوراً گرانٹ سے میری بات کرواؤ۔"

وہ رائن سے کئی باتوں کی وضاحت چاہتی تھی مگر گرانٹ سے بات کرنے سے پہلے کچھ اور نہیں کر سکتی تھی۔

"یہ اپارٹمنٹ تو خالی پڑا تھا۔ ٹیلی فون سیٹ بھی اتار کر وارڈ روب کے نچلے خانے میں رکھا ہوا تھا۔ میں

نے بڑی مشکل سے ڈھونڈ کر اسے چالو کیا ہے۔ گرانٹ ابھی یہاں نہیں رہتا۔"

"تو کہاں ہے وہ؟"

"اس کے ڈائریکٹر سالومن موریل نے اسے brentwood میں ایک بہت خوبصورت فلیٹ دلوا دیا ہے۔ وہ وہیں رہتا ہے اپنی ہسپانوی گرل فرینڈ کے ساتھ۔ تم جانتی ہو البا کو؟"

پرنیاں کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

"میں نے تو کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا تھا گرانٹ سے۔ مجھے البا بالکل پسند نہیں۔ بہت مصنوعی قسم کی لڑکی ہے۔ میں تمہیں زیادہ پسند کرتا ہوں۔ تم اور گرانٹ پھر سے اکٹھے ہو جاؤ تو مجھے اچھا لگے گا۔ تم جیسے ہی لاس اینجلس آؤ مجھے ضرور ملنا۔ تمہیں بڑی خوشی ہوگی مجھ سے مل کر۔"

"مجھے گرانٹ کا نیا ٹیلی فون نمبر چاہیے۔ مجھے لکھوا دو۔"

"یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ دوستوں کی مدد کے لیے میں ہر دم تیار رہتا ہوں۔ تم کہو تو میں اپنے طور پر گرانٹ سے بات بھی کروں گا۔" رائن نے خاصی دیر بعد اسے brentwood والے فلیٹ کا ٹیلی فون نمبر بتا دیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ رائن کے بتائے ہوئے نمبر پر بات کر رہی تھی۔ جو آواز سنائی دی اسے سننے کی پرنیاں کو ہرگز تمنا نہ تھی۔ البا نے ریسیور اٹھا کر اس کے خدشات میں اضافہ کر دیا تھا۔

"تم کو یہ نمبر کہاں سے معلوم ہوا؟" البا نے فوراً ہی اس کی آواز پہچان لی تھی۔

"میں گرانٹ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔" وہ خاموش ہو کر لمحہ بھر میں گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

"اسے بلا دو البا!"

"کیے؟" البا نے یوں چونک کر کہا جیسے کسی گہری سوچ سے نکلی ہو۔

"گرانٹ سے بات کروا دو میری۔"

"کیا بات کرنا چاہتی ہو تم؟"

"یہ میں تمہیں کیوں بتاؤں۔ تم وقت ضائع نہ کرو۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"تم مجھے کیوں نہیں بتا سکتیں۔ کیا کوئی زیادہ ذاتی نوعیت کی بات ہے۔ ویسے میرے پاس کچھ فرصت ہے، تم چاہو تو میں تمہاری بات سن لوں گی۔" اس کا انداز چڑانے والا تھا۔

"البا! تم مجھے ناپسند کرتی ہو، مجھے معلوم ہے۔ تمہیں میرا اور گرانٹ کا ایک ہونا اچھا نہیں لگا۔ لیکن قسمت میں ایسا ہونا لکھا تھا۔ میرے یا تمہارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔"

"قسمت خدا لکھتا ہے۔ جہاں تک میری معلومات کام کرتی ہیں تم خدا نہیں ہو۔ تو پھر میری قسمت تم نے کیوں لکھی؟"

"اس طرح سے بات نہ کرو۔ تمہارے اندر میرے لیے جتنا بھی غصہ ہے اس وقت اسے بھول کر ایک بار میری بات اس سے کروا دو۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں میرا اس سے بات کرنا بے حد ضروری ہے۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ یہ اتنا ضروری ہے۔ جتنا تم کہہ رہی ہو۔ ویسے وہ میرے سامنے ہی بیٹھا ہے اور اسے معلوم ہے کہ اس وقت میں فون پر کس سے بات کر رہی ہوں۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے مجھے بالکل محسوس نہیں ہو رہا کہ وہ تم سے بات کرنے میں کچھ دلچسپی رکھتا ہے۔ کیا کہتے ہو گرانٹ فون بند کر دوں؟ نہیں... ایسا مت کرو یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ آخر یہ..."

"اسے فون دو... سامنے بیٹھا ہے تو بات کیوں نہیں کرتا۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

البا کی بے مہر ہنسی سنائی دی۔ "تم تو رونے لگی ہو پرنیاں۔ میں تو نہیں روئی تھی جب مجھے تمہاری اور گرانٹ کی شادی کے بارے میں پتہ چلا تھا۔ میں بچپن سے ہی بڑے مضبوط اعصاب کی مالک ہوں۔ بڑی سے بڑی بات سہہ جاتی ہوں۔ مجھے دکھ تو ہوا تھا مگر جب گرانٹ نے مجھ سے معافی مانگی اور وضاحت کی کہ

پریناں نامی مذہبی جنونی سے شادی کرتا تو محض ایک ضد کی تکمیل کے لیے تھا تو میں نے اپنا دل صاف کرلیا۔ مجھے جو اذیت پہنچی۔ اس کی تلافی گرانٹ نے اس انداز سے کی کہ میں تمہیں تفصیل بتاؤں تو تم یقین ہی نہیں کروگی۔" وہ دوبارہ ہنسی۔

پریناں کو لگ رہا تھا اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ وہ حلق کے بل چیخی۔

"گرانٹ تمہارے ساتھ نہیں ہے۔ اگر وہ تمہارے پاس موجود ہوتا تو تمہاری باتوں کے جواب میں تمہارا منہ توڑ دیتا۔ خاموش بیٹھا نہ رہتا۔"

"اگر یہ بات ہے تو میں فون بند کررہی ہوں۔ جب تمہیں مجھ پر اعتبار ہی نہیں تو پھر اس بات چیت کا فائدہ۔"

"فون بند مت کرنا۔ مجھے جتنی بھی گالیاں دینا چاہتی ہو دے لو مگر ایک بار مجھے گرانٹ سے بات کرلینے دو۔ خدا کے لیے اسے فون دو۔" وہ گڑگڑا کر بولی۔

"میں نے تم سے کچھ چھین لیا ہوتا تو تم کو شکایت کرنے کا حق تھا مگر تم بھول رہی ہو کہ میں گرانٹ کی پہلی محبت ہوں۔ میں تم دونوں کے بیچ نہیں آئی بلکہ تم ہم دونوں کے درمیان آگئیں۔ اور اس طرح گھس آنے والوں کو کیا کہتے ہیں۔ معذرت چاہتی ہوں انگریزی پر مجھے زیادہ عبور نہیں اور ایسنس تم نہیں سمجھ سکتیں۔ وہ ایک اچھا سا لفظ ہے انگریزی زبان میں کیا ہے وہ گرانٹ؟ ہاں مجھے یاد آگیا۔ intruder تم intruder ہو پریناں اور میں گھر کی مالکہ۔ اپنے اور میرے مقام کو پہچانو۔ گرانٹ کو تم سے ذرہ بھر بھی دلچسپی ہوتی تو وہ تمہیں تمہاری مشکلات سے نکالنے پاکستان کیوں نہ آجاتا۔ تم سے شادی محض اس لیے کی کہ ہر مرد میں ایک فاتح ہوتا ہے وہ راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ کو عبور کرنا چاہتا ہے ورنہ اس کی انا بے مزہ ہوتی ہے۔ تم سمجھ رہی ہو ناں۔ شادی کے بعد تم گرانٹ کو اپنے قریب نہیں آنے دے رہی تھیں تو اس نے سوچا کہ چلو دوسرا طریقہ [illegible]۔ وہ بہت ہی پیارا لڑکا ہے۔ اس وقت مسکراتے ہوئے وہ کسی فرشتے کی مانند معصوم نظر آرہا ہے۔"

پریناں کچھ دیر گہرے گہرے سانس بھر کر اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی پھر قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں یہ باتیں خود گرانٹ کی زبان سے سننا چاہتی ہوں۔ تم قیامت کے دن تک مجھے یہ سب بتاتی رہو۔ میں نہیں مانوں گی۔ جب تک میں اس کے منہ سے نہیں سنوں گی۔ مجھے یقین نہیں آئے گا۔ تم نے جو بھی کہا ہے اس کا ایک ایک لفظ جھوٹ ہے۔"

"میں پہلے ہی امید کررہی تھی کہ تم ایسا ضرور کہو گی۔ ویسے میں گرانٹ کو پریشان کرنا چاہتی تو نہیں تھی۔ مگر تمہاری ضد ہے تو کیا کیا جائے۔ اور ہاں کیا میں تمہیں بتاچکی ہوں کہ گرانٹ اور میں ایک ہی فلیٹ میں رہتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے 'ایک ہی کمرے میں۔ اس کمرے کی سجاوٹ میں نے خود کی ہے۔ ایک ایک چیز اپنی پسند سے منتخب کی ہے اور اس کمرے میں بیڈ ایک ہی ہے۔" اس نے "ایک ہی" کو لمبا کھینچا تھا۔

"گرانٹ سے کہو مجھ سے بات کرے۔"

چند لمحے خاموشی چھائی رہی۔ اسے لگا ساری کائنات دم سادھ کر کسی خاص لمحے کا انتظار کررہی تھی۔ شاید وہ خواہش کررہی تھی گرانٹ [illegible] فون پر نہ آئے۔ ایسی کیفیت کو وہ خود [illegible] طاری تھی۔ پھر گرانٹ کی آواز اس کے کانوں میں اتری۔

"اس [illegible]" پریناں نے جان لیا کہ [illegible] تم کیا محسوس کررہی ہوگی۔

پانچ لفظوں نے اس کی تقدیر بدل ڈالی تھی۔ اس نے پانچ کہا ہے۔ پانچ لفظوں سے بنا ایک جملہ اور وہ [illegible] کے آثار کردار پر طاری کی گئی تھی۔

"سنو گرانٹ! تم نے مجھے برباد نہیں کیا۔ کوئی انسان کسی انسان کا مقدر نہیں بدل سکتا۔ مجھے خدا نے برباد کیا ہے۔ میں نے ایک انسان کو خدا کے مقابل لانے کی کوشش کی تھی اور خدا نے مجھے میری اوقات

یاد کروادی۔ میرے لیے زمین اور آسمان کے بیچ کہیں پناہ نہیں ہے۔ میری بربادی کی کوئی حد نہیں ہے۔ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔ میں تمہیں اس لیے نہیں بتارہی کہ مجھے اب بھی تم سے کوئی امید ہے بلکہ اس لیے بتارہی ہوں کہ تم جان لو خدا جب منہ کے بل گراتا ہے تو ٹھوکر کھانے کے لیے کسی رکاوٹ کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

گرانٹ نے اور کچھ نہیں کہا تھا۔ کچھ اور کہنے کی ضرورت بھی نہ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ چونکے [illegible] ساکت تھی۔ ان لمحات میں مریم کو اس کے زندہ ہونے پر شبہ ہوا تھا۔

"مریم! [illegible] تھی تو ایک دن ابو کے ساتھ [illegible] باہر [illegible] ابو کو شاید کچھ چیزیں خریدنا تھیں۔ وہ ایک دکان دار سے باتیں کررہے تھے اور میں ان کی انگلی پکڑے سامنے والی گلی میں ایک کتے کے پلے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک لاغر سا پلا تھا مگر بے حد پیارا تھا۔ وہ سڑک کے دوسری جانب تھا اور سڑک پار کرنے کے لیے بار بار آگے بڑھتا تھا اور کسی تیز رفتار گاڑی کو آتا دیکھ کر جھجک کر پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ پھر ایک موقع دیکھ کر وہ دوڑ پڑا لیکن اس کے پیچھے گلی سے نکلنے والی ایک موٹر کار نے اسے کچل دیا۔ وہ مرا نہیں تھا بری طرح زخمی ہوگیا تھا۔ اس کا برا حال تھا پر وہ مرا ہی نہ تھا۔ میں رونے لگی اور ابو سے کہا کہ اسے ٹھیک کردیں اسے بہت درد ہورہا ہے۔ تو وہ بولے کہ جب وہ مرجائے گا تو درد رک جائے گا۔ میں اس جگہ جانا نہیں چاہتی تھی پر ابو زبردستی مجھے وہاں لے آئے۔ کاش ابو مجھے وہیں رکنے دیتے تو میں اسے مرتے ہوئے دیکھ سکتی۔ مجھے یہ اطمینان تو ہوجاتا کہ درد رک گیا ہے۔ آج مجھے وہ کتے کا پلا بہت یاد آرہا ہے۔"

"تم تھوڑی دیر کے لیے سوجاؤ تو اچھا ہے، رات بہت بیت گئی ہے۔"

"خدا نے مجھے اس کے دل سے نکال دیا۔ یا میں کبھی وہاں تھی ہی نہیں۔ جس جگہ آپ موجود ہی نہ ہوں وہاں سے نکالے کیسے جاسکتے ہیں؟"

"[illegible] آنکھیں بند کرکے لیٹو۔ تمہیں سکون محسوس ہوگا۔"

"[illegible] ستمبر کی آٹھ تاریخ تھی جب پہلی بار میں اس سے ملی تھی اور آخری بار سترہ نومبر کو۔ کتنے دن ہوئے؟ نہیں گننے کی ضرورت نہیں ہے میں کئی بار گن چکی ہوں۔ دو مہینے اور گیارہ دن۔ اکہتر دن۔ میں بیس سال اپنے ماں باپ کے ساتھ رہی میں نے اکہتر دنوں کو بیس سالوں پر ترجیح دی۔ بیس سالوں میں تو اتنے دن ہیں کہ مجھ سے گنے بھی نہیں جاتے۔ میرے ماں باپ نے مجھے طب پڑھانے کے لیے ملک سے باہر بھجوایا۔ انہیں چاہیے تھا مجھے ریاضی پڑھنے بھیجتے مجھے تو حساب کرنا ہی نہیں آتا جو بیس سالوں پر اکہتر دنوں کو برتری دے۔ تم ہی بتاؤ اسے حساب سیکھنے کی کس قدر ضرورت ہے۔" مریم اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"سوچ سوچ کر پاگل ہوجاؤ گی۔ اس سے کیا ہوگا؟"

"اپنے نکاح والے دن جب میں ان سے مل کر لوٹی تو میرے لباس پر کیچڑ لگی تھی۔ میں نے وہ لباس محفوظ کرلیا۔ تم بتاؤ کوئی کیچڑ بھی سنبھال کر رکھتا ہے میں نے کیچڑ کے عوض اپنا آپ بیچ دیا۔ گھٹیا سے گھٹیا شے کے بھی بازار میں اس سے بہتر دام ملتے ہیں۔ دنیا میں کسی نے ایسا گھاٹے کا سودا بھی کیا ہوگا؟"

"خاموش ہوجاؤ۔ کچھ مت بولو اور کچھ نہ سوچو۔"

"تم نے کبھی کسی گونگے کو روتے سنا ہے۔ انہیں روتے ہوئے سننا بڑا اذیت ناک ہوتا ہے وہ اپنا دکھ لفظوں میں بیان نہیں کرسکتے تو بولنے والوں سے زیادہ شدت سے روتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی جانور کو کند چھری سے ذبح کیا جارہا ہو۔ گونگے کے رونے کی آواز بڑی غیر انسانی ہوتی ہے۔ میرا بھائی گونگا۔ ایک ہی بھائی ہے میرا۔ وہ بھی گونگا ہے۔ وہ روتا تھا تو میرا دل چاہتا تھا کانوں پر ہاتھ رکھ لوں لیکن اب لگتا ہے کانوں پر ہاتھ رکھنے سے بھی آواز آنا بند نہیں ہوگی۔"

مریم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ "تم رولو۔"

تھوڑے آنسو بہیں گے تو جی ہلکا ہو جائے گا۔ رونا آرہا ہے تو خود کو رو لو دوست۔"

پرنیاں کی خشک آنکھوں اور جامد خطوط میں حیرت لہرائی۔

"کوئی اپنی موت پر بھی روتا ہے کیا۔ میں اپنے مرنے پر خود کیسے رو سکتی ہوں؟"

مریم کے ہونٹ بھینچ گئے۔ شدید بے بسی محسوس کرتے ہوئے وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

رات کے آخری پہر تک پرنیاں کی آنکھیں کھلی رہیں۔ اسے نیند آئی تھی اور وہ خود پر جبر کر کے سونے سے باز رہتی تھی اس رات سونے کے تصور سے اسے خوف آرہا تھا۔ مگر بے بسی اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور اس نے وہی خواب دیکھا جو لاس اینجلس کے ایک پارک میں گرانٹ سے ملنے کے بعد دیکھا تھا۔ وہ فلک بوس پہاڑوں سے گھری ایک پیالہ رو جھیل کے کنارے کھڑی تھی۔ زمین پر گھنی سبز دوب کے الجھے ہوئے ڈھیر تھے جن میں اس کے پاؤں دھنسے جاتے تھے۔ فضا انوکھے طرب سے معمور تھی۔ جیسے ان گنت گھنگھرو بج رہے ہوں۔ جھیل کے نیلگوں پانی کی سطح پر ایک راج ہنس تیر رہا تھا وہ اتنا سفید تھا کہ اس پر نظر ٹھہرنا مشکل تھا۔ راج ہنس کے الوہی پروں کو چھونے کی شدید خواہش سے بے قرار ہو کر وہ جھیل کے سرد پانی میں اتر گئی۔ ذرا سا آگے سرکنے پر کسی عجیب سے احساس نے اس کے دل میں سہم پیدا کر دیا۔ اندھیرا چھانے لگا تھا جیسے نیلے آسمان پر کسی نے سیاہ روشنائی کی شیشی الٹ دی ہو۔ وہ ٹھٹک کر تھم گئی۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں کو کچھ چیزیں چھو کر گزر رہی تھیں۔ اگلے ہی پل اسے معلوم ہو گیا کہ وہ چیزیں آسمان سے اترتی ہوئی مردہ تتلیاں تھیں۔ وہ اتنی تعداد میں گر رہی تھیں کہ آسمان سے زمین تک ان کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ پھر کہیں سے دو بڑے بڑے ہاتھ آگے بڑھے اور اس کی گردن گرفت میں کس لی۔ ٹوٹتی ہوئی سانسوں کے درمیان اس نے قاتل کو دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے چہرے سے نقاب کھسکتا سرکا ہوا تھا۔ وہ اسے پہچان گئی۔ وہ ایڈم گرانٹ تھا۔ وہ جاگی تو اس کا پورا جسم پسینے سے بھیگا ہوا تھا وہ ایک بار پھر نیند میں چلی گئی۔ دن چڑھے تک وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں بے سدھ پڑی رہی۔

وہ چارپائی سے اتری اور رکٹ چندن کی سنگھار میز کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ مریم کسی کام سے اندر آئی تو اس نے پرنیاں کو آئینے میں اپنے عکس کو گھورتے ہوئے پایا۔

"مریم!" اس نے آئینے سے نظر ہٹائے بنا آواز دی۔

"میں آج آمنہ کی ماں کے پاس جاؤں گی۔ مجھے نہیں لگتا کہ اس بچے کو پیدا ہونا چاہیے۔"

☼ ☼ ☼

غیر مقفل دروازے نے اسے باور کروا دیا کہ البا اپارٹمنٹ میں موجود تھی۔ وائن ہسپتال میں تھا اور ان دونوں کے علاوہ الباہی تھی جس کے پاس اپارٹمنٹ کی چابی تھی۔ وہ دل میں سوچتا ہوا اندر آیا کہ اسے البا سے فاصلہ بڑھانے کے لیے کوئی مناسب حکمت عملی اپنانی چاہیے۔ پہلے معاملات کس ڈگر پر جا رہے تھے اس نے کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہ کیا تھا۔ مگر اب بات اور تھی۔ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اب اس نے پرنیاں کو بیوی کی حیثیت سے اپنی زندگی میں شریک کر لیا تھا۔ اب تک آخری ملاقات کی سرشاری اس کے بند بند میں تیز شراب کی مانند دوڑ رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ الباکی وجہ سے ان دونوں کے درمیان کوئی پیچیدگی پیدا ہو۔ الباسے مکمل ملاقات ترک کرنے میں ہی اسے عافیت نظر آئی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپارٹمنٹ میں الباکی آمد روکنے کی خاطر اسے دروازے کا لاک تبدیل کروانا پڑا تو وہ ایسا بھی کرے گا۔

اندر آنے کے بعد اسے البا کہیں نظر نہ آئی۔ البتہ باتھ روم کے دروازے کے پیچھے سے آتے ہوئے شور سے اندازہ ہوا کہ کوئی نل کھلا ہوا تھا۔ شاید البا باتھ روم میں تھی اور اس نے تنہا ہونے کی بنا پر دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ وہ خاصی دیر کاؤچ پر بیٹھا اس کے باہر آنے کا انتظار کرتا رہا اور اسے چند آوازیں بھی دے ڈالیں۔ مگر نہ کوئی جواب موصول ہوا اور نہ ہی نل سے گرتے پانی کا شور بند ہوا۔ بالآخر وہ اٹھ کر باتھ روم کے دروازے کے قریب گیا اور بلند آواز میں اس کا نام پکار کر دستک دی کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا۔ حیران ہوتے ہوئے اس نے اور دروازے سے اندر جھانکا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ صوفیہ گہرے نیلے والے بڑے ٹب میں بیٹھی تھی اس کے اوپر نل سے متواتر ٹب میں پانی گر رہا تھا۔ وہ سیاہ آنکھوں سے پانی کی دھار کو گھورتے ہوئے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ وہ بمشکل چھ ماہ کی تھی اور ابھی اس نے ٹھیک طرح سے بیٹھنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ ٹب کا حجم اتنا تھا کہ صوفیہ آسانی سے اس میں ڈوب سکتی تھی۔ اور اگر احمد نے کچھ دیر اور انتظار کیا ہوتا تو شاید وہ ڈوب ہی گئی ہوتی۔

اس نے ایک لمحے میں آگے بڑھ کر صوفیہ کو گود میں اٹھایا اور نل کو بند کرتے ہوئے اونچی آواز میں الباکو غلیظ گالی دی۔ جانے وہ خود کہاں تھی۔ اس نے تولیے سے صوفیہ کو اچھی طرح خشک کیا۔ اور اسے کمبل میں لپیٹ کر کاؤچ پر لٹا دیا۔ کھڑکی کے قریب سے گزرتے ہوئے اسے بو محسوس ہوئی تھی وہ فوراً سمجھ گیا کہ البا ٹیرس پر تھی۔ اس کا خیال درست تھا۔

"کیا نشے میں ہو تم؟ کیا تم اسے جان سے مارنا چاہتی تھیں۔" احمد نے طیش سے مغلوب آواز میں چیخ کر کہا۔

"میرے چاہنے سے کچھ ہوتا گرانٹ! تو کچھ نہ پوچھو کہ کیا ہوتا لیکن یہی تو مصیبت ہے میں جو چاہوں۔ وہ ہوتا ہی نہیں۔" اس کی آواز میں لٹک سی تھی۔

"نکل جاؤ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ تم میں انسانیت ہے ہی نہیں۔ ذرا غور کرو۔ وہ صرف چھ ماہ کی ہے۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے کیا کر سکتی ہے۔ مجھے آنے میں ذرا بھی دیر ہو جاتی تو وہ مر گئی ہوتی۔ تم نے جان بوجھ کر اسے مار ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ میں شروع سے تمہارا چلن دیکھتا آرہا ہوں۔ صوفیہ تمہارے ساتھ محفوظ نہیں ہے۔ تم اسے نہیں رکھنا چاہتیں تو اسے کسی بے اولاد جوڑے کو دے دو۔"

البا نے کوئی جواب نہ دیا اور رخ بدل کر نیچے سڑک کو دیکھنے لگی۔

"میں نے کہا ہے یہاں سے چلی جاؤ۔ میں تمہیں اس اپارٹمنٹ میں برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ خاموش کھڑی رہی۔

"اگر تم نہ گئیں تو میں تمہیں گھسیٹ کر دروازے سے باہر پھینک دوں گا۔" وہ غصے کی انتہا کو چھوتے ہوئے اس کے قریب گیا اور کندھے سے پکڑ کر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

"میں بھول گئی تھی ہم بھی تو بھول جاتے ہو۔ ہم سب کبھی نہ کبھی کچھ بھول ہی جاتے ہیں۔"

"میں تمہاری کوئی وضاحت نہیں سنوں گا۔ تم یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ آئندہ میں تم سے ہرگز نہیں ملنا چاہتا۔" اس کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"میری ٹانگیں سن ہو گئی ہیں ابھی چلوں گی تو گر جاؤں گی۔ مجھے تھوڑی دیر یہیں رہنے دو۔ میں خود ہی چلی جاؤں گی۔"

وہ چند لمحے کھڑا ہونٹ کاٹتا رہا پھر جھٹکے سے مڑ کر واپس کمرے میں چلا گیا۔ صوفیہ منہ میں ہاتھ کا انگوٹھا لیے اسے چوس رہی تھی اور اس کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جاتی تھیں۔

احمد فرش پر یہاں وہاں بکھری ہوئی چیزیں سمیٹنے میں مشغول ہو گیا۔ کافی دنوں سے اس نے کمرے کی صفائی نہیں کی تھی اور ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ صفائی سے فرصت پانے کے بعد اس کا پاکستان کال کرنے کا ارادہ تھا۔ وارڈ روب کے پٹ کھولتے ہوئے اس نے دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ پرنیاں اب تک اپنے گھر پہنچ چکی ہوگی۔ تمام کپڑے ترتیب سے کھونٹیوں پر لٹکاتے ہوئے اس نے اپنی جیکٹ کو ہاتھ میں لیا تو اس سے آتی مہک سے اسے لگا کہ وہ تازہ دھلی ہوئی تھی۔ اسے تشویش محسوس

ہوتی۔ اپنی شادی کے روز اس نے یہی جیکٹ پہنی تھی اور پرنیاں کا دیا ہوا پتا اور ٹیلی فون نمبر والا کاغذ اسی جیکٹ کی جیب میں رکھا تھا۔ وہ جیکٹ کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ تمام جیبیں خالی تھیں۔ اس نے ایک بار پھر ساری جیبیں کھنگال ڈالیں۔ اسے وہ کاغذ نہیں مل سکا تھا۔ اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ پا کر اس نے گردن گھمائی۔ البا کچھ تصویریں ہاتھ میں لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے کھڑی تھی۔

"کیا انہیں ڈھونڈ رہے ہو تم؟"

اس نے ایک ہی نظر میں جان لیا کہ وہ اس کی اور پرنیاں کی تصویریں تھیں جو انہوں نے شادی والے دن ایک فوٹو گرافر سے بنوائی تھیں۔

"میں کہہ رہی تھی ناں۔ تم بھول جاتے ہو تم مجھے اپنی شادی کے بارے میں بتانا بھول گئے۔ کیسی عجیب بات ہے۔"

"یہ تمہیں کہاں سے ملیں؟"

"اسی جیکٹ میں رکھی تھیں۔ میں نے اسے دھونے سے پہلے جیبوں میں ہاتھ ڈال کر۔"

"کیا؟ تم نے اسے دھویا ہے لیکن کس لیے؟ کس نے کہا تھا تم سے؟"

"اس پر بارش کے قطروں سے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ تمہارے کپڑوں پر مٹی بھی لگی تھی۔ لگتا ہے تم نے بارش کا خوب لطف لیا۔"

"اس کی جیب میں ایک کاغذ تھا' وہ کہاں ہے؟"

اس نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"کیسا کاغذ؟" البا نے بے نیازی سے کندھے اچکائے "مجھے تو کوئی کاغذ نہیں ملا۔ تم اس تصویر میں کتنے اچھے لگ رہے ہو۔ تم ہمیشہ ہی اچھے لگتے ہو۔"

اس نے ایک تصویر احمد کی آنکھوں کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

اس تصویر میں وہ اور پرنیاں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ احمد نے تصویر چھین کر ایک طرف اچھال دی۔

"میں تم سے جو پوچھ رہا ہوں۔ صرف اس کا جواب دو۔"

"کیا الٹا پوچھ رہے ہو تم؟"

وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر چیخا۔ "ملعون عورت! میرے ساتھ کھیل مت کھیلو۔ تم نے اس کاغذ کا کیا کیا ہے؟ مجھے وہ چاہیے۔ ابھی۔"

البا پر کچھ اثر نہ ہوا۔ "میرا ذہن ہی ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہا ہے۔ مجھے بالکل یاد نہیں آ رہا کہ ایسا کوئی کاغذ میں نے دیکھا ہے۔ وہ اتنا اہم تھا' میں اسے گم کیسے کر سکتی ہوں۔ مجھے وہ ملا ہی نہیں۔ میں سچ کہتی ہوں۔"

احمد کے لیے اپنے غصے پر مزید قابو رکھنا ناممکن ہو رہا تھا۔ "میں تم پر ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا۔ اس لیے تم دفع ہو جاؤ۔ آئندہ میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ میں اپارٹمنٹ میں موجود ہوں یا نہیں۔ تم یہاں پاؤں رکھنے کی جرأت نہ کرنا۔"

البا خاموش ہو گئی اور خالی خالی نظروں سے اسے گھورنے لگی۔ احمد نے چند لمحے اس کے جانے کا انتظار کیا اور جب اسے کوئی آثار دکھائی نہ دیے تو بازو سے پکڑ کر اسے دروازے کی سمت دھکیل دیا۔ اسے پورا یقین تھا کہ البا نے جان بوجھ کر وہ کاغذ ضائع کر دیا تھا۔ وہ ایسی ہی واہیات عورت تھی۔ اب پرنیاں سے بات کرنا کیسے ممکن ہو گا۔ وہ تو پہلے ہی [illegible] تھی اگر اس نے فون نہ کیا تو وہ پریشان ہو جائے گی۔ پھر اسے خیال آیا کہ ٹیلی فون نمبر اس سے گم ہوا تھا۔ پرنیاں کے پاس تو موجود تھا وہ بے چینی سے انتظار کرنے کے بجائے خود ہی اپارٹمنٹ [illegible] فون کرے گی یہ سوچ کر اس کی تشویش [illegible] خود ہی کم ہو گئی۔ وہ وارڈ روب کے [illegible] خانوں کی ترتیب درست کرنے لگا۔ اچانک اسے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ وہ چونک کر مڑا اور کاؤچ پر لیٹی صوفیہ کو دیکھ کر بے اختیار اس کے ہونٹوں سے البا کے لیے ایک غلیظ گالی برآمد ہوئی۔ وہ عورت اسے زچ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ بے دھیانی میں صوفیہ کو ساتھ لے جانا بھول گئی ہو۔ اس نے جھپٹ کر صوفیہ کو اٹھایا اور اپارٹمنٹ سے باہر آ کر سیڑھیوں کی سمت بھاگا۔ اسے پوری امید تھی کہ البا ابھی بمشکل پارکنگ تک ہی پہنچی ہو گی۔ چند سیڑھیوں کے بعد اسے رک جانا پڑا تھا۔ البا ایک زینے پر بیٹھی گردن اٹھائے اسے نیچے اترتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ کپڑے جھاڑتی ہوئی وہ اٹھی اور متوازن آواز میں بولی۔

"میں اپنا کچھ لستف تمہارے گھر میں چھوڑ آئی ہوں۔"

"لستف" سے اس کی مراد یقیناً صوفیہ تھی۔

"تم اجازت دو تو میں تمہاری یہ تصویر رکھ لوں۔ یونہی یادگار کے طور پر۔"

بری طرح روتی ہوئی صوفیہ [illegible] دھیان دیے بنا وہ احمد کے قریب سے گزر کر سیڑھیاں چڑھنے لگی تھی۔

* * *

پوش ہدایت کار کام سے اس کی لگن کا دل سے قائل ہو چکا تھا۔ وہ معمولی سے معمولی باتوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا تھا۔ احمد اور سمون فاکس میں ذہنی ہم آہنگی بڑھانے کی خاطر اس نے کچھ اس قسم کا معمول مرتب کیا تھا کہ دن میں ایک وقت کا کھانا وہ دونوں اکٹھے کھاتے تھے۔ اگرچہ ان ملاقاتوں میں سمون کا رویہ سرد اور کسی حد تک ہتک آمیز رہتا تھا لیکن احمد ان چھوٹی چھوٹی مصیبتوں سے بددل ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔

سالومن سورل نے ماضی میں اپنی فلموں میں اچھوتا پن لانے کے لیے بہت سے تجربات کیے تھے لیکن احمد جیسے گمنام کو مرکزی کردار میں لینے جیسا بڑا جوا اس نے پہلے نہیں کھیلا تھا۔ اس کے کئی خیر اندیشوں نے اسے اس اقدام سے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ ان خیر خواہوں میں سب سے بڑھ کر اسے متنبہ کرنے والی سمون فاکس ہی تھی۔ مگر سالومن کا ارادہ متزلزل نہیں ہوا تھا کہ اسے اپنی بصیرت پر پورا اعتماد تھا۔

اپنی توانائی کا بڑا حصہ وہ احمد پر صرف کر رہا تھا۔ اس کے تخیل میں ہیرو کی ایک مخصوص شبیہ تھی۔ وہ احمد کی کردار نگاری میں وہی رنگ بھر پاتا تو کامیابی یقینی تھی۔ احمد کی شخصیت میں دیہاتی اکھڑپن اور سادگی کا تاثر پیدا کرنے کے لیے وہ اسے دیہی علاقوں میں بھجوانے اور وہاں کے لوگوں میں گھلنے ملنے کے مواقع فراہم کرتا۔ جسمانی تربیت کے دو ماہرین مقرر کیے گئے تھے کہ اس کا بدن دہقانوں کی مانند مشقت کوش دکھائی دے۔ گھڑسواری اور نشانہ بازی کی مشقیں اس کے معمول میں شامل کی گئی تھیں۔

احمد ابراہیم سے ایڈم گرانٹ بننے کے سفر میں یہ پہلا موقع تھا جب احمد کو منزل پا لینے کا مکمل یقین تھا۔ سالومن نے اسے برنٹ وڈ کے علاقے میں ایک فرنشڈ فلیٹ کی چابی دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ویسے فی الحال وہ کہیں اور منتقل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ کیونکہ اپنے اپارٹمنٹ والے ٹیلی فون کے سوا اس کے اور پرنیاں کے درمیان رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ پرنیاں کی جانب سے خاموشی پر وہ حیران بھی تھا۔ وہ روز رات اپنی آنسرنگ مشین کے پیغامات سنتا صرف اس امید پر کہ پرنیاں کی آواز سن پائے گا۔ شاید وہ پاکستان جا کر بہت زیادہ مصروفیت بھرے دن گزار رہی تھی۔

ایک روز رات گئے وہ اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ ریسیور اٹھاتے وقت اس کے گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ دوسری طرف ہالی ووڈ کے سب سے نامور ایجنٹ کی پیشکش اس کی منتظر ہو گی۔ فون کرنے والی جارج فلپ کی سیکریٹری کیتھی تھی وہی جارج فلپ جس نے کئی برس قبل احمد کو اپنے دفتر سے دھتکار کر نکال دیا تھا۔ کیتھی نے جونہی خود کو متعارف کروایا۔ اس دن کی اذیت تمام جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن میں تازہ ہو گئی۔

"شکر ہے تم نے مجھے پہچان لیا۔ میں سمجھ رہی تھی۔ تمہیں اپنے بارے میں یاد کروانے کے لیے مجھے بڑی محنت کرنا پڑے گی۔" کیتھی نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"تمہیں اور تمہارے باس کو میں کبھی نہیں بھلا

پالیسی لی ڈو آنے کے بعد جب میں نے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تو سب سے پہلا سفر جارج فلپ کے آفس تک ہی کیا تھا۔ میں چالیس میل سے زائد کا فاصلہ طے کر کے وہاں پہنچا تھا اور میرے پاس کار بھی نہیں تھی۔ اس کے لیے میں سفر کی عدم موجودگی نے کیتھی کا حوصلہ بڑھایا تھا۔

"میں مسٹر فلپ کی جانب سے تمہیں تمہاری کامیابی پر مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ تم نے وہ کر دکھایا ہے، جس پر بالی وڈ کا بڑے سے بڑا نام بھی رشک کرنے پر مجبور ہو گا۔"

احمد کو اس کا لہجہ ضرورت سے زیادہ پرجوش لگا۔

"شکریہ۔ تمہاری ستائش مجھے خوشی پہنچا رہی ہے۔ کیا تم نے صرف یہی کہنے کے لیے فون کیا ہے؟"

"تم اتنے ذہین ہو یقیناً" سمجھ گئے ہو گے کہ میرا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ در اصل جارج فلپ بطور ایجنٹ تمہاری نمائندگی کرنے کا خواہش مند ہے۔ اگر ہمیں ملنے والی معلومات صحیح ہیں تو اب تک تم نے کسی کو اپنا ایجنٹ مقرر نہیں کیا۔"

بے اختیار احمد کو ہنسی آ گئی اس کا جی قہقہہ لگا کر ہنسنے کو چاہا تھا۔ اس نے بمشکل خود کو ایسا کرنے سے روکے رکھا۔ بے حد ٹھہری ہوئی آواز میں اس نے کہا تھا۔

"جارج فلپ جیسے عظیم ایجنٹ کی یادداشت اتنی کمزور کیسے ہو سکتی ہے۔ اس نے جب مجھے اپنے آفس سے بے عزت کر کے نکالا تھا تو مجھے ایک تاریخ لکھ کر دی تھی اور کہا تھا کہ اس تاریخ کو مجھے ملنا کیونکہ اس تاریخ سے پہلے اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ اس پر اتنا برا وقت آ جائے گا کہ وہ مجھ جیسے گھٹیا اور نسلی فنکار کی نمائندگی کرنے پر مجبور ہو جائے۔ میں نے اس کا دیا ہوا کاغذ کا پرزہ آج تک سنبھال کر رکھا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس تاریخ کے آنے میں ابھی تقریباً آٹھ سال باقی ہیں پھر اتنی جلد بازی کیوں کر رہی ہے۔ جارج سے کہنا میں اس کی دی ہوئی تاریخ پر ضرور اس

سے ملوں گا۔ بس اللہ سے دعا ہے کہ تب تک وہ زندہ رہے۔" سنا ہے ان دنوں اس کی صحت کچھ زیادہ اچھی نہیں رہتی۔

وہ جانتا تھا کہ کیتھی اس کے پیغام میں توہین کے عنصر کو جتنا بھی مدھم بنا کر پیش کرے، جارج فلپ کے لیے وہ ایک زناٹے دار تھپڑ کی طرح ہو گا۔

ایک اور شام کا ذکر ہے کہ وہ گھڑ سواری کے ترجیحی سبق کے بعد اپارٹمنٹ جانے کے لیے روانہ ہوا تو تمام راستہ ایک شخص کو اپنا تعاقب کرتے ہوئے پایا۔ کچھ دیر تو وہ اس کی حرکات سے پریشان ہوتا رہا اور ارادہ کیا کہ cope کو اس کی بابت مطلع کرے لیکن جب اسے احساس ہوا کہ وہ شخص اس کی بے خبری میں اس کی تصاویر بنانا چاہتا تھا تو وہ سمجھ گیا کہ وہ ایک paparazzo (ایسا فوٹو جرنلسٹ جو مشہور لوگوں کی نجی زندگی کے لمحات کو تصاویر کی صورت میں میڈیا کو فراہم کرتا ہے) تھا۔ احمد نے اس کے کیمرے کی زد سے بچنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے یہ بات بے حد خوشی دے رہی تھی کہ یہ ایک طرح سے اس کے سیلبریٹی ہونے کا ثبوت تھا۔ تفاخر کی طاقت ور لہر نے اس کے دل و دماغ میں سنسنی سی دوڑا دی۔ جس مقام کو پانے کی خاطر وہ اتنے برسوں سے ترس رہا تھا اس کے قدموں تلے بچھنے کو وہ دوڑا چلا آ رہا تھا۔

کمیل کے اس دور میں اس کی [illegible] نے اس کے ساتھ [illegible] اس نے اپنے "احمد کو دکھانے [illegible] میں اسے جتانا چاہتی تھی [illegible] اس کے ذہن سے محو ہو گئی تھی۔ وہ [illegible] اپنے پیچھے میں پوشیدہ رکھتی [illegible] ایسے وقت میں اسے ظاہر کرتی ہے جب مقابل کو [illegible] پر کامل ایمان آ جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

پرنیاں کو پاکستان گئے ہوئے تقریباً تین ہفتے بیت گئے تھے جب ایک روز اس کا ٹیلی فون آ گیا۔

احمد یہ جان کر ششدر رہ گیا تھا کہ وہ اس سے قبل

لن گٹ یار اس کی آفس جنگ مشین پر پیغامات ریکارڈ کروا چکی تھی پھر وہ اسے کیوں نہیں ملے تھے۔ اس معاملے میں اسے زیادہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اس کیوں کا حتمی جواب الباہی ہو سکتی تھی۔ اگرچہ اس کے سختی سے منع کرنے کے بعد الباہ اس کے سامنے نہیں آئی تھی۔ مگر اس کی غیر موجودگی میں وہ اپارٹمنٹ میں نہیں آتی ہو گی یہ بات [illegible] نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ الباہ نے پرنیاں کے پیغامات کو اس تک پہنچنے نہیں دیا تھا۔ الباہ [illegible] کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا، وہ صاف انکار کر دیتی۔ اسے اپنی غفلت پر غصہ آ رہا تھا جس نے دروازے کا لاک بدلوانے کا ارادہ [illegible] تک اس پر عمل کیوں نہیں کیا تھا [illegible] مصروف معمول میں وہ فراموش کر چکا تھا [illegible] پہلا کام اسے یہی کرنا تھا۔

پرنیاں بے حد پریشان لگتی تھی اور اسے پاکستان آئے [illegible] گزر گئی تھی۔ اسے خود بھی احساس ہو رہا تھا کہ وہ شاید ان معاملات سے نمٹ نہیں پائے گی۔ وہ سالومن کو اپنی ہنگامی شادی اور پرنیاں کے حالات کے متعلق بتا چکا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اسے اچانک پاکستان جانے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اگلے روز اس نے سالومن کے سامنے اپنی بات دہرائی تو اس کا جواب ناں میں تھا۔ یہ تو طے تھا کہ سالومن کی نظر میں اس کی نجی زندگی سے زیادہ اہم وہ فلم تھی۔ احمد نے بدمزگی کے ڈر سے اصرار نہیں کیا اور مقرر کردہ معمول کے مطابق دن گزارتا رہا۔

چند دن بعد سالومن نے ذکر کیا کہ وہ لوکیشن اسکاؤٹ کی منتخب کی ہوئی لوکیشنز کا معائنہ کرنے برٹش کولمبیا روانہ ہو رہا ہے تو اس نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ایک بار پھر اس سے درخواست کی۔ کسی قدر لیت و لعل کے بعد وہ مان گیا تھا اور اسے دو ہفتوں کے لیے پاکستان جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ پرنیاں سے دوری کو وہ کس طرح سہہ رہا تھا یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ سالومن کی ہاں کی نے اس کے اندر ویسی ہی بے چینی بھر دی۔ جیسی اس نے چودہ سال کی عمر میں خواب

میں خود کو [illegible] میں دیکھنے پر محسوس کی تھی۔ اس رات ابراہیم کا [illegible] اس کی راہ میں حائل ہو گیا تھا۔ لاشعوری طور پر اسے ڈر سا لگ رہا تھا کہ اب بھی کوئی رکاوٹ اس کے پیروں میں الجھ نہ جائے۔ وہ بنا کوئی وقت گنوائے تیزی سے انتظامات میں مشغول ہو گیا۔ اس دوران چند ایک دفعہ الباہ نے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ کبھی وہ رہائشی عمارت کی سیڑھیوں میں کھڑی ملتی اور کبھی پارکنگ میں اپنی کار کے اندر بیٹھی ہوئی منتظر ہوتی۔ احمد نے ہر بار سامنا ہونے پر اسے سختی سے دھتکارا تھا اور اسے بتایا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو لینے پاکستان جا رہا ہے لہٰذا وہ ان دونوں کے بیچ نہ آئے اور ان کی زندگی میں مداخلت نہ کرے۔

جس روز اس کی فلائٹ تھی۔ وہ علی الصبح اٹھا اور عجلت میں ناشتہ کر کے اپنے کپڑے اور دیگر سامان بیگ میں رکھنے لگا۔ اطلاعی گھنٹی کی آواز گونجی۔ اسے حیرت ہوئی کہ اتنی صبح کون تھا جو اس کے دروازے پر آن کھڑا ہوا تھا۔ دروازہ کھولنے پر جونہی اس کی نظر الباہ پر پڑی اس نے کچھ کہے بغیر ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دینا چاہا لیکن الباہ شاید پہلے ہی اس بات کی توقع کر رہی تھی۔ پھرتی کے ساتھ اسے دھکیلتے ہوئے وہ اندر آ گئی تھی۔

"میری بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ میں تم سے نہیں ملنا چاہتا۔ تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ میری زندگی سے نکل جاؤ۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"تم ہی تو میری زندگی ہو۔ میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔"

الباہ کی ڈھٹائی پر اس کا جی چاہا کہ دیوار سے اس کا سر ٹکرا ٹکرا کر اسے مار ڈالے۔

"ٹھیک ہے، تم میری زندگی سے نہیں جا سکتیں۔ فی الحال اس اپارٹمنٹ سے تو جا سکتی ہو۔ میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔ مجھے پریشان مت کرو۔"

"میں خود بہت پریشان ہوں۔ کئی راتوں سے میں سوئی نہیں ہوں۔ تم کیوں مجھ سے دور ہونا چاہتے ہو۔ وہ خوبصورت دن جو ہم نے ساتھ بتائے کیا ان کا ایک

پل بھی تمہیں یاد نہیں۔"

احمد نے نرمی سے ہاتھ جھٹک کر اسے خاموش ہونے کو کہا۔ "میں بہت جلدی میں ہوں۔ مجھے کہیں پہنچنا ہے۔ ہم پھر کبھی اس موضوع پر بات کریں گے۔"

"تم مجھے بیٹھنے کو نہیں کہو گے؟ میں تمہارے لیے ناشتہ لے کر آئی ہوں۔ کافی اور اوٹ میل۔" اس نے ہاتھ میں تھاما پیپر بیگ احمد کے سامنے کیا۔ "میں Bacons خریدنے لگی تھی اور پھر مجھے یاد آیا کہ تم پورک تو کھاتے ہی نہیں۔ میں تمہاری ایک ایک عادت سے واقف ہوں۔"

احمد اس پر ہاتھ اٹھانے کی شدید خواہش کو دباتے ہوئے دوبارہ سفری بیگ کی طرف متوجہ ہوا۔ الیا مسلسل بول رہی تھی اور وہ لاتعلق بنا اپنا کام کر رہا تھا۔

"تم کہیں جا رہے ہو؟ میں جانتی ہوں تم کہاں جا رہے ہو۔ میرا مشورہ مانو تو ارادہ بدل ڈالو۔"

"تمہاری رائے کس نے مانگی ہے؟" اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر ایک قہر بھری نگاہ الیا پر ڈالی۔

"تمہارے جانے سے بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ میری بات مانو۔ میں نے کبھی تمہیں غلط صلاح نہیں دی۔ تم چلے گئے تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ سالومن سوریل تم سے ناراض ہو جائے گا۔"

اس کے انداز میں چونکانے والی کوئی بات تھی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو؟ میں سالومن کی اجازت سے جا رہا ہوں۔ جس چیز کے متعلق جانتی نہیں، اس کے بارے میں اپنا منہ کھولنے کی زحمت نہ کرو۔"

"میں بہت سے جھوٹ بولتی ہوں۔ کبھی ضرورت کے تحت اور کبھی عادتاً" مگر میں نے تم سے ایک سچ بولا تھا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم میری زندگی میں پیش آنے والے واحد اچھا واقعہ ہو۔ میں تمہیں کبھی کھونا نہیں چاہتی۔ تمہارے لیے میں مر بھی سکتی ہوں اور مار بھی سکتی ہوں۔"

احمد نے بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے اس کی طرف جلتی نظروں سے دیکھا تھا۔ "تمہاری بکواس میں نے سن لیا ہے۔ اب تم جاؤ۔"

"تم نے سنا تو ہے۔ سمجھے نہیں۔"

"مجھے کچھ سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مجھے جانا ہے۔ تم باہر نکلو تاکہ میں دروازے کو تالا لگا سکوں۔"

"جانے سے پہلے اگر تم اسے دیکھ لو تو شاید تمہاری سوچ بدل جائے۔" الیا نے شولڈر بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک میگزین نکالا اور اس کے سامنے بستر پر رکھ دیا۔

وہ یکدم ساکت ہو گیا۔

"تم اس میگزین کو بھولے تو نہیں ہو گے۔ یاد ہے نا۔ میں نے اپنے دوست اورکا سے تمہیں ملوایا تھا۔"

"یہ تم مجھے کیوں دکھا رہی ہو؟" احمد کو اپنی آواز ڈھونڈنے میں بڑی دقت ہوئی۔

"سب واقف ہیں پورنوگرافی کے بارے میں سالومن کے خیالات کیا ہیں۔ میں اس کی فلم کا کتنا معمولی حصہ تھی۔ تقریباً" نہ ہونے کے برابر۔ محض ایک کاک ٹیل ویٹرس۔ جب اسے پتہ چلا کہ میں پورنو فلم میں کام کر چکی ہوں تو اس نے مجھے یوں الگ کر دیا جیسے میں اس کی فلم میں رہی تو خدا کا قہر اس پر نازل ہو جائے گا۔ وہ لبرل ہونے کی باتیں تو کرتا ہے لیکن اندر سے کٹر یہودی ہے۔ کیا وہ برداشت کر سکے گا کہ اس کی فلم میں لیڈ رول کرنے والا ایک پورن آرٹسٹ ہو۔ مجھے تو نہیں لگتا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"تم مجھے بلیک میل کر رہی ہو؟"

یہ ایک بے معنی سوال تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایسا ہی کر رہی تھی۔

"میں زیادہ دیر اپنی بے وقوفانہ باتوں سے تمہیں پریشان نہیں کروں گی۔ تمہاری صورت پر میرے لیے بیزاری ہے۔ بات اتنی سی ہے کہ تم پرنیاں کے پاس پاکستان گئے تو میں یہ میگزین لے جا کر مسٹر سوریل کو دکھا دوں گی۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ مجھے ایسا کرنے پر مجبور نہ کرنا۔ تمہارے پاس دو راستے ہیں۔ تم پاکستان چلے جاؤ اور فلم کیریئر کو بھول جاؤ یا تم پرنیاں کو چھوڑ دو اور ہالی وڈ کا عظیم ترین نام بن جاؤ۔"

احمد کا منہ کھل گیا۔ اسے اپنی سانس سینے میں اٹکتی محسوس ہو رہی تھی۔

کسی پرندے سے پوچھا جائے کہ تمہارے پر کاٹنا زیادہ مناسب ہو گا یا تمہیں پنجرے میں بند کرنا تو کون سا انتخاب بہتر ہو گا۔

وہ یک ٹک الیا کو گھورے جا رہا تھا۔ اس سے قبل اس نے غور نہیں کیا تھا مگر آج اسے احساس ہو رہا تھا کہ الیا کے چہرے کی بناوٹ میں ایک عجیب سی سفاکی تھی۔ اس کے باریک ہونٹ اور چہرے کی ٹھوڑی اسے اذیت پسند ظاہر کرتی [illegible] اپنے کیے عمل کرنے کا کس حد تک ارادہ [illegible] تھی۔ یہ جاننے کے لیے احمد کو کوئی [illegible] نہیں تھی۔

"ایک بیر اصل [illegible] ہو گے۔"

اسے پوچھنے [illegible] نہیں ہوئی کہ وہ کیا تھا۔ الیا نے [illegible] اس کے چہرے کے قریب لاتے ہوئے سرگوشی کی۔ "مجھے مار ڈالو۔"

وہ [illegible] کیا اور دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایئرپورٹ پہنچنے کے لیے بہت تھوڑا وقت باقی تھا۔

"مجھے یقین ہے تم پرنیاں کی خاطر اپنی اور میری زندگی برباد نہیں کرو گے۔

Jesus freaks (مذہبی انتہا پسند) تمہارے قابل ہی کہاں ہے۔ تمہیں اس میں کیا نظر آیا کہ تم نے اسے مجھ پر ترجیح دی۔ میں تو تمہاری اپنی ہوں۔ تمہیں میرے پاس ہی لوٹنا ہے۔"

آگے کھسکتے ہوئے وہ قریب آتے ہوئے آہستہ آواز میں بولنے لگی۔ "ہم دونوں کے درمیان کوئی نہیں آ سکتا۔ ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکتا۔ چاہے کوئی کچھ بھی کر لے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوں گے۔"

احمد نے ایک جھرجھری لے کر اسے دھکا دیا۔ "تم نفسیاتی مریضہ ہو۔ مجھے پہلے کیوں اندازہ نہیں ہوا کہ تم سے میل جول رکھنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ تم سمجھتی ہو۔ تم مجھے دھمکی دو گی اور میں ڈر جاؤں گا۔ جو تمہارے بس میں ہو وہ کر دیکھو۔ میں ہر قسم کے نتائج بھگتنے کو تیار ہوں۔"

الیا نے یوں سر ہلایا جیسے اسے مایوسی ہوئی ہو۔

"تمہیں کس بات پر غصہ ہے؟ کیا تمہارا خیال ہے کہ میگزین دیکھنے کے بعد سالومن کا رد عمل وہ نہیں ہو گا جس کی میں توقع کر رہی ہوں یا تم سمجھ رہے ہو کہ میں ایسا کروں گی ہی نہیں۔" اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ "میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں۔ میں تمہیں ایک قصہ سناتی ہوں۔ شاید اسے سن کر تمہیں اعتبار آ جائے۔ کچھ عرصہ پہلے تمہارا دوست رائن سدرلینڈ ایک ہٹ اینڈ رن کا شکار ہوا تھا۔ تمہیں یاد ہے کہ اسے مارگریٹا نامی کسی لڑکی نے رقعہ بھجوا کر ملنے کے لیے بلایا تھا اور بقول رائن کے وہ اس نام کی کسی لڑکی سے واقف نہیں تھا۔ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ جب میں نے پہلی بار پورنو فلم میں کام کیا تو میرے کردار کا نام بھی مارگریٹا تھا۔ وہ ایک جنونی لڑکی تھی جو اپنے دشمن کو کبھی معاف نہیں کرتی تھی۔"

احمد نے بے یقینی سے اسے دیکھا تھا۔ دو جمع دو چار کرنے میں اسے چند گھڑیاں لگی تھیں۔

"تم نے رائن کو... تم نے اس کی جان لینے کی کوشش کی صرف اس وجہ سے کہ سیٹ پر اس کے منہ سے وہ بات نکل گئی۔ تم جنونی ہو۔ تمہارا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔"

الیا نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔ "تم مجھے کچھ بھی کہہ سکتے ہو۔ میں تمہاری بات کا کبھی برا نہیں مانتی۔ تم اس وقت میری زندگی میں آئے جب میں خودکشی کا پختہ ارادہ کر چکی تھی۔ تم تو میری زندگی ہو گرانٹ! آج میں زندہ ہوں تو صرف تمہاری وجہ سے اور تمہارے لیے۔ مجھے پہلی نظر میں تم سے محبت ہو گئی تھی۔ میں نے زندگی میں بہت سی مشکلات دیکھی ہیں۔ صوفیہ کی پیدائش سے پہلے اس کا باپ مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ وہ بہت ہی کمینہ شخص تھا۔ وہ مجھے..."

"تم تو ہمیشہ کہتی رہی ہو کہ صوفیہ تمہاری بھانجی ہے؟"

"میں نے کہا ناں میں سچ کبھی کبھار ہی بولتی ہوں۔ مار سیلینے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ہم ہونے والے بچے کو مل کر پالیں گے لیکن ایک دن میں سو کر اٹھی تو وہ نہیں

تھا۔ حاملہ ہونے کی وجہ سے میرا دن بعد اہو گیا۔ میں جس ڈیپارٹمنٹ اسٹور میں بطور ماڈل کام کرتی تھی وہاں سے مجھے فارغ کر دیا گیا۔ کئی مہینوں تک میں بے روزگار رہی۔ میں اتنی تنہا تھی کہ زندہ رہنے سے عاجز آگئی تھی۔ تم نے ہی تو میرے اندر امید پیدا کی۔ اب تم بھی مجھے چھوڑ کر جانا چاہتے ہو۔ میں تمہیں کیسے جانے دے سکتی ہوں؟"

احمد کی نظر گھڑی کی سمت اٹھ گئی۔ اب بھی اگر وہ روانہ نہ ہوتا تو وقت پر ایئرپورٹ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

"مجھے تمہاری دکھ بھری کہانی سے کچھ لینا دینا نہیں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ راستہ چھوڑو۔" وہ بیگ اٹھا کر جارحانہ انداز میں آگے بڑھا۔

البا کے باریک ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ آگئی تھی۔ اس کے سامنے سے ہٹتے ہوئے وہ بولی۔

"تم اجازت دو تو میں تمہارا فون استعمال کر لوں۔ بڑی دقت سے سالومن کا رابطہ نمبر حاصل کیا ہے۔ وہ ان دنوں برنٹ ووڈ والی رہائش گاہ میں نہیں ہے۔ شاید برٹش کولمبیا میں اپنی آنے والی فلم کے لیے کوئی لوکیشن وغیرہ دیکھنے گیا ہوا ہے۔"

احمد کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ اس کے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔

"تم مجھ سے چاہتی کیا ہو؟ دو ٹوک بات کرو۔"

"میں صرف تمہیں اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتی ہوں۔ پورا دن چوبیس گھنٹے۔ میں تم سے ایک لمحے کی دوری بھی نہیں سہہ سکتی۔ چوبیس گھنٹے کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ وہ تمہیں معلوم ہے۔"

اس نے ایک بار پھر گھڑی کو دیکھا۔ سوئیاں تیزی سے آگے سرک رہی تھیں۔ فیصلے میں مزید تاخیر ممکن نہیں تھی۔

سالومن اسے رد کر دیتا تو آئندہ ایسا موقع ملنے کے امکانات ناپید تھے۔ وہ ایکسٹرا بن کر رہتا۔ باربر بن جاتا یا پورن آرٹسٹ بن کر زندگی گزارتا۔

اور پرنیاں۔ اس کے بغیر زندگی "زندگی" رہے گی؟ اسے چناؤ کرنا تھا۔ ہوا یا پانی [illegible] کے بغیر جیتے رہنا ممکن ہوگا۔ کمرے کی خاموشی [illegible] میں ڈھل گئی تھی۔ البا کی منتظر آنکھیں اس پر جمی تھیں۔ بیگ کے تسمے پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ اسے احساس بھی نہ ہوا کب اس کی مٹھی کھلی اور تسمہ اس کے ہاتھ سے پھسل گیا۔

البا کی آواز کہیں دور سے اس کے کانوں میں آئی
"مجھے تمہارا پاسپورٹ چاہیے۔"

☆ ☆ ☆

البا یوں اس پر مسلط ہو گئی تھی جیسے سندباد جہازی کے کندھوں پر جزیرے کا شیطان بوڑھا سوار ہوا تھا۔ وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہتی۔ لمحہ بھر بھی اسے نظر سے اوجھل نہ ہونے دیتی اور وہ اسے برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ البا نے اس کے اپارٹمنٹ والا ٹیلی فون سیٹ اتار کر کہیں چھپا دیا تھا۔ لاکھ سمجھانے بجھانے پر بھی وہ اس اقدام سے باز نہ آئی۔ مجبوراً اسے برنٹ ووڈ والے فلیٹ میں منتقل ہونا پڑا کیونکہ اس کا سالومن سے رابطے میں رہنا نہایت ضروری تھا۔ وہاں کا ٹیلی فون نمبر چونکہ پرنیاں کو معلوم نہیں تھا اس لیے البا کو اس تبدیلی سے خاطر خواہ [illegible] ہوا تھا۔ وہ مستقل اس کے ساتھ رہتی [illegible] مشکل سے احمد نے اسے [illegible] کیا کہ [illegible] سالومن آنے سے گریز کرے گی۔

سالومن [illegible] مصروف [illegible] تھا کہ البا کو [illegible] والا تھا۔ [illegible] یاد آجائے کہ ایک [illegible] بار وہ اس کی [illegible] سکتا تھا۔ احمد [illegible] اندر [illegible] باور کراتا تھا کہ اسے اشتعال میں آکر [illegible] نہیں بگاڑنا اور البا کے ساتھ کچھ [illegible] سے گزارنا ہے۔

[illegible] طور پر البا کی من مانی برداشت کر لینے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ پرنیاں اگر خود اس سے رابطہ نہیں کر پائے گی تو اس مسئلے کا ایک دوسرا حل موجود تھا۔ وہ البا کی لاعلمی میں پاکستان فون کر سکتا تھا۔ وہ اس کی جتنی بھی نگرانی کر لیتی لیکن آخر انسان تھی اور انسانوں کے ساتھ بہت سی مجبوریاں لگی ہوتی ہیں۔

اس نے دو دفعہ البا کی نظروں کی زد سے بچتے ہوئے فون کیا بھی تھا۔ کہ پرنیاں کو پاکستان نہ آسکنے کے بارے میں کوئی معقول وضاحت دے سکے۔ ایک دفعہ گھر کے کسی اور فرد نے فون اٹھایا تھا مگر لائن اس قدر پرشور تھی کہ اس کی آواز دوسری جانب سنی ہی نہیں جا سکی تھی۔ دوسری مرتبہ بس گھنٹیاں بجتی رہیں اور کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

پاکستان اور امریکہ میں وقت کا تفاوت بھی ایک گمبھیر مسئلہ تھا۔ جب یہاں بیدار [illegible] کی گھڑیاں آتیں تو وہاں سونے کے اوقات [illegible] ہو جاتے۔

بہر حال وہ مطمئن تھا کہ جلد یا بدیر پرنیاں سے بات کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور [illegible] سالومن مووی کی پروڈکشن [illegible] کی توجہ بھی کوئی لاینحل معاملہ [illegible] ایک بار تکمیل کے مراحل میں داخل ہو گئی تو سالومن چاہ کر بھی اسے علیحدہ نہیں کر [illegible] البا کے اشاروں پر چلنے کی [illegible] مناسب وقت آنے پر وہ البا کو منہ توڑ جواب دینے والا تھا۔

سالومن ابھی کینیڈا میں ہی تھا اور جب اسے معلوم ہوا کہ احمد نے پاکستان جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا تو اس نے اسے وینکوور آنے کو کہا۔ حسب توقع البا بھی اس کے ساتھ جانے پر بضد ہو گئی۔ فی الحال وہ اسے ناراض کرنے کا متحمل نہیں تھا۔ سو اسے یہ ضد بھی ماننا پڑی۔ وینکوور میں چند روزہ قیام کے دوران وہ بے حد مصروف رہا۔ کسی بھی کام کو وہ پورے دل سے نہ کر پایا۔ اس کا دھیان مسلسل پرنیاں میں اٹکا تھا۔ اس کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی تھی اور تنہا اتنا دباؤ سہنے کی صلاحیت اس میں نہیں تھی۔ اس نے متعدد دفعہ کوشش کی مگر فون لائنز میں کسی خرابی کے باعث پاکستان بات کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ جس روز اسے واپس لاس اینجلس جانا تھا۔ اس نے ایک دفعہ پھر کوشش کی۔

اس بار اس کا فون مل گیا تھا۔ وہ پرنیاں کے کزن داؤد سے مخاطب تھا۔ ایک دفعہ اس کی داؤد سے ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ اسی ملاقات کا حوالہ دے کر جب اس نے اپنا تعارف کروایا تو داؤد کے جوابی الفاظ نے اسے ششدر کر دیا۔ وہ اسے رکیک گالیاں دے رہا تھا۔ شاید پرنیاں نے گھر میں اپنی شادی کا اعلان کر دیا تھا اور اس کا رد عمل تھا۔ خود پر ضبط کرتے ہوئے اس نے داؤد کی گالیاں تحمل سے سنیں اور اس کے خاموش ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

"میرے خیال میں تم کافی کہہ چکے ہو۔ مجھے پرنیاں سے بات کرنے دو۔"

"[illegible] کے پیچھے اس طرح انجان بن کر تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو۔"

"کیا مطلب؟"

"کیا تم نہیں جانتے وہ یہاں نہیں ہے۔ تمہیں یہاں فون کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ تم نے پرنیاں کو کیا کرنے پر مجبور کر دیا۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں اس کا باپ اس وقت کس حالت [illegible]"

احمد نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "کیا کیا ہے اس نے؟ کہاں ہے وہ؟"

"تمہارے علاوہ کون بتا سکتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ گھر سے بھاگنے سے قبل اس نے تمہارے ساتھ کوئی پروگرام تو طے کیا ہوگا۔"

وہ ہکا بکا سنتا رہا۔

"مجھے بالکل خبر نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے۔ میں نے تو اس سے بات کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ اس نے گھر چھوڑ دیا ہے تو وہ کہاں گئی ہے؟"

"مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ میں تمہارے ناپاک منہ سے یہ مکاری بھری باتیں سن سکوں۔ میں وہاں آکر تمہیں ملوں گا۔ میرا انتظار کرو۔" داؤد نے غرا کر کہا۔

"کیا واقعی وہ گھر سے جا چکی ہے یا تم میری اس سے بات نہیں کروانا چاہتے۔ دیکھو آرام سے بات کرو۔"

"بات انسانوں سے کی جاتی ہے اور میں تمہیں وہ نہیں سمجھتا۔"

لائن بے جان ہو گئی تھی۔

(باقی آئندہ)

مکمل ناول

نمرہ احمد

مصحف

محمل ابراہیم' آغا ابراہیم اور مسرت بیگم کی خوب صورت اور طرح دار بیٹی ہے۔ بچپن میں ہی آغا ابراہیم کے انتقال کے بعد تایا آغا کریم اور چچاؤں کے رحم و کرم پر ہے۔ مسرت سیدھی سادھی خاتون تھیں۔ اس لیے اپنی سسرال کو گھر اور کاروبار پر قبضہ کرنے سے روک نہیں پائیں۔ جس کا قلق محمل کو ہے۔ گھر والوں خصوصاً" تائی مہتاب کا رویہ ماں بیٹی کے ساتھ بے حد ناروا ہے۔ اپنے تعلیمی اخراجات و ضروریات کے لیے محمل ٹیوشن سینٹر میں پڑھاتی ہے۔

آغا ابراہیم کے اس محل نما گھر میں آغا کریم اور مہتاب تائی فواد' حسان' وسیم' سدرہ اور مہرین کے ساتھ مقیم ہیں۔ آغا ابراہیم کے جڑواں بھائی آغا غفران اور فضہ چچی کے تین بچے حسن' ندا اور سامیہ ہیں۔ سب سے چھوٹے آغا اسد اور ناعمہ بالائی منزل پر رہائش پذیر ہیں۔ جن کے تین بچے آرزو' معیز اور معاذ ہیں جبکہ رضیہ پھپھو کی ایک صاحبزادی فائقہ بھی ہیں۔ خاندان بھر میں تائی مہتاب اور آغا کریم کے فرزند فواد کو خاص مقام حاصل ہے۔ آرزو فائقہ اور ندا اس کے لیے خاص جذبات رکھتی ہیں۔ محمل کو تائی مہتاب کے خاندان کی اس دھتی رگ کا بخوبی اندازہ ہے۔ وہ فواد کی توجہ حاصل کرنے کے لیے اسے نظرانداز کرتی ہے تو وہ اس پر چونک جاتا ہے۔ آرزو' سدرہ اور فائقہ کو اس کی خوب صورتی اور ذہانت سے حسد ہے۔

کالج جاتے ہوئے ہر روز اسے ایک پر اسرار سیاہ فام لڑکی ملتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ جلد کی کتاب محمل کی توجہ کھینچتی ہے۔ وہ لڑکی محمل کو بتاتی ہے کہ اس کتاب میں ماضی' حال' مستقبل کا احوال ہے۔ اور اس میں حالات اپنے کنٹرول میں کرنے کا نسخہ ہے۔ محمل اسے سمجھ نہیں پاتی ہے۔ وہ لڑکی محمل سے کہتی ہے کہ ایک دن اسے اس کتاب کی ضرورت ضرور پڑے گی۔

محمل' آغا کریم کو بتاتی ہے کہ بہترین تعلیمی ریکارڈ پر اسے جلد ہی برٹش کونسل کی جانب سے لندن کی اسکالرشپ مل

جائے گی۔ وہ راستہ صاف ہو جانے کی اس نوید پر سکون کا سانس لیتے ہیں۔ ایروناٹکل انجینئر فرقان کا رشتہ سدرہ کے بجائے تحمل کے لیے ہوئے۔ پتا چلتا ہے تو سب کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔ تائی مہتاب فوراً انکار کر دیتی ہیں۔ حسن، تحمل اور مسرت کو بہت رنج ہوتا ہے۔ فواد اس سے اندر ہی رہتا ہے اور اسے فیکٹری میں آر شپ دینے اور جاب کرنے کے لیے آغا جان سے بات کرتا ہے۔ جس پر وہ انکار کر دیتے ہیں۔ حالات سے تنگ آکر تحمل اپنی مسز اوزکی سے سیاہ جلد والی کتاب لے آتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے تحمل ہی تائی مہتاب سب کے ساتھ اسے رنگے ہاتھوں پکڑتی ہیں۔ لیکن پتہ چلتا ہے کہ یہ تو قرآن مجید ہے۔ تحمل سمیت سب رنگ رہ جاتے ہیں۔ تائی مہتاب اپنی بے عزتی پر بے حد تلملاتی ہیں۔ تحمل غصہ میں آکر سیاہ فام لڑکی کو قرآن شریف واپس کر آتی ہے اور اسے سخت سست بھی سناتی ہے۔ اس ردِ عمل پر وہ لڑکی بجھ سی جاتی ہے۔

آغا فواد سب سے چھپ کر تحمل کو فیکٹری لے جانے لگتا ہے اور اسے منع کرتا ہے کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرے۔ وہ اسے بیش قیمت ملبوسات بھی دلواتا ہے تاکہ سدرہ کی منگنی پر وہ اپنی حیثیت کے مطابق نظر آئے۔ تحمل اپنی سادگی میں اسے فواد کی محبت سمجھتی ہے۔ حسن، تحمل کو فواد کے سائے سے بھی دور رہنے کی تنبیہ کرتا ہے تو تحمل کو برا محسوس ہوتا ہے۔ میرونٹ میں ڈنر کا جھانسہ دے کر فواد، تحمل کو اپنے ساتھ جانے پر آمادہ کرتا ہے۔ راستے میں کسی ڈیل کے نہ ہونے پر نقصان کا ذمہ دار جاکر تحمل کو کلائنٹ کے پاس بھیجتا ہے۔ وہاں جاکر تحمل کو آغا فواد کے اصل چہرے کا ادراک ہوتا ہے۔ فواد نے اے ایس پی کے سامنے تحمل کو بطور چارہ استعمال کیا تھا اس صورت حال پر تحمل چکرا کر رہ جاتی ہے۔ وہ اسے بتاتی ہے کہ آغا فواد اس کا بھائی ہے۔

انسپکٹر ہمایوں، تحمل کی آغا فواد سے بات کراتا ہے تو وہ اسے رات اسی کے ساتھ رہنے کو کہتا ہے۔ تحمل اس دھوکہ دہی پر ششدر رہ جاتی ہے۔ اس صدمے سے وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ اسے ایک کمرے میں قید کر لیا جاتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بذریعہ چھت بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس کوٹھی کے برابر میں مدرسہ ہے۔ جہاں اس کی ملاقات فرشتے نامی لڑکی سے ہوتی ہے جو وہاں دین کی تعلیم دیتی ہے۔ فرشتے جان لیتی ہے کہ تحمل اس وقت مشکل میں ہے۔ انسپکٹر ہمایوں اس کا کزن ہے۔ ہمایوں کے وہاں پہنچنے پر تحمل کو مشورہ دیتی ہے کہ وہ اپنے گھر انسپکٹر ہمایوں کے ساتھ جائے۔ کچھ سوچ کر تحمل فرشتے کی بات مان لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر اس کے ساتھ روایتی سلوک ہوتا ہے اور آغا کریم اور تمام چچا اسے گھر سے نکال دینے کے درپے ہو جاتے ہیں کہ انسپکٹر ہمایوں کی آمد سب کو چونکا دیتی ہے۔ تحمل سب کو بتاتی ہے کہ کس طرح آغا فواد نے دھوکے سے اسے ڈیل کا حصہ بنایا۔ سوائے حسن اور مسرت (ماں) کے سب اسے جھٹلاتے ہیں۔ وہ آغا فواد کی [illegible] خلاف پولیس میں رپورٹ کروا دیتی ہے۔ تائی جان اسے مارنے کو لپکتی ہیں تو سب انہیں روک دیتے ہیں۔ [illegible] ہو جاتا ہے۔ مصلحتاً تحمل کو گھر میں رہنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ مسرت سے تحمل کی بات چیت [illegible] میں تحمل کو بھی قصوروار سمجھتی ہیں۔ تحمل فرشتے سے ملنے دوبارہ مدرسے جاتی ہے تو وہ اسے قرآن مجید کی [illegible] تحمل کرنے کا مشورہ دیتی ہے۔ وہ اس بات کو خاص اہمیت نہیں دیتی لیکن مصروفیت کے لیے اس کا مشورہ مان لیتی ہے۔ [illegible] علم اسے ذہنی و روحانی سکون بخشتی ہے۔ اس دوران انسپکٹر ہمایوں سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ [illegible] کے لیے اپنا سیل نمبر دیتا ہے۔ وہ آغا فواد کے خلاف تحمل کو وعدہ معاف گواہ بنانا چاہتا ہے۔ یہ بات [illegible] والوں [illegible] نہیں آتی ہے تو وہ تحمل کو بری طرح زدوکوب کرتے ہیں۔ وہ رو رو کر ان سب کو بددعا دیتی ہے۔ [illegible] والوں کے اس سلوک پر ششدر ہے۔ مسرت، تحمل کو آغا فواد کے خلاف وعدہ معاف گواہ بننے کا کہتی ہیں۔ تحمل [illegible] ہمایوں کو تمام صورت حال بتاتی ہے تو وہ اسے مصلحتاً جھوٹ بولنے کا مشورہ دیتا ہے۔ تایا کریم اسے جائیداد میں [illegible] دینے کا جھانسہ دیتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ شرط رکھتے ہیں کہ وہ انسپکٹر ہمایوں والوں کے خلاف کورٹ میں بیان [illegible] تو اسے اس کا حصہ مل جائے گا۔ وہ ان کا ساتھ دینے کی حامی بھر لیتی ہے۔

(اب آگے پڑھیے)

۳

تیسری قسط

صبح آٹھ بجے وہ مسجد کے گیٹ پر تھی۔ اندر داخل ہونے سے قبل اس نے رک کر ریلوں سے جھانکتے ٹیلے کو دیکھا۔ اس کا کلی تیج آج بھی ویران پڑا تھا۔

"کیا تمہارا صاحب ہے؟" کچھ سوچ کر اس نے باوردی گارڈ کو مخاطب کیا۔

"وہ تو شہر سے باہر گیا ہے۔"

"کب آئے گا؟"

"معلوم نہیں۔"

"اچھا۔" اس نے ذرا سی ایڑی اونچی کر کے [illegible] دیکھا۔ ہمایوں کی گاڑی گھر میں [illegible]

"وہ وہاں نہیں دوبارہ [illegible]" گارڈ نے [illegible] گزر دیا۔

"بھاڑ میں گیا تمہارا صاحب" میری طرف سے اس سفید [illegible] بولو نہیں ملنا چاہتا تو سیدھا منع کر دو [illegible] جھوٹ بولنا منافقت کی نشانی ہوتی ہے۔ ایمان [illegible] خدا کا خوف کرو۔" وہ آخری فقرے [illegible] انداز میں کہتی اسکول کے گیٹ کی [illegible] گئی۔ پتا نہیں ہمایوں نے اس کے لیے یہ [illegible] کہہ رکھا تھا۔

(اور پتا نہیں میں نے صحیح کیا یا غلط۔ مگر وہ اسے میری جائیداد بھی نہیں دیں گے پھر اور کیا کرتی؟)

بے زار سا تاثر چہرے پہ سجائے بیگ اٹھائے وہ سست روی سے برآمدے کی طرف چل رہی تھی۔

(اور یہ جھوٹ تو نہیں، اس نے مجھے حبس بے جا میں رکھا تھا۔)

اس نے چپل ریک پہ اتاری اور خود کو گھسیٹتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی۔

(مگر اغوا تو نہیں کیا تھا، میں اُدھر اپنی مرضی سے ہی گئی تھی تو اس پہ یوں اغوا کا الزام لگا دینا جھوٹ نہیں ہوگا؟)

وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ زینے اتر رہی تھی۔

(نہیں، جھوٹ کہاں، اس نے ڈیل تو کی تھی، اغوا اور خرید نا ایک ہی بات ہے۔ اگر ذرا سا لفظوں کا ہیر پھیر کر دوں تو کیا ہے؟)

اس نے کرسی پہ بیٹھ کر کتابیں سامنے ڈیسک پر رکھیں اور ساتھ [illegible] اپنے سیپارے پہ جھکا کر اور پھر مطلوبہ صفحہ [illegible] تفسیر شروع ہو چکی تھی۔ وہ آج بھی لیٹ [illegible] تھی۔

(فواد کے خلاف گواہی نہ بھی دوں تو بھی وہ سزا پائے گا اور وہ اتنا بڑا اے ایس پی کوئی میرے بیان سے اسے سزا تھوڑی ملے گی؟ بس لفظوں کو تھوڑا سا ایکسچینج کر دیا جائے تو کیا ہے، میری نیت تو صاف ہے)

مطلوبہ صفحہ کھول کر اس نے پین کی کیپ اتاری اور آج کی تاریخ لکھنے لگی۔

"اور تم جھوٹ کو سچ کے ساتھ نہ ملاؤ اور نہ تم سچ کو چھپاؤ حالانکہ تم خوب جانتے ہو۔"

میڈم مصباح کی آواز پہ جیسے کرنٹ کھا کر اس نے سر اٹھایا۔ وہ اپنی ٹیچر چیئر پہ بیٹھی کتاب سے پڑھ رہی تھیں۔ اس نے بے اختیار اپنے سیپارے کو دیکھا۔ اس صفحے پہ سب سے اوپر یہی لکھا تھا۔

"تم میری آیات کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لو اور صرف مجھ سے ہی ڈرو۔ اور تم جھوٹ کو سچ سے نہ ملاؤ اور نہ تم حق کو چھپاؤ حالانکہ تم جانتے بھی ہو۔"

وہ گنگ سی بے حد ساکت سی پھٹی پھٹی نگاہوں سے ان الفاظ کو دیکھ رہی تھی۔ میڈم آگے پڑھ رہی تھیں مگر اسے کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ ساری آوازیں جیسے بند ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ بنا پلک جھپکے ان ہی الفاظ کو دیکھے جا رہی تھی۔

"کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے نفسوں کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب پڑھتے ہو۔ کیا پھر تم عقل سے کام نہیں لیتے؟"

اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ ذرا دیر پہلے گارڈ کو کی گئی نصیحت اس کے کانوں میں گونجی۔ اسے لگا وہ کتاب اسے اس سے زیادہ جانتی ہے۔

(پھر پھر میں کیا کروں؟) اس کا دل کانپنے لگا تھا۔ بے اختیار اس نے رسی تھامنا چاہی۔ کلام کی رسی۔ سو نہ جانتی تھی کہ دوسرے سرے پہ کون ہے، مگر اسے یقین تھا کہ دوسرے سرے پہ کوئی ضرور موجود

سبب
"صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو۔ بے شک وہ (نماز) سب پہ بہت بھاری ہے' سوائے ان کے جو ڈرنے والے ہیں۔"
اس نے وحشت زدہ سی ہو کر سر اٹھایا۔ پنک اسکارف والے بہت سے سر اپنی کتابوں پہ جھکے تھے۔ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔
اس نے پھر سے ان الفاظ کو پڑھا۔ وہ کوئی مضمون نویسی نہ تھی' وہ گفتگو تھی۔ بات "کوئی کر رہا تھا" اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔
It's talking to me
ساتھ بیٹھی لڑکی نے سر اٹھایا۔
"تو یہ ٹاک ہی تو ہے۔ کلام۔ اس کو ہم کلام پاک اسی لیے تو کہتے ہیں۔" وہ سادگی سے کہہ کر اپنے سپارے پہ جھک گئی۔
محمل نے سپارہ بند کر دیا' اور کچھ بھی اٹھائے بنا' تیزی سے بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھتی گئی۔
فرشتے اپنے آفس میں آئی تو وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔
"محمل تم؟"
"میں... میں آئندہ نہیں آؤں گی' میں مدرسہ چھوڑ رہی ہوں۔" وہ جو کرسی پہ بیٹھی تھی' بے چینی سے کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا خوف اور گھبراہٹ تھی۔ فرشتے نے آرام سے فائل میز پہ رکھی اور کرسی کی دوسری جانب جگہ سنبھالی' کھڑکی کے بلائنڈز بند تھے' کمرے میں چھاؤں سی تھی۔
"آپ میری بات سن رہی ہیں؟"
"بیٹھو۔" وہ میز کی دراز کھول کر جھکی کچھ تلاش کرنے لگی تھی۔ محمل بمشکل ضبط کرتی کرسی پہ ٹکی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ ادھر سے بھاگ جائے۔
"میں نہیں آؤں گی آئندہ فرشتے!" اس نے دہرایا۔ وہ ابھی تک دراز سے مصروف تھی۔
"پھر کہاں جاؤ گی؟"
"بس قرآن چھوڑ رہی ہوں۔"
"اسے چھوڑ کر کہاں جاؤ گی محمل!" وہ کچھ کاغذات نکال کر سیدھی ہوئی اور اسے دیکھا۔
"اپنی نارمل لائف میں۔"
"تمہیں یہ ابنارمل لائف لگتی ہے؟"
"یہ مجھ سے بات کرتی ہے فرشتے!" وہ دبی دبی سی چیخی۔ "آپ سمجھ نہیں سکتیں میں کتنے کرب سے گزر رہی ہوں۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا۔ آپ سمجھ نہیں سکتیں۔"
"میں سمجھ سکتی ہوں' جب قرآن مخاطب کرنے لگتا ہے تو سب اس کرب سے گزرتے ہیں۔"
"نہیں۔" اس نے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ کسی کے ساتھ نہیں ہو سکتا جو میرے ساتھ ہوا' آپ تصور نہیں کر سکتیں۔"
"تمہیں لگتا ہے تم پہلی ہو؟"
اس نے گہری سانس لے کر آنکھیں بند کیں اور سر دونوں ہاتھوں میں گرا لیا۔
"ہم انسان ہی تو یہ بوجھ اٹھانے کے قابل ہیں' پھر تم اتنی کمزور کیوں پڑ رہی ہو؟ ہم پہاڑ ہوتے تو نہ سہار سکتے' دب جاتے۔"
اس نے آہستہ سے سر اٹھایا۔ فرشتے کو وہ لمحے بھر میں بہت بیمار لگی تھی۔
"وہ میری سوچیں پڑھ رہی ہے فرشتے!"
"وہ مخلوق نہیں ہے' وہ کلام ہے' بات ہے اللہ کی بات' اور اللہ ہی تو سوچیں پڑھ سکتا ہے۔"
"وہ مجھ سے ہی ہو گی؟"
"نہیں... میں اللہ تعالیٰ سے بات کر رہی تھی؟"
"تمہیں کوئی شک ہے؟"
"یہ چودہ سو سال پرانی کتاب ہے' یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ پاسٹ (ماضی) میں ہو کر ہم سے چودہ سو سال بعد کے فیوچر (مستقبل) سے خود کو کنیکٹ کرے۔ اِٹس لائیک اے میریکل۔" (یہ تو معجزہ کی طرح ہے)
"یہی تو ہم اسے کہتے ہیں۔ معجزہ!"

"اور جب یہ ختم ہو جائے گی؟"
"تو پھر سے شروع کر لینا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے قرآن کے معجزے بار بار دہرانے سے کبھی پرانے نہیں ہوں گے۔ تمہارا بتا رہی ہوں۔"
"نہیں... میں اسے چھوڑ دوں تو؟"
فرشتے نے تاسف سے اسے دیکھا۔
"محمل! جب روز قیامت اللہ زمین آسمان کو لپیٹ لے گا تو ہر چیز کھنچی چلی آئے گی طوعاً" یا کرہاً "خوشی سے یا ناخوشی سے۔ جب ہم اللہ کے بلاوے پہ طوعاً اور قرآن کی طرف نہیں آتے تو اللہ ہمارے لیے ایسے حالات بنا دیتا ہے' دنیا اتنی تنگ کر دیتا ہے کہ ہمیں زبردستی سخت ناخوشی کے عالم میں آنا پڑتا ہے اور پھر ہم کرہاً" ہی بھاگ کر آتے ہیں اور اس کے علاوہ ہمیں کہیں پناہ نہیں ملتی۔ اس کی طرف طوعاً" آ جاؤ محمل! ورنہ تمہیں کرہاً" آنا پڑے گا۔"
محمل مزید کوئی بحث نہ کر سکی۔
اسے فرشتے کی بات سے بے حد خوف آیا تھا۔ اسے لگا وہ اب کبھی قرآن چھوڑ نہ سکے گی۔

✲ ✲ ✲

اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس ایک لفظ میں اس کی زندگی کا سب سے بڑا امتحان چھپا ہے تو وہ اسے کبھی مس نہ کرتی' اور نہیں تو اس کا مطلب لغت میں ہی تلاش کر لیتی' مگر جانے کیسے وہ اس سے لکھنا رہ گیا تھا۔
آج کا رکوع میڈم مصباح کے علاوہ ایک اور ٹیچر پڑھا رہی تھیں۔ میڈم ذکیہ آیات بنی اسرائیل کے ہیکل میں داخل ہونے کا قصہ بیان کر رہی تھیں۔
"اور دروازے میں داخل ہو جاؤ سجدہ کرتے ہوئے' اور کہو "حطۃ" ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے اور عنقریب ہم محسنین کو زیادہ دیں گے۔"
وہ آیت پڑھ کر اب الفاظ کی گہرائی میں جا رہی تھیں۔
"حطۃ" کا مطلب گرانا مراد گناہ گرانے یعنی بخشش مانگنے سے ہے' اب بنی اسرائیل نے کیا یہ کہ انہوں نے جیسا کہ اگلی آیت میں ذکر ہے' منہ ٹیڑھا کر کے بات کو بدل دیا' وہ سجدہ کرتے یعنی جھک کر "حطۃ" کہہ کر داخل ہونے کے بجائے حنطۃ hinta tun کہہ کر ___ داخل ہوئے۔ حنطۃ گندم کو کہتے ہیں۔"
وہ تیز تیز قلم چلا کر لکھ رہی تھی کہ کسی نے بڑھی سے چین اس کے رجسٹر پہ رکھا۔ اس نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا۔
ایک کلاس انچارج اس کے سر پہ کھڑی تھیں۔
"بعض لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن ان کے لیے دعا کرتا ہے اور بعض لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور قرآن ان پہ لعنت کرتا ہے۔"
"کیا ہوا میم؟"
"آپ رجسٹر قرآن پہ رکھ کر لکھ رہی ہیں۔"
انچارج نے صوفے سے آگے دیکھا تو اس نے گھبرا کر قرآن نیچے سے نکالا۔ یہ اس کا تجوید کا قرآن تھا' سپل آف وائٹ جلد والا۔
"سوری میم۔" اس نے قرآن احتیاط سے ایک طرف رکھا' اور رجسٹر پہ جھک گئی۔ پھر ادھر ادھر ساتھ والی لڑکی کے رجسٹر پہ جھانکا کہ دیکھ سکے کہ حنطۃ کا کیا مطلب میڈم نے لکھوایا ہے' مگر اس نے کچھ نہ لکھا تھا۔ قرآن کی کلاس تھی' وہ بول نہ سکتی تھی' سو مایوسی سے واپس اپنے نوٹس کو دیکھا۔ صفحے کی لائن یہاں ختم ہوتی تھی' وہاں اس نے لکھ رکھا تھا "حنطۃ" یعنی گند... "گندم" کے وال سے آگے صفحہ ختم تھا۔
بعض دفعہ ہم میکانکی انداز میں کچھ لکھتے ہوئے جب صفحہ ختم ہو جائے تو آگے جو بھی چیز ہو' بجلے نیچے رکھی ہوئی کتاب ہو یا ڈیسک کی لکڑی اس پہ لکھ ڈالتے ہیں' اور بعد میں یاد ہی نہیں آتا۔
"گند اس کا مطلب ہے؟" وہ اس ادھورے لفظ پہ حیران ہوئی۔ کوئی سینس نہ بنتا تھا' مگر خیر وہ آگے لکھنے لگی۔ سوچا بعد میں کسی سے پوچھ لے گی' مگر بعد میں یاد ہی نہ رہا۔
چھٹی کے وقت اس نے ہمایوں کو اپنے گیٹ کا دروازہ بند کرتے دیکھا۔ وہ بک چڑھا کر پلٹا ہی تھا کہ وہ

سامنے آکھڑی ہوئی۔

پنک اسکارف میں مقید چہرہ کندھے پہ بیگ سفید یونیفارم اور سینے پہ ہاتھ باندھے وہ تیکھی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ تبدیلی کیسے آئی؟" وہ بے اختیار مسکرا دیا۔ غالباً "اچھے موڈ میں تھا۔ محمل اسی طرح تیکھی سخت نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

"خیریت؟" وہ دو قدم آگے بڑھا۔ اس کے پیچھے سیاہ گیٹ کے باہر اس کا مستعد چوکیدار کن انکھیوں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ جو آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ہمایوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے اور وہ سخت تیوروں کے ساتھ سینے پہ بازو لپیٹے۔

"آپ کو مسئلہ کیا ہے فواد بھائی کے ساتھ؟"

"شاطر مجرم کسی بھی پولیس آفیسر کے لیے چیلنج ہوتے ہیں اور مجھے چیلنج لینے میں مزا آتا ہے۔"

"اس چکر میں اگر آپ الٹا پھنس گئے تو؟"

"میں کیوں پھنسوں گا؟ تم نے کورٹ میں مکر جانا ہے نا۔"

"آپ کو کس نے کہا کہ میں مکر جاؤں گی؟"

"کیا مطلب؟" وہ یکلخت چونکا۔

وہ اسی طرح تیکھی نگاہوں سے دیکھتی واپس پلٹی اور سینے پہ بازو لپیٹے سر جھکائے سڑک پہ چل دی۔ عقل کے سارے راستے عجیب دھوئیں میں گم ہوتے تھے وہ کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

کتنے دنوں بعد آج وہ شام کی چائے سرو کرنے ٹرالی دھکیلتی باہر لائی تھی۔ لان میں سب بڑے یونہی بیٹھے تھے۔ ادھر ادھر کی خوش گپیاں، تبادلہ خیال چل رہے تھے۔

"محمل میری چائے میں [illegible] ڈالنا بیٹا۔" [illegible] جس بے تکلفی سے کہہ کر غفران چچا [illegible] باتوں میں مصروف ہوگئے، ناعمہ اور [illegible] نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا [illegible] فواد چل گیا تھا۔ ان دونوں کا الائنس (اتحاد) تائی مہتاب سے ہٹ کر بن چکا تھا۔ دونوں کے خواب اسے داماد بنانے کے چکنا چور ہو چکے تھے۔ اور وہ اب مزید تائی کی خوشامدیں کرنے کے بجائے انہیں بے رخی دکھانے لگی تھیں۔

"یہ لیجیے آغا جان۔" اس نے بھی پورے اعتماد سے کپ ان کو تھمایا اور پھر تائی مہتاب کو، جو الگ سی گم صم سی بیٹھی تھیں۔

"تھینک یو محمل۔" جانے انہوں نے کس دل سے بظاہر مسکرا کر کہا۔ فضہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ناعمہ کو ہلکا سا اشارہ کیا۔ ناعمہ نے "ہونہہ" کہہ کر سر جھٹکا۔ ان کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ یہ اچانک وہ اس پہ اتنے مہربان کیوں ہو رہے تھے۔

وہ خالی ٹرالی لیے اندر آئی تو سیڑھیوں سے اترتا حسن جو شرٹ کے کف بند کر رہا تھا اسے دیکھ کر [illegible] رک گیا۔ "محمل!"

ٹھیک یہی منظر اس کی آنکھوں میں لہرایا تھا۔ فواد کا یونہی اترنا پھر اس کا اسے چائے دینا اور وہ انگلی کا ٹکرانا۔ کیا اب فواد نے یہ سوچا تھا کہ یہ لڑکی بھی کوئی ہتھیار بن سکتی ہے اتنی ارزاں تھی وہ؟

منظر وہی تھا، کردار بدل چکا تھا۔ [illegible] آنکھوں میں کرچیاں سی چبھنے لگیں۔

"[illegible]" تیزی سے [illegible]

"محمل [illegible]" [illegible] سے اس کے پیچھے لپکا، اور [illegible]

[illegible] سے سلیب صاف کر رہی تھیں محمل ساتھ ہی کرسی پہ رخ موڑے بیٹھی تھی۔ اونچی سی پونی ٹیل جس سے اس کی لمبی گردن پیچھے جھکتی تھی اور کرتے کے اوپر دوپٹے کو شانوں پہ ٹھیک سے پھیلائے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے وہ چہرہ موڑے بیٹھی تھی۔ اس کے اس سائیڈ پوز سے بھی حسن کو اس کی جھکی آنکھوں کا سوگوار سا رنگ دکھائی دے رہا تھا۔ اسے لگا وہ بدل گئی ہے۔

"محمل! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

مسرت کا سلیب پہ گرتا ہاتھ تو رک گیا، انہوں نے حیرت سے گردن موڑی۔

"حسن"

"چچی! محمل کو کہیں ذرا میری بات سن لے۔"

انہوں نے اسے دیکھا جو بے تاثر سی لب بھینچے سر جھکائے کرسی پہ بیٹھی تھی۔

"محمل! حسن بلا رہا ہے۔"

"میں ان کے باپ کی نوکر ہوں جو [illegible]" دل چاہا وہ یہ کہہ دے مگر آج ہی تو فرشتے نے اس سے کچھ کہا تھا۔

"محمل [illegible]" مسرت [illegible]

"نہیں، جو کہنا ہے [illegible] کہہ دیں۔" منظور نہیں ہے تو [illegible] سر جھکائے ٹیبل کو دیکھ رہی تھی [illegible] جو آخری جرح میں اس نے کھائی تھی وہ [illegible] سانس تک گھٹتی تھی۔

"[illegible] کیوں نہیں ہو [illegible]" وہ بے بس سا اس کے سامنے آیا۔ "تمہیں فواد کے لیے استعمال کر رہے ہیں، تم خود کو اس کیس میں مت الجھاؤ۔"

اس نے گردن اٹھائی، وہ اس کے سامنے کھڑا فکر مندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

محمل کا چہرہ بے تاثر تھا، بالکل سپاٹ۔

"آپ نے کہہ لیا جو کہنا تھا؟ اب آپ جا سکتے ہیں۔"

اس نے آلوؤں کی ٹوکری قریب کھسکا کر میز سے چھری اٹھائی، وہ چند لمحے بے بس سا اسے دیکھتا رہا پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔ مسرت الجھی سی اس کے قریب آئیں۔

"کس کیس کی بات کر رہا ہے حسن؟"

"آلو گوشت میں بناؤں گی، آپ قورمہ دیکھ لیجیے گا اور کھیر بھی، [illegible] میں نہیں چاہتی کسی کو کوئی شکایت ہو۔" وہ اب [illegible] سی آلو چھیل رہی تھی۔

مسرت گہری سانس لے کر سلیب صاف کرنے لگیں، وہ جانتی تھیں اب وہ نہیں بتائے گی۔

اور وہ آلو چھیلتے اس عجیب بات کو سوچ رہی تھی جو صبح اس کو فرشتے نے کہی تھی۔ جب وہ رشتے داروں اور یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کی آیتیں پڑھ کر تڑپ گئی تھی اور پوچھا تھا کہ جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں ان کے لیے کیا سزا بتائی گئی ہے۔

"یتیموں سے پہلے قرابت داروں کا ذکر ہے محمل۔"

"میں اور میری ماں ان قرابت داروں کی جیسے خدمت کرتے ہیں، آپ سوچ بھی نہیں سکتیں۔"

"تو اس خدمت کا کبھی ان کو احساس بھی دلایا؟"

"ماں تو ہر وقت چپ رہتی ہیں، مگر میں ادھار رکھنے کی قائل نہیں ہوں، وہ ایک سنائیں تو دس سناتی ہوں، ایک ایک آنسو گنواتی ہوں جو بہاؤں۔"

اس نے فخر سے کہا اور پھر فرشتے کا سنجیدہ چہرہ دیکھا تو لگا کچھ غلط کہہ دیا ہے۔

"یعنی سب کیا کرایا ملیا میٹ کر دیتی ہو، یہ تو ان پہ ظلم ہے۔"

"وہ ظلم کریں تو؟ میں ظلم کرتی ہوں ان پہ؟" وہ ششدر رہ گئی۔

"ظلم کی تعریف کیا ہوتی ہے؟ کسی کے حق میں کمی کرنا۔ ایک کی ایک سنانا برابر کا بدلہ ہے مگر دو سنانا زیادتی ہے، ان کے حق میں کمی ہے۔"

"تو مجھے جو بولیں وہیں اور میں آگے سے چپ کر جاؤں؟ ایک بھی نہ سناؤں؟"

"تم اگر سناؤ گی تو سب برابر کر دو گی، پھر تم ان کے کیے کا شکوہ کسی سے کرنے کی حق دار نہیں ہو گی۔ معاف کر دیا کرو اور جانتی ہو، معاف کرنا کیا ہوتا ہے؟"

اس کا سر خود بخود نفی میں ہل گیا۔

"اس کو دکھ نہ دینا جس نے آپ کو دکھ دیا ہو۔ ان کو ان کے رویے کا احساس تک نہ دلانا، کچھ نہ جتانا، یہ معاف کرنا ہوتا ہے۔ تم معاف کر دیا کرو، صبر کیا کرو۔"

"ساری زندگی صبر ہی تو کیا ہے میں نے۔"

"وہ صبر نہیں ہوتا جو تم کرتی ہو۔ صبر وہ ہوتا ہے کہ اگر سر پہ بھاری پتھر بھی لگ جائے تو لبوں سے اف تک نہ نکلے۔ صبر وہ ہوتا ہے جو تمہاری ماں کرتی ہیں۔"

"اور احسان؟"

"صبر اور معاف کرنے کے بعد ان کے برے رویے کے جواب میں بہت اچھا رویہ دو۔"

"میں کیوں کروں یہ سب۔ وہ کیوں نہیں کرتے؟ رشتے داروں کے ساتھ ویسا ہی رویہ رکھنا چاہیے جیسا وہ ہمارے ساتھ رکھتے ہوں۔"

"مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایسا کرتے تھے کہ بدلے کی صلہ رحمی کرنے والا صلہ رحمی نہیں کرتا۔ اس پہ تو آپ کو اجر ہی نہیں ملے گا۔ اجر تو تب ملے گا جب آپ برے کے جواب میں اچھا کریں۔ تم انہیں معاف کرو اور اپنا حق اللہ سے مانگو۔"

"انہوں نے میری جائیداد کھائی ہے۔" وہ چیخ پڑی تھی "ابا اپنی ساری پراپرٹی میرے نام کر گئے تھے۔"

"بہت غلط کر گئے تھے پھر۔ انہیں حق ہی نہیں تھا کہ ساری پراپرٹی وصیت کرتے۔ ان کا حق تو بس ایک تہائی تھا۔ اس کو بے شک تمہارے نام وصیت کر جاتے مگر باقی کے دو تہائی حصے کی شرعاً تقسیم کی اجازت دے جاتے تو شاید تمہارے چچا لوگ اپنے حصے پہ قناعت کر لیتے۔ وارث تو اللہ نے بنائے ہیں۔ جانے والے کو برا بھلا نہیں کہہ رہی مگر ایک غلط فیصلہ بہت سوں کی زندگیاں خراب کر دیتا ہے۔ محمل! تم کچھ لوگوں کے غلط فیصلوں کو بنیاد بنا کر اپنے رشتہ داروں پہ ظلم کرو گی تو یہ مت بھولو کہ پل صراط پہ رحم اور امانت کے کانٹے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ ہر خائن اور قطع رحمی کرنے والے کو وہ پل سے نیچے جہنم میں گرائیں گے اور ہر امانت دار اور صلہ رحمی کرنے والا پل پار کر جائے گا۔ تم وہ پل پار نہیں کرنا چاہتیں؟"

وہ سر جھٹک کر تیز تیز آلو چھیلنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"میڈم مجھے ایک بات پوچھنا ہے۔"

"جی ضرور پوچھیے۔"

"وہ میم۔ مجھ سے نماز پڑھی نہیں جاتی تو خیر ہے؟"

"ہاں کیوں نہیں خیر ہے۔ اٹس او کے اگر آپ نہیں پڑھ سکتیں تو۔" محمل کو لگا منوں بوجھ اس کے کاندھوں سے اتر گیا ہو۔ وہ ایک دم کسی قید سے آزاد ہو گئی۔

"وہی تو میم! میں باقی نیکیاں کر لوں، قرآن پڑھ لوں، ٹھیک ہے نا نماز پڑھنا بہت ضروری تو نہیں ہے؟"

"نہیں، کتنا ضروری تو نہیں ہے۔ اگر آپ نہیں پڑھنا چاہتیں تو نہ پڑھیں۔"

"میم! کوئی فرق تو نہیں پڑے گا نا؟"

"قطعاً فرق نہیں پڑے گا۔ یہ بالکل آپ کی اپنی مرضی پہ ہے۔"

"اوہ۔ اوکے۔" وہ بے حد آسودہ سی مسکرائی۔ مگر میڈم مصباح کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

"یقین کریں محمل! کوئی فرق نہیں پڑے گا اسے۔ آپ بے شک نماز نہ پڑھیں، بے شک سجدہ نہ کریں، جو ہستیاں اس کے پاس ہیں، وہ اس کی عبادت [illegible] نہیں کرتیں۔ اگر آپ کر لیں اسے کیا فرق پڑے گا؟ اس آسمان کا بالشت بھر بھی حصہ خالی نہیں [illegible] فرشتہ سجدہ نہ کر رہا ہو۔ اور فرشتے [illegible] ہے؟ جب اس پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام کو [illegible] کر دیکھا تھا تو جبرئیل علیہ السلام کا [illegible] زمین سے آسمان تک تھا۔ اور ان کے [illegible] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان نظر نہیں آیا [illegible] ہوتے ہیں فرشتے۔ 70 ہزار [illegible] کا طواف کرتے ہیں، یہ تعداد عام سی لگتی [illegible] جانتی ہو، جو 70 ہزار فرشتے روز طواف کرتے ہیں ان کی باری پھر قیامت تک نہیں آئے گی۔ اس رب کے پاس اتنی لاتعداد ہستیاں ہیں عبادت کرنے کے لیے، آپ نماز نہ بھی پڑھیں تو اسے کیا فرق پڑے گا؟"

میڈم مصباح جا چکی تھیں اور وہ دھواں دھواں [illegible] کے ساتھ کتابیں سینے سے لگائے ساکت سی کھڑی تھی۔ اس کو لگا وہ اب بھی نماز چھوڑ نہیں سکے گی۔

شام میں اس نے بہت اہتمام سے عصر پڑھی پھر لاؤنج میں فون اسٹینڈ کے ساتھ بیٹھی ہی تھی کہ [illegible] کو فون کرے۔ ناعمہ چچی معاذ کو کان سے پکڑے بے بس سی ڈانٹ رہی تھیں اور وہ کان چھڑا کر بھاگ [illegible] منہ چڑاتا بھاگ گیا تھا۔

"اتنا شیطان ہو گیا ہے یہ لڑکا، کیا کروں میں اس [illegible]۔" وہ کمر پہ ہاتھ رکھے پریشانی سے بولیں اور محمل کی [illegible] نمبرز پریس کرتی انگلیاں تھم سی گئیں۔

"شیطان ہو گیا ہے لڑکا۔" اس نے زیر لب دہرایا۔

لفظ شیطان کا روٹ ورڈ کیا تھا؟ شین، طا، نون (ش ط ن) شطن، یعنی رحمت سے دور، اللہ کی رحمت سے [illegible] ہوا اور کیا انہوں نے اپنے بچے کو اللہ کی رحمت سے دور ہوا کہہ دیا؟

"چچی۔" اس نے ہولے سے انہیں پکارا۔ فون کا ریسیور ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

"ہاں؟" ناعمہ چچی نے پریشانی سے چونک کر اسے دیکھا۔

"معاذ کو شیطان تو نہ کہیں۔ چچی اللہ نہ کرے وہ شیطان ہو۔ شیطان تو اللہ کی رحمت سے دور ہونے کو کہتے ہیں۔"

"اچھا اچھا۔ بس کرو، دو سیپارے کیا پڑھ لیے اب ہمیں سکھائیں گی یہ۔ ہونہہ ان کا تو قبلہ ہی بدل گیا ہے۔" وہ استہزائیہ کہتی باہر نکل گئیں اور وہ جہاں تھی وہیں سن سی بیٹھی رہ گئی۔

"ان کا تو قبلہ ہی بدل گیا ہے۔" وہ فقرہ اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔

بہت پہلے ملنے والی وہ سیاہ فام لڑکی ایک دم اسے یاد آئی تھی۔

"اس میں تمہارا ماضی ہے، حال ہے اور مستقبل لکھا ہے۔"

☼

وہ بے حد خاموشی سے برتن دھو کر ریک میں لگا رہی تھی۔ دھلی پلیٹوں سے پانی کے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ اس کے ہاتھ سست روی سے کام کر رہے تھے۔ وہ کچن میں اکیلی تھی۔ اماں جانے کہاں تھیں۔ باقی لوگ تو کام کے وقت کچن میں آنا مزاج کے خلاف سمجھتے تھے، مگر خیر، اس نے سر جھٹکا۔ وہ اب کوشش کرتی تھی کہ ایسی سوچوں کو دل میں جگہ نہ دے۔ اب محسوس ہوتا تھا کہ اس نے اپنے بد صورت رویے سے اپنے اور ان کے درمیان فرق نہ رکھا تھا۔ پہلے وہ ہر چیز اسی دنیا میں برابر کرنے پہ تلی تھی۔ اب اس

[illegible] کرنا شروع کر دیا تھا۔

زندگی ویسے بھی اب لطف ہو گئی تھی۔ اب مسجد کی بچیوں نے اسے دیر سے آنے پہ الٹی میٹم دے دیا تھا' وہ خود بھی اپنی تجوید درست کرنے فجر کے بعد آنا چاہتی تھی کہ تب لڑکیاں اکٹھی بیٹھ کر تجوید کی پریکٹس کرتی تھیں۔ صرف یہ مسئلہ تھا کہ فجر کے وقت فرنچ لاک ہوتا تھا' اس کے لاکھ کہنے پہ بھی کسی پہ اثر نہ ہوا تھا' اس کے پاس اپنے ناشتے کے پیسے نہ تھے' یا تو وہ ٹرانسپورٹ کا کرایہ ادا کرتی یا اپنا ناشتہ لا کر رکھتی۔ سو ناشتہ قربان کر کے اس نے وین والے کو فیس دی۔ اور روز صبح تہجد پہ اٹھ کر وہ آدھے گھنٹے اپنا ہوم ورک کرتی' پھر پڑھ کر نکل جاتی۔ عصر کے قریب اس کی واپسی ہوتی۔ ہمارے بزرگ کہا کرتے تھے' علم فقر و فاقے کے بغیر نہیں آتا' ٹھیک ہی کہتے تھے۔

اس نے آخری پلیٹ ریک پہ رکھی' ٹونٹی بند کی اور ہاتھ خشک کرتی اپنے دھیان میں پلٹی ہی تھی کہ کچن کے کھلے دروازے میں کسی کو کھڑا دیکھ کر ٹھٹکی اور پھر دوسرے ہی پل ساکت رہ گئی۔

"کیسی ہو؟" فواد سینے پہ ہاتھ باندھے مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ گنگ سی بنا پلک جھپکے اسے دیکھے گئی۔ یہ کب واپس آیا؟

"تم مجھے بہت یاد آئیں محمل! میں ایک بہت بڑی سازش کا نشانہ بنا ہوں۔"

"اماں۔ اماں۔" وہ ایک دم بلند آواز میں پکارنے لگی۔ خون ابلنے لگا تھا' اسے محسوس ہوا اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" مسرت بوکھلا کر اندر آئیں اور پھر فواد کو دیکھ کر چپ سی رہ گئیں۔

"فواد بیٹا تم؟"

"چاچی۔" وہ ان کی طرف بے قراری سے لپکا۔ "میرے ساتھ بہت بڑی سازش ہوئی ہے۔ یہ سب اس اے ایس پی کا کیا دھرا ہے۔ میں بھلا محمل کے ساتھ ایسا کر سکتا ہوں؟ محمل تم۔" وہ اب اس کی جانب مڑا۔ "تم جانتی ہو میں بے قصور ہوں۔ ریکارڈنگ جو انہوں نے تمہیں سنوائی' وہ ان کے کسی فنکار کی تھی۔ ہم ان پولیس والوں کو بھتہ نہیں دیتے اس لیے انہوں نے ایسا کیا۔ تم یاد کرو تم نے خود کہا تھا کہ تم سائن کروانے چلی جاتی ہو۔ میں نے اگر سودا کیا ہوتا تو میں تمہیں مجبور کرتا۔"

وہ ایک دم چونکی۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا مگر۔

"آپ نے۔ آپ نے مجھ پہ الزام لگایا کہ آپ نے مجھے رنگے ہاتھوں۔" اس سے آگے بولا نہیں گیا۔

"وہ سب مجھے اے ایس پی نے رات کو کہا تھا کہ میں تمہارے اور اس کے درمیان آنے کی کوشش نہ کروں' بھلا بتاؤ' میں ایسا کر سکتا ہوں' پھر مجھے یقین آ گیا کہ تم جیسی باکردار اور پارسا لڑکی ایسا نہیں کر سکتی۔ میں پورے گھر کے سامنے تمہارے کردار کی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ چاچی! آپ میرا یقین کریں۔"

وہ بے بس سا مسرت کے پاس جھکا اور ان کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"یقین کریں' میں نے کچھ نہیں کیا [illegible] سمجھتی ہیں کہ محمل میری وجہ سے [illegible] میں محمل سے شادی کرنے کو تیار ہوں۔ [illegible] جب تک تایا جان [illegible] ہو جائیں گے۔ آپ ہاں تو کریں [illegible] محمل سے میری شادی ہو جائے' پھر [illegible] پورے خاندان میں عزت [illegible] محمل [illegible] ہم پر وہ انگلی نہیں اٹھا سکیں گے۔ اللہ [illegible] ہم ایسا کریں گے۔"

"فواد! تم سچ کہہ رہے ہو؟" فرط جذبات سے مسرت کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔

وہ جو ساکت سی سلیب کا سہارا لیے کھڑی تھی' ایک دم بھاگتی ہوئی باہر نکل گئی۔

اس نے رات کا کھانا نہیں کھایا' بس سر منہ لپیٹے پڑی رہی۔ باہر سے چہل پہل کی آوازیں آ رہی تھیں' ہنسی مذاق' باتیں' شور' قہقہے گویا جشن کا سماں تھا' اشتہا انگیز کھانوں کی مہک اس کے کمرے تک آ رہی تھی مگر اس کا کسی چیز کے لیے دل نہ چاہ رہا تھا۔

وہ چت لیٹی دیر تک چھت پہ گھومتے پنکھے کو دیکھتی رہی تھی۔ تینوں پر گول گول گھوم رہے تھے۔ بار بار ایک ہی مدار کے گرد چکر کاٹتے' آخر میں وہیں پہنچ جاتے جہاں سے چلے تھے۔ وہ بھی وہیں پہنچ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح پرنسپل کی کشادہ سفید سیڑھیاں وہ ننگے پاؤں سست روی سے اتر رہی تھی' سفید شلوار قمیص کے اوپر پنک اسکارف نفاست سے اوڑھے' ایک ہاتھ ریلنگ پہ رکھے وہ [illegible] پہ چلتی جانب بائیں سے نیچے آئی تھی۔

پرنسپل کے گلاس ڈورز بند تھے۔ شیشوں کے پار [illegible] اتر رہی تھی۔ اس کو آج کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا' وہ چپ چاپ اپنی جگہ پہ آئی۔ بیگ ڈیسک پہ رکھا اور [illegible] کے انداز میں بیٹھی۔

اگر کالج ہوتا تو یقیناً وہ آج نہ آتی' اتنی ڈپریسڈ ہو گئی تھی کہ وہ پڑھ نہ سکتی تھی۔ مگر وہ کالج نہ تھا' نہ ہی وہ پڑھنے آئی تھی۔ وہ تو سننے آئی تھی۔

بعض چیزیں اتنی حیرت انگیز ہوتی ہیں کہ انسان ان پہ حیران ہونا ترک کر دیتا ہے۔ معجزانہ کتاب بھی ایسی ہی تھی' عاجز کر دینے والی' مبہوت کر دینے والی۔ وہ جو سوچتی تھی' اس کتاب میں لکھا آ جاتا تھا۔ اب محمل نے حیران ہونا ترک کر دیا تھا۔ اسے لگا' وہ اب کبھی حیران نہ ہو سکے گی مگر آج کی آیات پہ پھر وہ چونکی تھی۔

"اور لوگوں میں سے کوئی ہے' اچھی لگتی ہے تمہیں اس کی بات دنیا کی زندگی کے متعلق۔" اس نے سر گھٹنوں پہ رکھ دیا اور بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ لیے۔

"اور وہ اپنی بات پہ اللہ کو گواہ بنا لاتا ہے' جبکہ حقیقت میں وہ سخت جھگڑالو ہے۔"

اس نے سر اٹھایا' چہرہ دائیں جانب گھمایا' پنک اسکارف میں لپٹی لڑکیاں سر جھکائے تیزی سے قلم چلا رہی تھیں۔ وہاں کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے [illegible] کیا گزر رہی ہے۔ کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ کیا محسوس کر رہی ہے۔

بس وہی جانتا تھا جس نے یہ کتاب اس کے لیے اتاری تھی۔ اسے کبھی کبھی لگتا تھا' بس اسی کی کہانی ہے' کسی اور کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔

"اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے۔"

اس نے دونوں کنپٹیوں کو انگلیوں سے سہلایا۔

"اچھی لگتی ہے تمہیں۔"

وہ آہستہ سے اٹھی' سیپارہ بند کیا اور کچھ بھی لیے بغیر سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔

"اس کی بات۔"

"وہ دھیرے دھیرے زینے چڑھ رہی تھی۔"

"دنیا کی زندگی کے متعلق۔"

وہ آخری زینہ عبور کر کے راہداری کی طرف بڑھی۔

"اور وہ اپنی بات پہ اللہ کو گواہ بنا لاتا ہے جبکہ حقیقت میں وہ سخت جھگڑالو ہے۔" وہ تھکاوٹ سے باہر برآمدے کے اسٹیپس پہ بیٹھ گئی۔ سامنے ہرا بھرا لان تھا۔ وہ ستون سے سر ٹکائے لان کے سبزے کو خالی خالی آنکھوں سے دیکھے گئی۔

یہ تو اس نے اپنے دل سے بھی نہ کہا تھا کہ اسے فواد کی بات اچھی لگی تھی۔ اس کی آفر فریب تھی' دلکش تھی۔ وہ اپنے دل سے اقرار کرتے ڈرتی تھی مگر وہ تو ہر نگاہوں کی خیانت بھی جانتا ہے' اس سے کیسے چھپ سکتی تھی کوئی بات۔ مگر اس نے اسے ڈانٹا نہیں' ذلیل نہیں کیا جیسے لوگ کرتے تھے' اس کا تماشا نہیں بنایا جیسے خاندان والے بناتے تھے۔ اس کی بات سنی ان سنی نہیں کی جیسے نادیہ کرتی تھی' کوئی ڈانٹ ڈپٹ' لعن طعن نہیں۔ بس وہی ایک نرم مہربان انداز جس کی ترغیب میں وہ قرآن سننے آئی تھی' وہ ڈانٹتا ہی تو نہیں تھا' اس کی طرح کوئی سمجھاتا ہی نہ تھا۔ کوئی اس کی طرح تھا ہی نہیں۔

وہ وہیں بیٹھی تھی جب ساتھ ہی وہ لڑکی آ بیٹھی۔ غالباً "بریک" تھی۔ اور لڑکیاں اس میں بھی بیٹھ کر تجوید کرتی تھیں۔

وہ تھوڑی ہتھیلی تلے رکھے، چہرہ موڑے یونہی اسے دیکھے گئی۔

وہ لڑکی گھٹنوں پہ قرآن رکھے بائیں ہاتھ سے صفحے پلٹ رہی تھی، دایاں ہاتھ یونہی ایک طرف گرا پڑا تھا۔ مطلوبہ صفحہ کھول کر اس نے بائیں ہاتھ سے گرے ہوئے ہاتھ کو اٹھایا اور گود میں رکھا، پھر ٹھیک ہاتھ سے صفحے کا کنارہ پکڑے پڑھنے لگی۔

"ان المسلمین والمسلمات۔"

وہ رک رک کر اٹک اٹک کر پڑھتی، بار بار آواز ٹوٹ جاتی۔ وہ پھر سے شروع کرتی، مگر ہکلاہٹ زدہ زبان پھر ساتھ چھوڑنے لگتی۔ مخارج صحیح نہ نکل پاتے۔ وہ بدقت تمام ایک لفظ بولتی تو ساتھ "گھل گھل" آواز بھی آتی۔

یکدم محمل کو احساس ہوا وہ رونے لگی تھی۔ اس کا مفلوج دایاں ہاتھ بار بار نیچے گر جاتا، وہ بائیں ہاتھ سے اسے اٹھاتی، پھر سے تجوید سے پڑھنے کی کوشش کرتی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور آنسو ابل کر گال پہ لڑھکنے لگے۔ وہ بائیں ہاتھ سے آنسو رگڑتی، دبی دبی سسکیوں کے ساتھ پھر سے کوشش کرنے لگی۔

محمل گم صم سی اسے دیکھے گئی۔ وہ اپاہج لڑکی اپنے اللہ سے بات کر رہی تھی، وہ اس کا بہت ہمدرد تھا۔ اسے محمل کی ہمدردی کی اس وقت ضرورت نہ تھی، لمحے بھر کو بھی اسے اس پہ ترس نہ آیا تھا، بلکہ رشک ہوا تھا۔ کوئی ایسے بھی تڑپ کر قرآن پڑھتا ہے جیسے وہ پڑھ رہی تھی؟ اور ایک ہم ہیں، برسوں اس مصحف کو لپیٹ کر سب سے اونچے شیلف میں سجائے رکھتے ہیں اور بس سجائے ہی رکھتے ہیں۔ وہ اسی طرح ہتھیلی تھوڑی تلے جمائے گردن پوری اس کی طرف موڑے پلک جھپکے بنا اسے دیکھے جا رہی تھی۔

وہ پھر سے ہکلاتی زبان سے پڑھنے لگی، مگر ٹھیک پڑھا نہ جا رہا تھا، آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ دبی دبی سسکیوں کے درمیان وہ مسلسل استغفراللہ کہتی جا رہی تھی۔ عام سی شکل کی اپاہج لڑکی۔ اسے بے اختیار وہ سیاہ فام لنگڑی لڑکی یاد آ گئی۔

وہ کتنوں کو سہارا دیے ہوئے تھا، اور وہ کتنے بدنصیب ہوتے ہیں جو تلاوت کی آواز سن کر کان بند کر لیتے ہیں۔ کبھی میں بھی ان بدنصیبوں میں تھی۔

وہ آہستہ سے اٹھی اور سر جھکائے چل دی۔

برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھی اپاہج لڑکی اسی طرح رو رہی تھی۔

✲ ✲ ✲

وہ گیٹ بند کر کے اندر داخل ہوئی تو لان میں کرسیاں ڈالے تقریباً تمام کزنز بیٹھے تھے۔ فواد بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔ وہ کسی بات پہ ہنس رہا تھا، شرٹ کا اوپری بٹن کھولے، قیمتی رسٹ واچ پہنے، اس کے پرفیوم کی مہک یہاں تک آ رہی تھی۔

وہ کرسیوں کا دائرہ بنا کر بیٹھے تھے۔ یہ ندا تھی جو اس کی بات دلچسپی سے سن رہی تھی۔ جبکہ آرزو بھی اس دائرے میں لاتعلق سی بیٹھی تھی اور فائقہ بھی... پھپھو کی فائقہ۔ وہ بھی جیسے فواد سے احتراز برت رہی تھی۔ جیل جانے کے بعد بھلے تائی مہتاب تاویلیں پیش کرتیں فواد کی اہمیت اب وہ نہ رہی تھی۔

وہ کتابیں سینے سے لگائے سر جھکائے تیز تیز چلنے لگی۔

"محمل!" وہ ابھی برآمدے کے اسٹیپ پہ تھی جب فواد نے بے اختیار پکارا۔ اس نے ایک پاؤں سیڑھی پہ رکھے گردن موڑی۔ وہ مسکرا کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے کام ہے۔" روکھے تاثرات دے کر وہ برآمدے کا دروازہ پار کر گئی۔ سلان میں بہت سی معنی خیز نگاہوں کا تبادلہ ہوا تھا۔

"اس کی ہمت کیسے ہوئی کہ یوں مجھے سب کے سامنے بلائے۔ سبالی فٹ!" وہ پیر پٹختی اندر آئی تھی۔ لاؤنج میں حسن نظر آیا تو ایک دم ٹھٹک کر رکی، پھر سر جھٹک کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

"محمل!" اس کے قدم رک گئے مگر پلٹی نہیں۔

"تمہیں فواد کی ہر بات پہ یقین ہے؟"

"مجھے آپ پہ بھی یقین نہیں ہے۔" اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ تیزی سے کمرے کی طرف بڑھ کر اس نے دروازہ کھولا اور پھر دھڑام سے اپنے پیچھے بند کیا۔

حسن نے تاسف و بے بسی سے چہرہ اوپر اٹھایا، پھر ست روی سے اوپر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

✲ ✲

اس نے پیچھے بال کر چٹیلی کا ... بند کیا، جھک کر چولہا قدرے آہستہ کیا اور کٹنگ بورڈ کی طرف آئی جہاں سلاد کی سبزیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ وہ وہیں کھڑے کھڑے سر جھکائے کھٹ کھٹ سبزیاں کاٹنے لگی۔

"ارے محمل!" رضیہ پھپھو نے اندر جھانکا۔ اس نے سر اٹھایا۔ آج اس نے پونی نہیں باندھی تھی اور بھورے لمبے بال شانوں پہ گر رہے تھے۔ جنہیں اس نے کانوں کے پیچھے اڑس رکھا تھا۔

"جی پھپھو؟" وہ آہستہ سے گویا ہوئی، یہ محمل کے اندر ایک واضح تبدیلی تھی، وہ پہلے جیسی بدلحاظ نہ رہی تھی، ورنہ پہلے تو اسے مخاطب کرتے ہوئے ڈر لگا کرتا تھا۔

"میں نے سوچا، ذرا تمہاری کوئی مدد کروا دوں۔ مسرت کو تو بھابھی نے دوسرے کاموں پہ لگا رکھا ہے۔ کوئی تُک ہے بھلا؟ جب دیکھو، بے چاری سے کام ہی کرواتی رہتی ہیں۔"

"تو کوئی بات نہیں پھپھو! ہمارا فرض ہے۔" وہ نرمی سے مسکرا کر پھر سے سبزی کاٹنے لگی تھی۔

"یہ فواد رہا کب ہوا؟" پھپھو سامنے کاؤنٹر سے ٹیک لگائے رازداری سے گویا ہوئیں۔

"معلوم نہیں۔"

"بیک ہے، بڑا ظلم کیا اس نے تمہارے ساتھ۔ میرا تو اس کی شکل دیکھنے کا دل نہیں کرتا۔"

وہ سر جھکائے کھٹا کھٹ پیاز کاٹتی جا رہی تھی۔ آنکھوں میں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

"بڑا دل تھا میرا بھی فائقہ کے لیے، مگر دل ایسا ٹوٹا کہ ادھر آنے کو بھی نہیں چاہتا تھا، کتنے چہرے نکلتے ہیں نا لوگوں کے محمل!"

"جانے دیں پھپھو انا للہ پڑھ لیں۔ فائقہ باجی کوئی کم تھوڑی ہیں۔ وہ کسی اچھے بندے کے قابل ہیں، اچھا ہی ہوا جو بھی ہوا۔"

اسے پھپھو کے آزردہ چہرے کو دیکھ کر دکھ ہوا تھا، یہ پہلی دفعہ تھا کہ وہ اس کے ساتھ یوں بات کر رہی تھیں، ورنہ پہلے تو درمیان میں محمل نے اتنی دیواریں کھڑی کر رکھی تھیں کہ انہیں پاٹنا مشکل تھا، وہ اس کے ابا کی ایک ہی بہن تھیں۔ وہ کیوں لوگوں سے شکایت کرے؟ اس نے خود بھی تو کبھی بنا کر رکھنے کی کوشش نہ کی تھی۔

"ہاں۔ وہ تو ٹھیک ہے مگر۔"

اسی لمحے فواد نے کچن کا دروازہ کھولا۔ ان دونوں نے چونک کر ادھر دیکھا، محمل کے لب سختی سے بھنچ گئے۔ وہ تیز تیز سبزی کاٹنے لگی۔

"محمل! ایک کپ چائے مل سکتی ہے؟"

"یہ فارغ نہیں ہے۔ اپنی بہنوں سے کہو، وہ فارغ ہی بیٹھی تھیں باہر۔" پھپھو نے نہایت بے رخی سے کہا، وہ چند لمحے کھڑا رہا، پھر واپس مڑ گیا۔

"ہونہہ، حکم دیکھو کیسے چلا رہا ہے۔ تم ذرا بھی اس کی نہ سنا کرو۔ میرے بھی کتنے خواب تھے۔ ہمیں کوئی کمی تھوڑی ہے۔ فائقہ کے ابا کے بزنس کا تو تمہیں پتا ہے، کروڑوں میں کھیلتے ہیں۔ ان کی طرح یتیموں کا مال نہیں کھاتے۔"

"میں یتیم نہیں ہوں پھپھو! میں بالغ ہوں، اور بلوغت کے بعد یتیمی نہیں ہوتی۔"

وہ اب سلاد میں لیموں نچوڑ رہی تھی۔

"ہاں ہاں، تمہیں پتا ہے؟ ابھی فائقہ کے ابا نے نیا گھر بنوایا ہے، دوسرا گھر تو پھر سے فرنش کر کے فائقہ کو جہیز میں دیں گے۔"

محمل کی لیموں نچوڑتی انگلیاں تھمیں۔ ایک خیال

کے پیش نظر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"پھپھو!" اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ "آپ کو مدد کی ضرورت ہوگی نا۔ گھر شفٹ کیا ہے۔ آپ اکیلے کیسے کریں گی سب؟ نوکروں پہ بھروسہ کر ہی نہیں سکتے۔ میں آجاؤں آپ کے پاس؟ ہیلپ کروا دوں گی۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" پھپھو تو نہال ہو گئیں۔ "میں تم سے کہنے ہی لگی تھی پھر سوچا تمہاری پڑھائی ہے۔" (تو اسی لیے اتنا پیار جتا رہی تھیں نخرہ)

"کوئی بات نہیں' ویک اینڈ ہے' پھپھو۔ آپ کی ہیلپ بھی تو کرانی ہے نا۔"

اسے فواد سے دور رہنے کا یہی طریقہ نظر آیا تھا' پھپھو نے تو فوراً "ہاں" بھر لی۔ وہ جلدی سے اپنا بیگ تیار کرنے لگی۔

تیاری کیا تھی۔ دو جوڑے رکھے' چند ضروری چیزیں اور پھر قرآن رکھتے رکھتے وہ رہ گئی۔

"قرآن تو وہاں ترجمے والا مل ہی جائے گا' دو دن کی تو بات ہے' اب ساتھ کیا رکھوں۔ کوئی بات نہیں۔" اس نے بیگ کی زپ بند کر دی۔

☼ ☼ ☼

پھپھو کا سامان شفٹ ہو گیا تھا' بس ڈبوں میں بند تھا۔ وہ جاتے ہی کام میں لگ گئی' فائقہ تو ٹی وی میں ہی مگن تھی۔ ڈش بھی لگ گئی تھی اور وہ بہت شوق سے کچھ دیکھ رہی تھی۔ پھپھو نے اس سے کچھ نہ کہا' محمل ہی ساری چیزیں نفاست سے سیٹ کرتی رہی۔

رات گیارہ بج گئے جب اس نے آج کے لیے بس کی۔ اور پھر نہا کر نیا سوٹ پہنا' پھر نئے سرے سے وضو کیا اور دوپٹہ سر پہ لپیٹے' وہ پھپھو کے پاس چلی آئی۔

"پھپھو! آپ کے پاس ترجمے والا مصحف ہے نا؟"

"کیا ترجمے والا؟" وہ اپنے کپڑوں کی الماری سیٹ کر رہی تھیں۔

"قرآن۔ قرآن ہو گا۔" اس نے جلدی سے وضاحت کی۔

"ترجمے والا تو... فائقہ کی دادی کا تھا' پچھلے گھر میں۔ مگر وہ کسی نے مانگ لیا تھا' ترجمے تفسیر والا ہو گا۔"

"اچھا۔ چلیں' سادہ ہی دے دیں۔"

"کتابوں کے ڈبے سے نہیں نکلا؟"

"نہیں تو میں نے خود ساری کتابیں ادھر رکھی ہیں۔"

"پھر شاید کہیں مس پلیس ہو گیا ہو' فائقہ سے پوچھ لو۔" وہ پھر سے کام میں مگن ہو گئیں۔

وہ بے دلی سے فائقہ کے پاس آئی۔

"فائقہ باجی! آپ کے پاس قرآن ہو گا؟"

"میرے پاس؟ مجھے کیا کرنا ہے؟" وہ الٹا حیران ہوئی۔ "اماں سے پوچھو' ان کو ہی پتا ہو گا۔"

وہ مایوس سی خود ہی ڈھونڈنے لگی۔ کتابوں کے ریک کو پھر سے دیکھا' ایک ایک چیز چھان ماری' مگر قرآن نہ تھا نہ ملا۔

وہ اپنے کمرے میں آئی اور اپنا بیگ پھر سے کھولا۔ شاید کوئی معجزہ ہو جائے اور شاید اس نے قرآن رکھ دیا ہو' سارے کپڑے اوپر نیچے کیے' مگر وہ ہوتا تو ملتا۔

وہ پھر سے لاؤنج میں گئی۔

"فائقہ باجی! آپ کے پاس کوئی کیسٹ ہو گی تلاوت کی؟"

"نہیں!" فائقہ نے لاپروائی سے شانے جھٹکے۔ "کوئی چینل ہو گا' تلاوت آتی ہو؟"

"تنگ مت کرو محمل! میں مووی دیکھ رہی ہوں۔"

وہ اکتا کر پھر ٹی وی کی طرف موڑ کر بیٹھ گئی۔

محمل تھکے تھکے قدموں سے واپس آئی اور پھر بیڈ پر بیٹھ کر جانے کیوں رونے لگی تھی۔

رات وہ بے چین سی نیند سوئی۔ اگلا سارا دن کام کرواتے وہ "مغموم" سی بے چین رہی' کھانے کے بھی چند لقمے لیے' اس سے کھایا ہی نہیں جا رہا تھا۔

ہفتے اور اتوار کے وہ دو دن اس کی زندگی کے بے چین ترین دن تھے۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا وہ اڑ کر گھر پہنچ جائے اور اپنا قرآن تھام لے۔ کوئی ایسا اتفاق تھا کہ رضیہ پھپھو کا ڈرائیور چھٹی پہ چلا گیا' وہ اب ان کے میاں نفیس انکل سے کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ گھر سے بھی کوئی نہیں لینے آ جائے گا' وہ جانتی تھی۔

اللہ اللہ کر کے اتوار کی رات گھر سے گاڑی اسے لینے آئی۔

پھر جس لمحے وہ گھر میں داخل ہوئی' بجائے کہیں اور جانے کے' بجائے کسی سے ملنے کے وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں گئی' شیلف پہ بیگ ایک طرف ڈالا اور شیلف پر سے قرآن اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ اب وہ زندگی بھر قرآن کے بغیر کہیں نہیں جائے گی۔ لوگ چابی' بٹوہ اور موبائل کے لیے پلٹتے ہیں' قرآن کے لیے کوئی واپس نہیں آتا۔

"محمل!" اماں پکارتی ہوئی آئیں تو اس نے آنسو خشک کیے اور اپنے مصحف کو احتیاط سے شیلف پہ رکھا۔

"محمل بیٹا!" اماں نے دروازہ کھولا اور ایک خط/لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ "تمہاری ڈاک آئی تھی۔"

"میری ڈاک؟" اس نے حیرت سے لفافہ تھاما۔ مسرت جلدی میں تھیں' لفافہ دے کر پلٹ گئیں۔

اس نے الجھتے ہوئے لفافہ چاک کیا اور اندر موجود کاغذات نکالے۔

وہ اسکالرشپ تھا جو اس کو دیا گیا تھا۔ انگلینڈ میں اعلیٰ تعلیم کا اسکالرشپ۔

وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"محمل۔ تمہاری ڈاک آئی تھی۔ کیا یہ وہ اسکالرشپ تھا؟"

کھانے کی میز پہ تائی جان نے پوچھا تو یکدم سناٹا چھا گیا۔ محمل نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ سب ہاتھ روکے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"جی۔" اسے اپنی آواز کہیں دور سے آتی سنائی دی۔ خوشی اور رشک سے خالی آواز۔

"کیوں؟ کلاسز کب اسٹارٹ ہوں گی؟" تایا جان بات کرنے کے ساتھ ساتھ چھری کانٹا پلیٹ میں رکھ کر رکے تھے۔ باقی سب دم سادھے محمل کو دیکھ رہے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک بڑی خبر تھی۔

"ستمبر میں۔"

"تمام اخراجات وہی اٹھائیں گے؟"

"جی۔" وہ بھی جواب دینے کے ساتھ ساتھ کھانے لگی تھی۔ ڈائننگ ہال میں اب اس کے چمچے کی آواز بھی آرہی تھی۔

"ویری گڈ۔"

"انگلینڈ میں؟"

"اسکالرشپ؟"

"محمل انگلینڈ چلی جائے گی؟"

سرگوشیاں چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔ اس نے سر جھکائے خاموشی سے کھانا ختم کیا' پھر کرسی دھکیل کر اٹھی اور بنا کچھ کہے ڈائننگ ہال سے چلی گئی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ خوش تھی' یا ناخوش۔ اسے ایک نئی زندگی گزارنے کا موقع مل رہا تھا' اسے خوش ہونا چاہیے۔ لیکن پھر یہ ناخوشی؟ دل ڈوبنے کا یہ احساس؟ شاید یہ اس لیے تھا کہ اس صورت میں اسے علم الکتاب اور مسجد چھوڑنی پڑے گی۔ قرآن کی تعلیم ادھوری رہ جائے گی۔ لیکن وہ تو میں بعد میں بھی کر سکتی ہوں۔ انگلینڈ جانے کا موقع بعد میں نہیں ملے گا۔

ان ہی سوچوں میں گم نیند نے اسے آ لیا۔

☼ ☼ ☼

صبح کلاس میں سیپارہ کھولتے وقت اسے امید تھی کہ آج کے سبق میں اس کے اسکالرشپ کے بعد کے خیالات کے متعلق آیات ضرور آجائیں گی' لیکن آج کی آیات سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کے کسی قدیم قصے کی تھیں۔

یہ پہلی دفعہ ہوا تھا کہ اسے اس کا جواب نہیں مل رہا تھا اور وہ واقعہ جو بیان کیا جا رہا تھا وہ بھی قدرے ناقابل فہم تھا بلکہ تھا نہیں 'اسے لگا تھا۔ وہ اسکالر شپ بھلا کر اس واقعے میں ہی الجھ گئی۔

واقعہ کچھ یوں تھا کہ جب طالوت کا لشکر جالوت سے مقابلے کے لیے نکلا تو راستے میں آنے والی ایک نہر میں ان کے لیے آزمائش ڈال دی گئی۔ اللہ نے اس نہر کے پانی کو سوائے ایک چلو کے 'پینے سے منع کیا تو جو لوگ پانی پینے گئے 'وہ نہر پہ بیٹھے رہ گئے اور جنہوں نے چلو سے زیادہ نہ پیا' وہ آگے نکل گئے' اور انہی میں حضرت داؤد علیہ السلام تھے جنہوں نے جالوت کو قتل کر کے اس کو اپنے انجام تک پہنچایا۔

پوری تفسیر سن کر بھی اسے نہ سمجھ آیا کہ بھلا نہر کا پانی کیوں نہیں پینا تھا؟ پانی تو حرام نہیں ہوتا' پھر کیوں؟

وہ پورا دن یہی سوچتی رہ گئی تھی' یہاں تک کہ رات جب میٹھا لینے کچن میں آئی تو بھی یہی سوچ رہی تھی۔

کچن خالی تھا' اس نے فریزر کا ڈھکن کھولا' سویٹ ڈش کے ڈونگے نکالے' ٹرے میں رکھے اور ٹرے اٹھائے باہر آگئی۔

"پھر جب طالوت اپنے لشکروں کے ساتھ جدا ہوا۔"

وہ ٹرے اٹھائے ڈائننگ ہال میں آئی۔ اونچی پونی جھلکے سر سے اور اٹھ جاتی تھی۔ کندھوں پہ پھیلایا دوپٹہ' اور شفاف چہرے پہ سنجیدگی لیے' اس نے ٹرے ٹیبل پہ رکھی۔ سب وقفے وقفے سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ متاثر' جلن زدہ نگاہیں۔

"اس نے کہا' بے شک اللہ تم کو آزمانے والا ہے ایک نہر کے ساتھ۔"

وہ خاموشی سے ٹرے سے ڈونگے نکال رہی تھی۔ پہلا ڈونگا اس نے آغا جان کے سامنے رکھا۔

"تو جو کوئی اس نہر سے پیے گا' وہ مجھ سے نہیں ہے۔"

دوسرا ڈونگا دونوں ہاتھوں میں ہی اٹھا کر اس نے ٹیبل کے وسط میں رکھا۔

"اور جو کوئی اس نہر سے نہ پیے گا' سوائے اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر پینے کے' وہ بے شک مجھ میں سے ہے۔"

اس نے آخری ڈونگا ٹیبل کے آخری سرے پہ رکھا اور واپس اپنی کرسی پہ آگئی۔

"تو سوائے چند ایک کے انہوں نے اس (نہر میں) سے پی لیا۔"

سب سویٹ ڈش شروع کر چکے تھے۔ شیشے کے پیالوں اور چمچوں کے ٹکرانے کی آوازیں وقفے وقفے سے آرہی تھیں' ان آوازوں کے درمیان وہ مدھم مہربان آواز بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی' اور وہ تو ابھی تک وہیں کہیں اس آواز میں کھوئی تھی۔

"تو سوائے چند ایک کے 'انہوں نے اس میں سے پی لیا۔"

اس نے پیالہ آگے کیا' اور تھوڑی سی کھیر اپنے پیالے میں ڈالی۔

"تو سوائے چند ایک کے 'انہوں نے اس میں سے پی لیا۔"

وہ اب آہستہ آہستہ چھوٹے چھوٹے چمچ لے رہی تھی۔

"تو تمہیں کب تک جانا ہو گا محمل؟"

آغا جان نے پوچھا تو یکدم پورے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ چمچوں کی آواز رک گئی۔ سب نے گردنیں اس کی طرف موڑیں۔ اس نے سر اٹھایا۔ سب اس کی طرف متوجہ تھے۔

"اگست کے اینڈ تک۔"

"یعنی تم ستمبر سے پہلے تک نہیں ہو گی۔"

"میں"

"کیا مطلب؟" آغا جان چونکے۔

"میں نہیں جا رہی۔" اس نے چمچ واپس پیالے میں رکھا اور نیپکن سے لب صاف کیے۔

"کیا مطلب؟"

"تم اتنا بڑا اسکالر شپ چھوڑ دو گی؟" فضہ چچی نے تحیر سے کہا تھا۔

"میں چھوڑ چکی ہوں۔"

"مگر... مگر کیوں؟"

وہ نیپکن ایک طرف رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیونکہ ہر جگہ رکنے کے لیے نہیں ہوتی۔ اگر میں نے اس نہر سے پانی پی لیا تو میں ساری عمر ادھر ہی بیٹھی رہ جاؤں گی اور طالوت کا لشکر دور نکل جائے گا۔ بعض حلال چیزیں کسی خاص وقت میں حرام ہو جاتی ہیں۔ اگر اس وقت آپ اپنے نفس کو ترجیح دیں' تو بڑا کام کرنے والے لوگ دور نکل جاتے ہیں۔ میں نہر پہ ساری عمر بیٹھی نہیں رہنا چاہتی۔ مجھے داؤد بننا ہے' جو جالوت کو مار سکے۔"

وہ سوچ کر رہ گئی' اور کہا' پھر آہستہ سے بولی۔

"مجھے ابھی قرآن پڑھنا ہے۔" اور تیز تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

شام کی ٹھنڈی ہوا اپنے ساتھ بہہ رہی تھی۔ وہ چائے کا کپ لیے ٹیرس پہ کرسی ڈالے دور آسمان کو دیکھ رہی تھی جہاں شام کے پرندے اپنے گھروں کو اڑتے جا رہے تھے۔

ٹیرس سے سامنے والوں کا گھر نظر آتا تھا۔ ان ہی بریگیڈیئر صاحب کا گھر جن کی قرآن خوانی ایک روز اس نے دیکھی تھی۔ قرآن کو بھی پتا نہیں ہم لوگوں نے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔

اس نے کسی خیال کے تحت کپ سائیڈ پہ رکھا اور اٹھی۔ ابھی مڑی ہی تھی کہ سامنے فواد کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹی۔

وہ اندر کھلنے والے دروازے میں کھڑا تھا' سینے پہ ہاتھ باندھے لب بھینچے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم مجھ سے کترا کیوں رہی ہو۔ حالانکہ تم جانتی ہو' میرا قصور نہیں ہے۔" وہ چپ رہی۔

"کل دوپہر تین بجے میں اسٹاپ پہ تمہارا انتظار کروں گا' مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ آئی ہوپ کہ تم ضرور میری بات سننے آؤ گی۔" وہ کہہ کر

ایک طرف ہو گیا۔ محمل کا راستہ کھل گیا۔ وہ بنا اسے دیکھے تیزی سے دروازہ پار کر گئی۔

ایک قسم تھی جو اس نے کھائی تھی' وہ اسے توڑ نہیں سکتی تھی' اور اس لمحے' سیڑھیاں اترتے اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ اس قسم کے بوجھ سے اب نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اب اس سے وہ قسم نبھائی نہیں جا رہی۔ بس اگر ایک دفعہ وہ فواد سے باہر مل لے تو کیا ہو جائے گا؟ بس ایک دفعہ۔ کل دوپہر تین بجے۔ نہیں میں قسم نہیں توڑوں گی اس نے گھبرا کر سر جھٹکا۔ اس کے اندر کی سوچیں اسے وحشت زدہ کرنے لگی تھیں۔ پھر اسے یاد آیا' وہ ٹیرس سے بھلا کیوں نیچے آنے لگی تھی؟ اور ہاں وہ قرآن خوانی والا گھر وہ کچھ سوچ کر گھر سے باہر آگئی۔

ساتھ والا بنگلہ بیلوں سے ڈھکا خوب صورت بنگلہ تھا' اس نے گیٹ کے ساتھ نصب بیل پہ ہاتھ رکھا' دوپٹہ شال کی طرح کندھوں کے گرد لپیٹے اونچی سی ہوئی پونی ٹیل ادھر ادھر جھلاتی وہ ارد گرد کا جائزہ لے رہی تھی۔

قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور پھر گیٹ کھلا۔ اسی ملازم کی شکل سامنے آئی۔

"جی؟"

"بریگیڈیئر صاحب گھر پہ ہیں؟"

"نہیں' مگر آپ کون؟"

"میں محمل ابراہیم ہوں' ساتھ والے گھر میں رہتی ہوں' آغا ہاؤس میں۔ یہ کچھ پمفلٹس ہیں' بریگیڈیئر صاحب کو دے دینا' وہ پڑھ کر مجھے واپس کر دیں۔ میں ان سے واپس لینے ضرور آؤں گی۔ یہ ذمہ داری میں تمہیں دے رہی ہوں' اور ذمہ داری امانت ہوتی ہے۔ اگر امانت میں خیانت کی تو پل صراط پار نہیں کر سکو گے۔ سمجھے؟"

چند پمفلٹس اور کارڈز اسے تھما کر اس نے تنبیہہ کی تو ملازم نے گھبرا کر "اچھا جی" کہہ کر سر اندر کر لیا۔

☼ ☼ ☼

وہ شام' وہ رات اور وہ اگلی صبح بہت کٹھن تھی۔ وہ لمحے بھر کو بھی سو نہ سکی تھی۔ ساری رات بستر پہ کروٹیں بدلتے گزری۔ مستقبل بہت سے اندیشوں کی دھند میں لپٹا نظر آتا تھا۔ وہ کیا کرے' کس سے مشورہ کرے' کس سے پوچھے؟

اور جواب تو اسے سوچنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جب صبح کے قریب اس نے قسم توڑنے کا سوچا تو بستر سے نکلی اور معاملہ اللہ پہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

کل ان کی کلاس میں سورۃ بقرہ ختم ہوئی تھی' اور آج آل عمران شروع ہونا تھی۔ سنا تھا' پہلی گیارہ آیات پڑھنی تھیں۔ اسے پکا یقین تھا کہ کوئی حل آج کے سبق میں موجود ہو گا۔ سو اس نے آج کی آیات کھولیں۔

پھر ان تمام آیات کو اس نے دو تین دفعہ پڑھا' طبیعت میں عجیب سی بے چینی پیدا ہوئی۔ وہاں کوئی ذکر نہ تھا۔ نہ قسم کا' نہ قسم توڑنے کے کفارہ کا۔

"کفارہ؟" وہ چونکی۔ "تو کیا میں قسم توڑنا چاہتی ہوں؟"

"ہاں!" دل نے واضح جواب دیا تو اس نے خود سے نگاہیں چرا کر مصحف بند کیا اور اوپر رکھ دیا۔

فرشتے ایک فائل پہ سرسری نگاہ ڈالتے کاریڈور میں سے گزر رہی تھی جب وہ پھولی سانس کے تقریباً دوڑتی ہوئی اس کے سامنے آئی۔

"فرشتے! مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔"

فائل کا صفحہ کے کنارہ فرشتے کی انگلیوں کے درمیان تھا' اس نے سر اٹھایا۔

"السلام علیکم! کیا بات ہے؟"

"وعلیکم السلام۔" وہ پھولی سانسوں کے درمیان تیز تیز بول رہی تھی۔ "وہ ایک فتویٰ لینا ہے۔"

"میں مفتی نہیں ہوں۔"

"مگر بس ایک فقہی مسئلہ ہے۔"

"ضرور پوچھنا' مگر آج کی تفسیر … کون سا ہے تمہارا مسئلہ۔" محمل کو …

"آپ کو میرے مسئلے کا پتہ …"

"مگر نہیں' مجھے تو آج کی آیات کا بھی تفسیر … میڈم مصباح لیتی ہیں نا آج کل آپ کی کلاسز؟"

"پھر آپ کو کیسے پتہ کہ …"

"کیونکہ یہی ہمیشہ ہوتا ہے۔ تفسیر کلو سٹ کرلو' تمہارا مسئلہ کلیر کٹ لفظوں میں آجائے گا۔" اس نے فائل کا صفحہ پلٹا اور سرسری سا اوپر نیچے دیکھنے لگی۔

"مگر میں نے آج کی آیات پڑھ لی ہیں' ان میں میرا مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے پتہ ہے۔"

"صبر لڑکی! علم صبر کے ساتھ آتا ہے۔ تفسیر کے بعد پوچھ لینا' مگر اس کی یقیناً نوبت نہیں آئے گی۔" وہ ہلکا سا اس کا گال تھپتھپا کر فائل دیکھتی آگے بڑھ گئی۔ محمل نے اپنے گال کو چھوا' پھر سر جھٹک کر کاریڈور میں آگے بھاگ گئی۔

یہ کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ جو سوچے' وہ قرآن میں لکھا ہوا نہ آئے۔ لوگ اس کی بات نہیں سنتے تھے' سنتے تھے تو توجہ نہیں کرتے' اگر توجہ بھی کرتے تو سمجھتے نہیں' اور ایک قرآن تھا' اسے کہنا بھی نہ پڑتا اور وہ دل کی بات دھیان سے سنتا' توجہ کرتا' سمجھتا اور پھر دانائی اور حکمت سے اسے سمجھاتا تھا اور اس جیسا کوئی نہ سمجھاتا تھا۔

مگر اسے لگا آج کی آیات میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو اس سے متعلق ہو۔

بہت سے دل اور … نے سپارہ کھولا' وہ سفید چادر پہ دو زانو … ڈیسک پہ سپارہ کھلا پڑا تھا … طرف رجسٹر تھا جس پہ جھکی وہ تیز تیز لکھ رہی …

… میڈم مصباح محکم آیات اور متشابہ آیات کا مطلب سمجھا رہی تھیں۔

"محکمات وہ آیات ہیں جن کا مطلب ہم سمجھ سکتے ہیں' مثلاً" احکامات' اس دنیا کی باتیں' دنیا کے کسی باغ کی مثال' تاریخی واقعات اور متشابہات وہ آیات ہیں جو ہم تصور نہیں کر سکتے' مگر ان پہ ایمان بالغیب لانا ضروری ہے' مثلاً" جنت' دوزخ' اللہ کا ہاتھ' فرشتوں کی وسعت۔ مشابہات کے پیچھے نہیں پڑنا

چاہیے۔ اور جو پڑے' اس سے دور رہنا چاہیے۔
میڈم منہاج یہی سمجھا رہی تھیں۔ سست روی سے تمام پوائنٹس رجسٹر پہ لکھ رہی تھی۔

"متشابہات پہ ایمان بالغیب ایسا ہونا چاہیے جیسے..." میڈم کی آواز ہال میں گونج رہی تھی "جیسے اگلی آیات میں ذکر ہے کہ راسخون فی العلم کن پہ ایمان لاتے ہیں۔ اب یہ راسخون فی العلم کون ہوتے ہیں؟ ایک ہوتا ہے طالب علم' ایک صاحب علم اور اس سے بڑا درجہ راسخ العلم والے کو ہوتا ہے۔ یہ کون لوگ ہوتے ہیں؟ ان کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ راسخون فی العلم کون ہوتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"وہ جو قسم پوری کرتے ہیں۔"

محمل کے ہاتھ سے پین گر پڑا۔ سیاہی کے چند چھینٹے چادر کو بھگو گئے۔

میڈم آگے بھی کہہ رہی تھیں "جن کے دل مستقیم ہوں۔"

مگر وہ یک ٹک پھٹی پھٹی نگاہوں سے سیپارے پہ لکھے "راسخون فی العلم" کے الفاظ کو دیکھے جا رہی تھی۔ ایک ہی تکرار اس کے کانوں میں بار بار گونج رہی تھی۔

"وہ جو قسم پوری کرتے ہیں۔"

وہ بس سکتہ کی کیفیت میں سیپارے کو دیکھ رہی تھی۔

"راسخون فی العلم" سیپارے کے الفاظ دھندلا گئے۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تھے۔

صدیوں پہلے عرب کے صحراؤں میں کچھ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا کہ پختہ علم والے کون ہوتے ہیں۔ اور تب انہوں نے بتایا تھا کہ وہ جو قسم پوری کرتے ہیں۔ اسے لگا صدیوں پہلے کہی گئی بات کسی اور کے لیے نہیں' صرف اس کے لیے تھی۔ وہ انگلیوں کے پوروں سے ان تین الفاظ کو بار بار چھو رہی تھی' انہیں محسوس کر رہی تھی۔ آنسو اس کے گالوں سے لڑھک کر گردن پہ پھسل رہے تھے۔

"ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی۔" اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ قسم کھانا ناپسندیدہ تھا' لیکن اب وہ اسے ہمیشہ نبھانی تھی۔ اور جانتی تھی کہ یہی اس کے لیے بہتر تھا۔

اس روز وہ تین بجے سے پہلے ہی گھر آگئی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ صبح بہت زردی طلوع ہوئی تھی۔ آئینے کے سامنے کھڑی خود کو دیکھ رہی تھی۔ آج اس نے اونچی پونی کے بجائے سادہ سی چوٹی بنائی تھی۔ شفاف چہرے پہ ذرا سی پژمردگی چھائی تھی۔ وہ چند لمحے خود کو دیکھتی رہی' پھر سیاہ چادر سر پہ رکھی اور ٹھوڑی تک لپیٹ کر بکل دوسرے کندھے پہ ڈالی۔ آج اسے گواہی دینی تھی۔ فواد کے خلاف یا اپنے خلاف۔

لاؤنج میں تینوں چچا انتظار کر رہے تھے۔ کلف لگے سفید شلوار قمیص میں آغا جان کمر پہ ہاتھ باندھے ادھر ادھر بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ اسے راہداری سے آتے دیکھا تو رک گئے۔

"چلیں۔" وہ سپاٹ چہرہ لیے ان کو دیکھے بغیر دروازے کی طرف بڑھی اور اسے کھول کر باہر نکلی۔ وہ سب اکٹھے باہر نکلے۔

گیٹ کھلا' یکے بعد دیگرے دونوں گاڑیاں پورچ سے باہر سڑک پہ رواں دواں ہوئیں۔ اس اونچے گھر کی بہت سی کھڑکیوں میں بہت سی آنکھیں ان کو جاتے دیکھ رہی تھیں۔ گاڑیاں چلی گئیں تو لڑکیوں نے پردے چھوڑ دیے۔

عدالت کی راہداری میں وہ سمٹی سمٹائی نگاہیں نیچی کیے آغا جان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ادھر ادھر پولیس والے' وکلاء اور کتنے ہی لوگ گزر رہے تھے۔ بہت وحشت ناک سی جگہ تھی وہ۔ اس سے سر نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔ بس لمحے بھر کو اس نے چہرہ اوپر کیا تو کاریڈور کے اختتام پہ وہ کھڑا تھا۔ اپنے کسی سپاہی کو اکھڑتے تیور لیے غصے سے کچھ کہتا یونیفارم میں ملبوس' سر پہ کیپ۔ وہ بہت وجیہہ تھا۔ اور زندگی میں پہلی دفعہ محمل کو اس پہ غصہ نہیں آیا تھا۔ اسے ان تمام لوگوں میں ایک وہی اپنا ہمدرد لگا تھا۔

اس نے نگاہیں جھکالیں۔ کاریڈور کے موڑ کے قریب ہی تھی جب ہمایوں کی نگاہ اس پہ پڑی اور وہ ٹھہر گیا۔ آغا کریم کے بائیں کندھے کے پیچھے چھپی ہوئی گردن جھکائے آتی' سیاہ چادر میں لپٹی لڑکی' جس کے چہرے پہ زمانوں کی تھکن رقم تھی۔ اس نے سر نہیں اٹھایا۔ وہ اسے دیکھتا رہا' یہاں تک کہ وہ اس کے قریب سے سر جھکائے گزر گئی۔

ہاں آغا کریم نے ایک تند نگاہ اس پہ ضرور ڈالی تھی۔

وہ اب گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ شاید وہ اس کی آنکھیں دیکھنا چاہتا تھا' انہیں پڑھنا چاہتا تھا۔ کاریڈور کے درمیان میں یکدم اس کالی چادر والی لڑکی نے گردن پیچھے موڑی۔ دونوں کی نگاہیں لمحے بھر کو ملیں۔ اسے محمل کی آنکھوں میں زمانوں کی تھکن دکھی تھی۔ پھر اس نے چہرہ موڑ لیا اور اسی طرح سر جھکائے اپنے چچاؤں کے نرغے میں آگے چلتی گئی۔

کمرۂ عدالت میں وہ قطار کی بائیں نشست پر سب سے پیچھے بیٹھی تھی۔ آغا جان اس کے دائیں طرف تھے۔ اس کے بائیں جانب کچھ نہ تھا' قطار خالی تھی۔ وہ سر جھکائے ساری کارروائی سنتی رہی۔ اس سے نظر تک نہ اٹھائی جاتی تھی۔ یوں جیسے ہر کوئی اسے ہی دیکھ رہا ہو۔

اور پھر ایک ساعت کو جیسے ہی اس نے سر اٹھایا۔ وہ دوسرے اسٹینڈ میں بیٹھا گردن ترچھی کیے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ہمایوں کی نگاہوں میں سوال تھے۔ چبھتے ہوئے' پریشان کن سوال۔ اس سے زیادہ دیر دیکھا نہ گیا۔ وہ گردن موڑ کر آغا جان کو دیکھنے لگی جو لب بھینچے وکلاء کے دلائل سن رہے تھے۔ نگاہوں کے ارتکاز پہ چونک کر محمل کو دیکھا۔

"کیا؟" وہ جس طرح انہیں دیکھ رہی تھی' وہ ذرا سے الجھے۔

"جائیداد میں میرا حصہ مجھے مل جائے گا؟" اس نے سرگوشی کی' نگاہیں ان پر سے ہٹائے بغیر۔

"ہاں' کیوں نہیں؟"

"یہی اگر میں پوچھتی کہ کیوں نہیں تو؟"

"کیا مطلب؟"

"میں ابھی جا کر ہمایوں داؤد کے خلاف بیان دوں تو کیا گارنٹی ہے کہ آپ مکر نہیں جائیں گے؟"

"تمہیں مجھ پہ شک ہے؟"

"اگر ہے تو؟"

آغا جان کے ماتھے پہ غصے کی لکیر ابھری جسے وہ ضبط کر گئے۔ "تم اب کیا چاہتی ہو؟"

"یہ!" اس نے کالی چادر میں سے بیگ نکالا' زپ کھولی اور ایک کاغذ اور پین نکال کر ان کی طرف بڑھائے۔

"میری صرف فیکٹری میں شیئرز کی قیمت نو کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ باقی کا حساب میں ابھی نہیں مانگ رہی۔ یہ آپ کی چیک بک کا چیک ہے' رقم میں نے بھر دی ہے' اسے سائن کر دیں۔" اس نے پین ان کے سامنے کیا' وہ کبھی اس کو دیکھتے' کبھی پین کو۔

"آغا جان! محمل بچی نہیں ہے۔ آپ مجھ سے میری آخرت خرید رہے ہیں۔ اگر میں نے جھوٹی گواہی دی' تو میں پل صراط پار کرنے سے پہلے ہی گر جاؤں گی۔ اگر گرنا ہے تو کچھ ورتھ تو ہونا چاہیے نا' آپ یہ سائن کریں۔ میں ابھی جا کر جھوٹی گواہی دیتی ہوں۔"

اس نے پین اور چیک ان کے ہاتھ پہ رکھا۔

"اس ہال میں کوئی میرے اشارے کا منتظر ہے۔ میں یہ چیک سائن کروا کر ابھی اس کو دے کر بھیجتی ہوں' جیسے ہی چیک کیش ہوگا' وہ مجھے سگنل کرے گا' تب میں گواہی دوں گی' ورنہ نہیں۔"

انہوں نے چیک کو ایک نظر دیکھا اور پھر پین کو۔ دوسری طرف محمل کا نام پکارا گیا۔ وہ انہیں متذبذب نگاہوں سے دیکھتی اٹھی اور سر اٹھائے پورے اعتماد

سے کٹہرے کی طرف بڑھی۔
آغا کریم کبھی چیک کو دیکھتے اور کبھی اسے جو کٹہرے میں کھڑی تھی اور اس کے سامنے غلاف میں لپٹا قرآن لایا گیا تھا وہ نگاہیں ان پہ جمائے پلک جھپکے بغیر قرآن پہ ہاتھ رکھ کر چند فقرے دہرا رہی تھی۔
انہوں نے آخری بار چیک کو دیکھا اور پھر طیش میں آکر اسے مروڑ کر دو ٹکڑے کیے۔
محمل تلخی سے مسکرائی، سر جھٹکا اور وکیل کی طرف متوجہ ہوئی، جو اس سے کچھ پوچھ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

فواد کی ضمانت منسوخ ہو گئی، اس کے خلاف ثبوت بہت سے تھے۔ وہ واپس جیل بھیج دیا گیا۔
واپسی کا سفر بہت خاموشی سے کٹا۔ وہ آغا جان کی لینڈ کروزر کی پچھلی سیٹ پہ بہت خاموشی سے سارا راستہ باہر دیکھتی آئی تھی۔ جب کار پورچ میں رکی تو وہ سب سے پہلے اتری۔
لان میں بہت سی عورتیں تیزی سے ان کی طرف بڑھی تھیں۔
"کیا ہوا؟" وہ کسی کو دیکھے بغیر تیزی سے اندر چلی گئی۔
"اس احسان فراموش لڑکی نے فواد کے خلاف گواہی دے دی۔"
"وکیل نہ ہو تو۔"
"مگر فکر کی بات نہیں ہے، وہ جلد ہی باہر آجائے گا، کیس اتنا مضبوط نہیں ہے۔"
غفران چچا اور اسد چچا انہیں تسلی دینے لگے، مگر تائی مہتاب کا چہرہ سفید پڑ گیا۔
"ہائے میرا فواد۔" وہ بیٹھے بیٹھے دو ہتڑ مار کر اونچا اونچا رونے لگیں، روتے روتے وہ لڑھکنے کو تھیں کہ فضہ اور ناعمہ نے بڑھ کر انہیں سہارا دیا۔ پل بھر میں لان میں کہرام مچ گیا تھا۔ اپنے کمرے میں پردے [illegible] پکڑ کر ذرا سی جھری سے دیکھتی وہ [illegible] کھڑی تھی۔ کالی چادر سر سے پھسل کر گردن پہ پڑے

بالوں پہ پھسل گئی تھی۔ بھورے بال چہرے کے اطراف میں گرے تھے۔ وہ کانچ سی سنہری آنکھیں سکیڑے پرسوچ نگاہوں سے باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ ستون سے ٹیک لگائے، ننگے پاؤں گھاس پہ رکھے بیٹھی تھی۔ جوتے ساتھ اترے پڑے تھے۔ سفید شلوار قمیص اور سر پہ گلابی اسکارف کس کر باندھے وہ گردن جھکائے دونوں ہاتھوں میں چھوٹا قرآن لیے پڑھ رہی تھی۔ چھٹی ہو چکی تھی اور لڑکیاں ادھر ادھر گزرتی باہر جا رہی تھیں۔ وہ سورہ کہف پڑھتی تھی۔ آج جمعہ تھا۔
"السلام علیکم۔" سارہ آہستہ سے آئی اور اس کے ساتھ پاؤں لٹکا کر سیڑھی پہ بیٹھی۔
اس نے صفحے کا کنارہ پکڑے سر کے اثبات سے جواب دیا اور صفحہ پلٹا۔
ربیعہ اپنی گود میں رکھی اسائنمنٹ حل کرنے لگی۔ گیٹ کے قریب فرشتے کھڑی ایک لڑکی سے بات کر رہی تھی۔ وہ لڑکی منمناتے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی مگر فرشتے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ اس کا انداز [illegible] مضبوط اور دو ٹوک مگر نرم انداز۔
"کیا کر رہی ہو سارہ؟"
"فرشتے باجی کی اسائنمنٹ کر رہی ہوں، فرشتے باجی نے دی ہے۔" [illegible] سر اٹھایا۔ "دین اور مذہب میں کیا فرق ہوتا ہے؟"
"دین [illegible] جیسے اسلام اور مذہب کسی بھی دین کے اندر [illegible] آف تھاٹ کو کہتے ہیں۔ مسلک مذہب کے اندر کسی طریقے کا نام ہوتا ہے۔ مثلاً فقہی مسالک جیسا کہ شافعی، حنفی وغیرہ۔ آئی سمجھ؟"
"ہوں۔ تمہارا فہم اچھا ہے محمل!"
"فرشتے نے سمجھایا تھا اس دن۔" اس نے ذرا سی گردن موڑی۔ فرشتے اسی طرح اس سے بات کر رہی تھی۔ سارہ بھی اس کی نگاہوں کے تعاقب میں اسے

دیکھنے لگی۔
"فرشتے کی آئیز (آنکھیں) مجھے بہت پسند ہیں۔"
محمل کے لبوں سے پھسلا۔
"ہاں بہت مشابہت ہے، آئی نو۔" وہ بری طرح چونکی۔
"مشابہت؟" وہ ایک دم بہت پرجوش ہو کر اس کی طرف پوری مڑی۔ "مشابہت ہے نا سارہ! [illegible] فرشتے کی آنکھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ [illegible] ملتی ہیں۔"
"تمہیں پتا ہے کس سے ملتی ہیں؟"
"تو تمہیں نہیں پتا؟" [illegible]
"کیا ان کے کزن [illegible]"
"کزن کون؟"
"چھوڑو [illegible] کس سے ملتی ہیں؟"
ربیعہ [illegible] حیرت سے اسے دیکھتی رہی، پھر ہنس [illegible]
"تم سے ملتی ہیں محمل۔ بالکل تمہارے جیسی ہیں۔ کیا تم آئینہ نہیں دیکھتیں؟"
"مجھ سے؟" محمل ساکت رہ گئی۔ اپنا چہرہ ہر وقت نگاہوں کے سامنے نہیں رہتا، شاید اس لیے وہ اتنے عرصے میں اندازہ نہ کر سکی۔
اس لڑکی کی کسی بات پہ فرشتے ذرا سی مسکرائی۔ اس کی آنکھیں مسکراتے ہوئے کناروں سے ذرا سی چھوٹی ہو گئیں، بالکل اس کی اپنی طرح، ہو بہو۔ وہ پلک جھپکے بنا اسے دیکھے گئی۔
وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے، گھٹنوں پہ کتاب رکھے سوچ میں گم تھی۔ بھورے بال کھلے شانوں پہ گرے تھے۔ مسرت اندر داخل ہوئیں تو وہ اسی طرح خلا میں گھور رہی تھی۔ آہٹ پہ چونکی۔
"اماں۔ بات سنیں۔"
"ہاں بولو۔" مسرت الماری کھول کر کچھ تلاش کر رہی تھیں۔
"آپ ماموں لوگوں سے پھر کبھی نہیں ملیں؟"

"نہیں۔" ان کے ہاتھ لمحے بھر کو تھمے، پھر دوبارہ کپڑے الٹ پلٹ کرنے لگے۔
"ماموں کی ایک ہی بیٹی ہے نا؟"
"ہاں شاید۔"
"اس کا نام کیا ہے۔"
"پتا نہیں، وہ میری شادی کے بعد ہوئی تھی۔" وہ مطلوبہ کپڑا نکال کر کھلے دروازے سے باہر چلی گئیں۔
اور یہ تو وہ جانتی تھی کہ اماں شادی کے بعد ماموں سے کبھی نہیں ملیں۔ نہ ہی وہ خود کبھی ان سے ملی تھی۔ اس نے تو ان کو دیکھا تک نہ تھا۔ اماں اور ابا کی پسند کی شادی تھی۔ اور اماں کے خاندان والوں نے پھر کبھی کوئی رابطہ نہ رکھا تھا۔ آج فرشتے کی آنکھیں دیکھ کر اسے یونہی کچھ لگا تھا مگر شاید... مگر خیر۔
"ہم نے فیصلہ کر لیا ہے۔" باہر تائی کے زور سے بولنے کی آواز پہ یکدم اس کا دل دھڑکا۔ وہ کتاب بند کیے لحاف اتار کر تیزی سے ننگے پاؤں باہر آئی۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا۔
آغا جان اور مہتاب تائی بڑے صوفے پہ عوت بھرے انداز میں بیٹھے تھے اور مسرت ان کے سامنے جیسے بے بس سی کھڑی تھیں۔ دروازہ کھلنے کی آواز پہ مسرت نے اسے دیکھا۔ بے بسی، آنکھوں میں آنسو۔
"اپنی بیٹی کو بھی بتا دینا۔" تائی نے ایک تفاخر بھری نگاہ اس پہ ڈالی۔ "ہم اس کو بہو بنا رہے ہیں، ہمارا احسان ساری زندگی بھی تم دونوں چاہو تو نہیں اتار سکتیں۔"
وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہ گئی۔ "تو کیا فواد واقعی جیل سے باہر آجائے گا؟"
"مگر بھابھی۔" مسرت کی آنسوؤں میں ڈوبی آواز آئی۔ "محمل۔ محمل کبھی نہیں مانے گی وسیم کے لیے۔"
"وسیم؟" وہ جھٹکے سے دو قدم پیچھے ہٹی۔

اور یہ چند روز پرانی ہی تو بات تھی جب فریدہ پھوپھو نے گھر آکر خوب مزے لے لے کر وسیم کے چند "آنکھوں دیکھے قصے" سنائے تھے۔ فریدہ پھوپھو محمل کے ابا کی کزن تھیں اور ہر خبر سارے خاندان میں سب سے پہلے ان کے پاس پہنچتی تھی۔ گھر میں تو چلو ان کو تائی نے چپ کرا دیا مگر ہفتے بعد ہی ایک شادی کی تقریب میں انہوں نے وہی قصے چھیڑ دیے، ابھی فواد کی گرفتاری کے چرچے پرانے نہیں ہوئے تھے کہ خاندان والوں کے ہاتھ ایک اور شوشہ لگ گیا۔

پوری تقریب گویا اکھاڑہ بن گئی۔ تائی مہتاب ان عورتوں کو جتنا لعن طعن کر سکتی تھیں کیا، مگر وہ اکیلی تھیں اور مقابل پورا جتھا تھا۔ معنی خیز نگاہیں اور طنزیہ انداز۔

"برا نہ مانا مہتاب بھابھی! مگر وسیم کو میرے سمیع نے ہی نشے کی حالت میں رات کے دو بجے سڑک سے اٹھا کر تمہارے گھر پہنچایا تھا۔"

"ہاں تو سمیع خود اس وقت ادھر کیا کر رہا تھا؟" تائی ہاتھ نچاتے ہوئے غصے سے بے قابو ہو کر بولی تھیں۔

وسیم کی بات بچپن سے آغا جان کے چچا زاد آغا سکندر کی بیٹی کے ساتھ طے تھی۔ کچھ عرصے سے آغا سکندر کی فیملی کھنچی کھنچی سی رہنے لگی تھی اور جب یہ باتیں منظر عام پہ آئیں تو انہوں نے فون پہ ہی دو ٹوک رشتہ ختم کر دیا۔

"گزرے برسوں کی ایک نادانی تھی" وہ مہتاب بھابھی! بھلا کس طرح ہم اپنی بیٹی کو اس لڑکے سے بیاہ دیں جسے پورے خاندان میں کوئی رشتہ دینے کو تیار نہیں؟"

"اور میں بھی آپ کو خاندان کی سب سے خوب صورت لڑکی وسیم کی دلہن بنا کر دکھاؤں گی۔" تائی نے بھی کھولتے ہوئے فون پٹخا تھا۔

محمل کو قابو کرنے، اس کی جائیداد حاصل کرنے اور وسیم کو بیاہ کر خاندان میں گردن اونچی کرنے کا بہترین حل تائی کو نظر آ ہی گیا تھا۔ انہوں نے ایک تیر سے تین شکار کر لیے تھے۔

✿ ✿ ✿

وہ سر جھکائے تیز تیز سڑک کے کنارے چلتی جا رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ لمبے سیدھے بھورے بال شانوں پہ پھیل کر گر رہے تھے، کہاں کدھر آ گئے کچھ پتا نہ تھا۔

زندگی اس کے ساتھ یوں بھی کر سکتی ہے، اس نے تو سوچا بھی نہ تھا۔ ایک تنگ پھندا تھا جو اسے اپنی گردن کے گرد کستا محسوس ہو رہا تھا۔

اداس درختوں کی گھنی باڑ آج بھی ویسے ہی کھڑی تھی۔ شام کے پرندے شاخوں پہ لوٹ آئے تھے۔ وہ راستہ جانا پہچانا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا رہی تھی، جب اس کی سماعتوں نے وہ آواز سنی۔

"محمل... رکو۔"

مگر وہ نہیں رکی، اسے رکنا نہیں تھا، وہ رکنے والا راستہ تھا بھی نہیں۔

"محمل!" وہ تیز دوڑتا اس کے ساتھ آملا۔ "بات تو سنو۔"

پھولی سانسوں سے اس کے بائیں طرف اس کی رفتار سے بمشکل مل پاتا وہ ہمایوں تھا، ٹریک سوٹ میں ملبوس، وہ شاید جاگنگ سے آ رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے محمل؟ مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟"

اس کے قدم تھمے، بہت آہستہ سے اس نے گردن اٹھائی، بھیگی سنہری آنکھوں سے آنسو مسلسل گر رہے تھے۔

"میرا اور آپ کا کیا رشتہ ہے جو میں آپ کو بتاؤں؟"

"کیا انسانیت کا رشتہ کچھ نہیں ہوتا؟"

"کچھ نہیں ہوتا۔" وہ تیزی سے چلنے لگی تھی۔

"ہوا کیا ہے؟"

"میری تائی نے میرا رشتہ اپنے آوارہ بیٹے سے طے کر دیا ہے۔"

"تو تم رو کیوں رہی ہو؟"

"پھر کیا خوشی مناؤں؟" وہ پوری اس کی طرف

گھومی۔ غصہ بہت شدت سے ابلا تھا۔ یہی شخص تھا اس کی ہر مشکل کا ذمہ دار۔

"ٹھیک ہے، تم صاف انکار کر دو، کچھ اور کرلو، لیکن اگر یوں اپنے آپ پہ ظلم سہتے روتی رہو گی تو گھٹ گھٹ کر مر جاؤ گی۔" اس نے بھیگی آنکھوں سے ہمایوں کا چہرہ دیکھا، مغرور مگر فکر مند چہرہ۔

"میں مروں یا جیوں، آپ کو کیا فرق پڑتا ہے؟"

اس کے انداز پہ وہ چند لمحے لب بھینچے خاموش کھڑا رہا، پھر گہری سانس اندر کو کھینچی۔ "ہاں مجھے نہیں فرق پڑتا۔" اور واپس پلٹ گیا۔

"ہونہہ!" محمل نے استہزائیہ سر جھٹکا۔ "آپ وہ ہی ہیں نا، راہ میں چھوڑ دینے والے۔" وہ جیسے چونک کر پلٹا۔

اسی پل ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا تھا۔ اس کے بھیگے چہرے کے اطراف میں گرے بال پیچھے کو اڑنے لگے۔

"اور آپ کو پتا ہے ہمایوں! اسی لیے آپ سے میں نے کبھی امید ہی نہیں لگائی تھی، پھر کیا میں نہ روؤں۔" وہ کہہ کر واپس پلٹ گئی، ہوا بھی پلٹ گئی، شام کے پرندے بھی پلٹ گئے۔

وہ ساکت سا تارکول کی ویران سڑک پہ کھڑا رہ گیا۔ درختوں کی باڑ اب بھی اداسی سے سر جھکائے کھڑی تھی۔

✿ ✿ ✿

اس نے اسٹاف روم کے دروازے پہ ہلکی سی دستک دی۔ چند لمحے منتظر سی کھڑی رہی، پھر جواب نہ پا کر اندر جھانکا۔ اسٹاف روم خالی تھا۔

وہ کتابیں سینے سے لگائے متذبذب سی واپس پلٹ گئی۔ اسی پل سامنے سے ایک گروپ انچارج آتی دکھائی دی۔

"السلام علیکم باجی! میم فرشتے کدھر ہیں؟"

"فرشتے باجی ہاسٹل میں لائبریری میں ہوں گی، ان کو کچھ کام تھا اسی لیے وہ آج آئی نہیں تھیں۔"

"اچھا۔" وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگنے لگی۔

لائبریری کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے قدرے جھجکتے ہوئے اندر قدم رکھا۔

کتابوں کے اونچے اونچے ریکس، اور دیوار گیر فرنچ ونڈوز، لائبریری کا مخصوص خاموش ماحول۔

"فرشتے؟" اس نے ہولے سے پکارا۔ خاموش لائبریری کا تقدس زخمی ہوا تو وہ گڑبڑا کر چپ ہو گئی۔

"ادھر۔" لائبریرین کسی کونے سے نکل کر آئی اور ایک طرف اشارہ کیا، وہ شرمندہ سی ادھر لپکی۔

چند ریکس سے گزر کر اس نے دوسری طرف جھانکا۔

وہ کتاب اٹھائے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی، ہلکے گلابی شلوار قمیص پہ گرے دوپٹہ شانوں کے گرد لپیٹے، فرشتے کی اس کی طرف پشت تھی، محمل کو اس کی کمر پہ گرتے سیدھے بھورے بال دکھائی دیے تھے۔

وہ ذرا سی حیران ہوئی تھی۔ اس نے ہمیشہ حجاب میں ملبوس فرشتے کو دیکھا تھا۔ سر ڈھکے بغیر تو وہ قطعاً "مختلف" لگ رہی تھی۔

"فرشتے؟" وہ جیسے چونک کر مڑی، اسے دیکھا تو مسکرا دی۔ "ارے ماشاءاللہ، آج تو لوگ لائبریری آئے ہیں۔"

"مگر صرف آپ سے ملنے۔"

"بیٹھو۔" وہ کھڑکی سے لگی کرسی پہ آبیٹھی، جس کے سامنے میز تھی۔ میز کے اس طرف ایک خالی کرسی رکھی تھی۔ وہ محمل نے سنبھال لی اور کتابیں میز پہ رکھ دیں۔

"مجھے ہمایوں نے کچھ بتایا تھا۔" وہ کہنے لگی تو محمل خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔

لمبے سیدھے بھورے بال جو اس نے کانوں کے پیچھے کر رکھے تھے۔ دمکتی رنگت والا چہرہ اور کانچ سی سنہری آنکھیں، اس کے نقش مختلف تھے، مگر آنکھیں اور بال یوں تھے جیسے وہ آئینہ دیکھ رہی ہو۔

"تو تمہارا رشتہ انہوں نے اپنے بیٹے سے طے کر دیا ہے؟"

محمل نے ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا۔

"تو تم انکار کر دو۔"

"کس کے لیے انکار کروں؟ اس کے لیے جو چھوڑ جاتا ہے؟" وہ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی۔ یہ تو ابھی اس نے اپنے دل سے بھی نہ کہا تھا، فرشتے سے کیسے کہتی؟

"میں کیوں انکار کروں؟ کیا میں صبر کر کے اجر نہ لوں؟"

"محمل! مظلومیت اور صبر میں فرق ہوتا ہے اور وہ فرق احتجاج کرنے کا حق رکھنے کا ہوتا ہے، بجائے اپنی زندگی خراب کرنے کے، تم ایک بہتر راستہ چن لو، صاف صاف انکار کر دو۔"

"مجھے ان کے ری ایکشن سے ڈر لگتا ہے۔"

"اس پہ تم صبر کر لینا۔" وہ ہلکی سی مسکرائی۔ "رشتہ داروں کے ساتھ بہت صبر سے گزارا کرنا پڑتا ہے لڑکی۔"

"آپ کرتی ہیں صبر؟"

"کیا مطلب؟"

"آپ کے رشتہ دار ہیں فرشتے؟ آپ کے پیرنٹس؟ اور ہمایوں کے پیرنٹس۔" اس نے سوال ادھورا چھوڑ دیا۔ جانتی تھی فرشتے کو ادھورے سوال پڑھنے آتے ہیں۔

"میری امی کی ایک ہی بہن تھیں، ہمایوں ان کا بیٹا ہے۔ ان کی ڈیتھ کے بعد امی نے ہمایوں کو گود لے لیا تھا۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ ڈیڑھ سال پہلے میری امی کی ڈیتھ ہو گئی۔ پھر میں نے اور ہمایوں نے فیصلہ کیا کہ گھر میں ہمایوں رہے اور میں ہاسٹل میں رہوں۔"

"اور آپ کے ابو؟"

"میں میٹرک میں تھی جب ان کی ڈیتھ ہوئی۔"

"آپ کے ابو کی کوئی بہن تو ہوں گی؟" اس نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"ہاں۔ ایک بہن ہیں۔" فرشتے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

"کدھر رہتی ہیں؟"

"یہیں اسی شہر میں۔"

"وہ آپ سے ملتی ہیں؟"

"نہیں، کچھ پرابلمز کی وجہ سے وہ لوگ مجھ سے نہیں ملتے۔"

"اور آپ؟"

"میں کوشش تو کرتی ہوں کہ ہر عید پہ ان کے گھر جاؤں، لیکن وہ میرے اوپر دروازے بند کر دیتے ہیں۔"

"پھر؟" وہ نا پلک جھپکے اسے دیکھتی آگے کو ہوئی۔

"پھر میں کیک اور پھول دے کر واپس آجاتی ہوں۔ میری اتنی ہی استطاعت ہے، آگے کیا کر سکتی ہوں؟" وہ سادگی سے مسکرائی۔

(کیک اور پھول؟ عیدوں پہ بہت جگہوں سے مٹھائی اور کیک پھول وغیرہ آتے تھے، کیا وہ بھی بھیجتی تھی؟)

"آپ کی پھپھو کے کتنے بچے ہیں؟"

"ایک ہی بیٹی ہے۔" اور اسے پتا تھا فرشتے جھوٹ نہیں بولتی، اس کا تجسس تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

"کیا عمر ہو گی اس کی؟"

"مجھ سے تو چند سال چھوٹی ہی ہے۔"

"نام کیا ہے؟"

"یہ ضروری تو نہیں ہے محمل!" فرشتے ذرا سی مضطرب ہوئی تھی۔

"ہو سکتا ہے میں آپ کی فیملی کو ملانے میں کچھ مدد کر سکوں؟"

"نہیں۔" فرشتے نے غور سے دیکھتے نفی میں سر ہلایا۔ "تم میری پھپھو کی فیملی کو نہیں جانتیں۔"

"[illegible]"

"کیا ہم قسمت بدل سکتے ہیں؟"

"ارے۔" اس نے اپنی تھوڑی اور قلمی انداز پہ وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"یہ کھڑکیاں بہت خوب صورت ہیں۔" وہ کہہ کر پرسوچ انداز میں کھڑکی کے باہر اترتی صبح کو دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

رات کھانے کے بعد اس نے سب کے کمروں میں

چلے جانے کا انتظار کیا یہاں تک کہ لاؤنج میں ٹی وی کے آگے جم کر بیٹھی لڑکیاں بھی اٹھ اٹھ کر جانے لگیں اور لاؤنج خالی رہ گیا تو وہ دبے قدموں باہر نکلی۔ آج اسے آغا جان کو ساف انکار کرنا تھا۔

لاؤنج اندھیرے میں ڈوبا تھا۔ آغا جان کے بیڈ روم کے دروازے سے روشنی کی لکیر آرہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی دروازے تک آئی۔ قریب تھا کہ وہ دستک دے ڈالتی کہ اندر سے آتی آوازوں نے اس کا ہاتھ روک لیا۔

"اس لڑکی سے کوئی بعید نہیں۔ آج پھر میرے آفس آئی تھی۔" آغا جان کی سوچ میں ڈوبی آواز آئی۔

"کون؟ فرشتے؟" تائی کا حیران کن لہجہ۔ "پھر وہی پرانی بات کرنے کہ محمل کی جائیداد میں اس کا بھی حصہ نکالیں؟"

محمل کو لگا پوری چھت اس پہ آن گری ہے۔

"ہاں آج وہ آفس آئی تھی اور یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اگر ہم نے وسیم سے محمل کا رشتہ کرنے کی کوشش کی تو..."

آغا جان کچھ کہہ رہے تھے اور چند دن پہلے کی پڑھی گئی ایک حدیث اس کے کان میں گونجی، جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا کہ اگر کوئی تمہارے گھر میں جھانکے اور تم پتھر مار کر اس کی آنکھ پھوڑ دو تو تم پہ کوئی گناہ نہیں۔ نہیں۔ وہ گھبرا اٹھی۔ اسے نہیں وہ سننا چاہیے۔ وہ غلط کر رہی ہے۔ وہ کسی کی پرائیویسی میں جھانک رہی ہے۔ اگلے ہی لمحے وہ واپس کمرے کی طرف بھاگی تھی۔

دروازے کی کنڈی لگا کر وہ پھولی سانس کو قابو کرتی بیڈ پہ گر سی گئی اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"محمل کی جائیداد میں فرشتے کا حصہ؟"

گو کہ اسے شک تھا کہ فرشتے کا ان سے تعلق ضرور ہے اور شاید بلکہ یقیناً وہ اس کے ان قطع تعلق کیے ہوئے ننھیالی رشتہ داروں میں سے ہے۔ جن کا کبھی تائی کے منہ سے اس کا نام سن کر اسے جو جھٹکا لگا تھا۔ اس سے بھی بڑا جھٹکا فرشتے کا مطالبہ جان کر لگا۔ فرشتے نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ محمل کے حصے میں سے اسے بھی کچھ دیا جائے؟ مگر کیوں؟ فرشتے ایسے کیوں کرے گی؟

اس کی نگاہوں میں ایک سراپا لہرایا۔

سیاہ عبایا میں ملبوس گرے اسکارف میں ملائم چہرے کو مقید کیے سنہری آنکھیں جھکائے دونوں ہاتھوں میں چھوٹا قرآن پکڑے، بال پوائنٹ سے صفحے پہ کچھ مارک کرتی فرشتے۔

وہ کون تھی؟ اس کا پورا نام کیا تھا؟ وہ ہمایوں سے زیادہ ملتی نہ تھی لیکن محمل کے متعلق ہر خبر اس کے پاس ہوتی تھی۔ وہ کیوں اس کی خبر رکھتی تھی؟ اور وہ کیوں آغا جان سے ملتی تھی؟

بہت سی الجھنوں کے سرے وہ سلجھا نہ پا رہی تھی، لیکن ایک بات طے تھی، فرشتے کی عظمت بھرا وہ تصور جو اس نے ذہن میں بنا رکھا تھا، کرچی کرچی ہو گیا تھا، پتا نہیں کیوں۔

☼ ☼ ☼
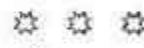
وہ چینی کی پلیٹیں احتیاط سے کیبنٹ سے نکال کر کاؤنٹر پہ رکھ رہی تھی، جب آہٹ پہ چونک کر پلٹی۔ کچن کے کھلے دروازے میں فضہ چچی کھڑی اس کو بغور دیکھ رہی تھیں۔

"جی چچی؟" وہ قدرے الجھی۔ پھر ایک نظر خود پہ ڈالی۔ سادہ سی گلابی شلوار قمیص، سادہ دوپٹہ کندھوں کے گرد لپیٹے، سلکی بالوں کو کیچر میں مقید کیے وہ ہرن کی طرح جی... چچی کو کیا ہوا تھا؟

"کچھ چاہیے چچی؟" اس نے پھر پوچھا۔ ان کی نظریں اب اس کو پریشان کرنے لگی تھیں۔

"ہوں؟ نہیں۔" فضہ چچی نے سر جھٹکا اور واپس چلی گئیں۔ جاتے سمے ان کے چہرے پہ ہلکا سا تفکر در آیا تھا۔

"ان کو کیا ہوا ہے؟" وہ پلیٹیں کپڑے سے صاف کرتے ہوئے سوچنے لگی، پھر شانے اچکا کر کام میں مصروف ہو گئی۔ ڈنر کا ٹائم ہونے والا تھا اور اسے میز لگانی تھی۔ سب آتے ہی ہوں گے۔

"میں نے اور مسرت نے وسیم اور محمل کا رشتہ طے کر دیا ہے۔ آپ سب کو یقیناً علم ہوگا۔" وہ رائتے کا ڈونگا میز پہ رکھ رہی تھی جب آغا جان نے سب کو مخاطب کیا۔

ڈائننگ ہال میں سناٹا سا چھا گیا۔ گو کہ سب کو معلوم ہی تھا پھر بھی سب چپ تھے۔ وہ سر جھکائے اپنی آخری کرسی پہ آ بیٹھی اور پلیٹ اپنی جانب کھسکائی۔

"یہ فیصلہ آپ نے بالا ہی بالا کر لیا۔ مسرت چچی سے پوچھنے کی زحمت بھی کی؟" حسن نے ... سب کو چونکا یا تھا۔ وہ بھی بے اختیار سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی جو اکھڑے تیوروں کے ساتھ آغا جان کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا مطلب؟ مسرت کی مرضی سے ہوا ہے رشتہ۔" آغا جان برہم بھی ہوئے اور حیران بھی۔

"کیوں چچی؟" اس نے خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی مسرت کو مخاطب کیا۔ "آپ کو اس وسیم کا رشتہ منظور ہے جسے خاندان میں کوئی بیٹی دینے کو تیار نہیں؟"

مسرت کا جھکا سر مزید جھک گیا۔ فضہ نے ناگواری سے پہلو بدلا۔

"بتائیے چچی! اگر آپ خاموش رہیں تو اس کا مطلب ہے، آپ کے ساتھ آغا جان نے زبردستی کی ہے۔"

"کیا بکواس ہے یہ حسن؟"

"آغا جان! مجھے مسرت چچی سے بات کرنے دیں۔" حسن کی آواز بلند ہونے لگی تھی۔ سب دم بخود اس کو دیکھ رہے تھے۔

"بتائیے چچی! آپ کو یہ رشتہ منظور ہے؟"

"نہیں!" محمل نے قطعی انداز میں کہا۔ اسے معلوم تھا اس کی ماں کچھ نہیں بول سکے گی۔

سب نے چونک کر اسے دیکھا۔ خود حسن بھی قدرے ٹھٹکا۔

"تم بیچ میں مت بولو۔" آغا جان برہم ہوئے۔

"ابھی نہیں بولی تو نکاح کے وقت انکار کروں گی۔ یہ حق مجھے میرے دین نے دیا ہے۔" آپ نے میرے ساتھ زبردستی کی تو میں کورٹ تک چلی جاؤں گی۔"

"تمہیں کیا مسئلہ ہے وسیم سے؟" غفران چچا جھنجلائے۔ ایسی ہی جھنجلاہٹ فضہ کے چہرے پہ بھی تھی۔

"اگر وسیم اتنا ہی اچھا ہے تو غفران چچا آپ ندا یا سامیہ باجی کا رشتہ اس کے ساتھ کیوں نہیں کر دیتے؟"

بہت دنوں بعد پورے گھر نے پرانی محمل دیکھی تھی۔

"شٹ اپ!"

"میں انکار کر چکی ہوں، اگر آپ لوگوں کو مزید اپنی بے عزتی کروانے کا شوق ہے تو میں نکاح کے موقع پہ اس سے بھی زوردار انکار کروں گی۔"

"ارے شکر کرو کہ ہم تمہیں سوچ رہے ہیں۔" بہت دیر سے خاموش بیٹھی تائی مہتاب ضبط نہ کر پائیں۔ "جو لڑکی ایک رات گھر سے باہر رہ چکی ہو، اسے کوئی نہیں قبول کرتا، ہم ہو نہ بتائیں تو کون قبول کرے گا تمہیں۔"

"میں!" حسن جیسے بھڑک کر بولا تھا۔ "میں قبول کروں گا محمل کو۔ وہ وسیم سے شادی نہیں کرنا چاہتی، میں اپنا نام مسرت چچی کے سامنے رکھ رہا ہوں اور چچی! میں آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔"

"ہرگز نہیں۔" فضہ چھٹ پڑیں۔ "میں اس لڑکی کو کبھی قبول نہیں کروں گی جو کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔"

"ممی!" وہ زور سے چیخا تھا۔

اس سے مزید سنا نہیں گیا، وہ کرسی دھکیل کر بھاگتی ہوئی ڈائننگ ہال سے نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

بریگیڈیئر فرقان کا بنگلہ، جس کے ٹیرس پہ بوگن ویلیا کی بیلوں کا راج تھا، آج بھی اسے ویسا ہی اداس اور

ویران لگتا تھا' بلکہ وہ شاید ہمیشہ ہی ایسا ہوتا تھا۔ مکین کے خود قرآن پڑھنے اور دوسروں کو محض سنوانے میں بہرحال فرق تو ہوتا ہے۔

آج پھر وہ چند پمفلٹس ہاتھ میں پکڑے ان کے گیٹ پہ کھڑی تھی۔

بیل پہ ملازم نے بھاگ کر چھوٹا دروازہ کھولا۔

"جی بی بی؟" اس نے سر باہر نکالا۔

"مجھے بریگیڈیئر فرقان سے ملنا ہے' وہ اندر ہیں؟"

"جی وہ کام کر رہے ہیں۔"

"ان سے کہو محمل آئی ہے!" قدرے تحکم سے کہہ کر وہ سینے پہ بازو باندھے وہیں کھڑی ہو گئی۔ "فوراً" ملازم اندر کو دوڑا۔ چند لمحے ہی بعد اس کی واپسی ہو گئی۔

"صاحب کہہ رہے ہیں آپ اپنے پمفلٹس واپس لے لیں۔" اس نے پرانے پمفلٹس اس کی طرف بڑھائے۔

"انہوں نے پڑھ لیے ہیں؟"

"نہیں جی وہ مصروف تھے۔"

"اپنے صاحب کو کہو یہ ان پہ میری امانت تھی' جب انہوں نے لیے تھے تو میری سونپی گئی ذمہ داری بھی انہیں نبھانی تھی' ورنہ لینے سے ہی انکار کر دیتے۔ انہوں نے خیانت کر کے یہ لوٹائے ہیں اور اگر میں نے معاف نہیں کیا تو ان کو معافی نہیں ملے گی۔" ملازم ہونقوں کی طرح اسے دیکھنے لگا' پھر اندر لپکا۔

"صاحب آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔" وہ پیغام دے کر جلد ہی واپس آیا تھا۔

"شکریہ۔" وہ پورے اعتماد سے اندر چلی آئی۔

اسٹڈی کا دروازہ کھلا تھا۔ محمل نے چوکھٹ میں کھڑے کھڑے دروازہ انگلی کی پشت سے بجایا۔

اسٹڈی ٹیبل کے پیچھے ریوالونگ چیئر پہ بیٹھے بریگیڈیئر فرقان نے کتاب پہ جھکا سر اٹھایا اور عینک کے پیچھے سے اسے دیکھا جو دروازے کے بیچ کھڑی تھی۔

یونیفارم کی سفید شلوار قمیص اور [illegible] نفاست سے لپٹا تروتازہ گلابی [illegible] پیچھے سے اونچی پونی کے باعث ذرا سا اٹھ گیا تھا۔ ہاتھ میں چند پمفلٹس پکڑے' وہ دراز قد سنہری آنکھوں والی لڑکی منتظر سی کھڑی تھی۔

"کم ان۔" بریگیڈیئر فرقان نے چشمہ اتار کر میز پہ رکھا' کتاب بند کی اور کرسی پہ قدرے پیچھے کو ٹیک لگائی۔

"میں کچھ پمفلٹس دے کر گئی تھی۔"

"اور میں نے واپس کر دیے تھے' اور کچھ؟" ان کے بارعب چہرے پہ قدرے ناگواری تھی۔

"جی' یہ کچھ اور ہیں۔" وہ آگے بڑھی اور چند پمفلٹس ان کی میز پہ رکھے۔ "یہ آپ پڑھ کر مجھے واپس کروا دیجیے گا۔"

"مگر مجھے یہ نہیں چاہئیں۔" وہ بیزار سے بولے۔

"میں نے آپ کو چوائس تو نہیں دی سر! آپ کو یہ لینے پڑیں گے' میں کچھ عرصے بعد آ کر واپس لے لوں گی۔ پڑھ کر سنبھال لیجیے گا' ان پہ اللہ کا نام لکھا ہے' امید ہے آپ پھینکیں گے نہیں۔" وہ کھڑی کھڑی کہہ کر تیزی سے واپس پلٹ گئی۔

بریگیڈیئر فرقان نے تلملا کر ایک نظر ان پمفلٹس کو دیکھا' پھر دراز میں ڈال کر اپنی عینک اٹھائی اور بڑبڑاتے ہوئے کتاب کھول لی۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنی دھن میں [illegible] جا رہی تھی کہ اچانک وہ بری طرح [illegible] فرشتے پہ نگاہ پڑی' اس کے لب بھینچے [illegible] اور وہ پیچھے ہو لی تھی۔

فرشتے نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے ساتھ چلتی لڑکی سے [illegible] کچھ کہتی چلی آ رہی تھی۔ محمل [illegible] واپس ہوئی اور برآمدے میں مڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی توقع کے عین مطابق فرشتے نے اس کی موجودگی نوٹ نہیں کی۔ ساتھی اور ٹیچر کے ہمراہ پیچھے پرنسپل کی سیڑھیاں اترتی گئی تھی۔

پرئیر ہال میں طلبہ کے ناموں سے ہی اسکالر ڈاکٹر سرور مرزا کے لیکچر کا انعقاد تھا۔ وہ بھی ست روی سے چلتی ہوئی ایک درمیانی صف کی نشست پہ آ بیٹھی۔ ابھی لیکچر شروع نہیں ہوا تھا۔ محمل نے ہاتھ میں پکڑا پاکٹ سائز قرآن کھولا اور یوں ہی پڑھنے کے لیے صفحے پلٹنے لگی۔

فرشتے نے ایسا کیوں کیا؟ یہ سوال مسلسل اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا۔

اس نے کتنا جان سے محمل کی جائیداد میں حصہ کیوں مانگا؟ فرشتے جیسی لڑکی اتنا [illegible] ہو سکتی ہے' وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

اس نے مطلوبہ صفحہ پلٹا اور وہ آیت نکالی جو آج پڑھائی جانے والی تھی۔ ڈاکٹر سرور کے لیکچر کے باعث آج تفسیر کی کلاس نہیں ہونا تھی۔

"اور ان چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو جو اگر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بری لگیں۔"

اس نے گہری سانس لے کر محمل نے قرآن بند کیا۔ "پھر بھی یہ اطمینان بخش نہیں ہے۔" اس نے بے چینی سے گردن اوپر کو اٹھائی اور پھر اوپر دیکھتے ہوئے مسکرا کر سر جھٹکا۔ جب بھی ایسا کچھ ہوتا تو اسے قرآن پہ بے حد پیار آتا تھا۔ اسے لگتا تھا دنیا میں اس سے تیز کوئی کمیونیکیشن سورس ایجاد نہیں ہوا تھا۔

"مگر ایسا کیا ہے جو مجھے اس سوال کا جواب برا لگے گا؟"

وہ چاہتے ہوئے بھی پھر سے سوچنے لگی تھی۔

ڈاکٹر سرور لیکچر شروع کر چکے تھے۔ پورا ہال کھچا کھچ بھرا تھا۔ دور دور تک پنک اسکارف میں ڈھکے سر دکھائی دے رہے تھے۔ اسٹیج کے قریب چیئرز پہ اسٹاف موجود تھا۔ فرشتے بھی وہیں ایک کرسی پہ بیٹھی ڈائری پہ تیز تیز لیکچر نوٹ کر رہی تھی۔ اسے نوٹس لیتے دیکھ کر وہ خود بھی چونک کر ڈاکٹر سرور کی طرف متوجہ ہوئی جو روسٹرم پہ کھڑے تھے۔ سر پہ جناح کیپ' سفید داڑھی' شلوار قمیص اور واسکٹ میں ملبوس وہ خاصے منجھے ہوئے اسکالر تھے۔ وہ اکثر ان کو ٹی وی پہ دیکھتی رہتی تھی۔

اپنی سوچوں کو جھٹک کر وہ بغور لیکچر سننے لگی۔

"بعض لوگ قرآن پڑھ کر بھٹکتے ہیں۔ واقعی ایسا ہوتا ہے۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں کہہ رہے تھے۔ "اس بات سے کہ قرآن کسی اچھے غیر متعصب عالم سے زندگی میں ایک دفعہ ضرور پڑھ لینا چاہیے۔ مگر اس کا مطلب نہیں ہے کہ کسی کا "دامن" پکڑنا ضروری ہے۔ نہیں' بلکہ کسی غیر متعصب تفسیر کو پڑھ کر بھی کسی حد تک قرآن کی سمجھ بوجھ پیدا کی جا سکتی ہے۔ قرآن کو پڑھ کر ہم ہر آیت کے اپنے حالات کے مطابق کئی مطلب نکالیں' وہ مطلب نکالنا غلط نہیں ہے مگر ظاہر کو باطن سے تشبیہ دینا قطعاً "غلط" ہے۔ مثلاً "بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا جو حکم اللہ سبحانہ تعالیٰ نے موسیٰ کے ذریعے دیا تھا" وہ ہم سب جانتے ہیں۔ اس واقعہ سے ہم یہ سبق تو نکال سکتے ہیں کہ کثرت سوال سے حکم مشتبہ ہو جاتے ہیں۔ مگر اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکالا کہ وہاں "گائے" سے مراد ایک صحابیہ ہیں' نعوذ باللہ بعض لوگوں نے واقعتا "یہاں گائے" سے مراد ایک صحابیہ کو لیا ہے۔ ایک اور مثال' سورۃ حجر کی آخری آیات میں ہے کہ اپنے رب کی عبادت کرو یہاں تک کہ تمہارے پاس یقین آ جائے۔

اب یہاں "یقین" سے مراد "موت" ہے یعنی موت آنے تک عبادت کرتے رہو۔ مگر بعض لوگ یہاں "یقین" سے مراد belief لے کر اپنی عبادت کو کافی سمجھ کر بس کر دیتے ہیں کہ جی' ہمیں اپنی عبادت پہ یقین آ گیا ہے تو بس عبادتیں ختم۔"

"سورۃ حجر کہاں تھی بھلا؟" اس نے آہستہ سے اپنا چھوٹا قرآن کھولا اور صفحے پلٹنے لگی۔ سورۃ حجر ملی تو اس نے اس کی آخری آیات کھولیں۔ آیت وہی تھی جو وہ کہہ رہے تھے۔ مگر آخری الفاظ عربی میں "حتیٰ یاتی الیقین" تھے۔ (حتیٰ کہ یقین آ جائے)

"یقین؟" اس نے "یقین" پہ انگلی پھیری' پھر الجھ کر ڈاکٹر سرور کو دیکھا' وہ کہہ رہے تھے۔

"یہاں پہ یقین سے مراد یقین نہیں بلکہ موت

ہے۔ سو اس طرح کے الفاظ کا من چاہا مطلب نکالنا انسان کو بھٹکا سکتا ہے۔ اپنی کوئی بات؟" انہوں نے رک کر ایک گہری نظر ہال پہ ڈالی۔
محمل نے ہاتھ فضا میں بلند کیا۔
"یس؟" انہوں نے سر کے اشارے سے اجازت دی تو وہ ہاتھ میں قرآن پکڑے اپنی نشست سے اٹھی۔
"سر! مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میرے پاس بغیر ترجمے والا مصحف ہے۔ اس میں مذکورہ آیت میں واقعتاً "یقین" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ سو اس کا مطلب "موت" کیسے ہوا؟ دونوں الفاظ میں خاصا فرق ہے۔"
"اس کا مطلب موت ایسے ہے کہ۔" وہ ذرا دیر کو رکے اور بغور اسے دیکھا "میں نے اس کا مطلب موت نکالا ہے۔"
"جی سر! میرا یہی سوال ہے کہ کیسے؟ اس کی دلیل کیا ہے؟"
"دلیل یہ ہے کہ میں نے یعنی ڈاکٹر سرور مرزا نے اس کا مطلب موت لیا ہے۔ میں اس ملک کا سب سے بڑا اسلامک اسکالر ہوں۔ آپ میرے کریڈنشلز اٹھا کر دیکھیں، میری ڈگریز دیکھیں۔ کیا میری بات بطور ایک ٹھوس دلیل کے کافی نہیں؟"
اگلی صفوں میں بیٹھی لڑکیاں گردنیں موڑ کر اسے دیکھنے لگی تھیں جو ہاتھ میں چھوٹا قرآن پکڑے کھڑی تھی۔
"سر! آپ کی بات یقیناً اہم ہے مگر قرآن کا بعض اس کے بعض کی تفسیر کرتا ہے، حدیث بھی یہ کرتی ہے۔ کیا قرآن یا حدیث میں کہیں یہ ذکر ہے کہ یہاں "یقین" سے مراد موت ہے؟" وہ بہت شائستگی و لحاظ سے مؤدب سی پوچھ رہی تھی۔ ڈاکٹر سرور کے چہرے پہ واضح ناگواری ابھری۔
"یعنی کہ اگر میں آپ کو اس مطلب کی دلیل نہ دوں تو اسے محض میری بات سمجھ کر آپ جھٹلا دیں گی؟ یعنی آپ کو میری بات کے اوپر مزید کوئی دلیل چاہیے؟"
"جی!" اس نے ہولے سے سر ہلا دیا۔
پورے ہال میں ایک اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ لڑکیاں قدرے پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔
"یعنی آپ ایک دینی اسکالر کو چیلنج کر رہی ہیں؟"
"سر! میں بہت ادب سے صرف دلیل مانگ رہی ہوں۔"
"اگر اس کی دلیل قرآن و حدیث میں نہ ہو تو کیا آپ "یقین" کا مطلب "موت" تسلیم کریں گی؟"
"نہیں سر! کبھی بھی نہیں۔"
"ہوں۔" ڈاکٹر سرور نے گہری سانس لے کر ہال پہ ایک نظر دوڑائی "کیا کوئی اور بھی ہے جو اپنی عمر سے زیادہ طویل تجربے کے حامل ایک اسکالر کو چیلنج کرے؟ کسی اور کو بھی دلیل چاہیے؟"
بہت سے سر نفی میں ہل گئے۔ وہ اکیلی کھڑی تھی۔
"یعنی تین سو لڑکیوں میں سے ایک لڑکی کو دلیل چاہیے؟ کیا پڑھا رہے ہیں آپ لوگ اس مسجد میں؟ کون ہیں آپ کی کلاس انچارج؟"
میڈم مصباح کھڑی ہو گئیں۔
"کیا آپ اس ناکام کلاس رپورٹ کی ذمہ داری لیتی ہیں؟ ون آؤٹ آف تھری ہنڈرڈ کی؟"
"جی سر!" میڈم مصباح کا سر ندامت سے جھک گیا۔
ڈاکٹر سرور نے محمل کو دیکھا۔
"کیا آپ کو ابھی بھی دلیل چاہیے؟"
"جی سر!"
وہ کچھ دیر خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتے رہے، پھر ہلکے سے مسکرائے۔
"المدثر آیت 43-47 میں یقین کا لفظ موت کے لیے استعمال ہے، وہاں سے ہم دلیل لیتے ہیں کہ یہاں بھی یقین سے مراد موت ہی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مرعوب ہوئے بغیر ادب کے دائرے میں رہ کر مجھ سے دلیل مانگی اور مجھے افسوس ہے کہ صرف ایک بچی نے یہ جرأت کی۔ باقی سب خاموش رہیں۔ دو سو ننانوے لڑکیوں میں یقیناً ابھی یہ کمی موجود ہے جو

کہ ایک قرآن کلاس کی ناکام کارکردگی کا ثبوت ہے۔ کیا کوئی شخص ڈگریوں کا پلندہ لے کر آپ کے سامنے آئے، خود کو سب سے بڑا دینی اسکالر بتائے تو آپ اس کی بات کو بطور دلیل مان لیں گے؟ کیا آپ کو پہلے دن ہی نہیں بتایا گیا تھا کہ دلیل صرف قرآن یا حدیث ہوتی ہے؟ کسی عالم کی بات دلیل نہیں ہوتی۔ پھر؟"
بہت سے گلابی اسکارف میں لپٹے سر جھک گئے۔
محمل سرخروی اپنی نشست پہ بیٹھی۔ ڈاکٹر سرور اور بھی بہت کچھ کہہ رہے تھے مگر وہ سورہ المدثر کھول کر اس آیت کو کنفرم کر رہی تھی۔
(سورہ المدثر کی 43-47 تک کا ترجمہ ڈاکٹر سرور کی تصدیق کر رہا تھا۔)
لیکچر کے بعد وہ کاریڈور میں سے گزر رہی تھی جب فرشتے نے اسے پیچھے سے پکارا۔ اس کے قدم وہیں رک گئے مگر وہ مڑی نہیں۔ فرشتے تیز تیز چلتی اس کے قریب آئی۔
"آئی ایم پراؤڈ آف یو محمل!" وہ یقیناً بہت خوش تھی۔ گرے اسکارف میں مقید اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔
محمل اجنبی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔
"ڈاکٹر سرور تم سے بہت خوش ہیں، انہوں نے ایک سیمینار کے لیے تمہارا نام دے دیا ہے اور تم میرے ساتھ ادھر جا کر اسپیچ کرو گی۔"
"آپ کے ساتھ؟" وہ بولی تو اس کی آواز میں خراشوں کی سی خشکی تھی "پھر مجھے نہیں جانا۔"
"کیا مطلب؟" فرشتے کی مسکراہٹ پہلے مدھم ہوئی اور پھر آنکھوں میں حیرت ابھری۔
"مجھے جھوٹے لوگ سخت ناپسند ہیں!"
"محمل!" وہ ششدر رہ گئی "میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے؟"
"یہ سوال آپ خود سے کیوں نہیں کرتیں؟"
"تم سے کسی نے کچھ کہا ہے؟"
"میں بچی نہیں ہوں فرشتے!" وہ گویا پھٹ پڑی تھی۔ اندر ابلتے لاوے کو باہر کا راستہ نظر آ گیا تھا۔
"آپ کیوں گئیں میرے آغا جان کے پاس؟ کیا لگتے ہیں وہ آپ کے؟ میں ایک یتیم لڑکی ہوں، کیا آپ کو بھی مال میں سے حصہ چاہیے؟ کیوں کی آپ نے ایسی حرکت؟ آپ کو جانے کس اونچی مسند پہ بٹھا رکھا تھا میں نے، بہت بری طرح خود کو گرا لیا ہے آپ نے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ ایسے کریں گی۔ کیا رشتہ ہے آپ کا مجھ سے؟ آپ جھوٹ نہیں بولتیں، مگر سچ چھپانا بھی تو جھوٹ ہوتا ہے۔ میں نے پوچھا آپ کی پھپھو کی بیٹی کا کیا نام ہے؟ آپ نے نہیں بتایا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟"
فرشتے کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ جذبات سے عاری، بالکل ساکت، جامد، وہ بنا پلک جھپکے محمل کو دیکھ رہی تھی۔ کتنی ہی دیر وہ کچھ کہہ نہ سکی، پھر آہستہ سے لب کھولے۔
"کیونکہ میری پھپھو کی بیٹی کا نام فاطمہ ہے۔"
"جی؟" اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔
"میں نے کہا تھا ناکہ تم نہیں جانتیں۔ میری پھپھو کی بیٹی کا نام فاطمہ ہے۔ میں فرشتے ابراہیم ہوں، آغا ابراہیم کی بیٹی۔ جاؤ اپنے گھر میں کسی سے پوچھو، مگر وہ کیوں بتائیں گے؟ وہ میری حیثیت تسلیم نہیں کرتے تو کیسے بتائیں گے۔"
وہ تھکے تھکے انداز میں کہہ کر اس کے ایک طرف سے نکل کر چلی گئی۔ محمل مڑ کر اس کو جاتا بھی نہ دیکھ سکی۔ اسے تو جیسے کسی نے ادھر ہی برف کا بنا دیا تھا۔ وہ دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ بیچ کاریڈور میں بت بنی کھڑی تھی۔
"فرشتے ابراہیم"
"آغا ابراہیم کی بیٹی۔"
اسے پوری مسجد میں ان چند الفاظ کی گونج پلٹ پلٹ کر سنائی دے رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اسے نہیں معلوم وہ کن قدموں پہ چل کر مسجد کے

گیٹ تک آئی تھی۔ بس وہ پھر [illegible] ہر شے سے غافل چلتی جا رہی تھی۔ اس کا بیگ اور کتابیں کلاس میں رہ گئے تھے اس نے انہیں ساتھ نہیں لیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا بہت کچھ مسجد میں کھو گیا ہے، وہ کیا کیا سمیٹتی؟

برابر والے بنگلے کی دیوار کے ساتھ نصب بینچ پہ وہ گر سی گئی۔

"آغا ابراہیم کی بیٹی۔ فرشتے ابراہیم۔"

اس کا دماغ انہی دو جملوں پہ منجمد ہو گیا تھا۔ آگے بڑھتا تھا نہ پیچھے۔

دور کہیں یاد کے پردے پہ آغا جان کی آواز لہرائی۔

"اس لڑکی سے کچھ بعید نہیں۔ آج پھر میرے آفس آئی تھی۔"

"پھر آئی تھی" اس کا ذہن جیسے چونک کر بیدار ہونے لگا تھا۔ پھر کا مطلب تھا وہ پہلے بھی ادھر جاتی رہتی تھی۔ وہ سب اس کو جانتے تھے۔ اور شاید اس سے خائف بھی تھے۔ تو کیا وہ واقعی آغا ابراہیم کی بیٹی تھی؟

"نہیں!" اس نے تنفر سے سر جھٹکا "آغا ابراہیم کی صرف ایک بیٹی ہے اور وہ ہے محمل ابراہیم۔ میری کوئی بہن نہیں ہے۔ میں نہیں مانتی۔"

وہ زور زور سے نفی میں سر ہلا رہی تھی اسے لگ رہا تھا آج اس کے دماغ کی رگ پھٹ جائے گی۔ غصہ تھا کہ اندر ہی اندر ابلا جا رہا تھا۔

"کیا واقعی وہ ابا کی بیٹی ہے؟ مگر اس کی ماں کون ہے؟ میری اماں...؟ نہیں۔ مگر مجھے کون بتائے گا؟ آغا جان اور تائی تو کبھی نہیں... اماں کو تو شاید پتا بھی نہ ہو! پھر کس سے پوچھوں؟"

وہ چکرا کر رہ گئی اور سر دونوں ہاتھوں میں گرا دیا۔ مگر اگلے ہی لمحے جیسے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

"ہمایوں!" اور پھر اس نے کچھ نہیں سوچا اور گیٹ کی طرف لپکی۔

☼ ☼ ☼

"صاحب اندر ہیں؟ مجھے اندر جانا ہے۔"

"جی، آپ چلی جائیں۔" چوکیدار فوراً سامنے سے ہٹا۔ وہ اندر کی طرف دوڑی۔ شاہانہ طرز کا لاؤنج خالی تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتی آگے بڑھی پھر کچن کے کھلے دروازے کو دیکھ کر رکی۔ کچھ سوچ کر وہ کچن میں آئی۔

ماربل فلور کا چمکتا صاف ستھرا کچن خالی پڑا تھا۔

چھریوں کا اسٹینڈ سامنے ہی تھا۔ اس نے لپک کر ایک بڑی چھری نکالی اور آستین میں چھپا کر باہر آ گئی۔

"ہمایوں؟" لاؤنج میں کھڑے گردن اوپر کر کے اس نے پکارا۔ آواز گونج کر لوٹ آئی۔ اس کا کمرہ اوپر تھا، یہ تو اسے یاد تھا۔ وہ تیز تیز سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ سیاہ ماربل کی چمکتی سیڑھیاں گولائی میں اوپر جا رہی تھیں۔ وہ بالائی منزل پہ رکی، ادھر ادھر دیکھا پھر تیسری منزل کی سیڑھیوں کی طرف جانے لگی۔ دفعتاً سامنے والے کمرے سے اس کی آواز آئی۔

"بلقیس؟" وہ اندر سے غالباً ملازمہ کو آواز دے رہا تھا۔

وہ دوڑ کر اس کمرے کے دروازے تک آئی۔

"دروازہ کھولیں!" اس نے دروازہ زور سے بجایا، اور پھر ادھر ادھر بجاتی چلی گئی۔

"کون؟" ہمایوں نے حیران سا ہو کر دروازہ کھولا۔ اسے دیکھ کر وہ بری طرح چونکا تھا۔

"تم؟ خیریت؟"

"مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔ ٹھیک ٹھیک بتائیے گا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"

وہ اتنے جارحانہ انداز میں بولی تھی کہ وہ پریشان ہی ہو گیا۔

"کیا ہوا ہے محمل؟"

"میری بات کا جواب دیں۔"

"اچھا اندر آ جاؤ۔" وہ اسے راستہ دیتے ہوئے پیچھے ہوا۔ بلیک ٹراؤزر پہ گرے آدھے بازوؤں والی شرٹ پہنے، ہاتھ میں تولیہ پکڑے وہ غالباً ابھی نہا کر نکلا تھا۔ ماتھے پہ بکھرے گیلے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

وہ دو قدم اندر آئی، یوں کہ اب دروازے کی چوکھٹ میں کھڑی تھی۔

"آپ فرشتے کے کون ہیں؟"

"ہاں، کیوں؟"

"فرشتے کس کی بیٹی ہے؟ اس کا باپ کون ہے؟"

"باپ؟" وہ ذرا سا چونکا "اس نے تم سے کچھ کہا ہے؟"

"میں نے پوچھا ہے، فرشتے کس کی بیٹی ہے؟" وہ [illegible] سی غرائی تھی۔

"ادھر بیٹھو، آرام سے بات کرتے ہیں۔" وہ اس کو راستہ دیتا اس کی طرف سے [illegible]

"نہیں بیٹھنا [illegible] مجھے اب [illegible]"

"ادھر بیٹھو تو [illegible] سے میری بات سنو۔" وہ بچوں کی [illegible] سہلاتے ہوئے آگے بڑھا اور نرمی [illegible] تھامنا چاہا۔

"ہاتھ مت لگائیں مجھے۔" وہ بدک کر پیچھے ہٹی۔

"[illegible] ادھر آؤ۔" وہ دو قدم آگے اس کے قریب آیا [illegible] محمل نے اچانک آستین میں چھپی چھری نکالی۔

"مجھے آپ پہ ذرا بھروسا نہیں ہے۔ دور رہیں۔" وہ چھری کی نوک اس کی طرف کیے دو قدم مزید پیچھے ہٹی۔

"چھری کیوں لائی ہو؟ مجھے مارنے؟" اس کے ماتھے پہ بل پڑے اور آنکھوں میں غصے کی لہر ابھری۔ وہ تیزی سے بڑھا اور محمل کا چھری والا ہاتھ کلائی سے پکڑ کر مروڑا۔

"چھوڑیں مجھے، ورنہ میں آپ کو مار دوں گی۔" وہ اس کی مضبوط گرفت کے باوجود کلائی چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے اس کے کندھے کو پیچھے دھکیلنا چاہا۔ ہمایوں اس کے چھری والے ہاتھ کا رخ دوسری طرف موڑ رہا تھا اور پھر اسے پتا بھی نہیں چلا اور چھری کی تیز دھار گوشت میں گھستی چلی گئی۔

محمل کو لگا وہ مرنے والی ہے، اس نے خون ابلتے ہوئے دیکھا اور پھر اپنی چیخ سنی۔ مگر نہیں اسے چھری نہیں لگی تھی۔ پھر؟

وہ کراہ کر پیچھے ہٹا تو محمل کی کلائی آزاد ہو گئی۔ ہمایوں کے دائیں پہلو سے خون ابل رہا تھا۔ وہ چھری پہ ہاتھ رکھے [illegible] دو قدم پیچھے ہٹا تھا۔

"او میرے اللہ! یہ میں نے کیا کر دیا۔" خوف سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔

چھری پہ رکھا ہمایوں کا ہاتھ خون سے سرخ پڑنے لگا تھا۔ وہ درد کی شدت سے آنکھیں بند کیے دیوار کے ساتھ بیٹھتا چلا گیا۔

وہ دہشت زدہ سی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا پورا جسم کانپنے لگا تھا۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب اس نے کیا ہے۔ خدایا! یہ اس نے کیا کر دیا تھا۔

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کو دیکھتی قدم قدم پیچھے ہٹنے لگی، اور پھر ایک دم مڑی اور تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی گئی۔ پوری قوت سے لاؤنج کا دروازہ کھول کر وہ باہر بھاگی تھی۔

چوکیدار گیٹ پہ نہیں تھا، کہاں تھا، اسے پروا نہ تھی۔ وہ تیز دوڑتی ہوئی مسجد میں داخل ہوئی تھی۔

"فرشتے... فرشتے کدھر ہیں؟" پھولی سانسوں کے درمیان پوچھتی وہ [illegible] پہ رکی تھی۔

"فرشتے باجی لائبریری میں ہوں گی۔"

اس نے پوری بات نہیں سنی اور راہداری میں دوڑتی گئی۔

لائبریری کے اسی کونے میں کرسی ڈالے وہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے بیٹھی تھی۔ وہ بدحواس سی بھاگتی ہوئی اس کے سامنے جا رکی۔

آہٹ پہ فرشتے نے چہرے سے ہاتھ ہٹائے۔ اسے دیکھ کر اس کی نگاہیں جھک گئیں۔

"میں جانتی ہوں تم ہرٹ ہوئی ہو۔" ایک گہری سانس لے کر وہ اپنی رو میں کہنے لگی تھی "اور میں اسی ڈر سے تمہیں یہ پہلے نہیں بتا..." کہتے کہتے فرشتے نے نگاہیں اٹھائیں۔ اور پھر اگلے الفاظ اس کے لبوں پہ دم توڑ گئے۔

محمل کے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"محمل کیا ہوا؟" وہ پریشان سی کھڑی ہوئی۔

"فرشتے، فرشتے... وہ ہمایوں..." وہ رو دینے کو تھی۔

"کیا ہوا ہمایوں کو؟ بتاؤ محمل!" اس نے فکرمندی سے محمل کو دونوں شانوں سے تھام کر پوچھا۔

"وہ... ہمایوں... ہمایوں مر گیا۔"

محمل کے شانوں پہ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اسے لگا وہ اگلا سانس نہیں لے سکے گی۔

"یہ کیا کہہ رہی ہو؟"

"میں نے جان... جان بوجھ کر نہیں... ہمایوں کو... وہ اسے چھری لگ گئی۔ میں نے غلطی سے اسے میری۔"

"وہ کدھر ہے۔ ابھی؟" فرشتے نے تیزی سے بات کاٹی۔

"اپنے گھر... بیڈروم میں۔"

فرشتے نے اگلا لفظ نہیں سنا اور تیزی سے باہر کی طرف بھاگی تھی۔ وہ کہیں بھی جاتی تو ہمیشہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ساتھ لے کر جاتی تھی۔ آج اس نے اس کا ہاتھ نہیں تھاما تھا۔ آج وہ اکیلی بھاگی تھی۔

اسے خود بھی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بس وہ بھی فرشتے کے پیچھے لپکی تھی۔

"ہمایوں... ہمایوں۔" وہ محمل کے آگے بھاگتی ہوئی ہمایوں کے لاؤنج میں داخل ہوئی تھی اور اسے آوازیں دیتی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔

"ہمایوں؟"

وہ آگے پیچھے گول سیڑھیوں کے دہانے پہ رکی تھیں۔ ہمایوں کمرے کی بیرونی دیوار کے ساتھ لگا زمین بیٹھا تھا۔ خون آلود چھری اس کے ایک طرف رکھی تھی۔

"ہمایوں! تم ٹھیک ہو۔" وہ پریشان سی گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھی۔ اس نے جیسے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

"تم ادھر ہو...؟" اپنے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھی فرشتے سے ہوتی ہوئی اس کی نظر اس کے پیچھے کھڑی محمل پہ جا رکی۔

"تمہیں محمل نے بتایا کہ..."

"فرشتے! تم جاؤ اور اس بے وقوف لڑکی کو بھی لے جاؤ۔"

"مگر ہمایوں..."

"میں نے احمر کو کال کر دیا ہے' پولیس پہنچنے والی ہے' تم دونوں کی ادھر موجودگی ٹھیک نہیں ہے' جاؤ۔" وہ درد کی شدت سے بدقت بول پا رہا تھا۔

"مگر..." فرشتے نے تذبذب سے گردن موڑ کر محمل کو دیکھا جو سفید پڑتا چہرہ لیے ادھر کھڑی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ اس وقت کیا کرے۔

"میں نے کہا نا۔ جاؤ۔" وہ گھٹی گھٹی آواز میں چلایا تھا۔

"اچھا۔" وہ گھبرا کر کھڑی ہوئی۔

"نہیں۔ میں نہیں جاؤں گی۔ بے شک مجھے پولیس پکڑ لے' مگر میں..."

"محمل جاؤ!!!!" وہ زور سے چیخا تھا۔

"چلو محمل۔" فرشتے نے جیسے فیصلہ کر کے اس کا ہاتھ پکڑا اور سیڑھیاں اترنے لگی۔

"ہمایوں! میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ آئی ایم سوری... آئی ایم رئیلی۔" فرشتے اس [illegible] کا ہاتھ کھینچتی ہوئی سیڑھیاں اتر رہی تھی مگر وہ اسی طرح گردن موڑ کر ہمایوں کو دیکھتی روہانسی سی کہے جا رہی تھی۔

"جسٹ گو!" وہ [illegible] کر بولا تھا۔ وہ اب سیڑھیوں کے درمیان میں تھیں' وہاں سے اسے ہمایوں کا [illegible] نظر آ رہا تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ابل رہے تھے۔ فرشتے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے باہر لے آئی تھی۔

"تم کیوں گئیں اس کے گھر محمل؟ مجھے بتاؤ ادھر کیا ہوا تھا؟" مسجد کے گیٹ پہ فرشتے نے پوچھا تو اس نے اپنا ہاتھ زور سے چھڑا لیا۔

"محمل! ناراض مت ہو۔ ابھی وہاں میری اور تمہاری موجودگی ٹھیک نہیں ہے۔"

"وہ ادھر مر رہا ہے اور آپ..." اس کی آنکھوں سے متواتر آنسو گر رہے تھے۔

"وہ ابھی اسے ہسپتال لے جائیں گے۔ زخم بہت زیادہ نہیں تھا' وہ ٹھیک ہو جائے گا مگر تم نے کیوں مارا اسے؟"

"میں بھلا ہمایوں کو مار سکتی ہوں۔ میں کر سکتی ہوں ایسا؟" وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ فرشتے بری طرح سے چونکی تھی۔ محمل کے چہرے پہ چھایا حزن' ملال' اور وہ آنسو۔ وہ عام آنسو نہ تھے۔ "میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا ایسا۔ آئی ایم سوری۔"

"اچھا اندر آؤ' آرام سے بات کرتے ہیں۔" اس نے خود کو سنبھال کر کہنا چاہا مگر وہ کچھ سننے کو تیار ہی نہ تھی۔

"انہوں نے بھی [illegible] کہا تھا۔ میرا قصور نہیں تھا۔" وہ اسی طرح [illegible] کھڑی روئے چلی جا رہی تھی۔ "وہ ٹھیک تو ہو جائیں گے فرشتے؟"

[illegible] فرشتے نے شاید اس کی بات نہیں سنی تھی۔ وہ گم صم سی اس کی آنکھوں سے گرتے آنسو دیکھ رہی تھی۔ وہ واقعی عام آنسو نہ تھے۔

"میں گھر جا رہی ہوں۔ پلیز' آپ مجھے ہمایوں کے بارے میں بتاتی رہیے گا۔"

"اچھا۔" اس نے غائب دماغی سے سر ہلا دیا۔

محمل اب درختوں کی باڑ کے ساتھ دوڑتی ہوئی دور جا رہی تھی۔ وہ جیسے نڈھال سی گیٹ سے لگی یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

ہاں' وہ آنسو بہت خاص تھے۔

☼ ☼ ☼

ہسپتال کا ٹائلز سے چمکتا کاریڈور خاموش پڑا تھا۔ کاریڈور کے اختتام پہ وہ بینچ پہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ محمل جو دوڑتی ہوئی ادھر آ رہی تھی' اسے بیٹھے دیکھ کر لمحے بھر کو ٹھٹکی رکی' پھر بھاگتی ہوئی اس کے قریب آئی۔

"فرشتے۔ فرشتے۔"

فرشتے نے ہاتھوں میں گرا سر اٹھایا۔ "وہ کیسا ہے؟"

محمل اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھی اور دونوں ہاتھ اس کے گھٹنوں پہ رکھے۔

"بتائیں نا' وہ کیسا ہے؟" وہ بے قراری سے اس کی سنہری آنکھوں میں دیکھتی جواب تلاش کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔" وہ بھی محمل کی بھوری آنکھوں میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔

"میں اس سے مل سکتی ہوں؟"

"ابھی وہ ہوش میں نہیں ہے۔"

"کیوں؟" وہ تڑپ کر بولی تھی۔ وہ فجر کا وقت تھا اور جبھی فرشتے نے اسے اطلاع دی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

"ڈاکٹرز نے خود اسے سلا رکھا ہے۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا محمل! تم پریشان نہ ہو۔"

"میں کیسے پریشان نہ ہوں؟ میں نے ان کو چھری ماری ہے۔ میں..."

"ایسا کیا ہوا تھا محمل؟ تم نے کیوں کیا ایسے؟"

"میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ میں ان سے پوچھنے گئی تھی کہ..." وہ لب کچلتی ڈبڈبائی آنکھوں سے کہتی چلی گئی۔ فرشتے اسی ٹھٹکے ٹھٹکے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم مجھ سے پوچھ لیتیں محمل! اس کو... خیر چھوڑو کوئی بات نہیں۔"

چند لمحے یونہی سرک گئے۔ وہ اسی طرح فرشتے کے سامنے فرش پہ دو زانو بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ ابھی تک فرشتے کے گھٹنوں پہ تھے۔ بہت دیر بعد اس نے خاموشی کو چیر دیا۔

"آپ نے کہا آپ آغا ابراہیم کی بیٹی ہیں؟"

"ہاں۔ میں آغا ابراہیم کی بیٹی ہوں۔"

"میرے ابا کی..." اس کا گلا رندھ گیا۔

"تمہیں یہ انہونی کیوں لگتی ہے؟ سوائے تمہارے' تمہارے سب بڑوں کو علم ہے۔ تمہاری امی کو بھی۔"

"امی کو بھی؟" اسے جھٹکا لگا تھا۔

باقی آئندہ شمارے میں

ادھر ادھر دیکھا۔ جانے سب لوگ کہاں تھے۔ ٹی وی کا منظر بھی بدل چکا تھا۔ وہ گہری سانس بھرتی ٹیلی فون تک آئیں اور ریسیور اٹھالیا۔ ابرار کی کوئی دور پرے کی عزیزہ تھیں۔ تقریب میں شریک نہ ہونے کی معذرت کررہی تھیں۔ دراصل ان کے شوہر کے کسی دوست کے والد کا انتقال ہوگیا تھا اور وہ لوگ وہیں جارہے تھے۔ نائلہ نے ناراض نہ ہونے کی یقین دہانی کرواکر فون رکھ دیا تھا تبھی ایک بچی بھاگتی ہوئی آئی۔

"آنٹی۔۔۔۔ آنٹی! معیز بھائی بیلون (غبارے) والا پیکٹ مانگ رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں پھلا کر لگانے ہیں۔" اس نے پھولی سانسوں کے درمیان پرجوش انداز میں بتایا تھا۔

"کیا بچوں کی طرح بیلون۔۔۔ ایک تو یہ لڑکا بھی نا!" وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں اور الماری میں دھرا غباروں کا پیکٹ نکال کر بچی کو تھمادیا۔ جانے کے لیے مڑی ہی تھیں کہ نظر میز کے نچلے حصے میں پڑی جائے نماز سے جاٹکرائی اور ایک بار پھر ماضی کی کھڑکی پر پڑے دبیز پردے یادوں کی تیز ہوا سے پھڑپھڑانے لگے۔

یہ کمرہ کبھی ان کی ساس کا ہوا کرتا تھا اور یہ جائے نماز بھی۔ وہ پکی نمازی خاتون تھیں۔ سب کے ساتھ بہت اچھے طریقے سے ملتیں مگر نائلہ کے ساتھ ان کا رویہ بہت ناقابل فہم تھا۔ ایک عجیب سی سرد مہری اور سخت مزاجی نائلہ کو دیکھتے ہی ان کی شخصیت میں در آتی تھی۔ انہوں نے کبھی عام ساسوں کی طرح ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ نہیں توڑے اور نہ ہی ابرار کو ان کے خلاف ورغلانے کی کوشش کی مگر ہر وہ کام کیا کہ جس سے نائلہ کے ذرا سا بھی پریشان ہونے کا امکان ہو۔ خواہ اس میں وہ اپنا ہی نقصان کیوں نہ کر بیٹھیں۔

شروع شروع میں تو نائلہ کو ان کا رویہ ذرا سمجھ میں نہ آتا لیکن پھر ایک دن ابرار نے ان کی یہ الجھن بھی دور کردی۔ دراصل وہ ابرار کی شادی اپنی بھتیجی سے کرنا چاہتی تھیں جو ان کی سگی بھانجی بھی تھی لیکن ابرار نے دوسرے کا رشتہ کرنے سے صاف انکار کردیا اور ایک رشتہ کروانے والی کے توسط سے ماں کو نائلہ کے گھر بھجوادیا اور بس یوں اماں کے غصے کو گھر میں ایک مستقل رکنیت حاصل ہوگئی۔

حقیقت جاننے کے بعد نائلہ مزید تندہی سے ان کی خدمت میں جت گئی تھی۔ اماں ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں اور نائلہ کو پریشان کرنے کے لیے وہ منع ہونے کے باوجود کئی گرم تاثیر والی چیزیں کھاتی رہتی تھیں۔ اسی طرح ایک دن نائلہ نے ابرار کے لیے ان کی پسندیدہ کڑھی تیار کی اور آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

وہ موقع پاتے ہی کچن میں گھس گئیں، خوب پیٹ بھر کر کڑھی کھائی یوں ان کا بلڈ پریشر شوٹ کرگیا اور نتیجتاً وہ فالج کا شکار ہوگئیں۔ اٹیک اتنا خطرناک تھا کہ ان کے جسم کا ہر حصہ مفلوج ہوگیا حتیٰ کہ زبان بھی لیکن اس دگرگوں صورت حال میں بھی نائلہ نے ہمت ہاری نہ ہی دن رات شوہر کے سامنے واویلا کیا بلکہ اس جانفشانی سے ساس کی خدمت کی کہ دن رات کا ہوش بھلادیا لیکن اپنے سے وابستہ رشتوں کو کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔ جس کا صلہ یہ ملا کہ بالآخر رخصت ہوتے وقت ان کی ساس نے انہیں مسکرا کر دیکھا تھا۔

اور یوں وہ تین سال اپنے اختتام کو پہنچے جو ان کی زندگی کے مشکل ترین دن اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھے۔

"نانو! نانو! آئیں نا دیکھیں باہر کتنی پیاری سی چیز آئی ہے۔"

ان کا نواسا اسد جو معیز کا بیٹا تھا ان کی انگلی پکڑ کر کھینچ رہا تھا۔ پہلے تو انہیں کچھ سمجھ ہی نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے جب ہوش ذرا بحال ہوئے تو آہستہ سے اس کے ساتھ ہولیں۔

معیز ان کا سب سے چھوٹا بیٹا جو ایک ہفتہ قبل ہی برطانیہ سے اپنی تعلیم مکمل کرکے آیا تھا لان میں کرسیاں سیٹ کروا رہا تھا۔

"بیٹا! ٹیبلز کے درمیان ذرا فاصلہ رکھنا تاکہ گزرنے میں آسانی رہے۔"

"جی امی! ڈونٹ وری میں خیال رکھوں گا۔" ان کی ہدایت پر وہ سعادت مندی سے بولا تھا۔

شام کے دھندلکے تیزی سے نمودار ہورہے تھے۔ وہ لان میں چہل قدمی کرتی گھر کی پچھلی طرف نکل آئیں اور کونے میں دھری کین کی واحد کرسی گھاس کے قطعے پر کھینچ لی۔ ابھی بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ مخصوص شور نے ان کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ انہوں نے بے ساختہ آسمان کی طرف دیکھا جہاں پرندے گروہوں کی صورت میں اپنے گھروں کی طرف محو پرواز تھے۔ ان کی نظریں بے اختیار گھومتی ہوئی اپنے گھر کی دیواروں سے جاٹکرائیں۔

انہیں بھی تو یہ آشیانہ اپنی جان سے عزیز تھا کیونکہ اس کی جڑوں میں ان کی محبت رچی بسی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ابرار کی تنخواہ اگر زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھی لیکن بڑھتی مہنگائی نے جینا مشکل کردیا تھا اور اوپر سے مکان کا کرایہ ایک اضافی خرچے کی طرح سر پر مسلط تھا۔ انہی دنوں کراچی میں کچھ نئی ہاؤسنگ اسکیموں کا آغاز ہوا جہاں مکان تو اچھے تھے ہی دام بھی مناسب تھے۔

انہوں نے اس موقع کو ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور آفس سے لون لے کر مکان کی تلاش شروع کردی۔ اب گھر تو ایک ہی بار خریدا جاسکتا ہے لہٰذا کوشش تھی کہ اچھا ہی لیا جائے اور پھر ان کی نظر اس مکان پر ٹھہر گئی۔ کشادہ کمرے، خوبصورت طرز تعمیر ابرار کے ساتھ ساتھ نائلہ کو بھی یہ گھر بے حد پسند آیا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کی قیمت ابرار کی گنجائش سے زیادہ تھی اور چھوڑنا وہ کسی قیمت پر نہیں چاہتے تھے۔ بہت غور و فکر کے بعد بھی جب کوئی راستہ نہ نکلا تو ابرار نے اسے تمام زیور بیچنے کا مشورہ دیا۔ سسرال کی تو خیر تھی مگر میکے والا زیور ان کے لیے بہت معنی رکھتا تھا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ کس طرح ان کی ماں نے ابو کی ماہوار تنخواہ سے ایک ایک پائی بچاکر خریدا تھا لیکن اپنے شوہر کی رضا اور خوشنودی کو انہوں نے اپنی خواہش پر ترجیح دی اور اپنا تمام زیور بیچ دیا سوائے ان بالیوں کے جو اب بھی ان کے کانوں میں جھوم رہی تھیں۔

نائلہ نے ہوش سنبھالتے ہی اپنی ماں کو ان بالیوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ انہیں بیچنے کے خیال سے ہی انہیں وحشت ہونے لگی تھی۔ انہیں لگتا جیسے وہ اپنی ماں کا لمس بیچ رہی ہوں اور یہ انہیں گوارا نہیں تھا۔ اسی لیے انہوں نے اس معاملے پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا اور ان کی جذباتی وابستگی دیکھتے ہوئے ابرار نے بھی ضد نہیں کی تھی۔

انہوں نے محبت سے ان بالیوں کو چھوا تھا تب ہی معیز کی پکار سنائی دی۔

"ارے امی! آپ یہاں بیٹھی ہیں اور ادھر مہمان آنے والے ہیں۔ ابو بھی نہیں ہیں۔ پلیز جلدی سے تیار ہوجائیے تاکہ مہمانوں کو ریسیو کیا جاسکے۔"

وہ کافی عجلت میں تھا۔ انہیں ہدایت دیتے ہی واپس پلٹ گیا تو وہ بھی نیم دلی سے اندر کی طرف بڑھ گئیں۔ تیار ہوکر باہر آئیں تو مہمانوں کی آمد شروع ہوچکی تھی۔ ابرار ابھی تک نہیں آئے تھے۔ وہ معیز کے ساتھ مہمانوں کا استقبال کرنے لگیں۔ تقریباً سارے مہمان آچکے تھے لیکن ابھی تک ابرار کا کچھ پتا نہیں تھا۔ تمام دوست احباب بار بار ان کا پوچھ رہے تھے اور وہ شرمندہ شرمندہ سب کو جواب دے رہی تھیں پھر ان سے رہا نہ گیا تو معیز سے بولیں۔

"بیٹا! ابو کا پتا کرو کہاں رہ گئے ہیں۔ سب ان کا پوچھ رہے ہیں اور کھانا بھی ٹھنڈا ہورہا ہے۔"

"میں نے فون کیا تھا انہیں کچھ دیر پہلے کہہ رہے تھے ذرا لیٹ ہوجائیں گے آپ تو آنے ہی والے ہوں گے۔" وہ انہیں جواب دے کر ایک اور مہمان کو ریسیو کرنے چلا گیا تو نائلہ بھی سب کے سوالوں سے بچنے کے لیے ایک نسبتاً خالی ٹیبل کی کرسی سنبھال کر بیٹھ گئیں۔ ان کی نظریں گیٹ پر لگی تھیں تب ہی پچھلی ٹیبل سے ایک مہمان خاتون کی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔

"کمال ہے۔ آج بھی ابرار صاحب اتنے لیٹ ہیں

تھا۔ بزنس کے معاملے میں کوئی کمپرومائز نہیں کرتے۔"

"تو اور کیا۔ ان کی دن رات کی محنت کی وجہ سے ہی کاروبار اتنی ترقی کر سکا ہے ورنہ سنا ہے پہلے تو کوئی معمولی سی جاب ہی کیا کرتے تھے۔"

دوسری خاتون کے پاس خاصی معلومات تھیں۔

نائلہ کو وہ وقت یاد آیا جب ابرار جاب کیا کرتے تھے۔ اچھے بھلے پُرسکون دن گزر رہے تھے کہ ابرار کے آفس میں ایک بہت بڑے گھپلے کی خبر منظر عام پر آئی اور ہر طرف کھلبلی مچ گئی۔ بہت تحقیقات کے بعد بھی جب اصل بندے کا پتا نہ چل سکا تو آفس والوں نے تمام پرانے ملازمین پر شک ظاہر کیا اور انہیں شامل تفتیش کر کے انکوائری شروع کر دی۔

ابرار چونکہ بے گناہ تھے لہٰذا ثابت ہو جانے کے بعد ہی سہی وہ اس کیس سے بری ہو گئے۔ لیکن نقصان یہ ہوا کہ ملازمت تو چھوٹی ہی ساتھ سارا جمع جتھا بھی کیس پر خرچ ہو گیا۔

غبن کا الزام لگنے کی وجہ سے اتنے تجربے کے باوجود بھی کوئی انہیں ملازمت دینے کو تیار نہیں تھا۔ ہاتھ میں کچھ تھا نہیں لہٰذا کھانے کے لالے پڑ گئے۔ کوئی راہ نکلتی نہ دیکھ کر نائلہ نے ایک فیصلہ کیا اور وہ آنگن جہاں انہوں نے بچپن سے جوانی کا حسین سفر طے کیا تھا۔ جہاں ان کے ماں باپ کے قدموں کے نشان تھے ان کی آوازوں کی گونج تھی نائلہ نے اپنے بچوں کی آوازوں کی کھنک کو برقرار رکھنے کے لیے بیچ دیا۔

ان کے پاس ان کے والدین کی آخری نشانی تھی جسے انہوں نے اپنے خاندان کے مستقبل کے لیے قربان کر دیا اور حاصل ہونے والی رقم ابرار کو تھمادی، جس سے انہوں نے ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کیا جو ان کی دن رات کی محنت کے سبب اتنا بڑھا کہ ان کا معیارِ زندگی ہی بدل گیا۔

سب سے پہلے انہوں نے اپنے گھر کے ساتھ والا خالی پلاٹ خرید کر گھر کی توسیع کی پھر دھوم دھام سے دونوں بیٹیوں شادی کی۔ بیٹے کو برطانیہ سے اعلیٰ تعلیم دلوانے کے بعد اب اس کی شادی کا ارادہ تھا۔

غرض کہ وہ ایک مکمل اور خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ بظاہر کہیں کوئی کمی نہیں تھی۔ انہوں نے اپنے گھر والوں کے لیے وہ سب کچھ کیا تھا جو ان کے بس میں تھا، انہیں خوش اور مطمئن ہونا چاہیے تھا مگر نہیں۔

کہیں کوئی کمی تھی نا محسوس سی جو انہیں خوش نہیں ہونے دیتی تھی۔ ایک عجیب سا خالی پن جو ان کے اندر کنڈلی مارے بیٹھا ان کے اطمینان کو نگل رہا تھا۔ ایک بے نام سا احساس کہ جس کے زیر اثر سب کچھ بے معنی، بے وقت لگ رہا تھا اور وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھیں۔ بس ایک تھکن تھی جو ان کے جذبات و احساسات سمیت پورے وجود پر حاوی تھی۔

"امی۔ چلیے ابو آگئے ہیں۔" یہ معیز تھا۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر اس ٹیبل کی طرف بڑھ گئیں جہاں ان کی بیٹیاں اور داماد براجمان تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ بیٹھتیں ابرار نے انہیں پکار لیا۔

"ارے بیگم! ابھی بیٹھنے کا وقت نہیں ہے تو کیک کاٹیں تاکہ کھانا لگایا جا سکے۔ بہت سے مہمان بھوک سے بے حال ہمیں بددعائیں دے رہے ہیں۔" وہ شرارت سے عجیب شاہ کی طرف دیکھ کر بولے جو کب سے بھوک بھوک کا شور مچا رہا تھا۔

"ارے بھابھی بیٹھیے آپ [illegible] بھوک کو ڈھال بنا کر [illegible] کی کوشش [illegible] بھی آج تمہاری شادی کی تیسویں سالگرہ [illegible] الفاظ تو بھابھی بیچاری کا حق [illegible] آخر انہوں نے تیس سال ابرار احمد [illegible] ہے۔" وہ بھی عجیب شاہ تھے۔ [illegible] ابرار کو دیے ان کے خطاب پر سب [illegible] ابرار بھی ہنستے ہوئے بولے۔

"[illegible] چند الفاظ۔ ارے بھئی ہم تو پورے کے پورے تمہاری بھابھی کے ہیں۔" انہوں نے مسکرا کر نائلہ کی طرف دیکھا پھر قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔

"لیکن مذاق سے قطع نظر آج جبکہ مجھے موقع مل ہی رہا ہے تو میں آپ سب لوگوں کے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ گو کہ میں جانتا ہوں کہ یہ بہت لیٹ ہے۔ آپ اسے میری کم ہمتی سمجھیں یا کم فہمی لیکن پچھلی کوتاہیوں کو فراموش کر کے میں آج بالکل سچے دل سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ صرف میرے لفظوں پر ہی نہیں میری پوری زندگی پر اگر کسی کا حق ہے تو وہ صرف اور صرف نائلہ ہے اور نہ صرف میری زندگی کی بلکہ ہماری 30th اینیورسری کے [illegible] کیک کو کاٹنے کی حق دار بھی نائلہ ہی ہے کیونکہ ازدواجی زندگی کے ان تیس سالوں کو کامیاب [illegible] میرا کردار تو شاید ایک فیصد بھی نہیں [illegible] نائلہ کا پورے سو فیصد ہے۔"

نائلہ نے حیرت سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا، وہ دھیرے دھیرے بول رہے تھے۔

"اس نے ہر مشکل میں میرا ساتھ دیا۔ ہماری شادی شدہ زندگی کے ہر کرائسس، ہر پریشانی میں یہ [illegible] ہمارے گرد تنی رہی کہ ہر کرائسس، پریشانی اس کا ناتواں وجود اپنے اندر ضم کرتا رہا اور ہمیں بچاتا رہا۔ تو وہ جو کہتے ہیں ناکہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے تو میں برملا یہ کہتا ہوں کہ میرے پیچھے وہ عورت نائلہ تھی۔

خواہ زندگی کا کوئی بھی معاملہ ہو اس نے ہمیشہ مجھے اور بچوں کو گھریلو سکون فراہم کیا۔ ہمیشہ ہماری تھکن اتاری، کبھی اس کا سامان نہیں کیا اور اس کا ایک احسان تو ایسا ہے جو شاید ہی میں کبھی اتار پاؤں۔

آپ میں سے شاید کوئی نہ جانتا ہو کہ میرا یہ بزنس جو آج پورے ملک میں اپنی شاخیں پھیلا رہا ہے اس کے لیے سرمایہ نائلہ نے فراہم کیا تھا۔ اپنا وہ آبائی گھر بیچ کر جو اس کے والدین کی واحد نشانی تھا اور وہ بھی اس وقت جب آفس کے مسائل کی وجہ سے میری نوکری ختم ہو چکی تھی اور ہمارے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا..." شدتِ جذبات سے وہ چند لمحوں کو خاموش ہوئے پھر دوبارہ سلسلۂ کلام جوڑا۔ نائلہ ساکت بیٹھی انہیں سن رہی تھیں۔

"اور آج اپنی تیسویں ویڈنگ اینیورسری کے موقع پر بھی [illegible] "آپ سب جاننا چاہتے ہوں گے کہ میں نائلہ کو کیا تحفہ دے رہا ہوں۔ میں چاہتا تو اسے ہیروں کے سیٹ دے سکتا تھا۔ چاہتا تو ورلڈ ٹور پر بھی لے جا سکتا تھا مگر ان تمام مادی چیزوں کو چھوڑ کر میں اسے وہ تحفہ دینا چاہتا ہوں جو میں جانتا ہوں کہ اس کے لیے سب سے قیمتی، سب سے اہم ہے۔"

"نائلہ!" انہوں نے اپنی نصف بہتر کو پکارا تھا۔

"یہ تمہارے آبائی گھر کی چابیاں اور کاغذات ہیں جو آج سے ہمیشہ کے لیے تمہارا ہے۔ میں تمہیں تمہارے والدین کی وہ محبت تو نہیں لوٹا سکتا جو میری وجہ سے تم سے دور ہوئی مگر ان کی وہ آخری نشانی ضرور لوٹا سکتا ہوں جو تمہارے میکے کی آخری یاد تھا اور جسے تم نے صرف میری خاطر چھوڑ دیا۔"

ابرار دھیرے سے چلتے ہوئے آئے، دونوں چیزیں ٹیبل پر رکھیں اور نرمی سے نائلہ کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں جانتا ہوں نائلہ! کہ میں نے تم سے یہ سب کہنے میں بہت دیر کر دی۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں بہت لاپروا ہوں اور یہ بھی کہ میں بالکل اچھا شوہر ثابت نہیں ہو سکا مگر میں آج تم سے یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ تم دنیا کی سب سے اچھی بیوی ہو اور یہ بھی کہ میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔"

ان کی آنکھوں میں سچائی کی چمک تھی۔ نائلہ نے نم آنکھوں سے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور کھل کر مسکرا دیں۔

ان کے شوہر کے لبوں سے ادا ہوئے چند الفاظ نے آج انہیں پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ اندر کا خالی پن جیسے پل میں بھرتا جا رہا تھا۔ ہر شے مکمل لگ رہی تھی بغیر کسی کمی کے۔

انہیں لگا جیسے ان کی تمام عمر کی قربانیوں کا صلہ مل گیا ہو۔ انہوں نے اپنے بچوں کی طرف دیکھا جو مسکرا رہے تھے اور اپنے شوہر کا ہاتھ تھامے پورے اعتماد سے کیک کی طرف بڑھ گئیں۔ ان کی چال میں ایسی جولانی اور خوشی تھی جیسے وہ آج ہی ابرار احمد کے سنگ رخصت ہو کر آئی ہوں۔

☆

کھیل، کھلاڑی

عجب طرز تماشا ہے
دُنیا کھیل تماشا ہے
اس کھیل، تماشے میں
ہم، تم حصہ
اپنے بڑے، جو آئے تھے
اس کھیل تماشے کا
وہ بھی حصہ
لیکن کھیل تماشے کو
وہ نہ سمجھے
آؤ! ہم تم کھیل سمجھ کے
ایسا کھیلیں
کہ کھیل کھلانے والے در پردہ کو
ہمیشہ کے لیے، کر دیں قصہ

ظریف احسن

مجھے رونا نہیں آواز بھی بھاری نہیں کرنی
محبت کی کہانی میں اداکاری نہیں کرنی

ہمارا دل ذرا اکتا گیا تھا گھر میں رہ کر
یونہی بازار آئے ہیں، خریداری نہیں کرنی

تحمل اے محبت، ہجر پتھریلا علاقہ ہے
تجھے اس راستے پر تیز رفتاری نہیں کرنی

ہوا کے خوف سے لپٹا ہوا ہوں خشک ٹہنی سے
کہیں جانا نہیں جانے کی تیاری نہیں کرنی

غزل کو کم لگا ہوں کیونکہ مجھے دور رکھنا ہو
مجھے ہجر دماغوں میں محو کاری نہیں کرنی

نصیحت کی تھی مجھ کو قیس نے صحرا کے بارے میں
یہ گھر ہے اس کی چار دیواری نہیں کرنی

افضل خان

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگزر پھر بھی

شب فراق سے آگے ہے آج میری نظر
کہ کٹ ہی جائے گی یہ شام بے سحر پھر بھی

پلٹ رہے ہیں غریب الوطن، پلٹنا تھا
وہ کوچہ روکش جنت ہو، گھر ہے گھر پھر بھی

خراب ہو کے بھی سوچا کیے ترے مہجور
یہی کہ تیری نظر ہے تری نظر پھر بھی

غم فراق کے کشتوں کا حشر کیا ہوگا
یہ شام ہجر تو ہو جائے گی سحر پھر بھی

فراق گورکھپوری

حساب ترکِ تعلق تمام میں نے کیا
شروع اس نے کیا، اختتام میں نے کیا

مجھے بھی ترکِ محبت پہ حیرتیں ہی رہیں
جو کام میرا نہیں تھا، وہ کام میں نے کیا

بہت دنوں میں مرے گھر کی خامشی ٹوٹی
خود اپنے آپ سے اک دن کلام میں نے کیا

اس ایک ہجر نے بلوا دیا وصال سے بھی
کہ تو گیا تو محبت کو عام میں نے کیا

مزاجِ غم نے بہر طور مشغلے ڈھونڈے
کہ دل دکھا تو کوئی کام وام میں نے کیا

مسعود عثمانی

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا، ایک شخص دوسرے شخص کی تعریف کر رہا ہے اور تعریف میں بہت مبالغہ سے کام لے رہا تھا تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم نے اسے ہلاک کر دیا یا (یہ فرمایا) تم نے اس شخص کی کمر توڑ دی۔" (بخاری)

الفاظ،

لفظ انسان کے غلام ہوتے ہیں مگر صرف بولنے سے پہلے تک۔ بولنے کے بعد انسان اپنے لفظوں کا غلام بن جاتا ہے۔ (حضرت علیؓ)

تواضع

حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عمرؓ حضرت سلمان فارسیؓ کے پاس گئے۔ حضرت سلمانؓ نے ان کے لیے ایک تکیہ رکھ دیا۔

حضرت عمرؓ نے کہا۔ "اے ابوعبداللہ! یہ کیا ہے؟"

حضرت سلمان فارسیؓ نے کہا۔

"میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس مسلمان کے پاس اس کا مسلمان بھائی آتا ہے تو وہ اس کے اکرام و تعظیم کے لیے ایک تکیہ رکھ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دیتا ہے۔" (حیاۃ الصحابہؓ)

تمہیں کیوں دوں؟

ایک امریکی کروڑپتی سے ایک خیراتی ادارے کا رضا کار چندہ مانگنے گیا۔ رضا کار پوری تیاری کر کے گیا تھا۔ کروڑپتی سے کہنے لگا۔

"جناب! ہماری اطلاع کے مطابق فلاں بینک میں آپ کے اتنے کروڑ اور فلاں بینک میں اتنے کروڑ جمع ہیں۔ فلاں ریاست میں اتنی زمین اور فلاں شہر میں اتنی عمارتیں ہیں۔ بے شمار کارخانوں میں آپ حصے دار ہیں مگر آپ نے کبھی کسی خیراتی ادارے کو کچھ نہیں دیا؟"

کروڑپتی نے بڑے تحمل سے ساری بات سنی اور پھر خیراتی ادارے والے سے کہنے لگا۔

"تمہاری معلومات مکمل طور پر درست ہیں، مگر کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ میری ماں فلاں [illegible] اکیلی رہتی ہے۔ اس کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔"

رضا کار بولا۔ "نہیں جناب! مجھے علم نہیں۔"

کروڑپتی نے کہا۔ "اور کیا تمہیں [illegible] بھائی معذور ہے۔ جو خود کچھ [illegible]"

رضا کار شرمندہ ہو گیا۔ [illegible] سر اٹھ [illegible] پتا نہیں تھا۔"

کروڑپتی [illegible] معلوم ہے کہ میری بہن اپنے بچوں [illegible] ہے اس کا کمانے والا بھی کوئی نہیں۔"

[illegible] بولا۔ "میں بہت شرمندہ ہوں مجھے پتا [illegible] اپنے ہی اتنے لوگوں کو پال رہے ہیں تو میں [illegible] آپ کے پاس آتا۔"

کروڑپتی گرج کر بولا۔ "یہ بات نہیں، اصل بات یہ ہے کہ میں اپنے ان غریب رشتہ داروں کو کچھ نہیں دیتا تو تمہیں کیوں دوں۔"

عزہ اقراء۔ کراچی

نفس،

حبیب بن حمزہؓ کہتے ہیں کہ دو جھوٹے آسمان پر دو فرشتوں کی آپس میں ملاقات ہوئی۔ ایک نے کہا۔

"میں دنیا میں جا رہا ہوں کہ فلاں مچھلی کو ماہی گیر کے دام میں پھنسا آؤں کہ فلاں یہودی کو اس کی بڑی خواہش ہو رہی ہے۔"

دوسرے نے کہا۔ "میں بھی جا رہا ہوں اور مجھے اس بیلے کو زمین پر گرانا ہے جسے لوگ فلاں عابد کی خواہش کے مطابق روغن [illegible] کر اس کے پاس لا رہے ہیں۔"

[illegible] کالونی کراچی

حاصل [illegible]

وکیل استغاثہ نے گواہ پر جرح کرتے ہوئے کہا۔ [illegible] رضوان صاحب! اور فرزدی کو آپ مسز سعید کے گھر گئے تو انہوں نے کیا کہا؟"

"آبجیکشن یور آنر [illegible]..." وکیل صفائی نے فوراً مداخلت کی۔ "فاضل وکیل کو میرے مؤکل سے یہ سوال کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔"

"کیوں نہیں پہنچتا؟" وکیل استغاثہ نے جارحانہ انداز میں کہا۔

اس کے بعد دونوں وکیلوں کے درمیان ایک گھنٹے تک بحث ہوتی رہی۔ وکیل استغاثہ نے بیسوں قانونی حوالے دیے اور بیسیوں مثالیں پیش کیں جن کی بنا پر اسے وہ سوال کرنے کا حق حاصل تھا۔ ان کے جواب میں وکیل صفائی بھی سینکڑوں دلائل پیش کرتے رہے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وکیل استغاثہ اپنی حیثیت کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں۔ آخر کار جج صاحب نے وکیل استغاثہ کو سوال کرنے کی اجازت دے دی۔

وکیل استغاثہ نے گہری سانس لے کر گویا تازہ دم ہوتے ہوئے نئے سرے سے سوال کیا۔

"ہاں تو... رضوان صاحب! اور فرزدی کو آپ مسز سعید کے گھر گئے تو انہوں نے کیا کہا؟"

"کچھ بھی نہیں... وہ گھر پر ہی نہیں تھیں۔" گواہ نے یاد کر کے بتا دیا۔

[illegible] نفیس۔ کراچی

حافظہ

دنیا کے سب سے بڑے موجد ایڈیسن کا حافظہ اس قدر کمزور تھا کہ وہ اپنے موضوع کے علاوہ ہر بات بھول جاتا تھا۔ ایک روز وہ کسی سائنسی مسئلے پر سوچتے ہوئے اپنے مکان کا ٹیکس ادا کرنے چلا تو لمبی قطار میں طویل انتظار کے بعد جب اس کی باری آئی تو کلرک نے اس کا نام پوچھا۔ اس کے جواب میں ایڈیسن خاموش کھڑا کلرک کا منہ تکتا رہا۔ کیونکہ وہ اپنا نام تک بھول چکا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد اپنا نام یاد آیا لیکن اس وقت تک ٹیکس آفس کا ٹائم ختم ہو گیا تھا اور آفس بند ہو رہا تھا۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کبیر والا

راز کے دیپ،

- آپ کسی پر جھنجلاہٹ طاری کر دیں۔ وہ اخلاق کی کوئی [illegible] جھلاہٹ کا [illegible] آپ پر منحصر ہے۔
- زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پرکھنا اور لوگوں پر اعتماد کرنا محض اس لیے نہ چھوڑ دیں کہ ان میں سے کچھ نے آپ کو مایوس کیا ہے۔ کوئی نہ کوئی شخص اور کوئی نہ کوئی پہلو آپ کا منتظر ہے۔
- اگر آپ کا دماغ سوچتا، سمجھتا، فیصلہ کرتا اور ان چیزوں کے نتائج کو یاد رکھتا ہے تو آپ بالکل ٹھیک ہیں۔
- اگر آپ کی زندگی غیر متوازن ہوتی جا رہی ہے تو ایک متوازن ٹائم ٹیبل بنا کر اس پر سختی سے عمل کریں۔ زبردستی بگڑتی چلی جانے والی چیز کو زبردستی بھی قابو کیا جا سکتا ہے۔
- کاغذ پر زندگی کے نقوش مکمل طور پر کبھی نہیں اتارے جا سکتے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کپڑے کا پرنٹ کاغذ پر اتارا جائے تو اس کا تاثر بدل جاتا ہے۔
- کاش کا لفظ آپ کی کوتاہی کو ظاہر کرتا ہے۔

بینا خان ______ کیٹھ مغرال ضلع نوشاب

شام سفر کی اور اثاثہ ہی کچھ نہیں
اک تیری بے چراغ ہتھیلی ہے اک تو

مس فوزیہ کنول ______ کنگن پور

دلوں میں دوریاں اتنی نہیں تھیں
بظاہر ہم میں جتنے فاصلے تھے
اسے معلوم کیا، ہم اس کی خاطر
چراغوں کی طرح شب بھر جلے تھے

پاکیزہ ساجدہ حمید ______ چمن بلوچستان

مشکل کہاں تھے ترک تعلق کے فاصلے
سوال اے دل مگر تیری زندگی کا تھا

شہزادی وقار النساء ______ قبولہ شریف

اے کاروان لالہ و گل تم کو یاد ہو
ہم میر کارواں تھے ابھی کل کی بات ہے
جن دوستوں کی آج کمی ہے حیات میں
وہ اپنے درمیاں تھے ابھی کل کی بات ہے

سائرہ سحر ریاض احمد ______ جلیانوالہ

جب خزاں آئے تو لوٹ آئے گا وہ بھی محسن
وہ بہاروں میں فقط کم ہی ملا کرتا ہے

پارس بلوچ ______ ڈیرہ

میں لوگوں سے ملاقاتوں کے لمحے یاد رکھتی ہوں
میں باتیں بھول جاتی ہوں مگر لہجے یاد رکھتی ہوں
میں بھول تو جاتی ہوں ان سخت باتوں کی
لیکن جو زخم گہرے دیں وہ دشمن یاد رکھتی ہوں

ثمینہ اکرم ______ لیاری کراچی

جب لوگ ہی بدلوں کی قدر نہیں کرتے
ہم بھی کوئی دکھ اپنا تحریر نہیں کرتے
پڑتا ہے ایسا لہجے کا دکھ سہنا لیکن
کرتی ہے زباں وہ کچھ جو تیر نہیں کرتے

ثمامہ عنایت چغتائی ______ پنڈ ٹاؤن

مسافتوں میں کہیں یوں بھی معتبر ٹھہرو
کہ دو قدم سہی اس کا ہمسفر ٹھہرو
تم ہی بتاؤ صبا کس طرح یہ ممکن ہے
وہ میرے شہر میں آئے ... میں بے خبر ٹھہروں

امت الصبور

کے نام

امید

وہ صبح کبھی تو آئے گی
ان کالی صدیوں کے سر سے جب رات کا آنچل ڈھلکے گا
جب دکھ کے بادل پگھلیں گے، جب سکھ کا ساگر چھلکے گا
جب امبر جھوم کے ناچے گا، جب دھرتی نغمے گائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی
جس صبح کی خاطر جگ جگ سے ہم سب مر مر کے
جیتے ہیں
جس صبح کے امرت کی دھن میں ہم زہر کے پیالے
پیتے ہیں
ان بھوکی پیاسی روحوں پر اک دن تو کرم فرمائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی
مانا کہ ابھی تیرے ارمانوں کی قیمت کچھ بھی نہیں
مٹی کا بھی ہے کچھ مول مگر انسانوں کی قیمت کچھ بھی
نہیں
انسانوں کی عزت جب جھوٹے سکوں میں نہ تولی
جائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی
دولت کے لیے جب عزت کو نہ بیچا جائے گا
چاہت کو نہ کچلا جائے گا
غیرت کو نہ بیچا جائے گا
اپنے کالے کرتوتوں پر جب دنیا شرمائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی
بیتیں گے کبھی تو دن آخر یہ بھوک کے
اور بے کاری کے
ٹوٹیں گے کبھی تو بت آخر دولت کے
اجارہ داری کے
جب ایک انوکھی دنیا کی بنیاد اٹھائی جائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی
"وہ صبح آخر آئے گی"

(کلثوم وسیم) کی ڈائری سے

کلاسیکی شاعری سے شغف رکھنے والی قارئین کے
لیے میری ڈائری سے حسرت موہانی کی غزل کا تحفہ۔
توڑ کر عہد کرم نا آشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے، اچھا خفا ہو جائیے

میری تحریر ندامت کا نہ کچھ کیجیے
کچھ تو کیجیے اور تغافل آشنا ہو جائیے

جی میں آتا ہے کہ اس شوخ تغافل کیش سے
اب نہ ملیے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے

دل سے یاد روزگار عاشقی دیجیے نکال
آرزوئے شوق سے نا آشنا ہو جائیے

اک بھی ارماں نہ رہ جائے دل مایوس میں
یعنی آخر بے نیاز مدعا ہو جائیے

کشمکش ہائے الم سے اب یہ حسرت جی میں ہے
چھٹ کے ان جھگڑوں سے مہمان قضا ہو جائیے

(سیدہ نسبت زہرا) کی ڈائری سے

ہمارا وطن جو کبھی بڑا امن تھا آج دہشت گردی
ٹارگٹ کلنگ، دھماکوں کی آماجگاہ ہے ہم بے بس امید کے
سہارے زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ رحم کرے ہم سب پر اور
ارض پاکستان پر۔ یہی امید ساحر لدھیانوی کی
نظم "امید" میں بیان کی گئی ہے۔ یہ نظم پاکستان

نے پہلی مرتبہ ہارڈ بال سے کھیلا۔"

"ڈر تو لگتا ہوگا اور چوٹیں بھی؟"

"بہت زیادہ ڈر لگتا تھا اور ہاتھ میں بال لگتی بھی تھی، چوٹیں بھی بہت آئیں۔ رونا دھونا سب ساتھ ساتھ چلتا تھا، کبھی ٹانگ سے بال روکنے کی کوشش کی تو ٹانگ کی ہڈی تڑوالی، کبھی کہیں بال لگ گئی تو کبھی کہیں، لیکن میری جدوجہد کام آئی میرے پڑوسیوں نے بھی مجھے بہت سپورٹ کیا۔ گھر والوں نے تو کیا ہی۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہائٹ میچ ہوتے تھے تو میں پانی پلانے کے بہانے چلی جاتی تھی۔ پاپا سو جاتے تھے تو امی سے کہتی کہ بھائی پانی منگوا رہا ہے۔ بس پھر پانی لے کر پہنچ جاتی تھی اور وہیں بیٹھ جاتی تھی اور ایسی تکنیکس بناتی تھی کہ وہ مجھے کھلانے پر مجبور ہو جاتے تھے اور جب میں لمبی لمبی ہٹس مارتی تو پھر لڑکوں نے مجھے چانس دینا شروع کر دیا اور آج جب میں گھر سے باہر نکلتی ہوں تو سارے مجھے سلیوٹ کرتے ہیں۔ پراؤڈ (فخر) فیل (محسوس) کرتے ہیں۔ مجھے دعائیں دیتے ہیں اور جب سے ہم نے ٹی 20 میں کامیابی حاصل کی ہے عزت بہت بڑھ گئی ہے۔"

"کتنے عرصہ ہو گیا کھیلتے ہوئے اور وائس کیپٹن کتنا عرصہ رہیں؟"

"2006ء میں، میں نے اپنا Debeut کیا انڈیا کے خلاف اور ایک میچ میں نے انڈیا کے خلاف کھیلا تھا۔ اس میں، میں ناٹ آؤٹ رہی تھی، 27 رنز تھے میرے، وائس کپتان میں پانچ مئی 2009ء سے 14 اگست 2010ء تک رہی۔"

"کیوں ہٹایا گیا تھا اور کیا آپ لڑکیوں کے ٹیم میں بھی سیاست ہے؟"

"نہیں۔ بات سیاست کی نہیں اور مجھے کیوں ہٹایا گیا اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی، مینجمنٹ کی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ شاید وہ چاہ رہے تھے کہ جونیئر کھلاڑیوں کو بھی چانس دیا جائے اور اب سیاست کی بات کر رہی ہیں تو اصل میں ہوتا یہ ہے کہ جو کوئی بہت اچھا پرفارم کر رہا ہوتا ہے تو پھر اس کو آگے لایا جاتا ہے اور جب میں وائس کپتان بنی تو میں (عروج) کپتان تھی اور بہت اچھا کھیل رہی تھی، پھر جب دوسری لڑکیاں آئیں تو ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کو چانس دینا بھی ضروری تھا، ہماری ٹیم میں کوئی سیاست نہیں ہے۔ سب کچھ میرٹ کی بنیاد پر ہی ہو رہا ہے اور میڈم بشریٰ اعتزاز (اعتزاز احسن کی بیگم) کی زیر نگرانی ٹیم آگے کی طرف بڑھ رہی ہے۔"

"کتنے انٹرنیشنل میچز کھیلے اور انڈیا کے خلاف کتنے میچ کھیلے ہیں اور انڈیا کے خلاف کیا ردعمل ہوتا تھا؟"

"انٹرنیشنل تو 29 میچ کھیلے ہیں اور انڈیا کے خلاف 4 میچ کھیلے ہیں اور انڈیا، پاکستان کا کوئی بھی میچ ہو خواہ وہ اسکواش ہو، شطرنج ہو یا کوئی بھی میچ ہو، پاکستان، انڈیا کے لیے احساسات ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں پتا ہے کہ ان کی ٹیم بہت اسٹرانگ ہے، کافی سالوں سے وہ کھیل رہی ہے، مگر ہم بھی ان کے سامنے بہت اسٹرانگ ہو کے جاتے ہیں۔ ہمیں ایکسپوژر اب ملنا شروع ہوا ہے، پہلے نہیں تھا تو ہم بھی پورے جوش و ولولے کے ساتھ کھیلتے ہیں مگر رزلٹ تو وہی آتا ہے، جو اللہ کو منظور ہوتا ہے۔"

"ٹریننگ کتنے گھنٹے ہوتی ہے اور کیا [illegible] ہی ٹریننگ کرواتی ہیں؟"

"کراچی میں، ہم [illegible] پانچ گھنٹے ٹریننگ لیتے ہیں، ہفتے میں [illegible] دن اور ایک دن میچ کھیلتے ہیں۔ اور خواتین ہی ٹریننگ نہیں کرواتیں، بلکہ ہمارے کوچ ظہیر عباس (انکل) کے چھوٹے بھائی صغیر عباس ہیں اور وہ ہماری بہت اچھی ٹریننگ کرتے ہیں اور کراچی میں جتنی بھی کرکٹ ہے، ان ہی کی وجہ سے چل رہی ہے اور انہوں نے وومن ونگ کو بھی بہت سپورٹ کیا ہے۔ پاکستان کی لڑکیاں جو اچھا رزلٹ دے رہی ہیں، وہ ان ہی کی وجہ سے ہے۔"

"کبھی احساس ہوا کہ میں لڑکی ہوں اور یہ کھیل

میرے بس کا نہیں، کیونکہ بچپن سے کھیل رہی ہو؟"

"نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ کبھی ایسا احساس نہیں ہوا، یہ تو ہمارے ہی لوگ سوچتے ہیں ایسی باتیں۔ آپ باہر کے ملکوں میں دیکھیں تو وہاں کی لڑکیاں ذہنی اور دماغی طور پر بہت زیادہ اسٹرانگ ہوتی ہیں اور ان کی ٹریننگ ہی اس انداز کی ہوتی ہے کہ وہ فرق محسوس نہیں کرتے لڑکے اور لڑکیوں میں۔ اور میں نے اپنے اندر یہی چیز مضبوط کی ہے کہ لڑکے اور لڑکی کی صلاحیتوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ الحمدللہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو ٹیلنٹ دیا ہوا ہوتا ہے۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ اسے کیسے بروئے کار لائے۔ آپ دیکھیں کہ لڑکیاں ہر فیلڈ میں کام کر رہی ہیں اور کامیاب بھی ہو رہی ہیں۔ مجھے کبھی بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میں ایک لڑکی ہوں اور کمزور ہوں اور کھیل میرے بس کا نہیں ہے۔ دس سال ہو گئے ہیں مجھے اس فیلڈ میں اور میں کبھی بھی کمزور نہیں پڑی اور میری ہمیشہ سے خواہش رہی کہ میں "رول ماڈل" بنوں اور میری یہ خواہش پوری بھی ہو گئی ہے۔"

"اب تک کتنے میچز کھیل چکی ہو اور کتنے ہارے جیتے اور انڈیا کے ساتھ کبھی جیت ہوئی؟ اور آپ کا دل چاہتا ہے کہ آپ کے میچ بھی براہ راست دکھائے جائیں؟"

"جی ہم نے 29 میچز میں سے 14 میچ جیتے ہیں۔ انڈیا کے خلاف ابھی تک کوئی میچ نہیں جیتا، مگر خواہش بہت ہے، ابھی گزشتہ دنوں ہم نے ایشین گیمز میں گولڈ میڈل جیتا تھا اور جہاں تک براہ راست دکھانے کی خواہش ہے تو ہمارا بھی دل چاہتا ہے کہ ہمارے میچ لائیو دکھائے جائیں۔ ہمیں دکھ ہوتا ہے کہ جتنی محنت لڑکے کرتے ہیں، اتنی ہی محنت ہم بھی کرتے ہیں، مگر ہمیں وہ پروجیکشن نہیں ملتی، لیکن اب جب سے ہم پی سی بی کے انڈر آئے ہیں اور میڈم شیریں جاوید (جن کا کچھ عرصہ پہلے انتقال ہو چکا ہے) جن کے تعاون سے وومن کرکٹ کا ایک نام ہوا ہے تو ان کی وجہ سے اب ہمارے میچز پی ٹی وی (ڈومیسٹک میچز) سے لائیو آنا شروع ہو گئے ہیں۔ جب ہم گولڈ میڈل جیت کر آئے تو میڈیا نے بھی بہت سپورٹ کیا، بہت حوصلہ افزائی کی۔ اب ہمیں بھی لوگ جاننے لگے ہیں اور بہت عزت ہو گئی ہے ہماری۔"

"عنقریب کون سا ایونٹ آنے والا ہے وومن کرکٹ کا؟"

"جی ان شاء اللہ ہم 18 اپریل کو "سری لنکا" جا رہے ہیں، جہاں ہم ٹرائی اینگولر (تین ممالک کی سیریز) سیریز کھیلیں گے۔ آئرلینڈ، سری لنکا اور پاکستان اور اس کے بعد ان شاء اللہ بنگلہ دیش جائیں گے۔ اس میں دس ٹیمیں ہوں گی اور 2013ء کے ورلڈ کپ (جو کہ انڈیا میں ہوگا) اس کے لیے چار بہترین ٹیموں کا انتخاب ہوگا۔ مطلب جو کوالیفائی کریں گی وہ پھر ورلڈ کپ کھیلیں گی۔ ان شاء اللہ ہم نے اتنی محنت کرلی ہے کہ ہم دوبارہ سے کوالیفائی کریں ورلڈ کپ کے لیے۔"

"کبھی آپ کی ٹیم کو پیش کش ہوئی کہ ہار جاؤ اور

اس کے بدلے میں اتنی رقم لے لو تو سٹے بازی ہوتی ہے؟"

"نہیں، نہیں ہے۔ وومن کرکٹ میں اب تک ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کوئی گروپ بندی، کوئی سیاست کچھ نہیں ہے فی الحال ہماری ٹیم میں ابھی تو ہم بچے ہوئے ہیں لیکن جس تیزی سے اب وومن کرکٹ آگے بڑھ رہی ہے اور کامیابیاں حاصل کر رہی ہے تو ہو سکتا ہے کہ فیوچر میں ایسا کچھ ہو۔ مگر شکر ہے کہ ہماری مینجمنٹ ابھی تک پالیٹکس یا کسی بھی غیر قانونی کام میں انوالو نہیں ہے۔"

"ڈریسنگ کے سلسلے میں آپ لوگوں کو کوئی پرابلم ہوتی ہے؟"

"جو تہذیب ہے پاکستان کی اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارا ڈریس ہے ہمارا آفیشل ڈریس شلوار قمیص اور بلیزر ہے۔ جب بھی ہم آٹھ دس ملکوں کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں تو ہم بہت زبردست لگ رہے ہوتے ہیں۔"

"والدین نے تو بہت سپورٹ کیا، رشتے داروں نے تو یقیناً اعتراض کیا ہو گا کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ اس کی تو شادی ہو جانی چاہیے؟"

"ہاں جی۔ رشتے دار تو اس کھیل کے کافی خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ کرکٹ تو لڑکوں کا کھیل ہے۔ وہ کہتے تھے میرے والدین سے کہ آپ اس کی شادی کے بارے میں سوچیں۔ اس کو گھر داری سکھائیں۔ مگر میرے والدین نے اس طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ یہی کہا کہ تمہیں جو بننا ہے تم وہی کرو۔ تمہیں آزادی ہے بس ہمارے اعتماد، ہمارے بھروسے کو ٹھیس نہ پہنچانا اور کھیل کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی کرنا۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ میں اپنے والدین کی امیدوں پر پوری اتری ہوں۔"

"بھائیوں کے ساتھ کھیل کے تم تو کرکٹر بن گئیں بھائی کہاں پہنچے؟"

"ایک بھائی لندن میں ہیں۔ انہوں نے ایم بی اے فنانس کیا ہے اور بڑی اچھی پوسٹ پہ ہیں۔ دوسرا آسٹریلیا میں ہے، وہ بھی بہت اچھی پوسٹ پہ ہے۔ تیسرے بھائی نے بابا کا بزنس سنبھالا ہوا ہے۔ ایک بھائی مجھ سے بارہ سال چھوٹا ہے۔ وہ اسکول میں پڑھتا ہے۔ کرکٹ تینوں نے بہت کھیلی ہے مگر کرکٹر کوئی نہیں بنا۔ چھوٹے کا خیال ہے کرکٹر بننے کا۔"

"ہمارے ہیروز کرکٹرز کو بہت پیسہ ملتا ہے آپ وومن کھلاڑیوں کو بھی کچھ ملتا ہے یا نہیں؟"

"ٹیم جنوری 2011 سے تقریباً 20 لڑکیوں کو جو کہ بہت اچھا کھیلتی ہیں جن میں میں بھی شامل ہوں۔ انہیں سینٹرل کنٹریکٹ ملے ہیں پھر ہم زرعی ترقیاتی بینک سے بھی منسلک ہیں تو ہمیں اچھی تنخواہ ملتی ہے۔ ماہانہ ہمیں تقریباً بیس ہزار ملتے ہیں اور جب ہماری پرفارمنس اچھی ہوتی ہے تو ہمیں بونس بھی ملتا ہے۔ اور اب پہلے سے بہت اچھی فنانس سپورٹ ملنے لگی ہے۔"

"ایشین گیمز میں گولڈ میڈل لے کر آئیں تو حکومت کی طرف سے کوئی پذیرائی ملی؟"

"جی بالکل۔ زرداری صاحب نے بلایا تھا۔ ایوارڈز دیے لڑکیوں کو۔ وزیراعظم گیلانی صاحب نے بلایا۔ وزیراعلیٰ پنجاب شہباز شریف صاحب نے بلایا تھا اور نقد انعامات بھی دیے۔ تو کافی اچھا لگا۔ میڈیا اور حکومت نے بہت حوصلہ افزائی کی۔"

"بحیثیت ایک کھلاڑی کے تم لڑکیوں سے کچھ کہنا چاہو گی؟"

"وہ لڑکیاں جو کسی بھی فیلڈ میں اپنا ٹیلنٹ دکھانا چاہتی ہیں وہ آگے آئیں اپنا ٹیلنٹ دکھائیں۔ نسیم حمید ہمارے لیے بہت بڑی مثال ہیں۔ کرن خان، رباب رضا اور لڑکیاں ہمارے لیے بہت بڑی مثال ہیں۔ صرف پڑھائی ہی آگے کی طرف نہیں لے جاتی۔ کھیلوں کا بھی بڑا حصہ ہوتا ہے۔ لوگوں کے درمیان رہ کر، ملک سے باہر جا کر بہت تجربے حاصل کرتا ہے انسان۔ اور اس میں شعور آتا ہے۔"

"گھر داری آتی ہے؟"

"گھر داری بھی آتی ہے۔ کھانا پکانا بھی آتا ہے۔ امی نے بہت سکھایا ہے۔ پہلے دل نہیں لگتا تھا کچن میں لیکن جب بابا نے کہا کہ کرکٹ بھی کھیلو گھر داری بھی سیکھو تو پھر میں نے اپنا دل لگایا اس طرف۔ اسپرائینڈ رائس، سلاد، کڑاہی گوشت اور [illegible] والا بنا لیتی ہوں۔"

"یہ سب کچھ لڑکیوں کے لیے ضروری ہے؟"

"بالکل ضروری ہے۔ لڑکیوں [illegible] کھانی چاہیے وہ [illegible] بن جائے آخر [illegible] گھر داری ہی کرنی ہے۔ لڑکیوں کے کام لڑکیوں کو آنے چاہئیں۔"

"مزاج کیسا ہے [illegible] ٹھنڈی یا گرم؟"

"میرا ستارہ جیمنائی ہے "دو فیس والا" جب جنون [illegible] سوار ہوتی ہے تو میں اپنے آپ کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اور گراؤنڈ میں مجھے زیادہ غصہ آتا ہے جب میں دیکھتی ہوں کہ لڑکیاں زیادہ اچھا کھیل پیش کر سکتی تھیں لیکن انہوں نے نہیں کیا۔ مگر پھر جلد ہی ٹھنڈی بھی ہو جاتی ہوں اور بھول جاتی ہوں کہ کچھ ہوا بھی تھا۔"

"شادی کب کرنی ہے؟"

"شادی کا سارا پلان اماں ابا کے ہاتھوں۔ وہ جب کہیں گے میں سر جھکا دوں گی۔ میں نے ان سے اپنے لیے جو وقت مانگا۔ انہوں نے مجھے دے دیا۔ میں ان کی بہت عزت کرتی ہوں۔ بہت پیار کرتی ہوں اور شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اس مقام تک پہنچایا۔ اور وہ جب میرے لیے کوئی فیصلہ کریں گے تو مجھے قبول ہو گا۔"

"تو پھر فیلڈ تو چھوڑنی پڑے گی؟"

"بالکل چھوڑ دوں گی اور پھر میرا پلان ہے کہ میں خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے کام کروں اس سلسلے میں پی سی بی سے میں نے بات بھی کی ہے۔ انہوں نے اس آئیڈیے کو پسند بھی کیا ہے۔ مجھے موقع ملا تو میں ضرور کام کروں گی۔"

"کافی ممالک جا چکی ہو۔ کیا دیکھا، کیا محسوس کیا؟"

"وہ لوگ بہت آرگنائزڈ ہیں۔ خاص طور پر آسٹریلیا، انگلینڈ، ویسٹ انڈیز سب ہی بہت ترقی یافتہ اور آرگنائزڈ ہیں۔ وہاں بہت احتیاط سے، بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑتا ہے کہ کچھ غلط نہ ہو جائے کیونکہ دوسرے ممالک میں ہمارا امیج بہت برا بنا ہوا ہے۔ اپنے ساتھ جونیئر لڑکیوں کو لے کر چلتے ہیں تو بہت خیال رکھتے ہیں۔ وہاں کے لا اینڈ آرڈر بہت اچھے ہیں۔"

"کرکٹ میں بہت چھوٹی عمر سے لڑکے اور لڑکیاں آ جاتی ہیں۔ چھوٹے شہروں سے تو جب آپ ملک سے باہر جاتی ہیں تو آپ کو تو نہیں لیکن ان لڑکیوں کو زبان کا پرابلم تو ہوتا ہو گا؟"

"پاکستانی ٹیم میں جو لڑکیاں ہیں، وہ گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ بھی ہیں لیکن کچھ لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں جو اندرون شہر سے آتی ہیں تو ہم ان کے ساتھ رہتے ہیں اس لیے انہیں بھی زیادہ پرابلمز نہیں ہوتیں۔"

"بہت شکریہ اتنا ٹائم دیا۔ دورۂ سری لنکا کے لیے ہماری دعائیں آپ کی ٹیم کے ساتھ ہیں۔ خدا کرے آپ کامیاب لوٹیں۔"

والدین کا رشتہ اولاد کے لیے سب سے قیمتی سب سے پیارا رشتہ ہوتا ہے اور ماں تو محبت کا ایک بحر کراں ہوتی ہے جو دکھ جھیل کر اپنی اولاد کو سکھ پہنچاتی ہے۔ ہر گھڑی اپنی اولاد کی بہتری بھلائی کے لیے کوشاں اس کے لبوں پر اپنی اولاد کے لیے دعائیں ہوتی ہیں۔ ماں کی جدائی بہت بڑا سانحہ ہے عنیزہ سید نے یہ مضمون اپنی والدہ کی یاد میں لکھا ہے۔

عنیزہ سید

میری امی

یہ سال 2005ء کی بات ہے جب میرے ایک شاگرد نے مدرز ڈے کے موضوع پر ماں کے عنوان سے ایک نظم اسکول کے مین نوٹس بورڈ پر لگائی۔ میں نے اس نظم کو پڑھا اور اس کے ایک ایک لفظ نے میرے دل پر بے انداز اثر کیا۔

میں نے اس بچے کو آفس میں بلا کر پوچھا کہ یہ نظم کہاں سے لی؟ اس وقت وہ آٹھویں کلاس کا طالب علم تھا۔

اس نے بتایا کہ وہ نظم اس نے خود لکھی تھی میں یہ بات سن کر ششدر رہ گئی میں نے اس سے پوچھا۔

"اتنی خوب صورت نظم' اتنے خوب صورت اور اثر انگیز الفاظ میں تم نے اس عمر میں کیسے لکھ لی؟"

اس کی آنکھوں میں میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے آنسو تھے جنہیں قابو میں رکھنے کی خاطر وہ مسکرا رہا تھا اس نے کہا۔

"میم! یہ سب میری ماں کی جدائی نے مجھ سے لکھوایا' جب میری والدہ کا انتقال ہوا اس وقت میں بہت چھوٹا تھا' اس وقت بھی میں اپنی والدہ کے بارے میں یہ ہی کچھ کہنا چاہتا تھا مگر میرے پاس الفاظ نہیں تھے' جو چند الفاظ میرے پاس تھے' وہ ادھورے اور ٹوٹے پھوٹے تھے ان کی مدد سے میں اپنے دل کی بات نہیں کر سکتا تھا۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں اب میرے پاس اتنے اور ایسے الفاظ ہیں جو امی کے بارے میں اپنے دل کی بات کہنے میں میرا ساتھ دے سکتے ہیں۔ اب یہ ایک نظم کیا میں ان کے لیے بہت کچھ لکھ سکتا ہوں۔"

میں نے اس بچے کو تھپکی دی اور کہا۔ "بالکل بیٹا! اب آپ اتنے بڑے ہو گئے ہو کہ اپنی امی کے بارے میں بہت کچھ بہت سلیقے سے کہہ سکتے ہو۔"

اس بات کو پانچ ساڑھے پانچ سال گزر گئے' وہ بچہ اس عمر سے پانچ ساڑھے پانچ سال اور آگے آ گیا ہو گا اسے اپنی بات کہنے کا پہلے سے بھی زیادہ بہتر سلیقہ آ گیا ہو گا۔ اسی طرح میں خود بھی اس عمر سے جو اس وقت میری تھی پانچ ساڑھے پانچ سال آگے آ گئی ہوں گر آج اپنی ماں کے بارے میں لکھنے بیٹھی ہوں تو محسوس ہو رہا ہے کہ میرے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہے وہ ان کے لیے اپنے دل کی بات کہنے کو ناکافی ہے' ادھورا ہے اور ٹوٹا پھوٹا ہے۔

میں آج اس اسٹیج پر ہوں جہاں وہ بچہ اس وقت تھا جب اس کی والدہ کا انتقال ہوا تھا۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر کہہ نہیں پا رہی۔ جس ہستی نے مجھے بولنا سکھایا' باتیں کرنا سکھایا' گفتگو کا سلیقہ سکھایا وہ دنیا سے جا چکی ہے اور اس کے جانے کے بعد گویا الفاظ گنگ ہو گئے ہیں' باتیں جامد ہو گئی ہیں۔

میں نے 1986ء میں کہانیاں لکھنا شروع کیا اور ان 24 سالوں میں جب بھی کسی نے پوچھا۔

"اس میدان میں آپ کا سورس آف انسپریشن کون ہے؟"

میرا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔

"میری والدہ!"

لفظوں سے میرا تعارف کروانے کے بعد کہانیوں' کتابوں' اردو اور انگریزی ادب سے بھی میرا تعارف انہوں نے ہی کروایا۔ بہت چھوٹی عمر میں ہی اکبر' شرر' آزاد' حالی' غالب' اقبال' شیکسپیئر' ورڈز ورتھ' ہارڈی' بھینکوئے' ٹینی سن' کولرج' وڈز ورتھ جیسے نام ہمارے کانوں میں پڑے ہوئے تو ڈالنے والی امی ہی تھیں۔

انہیں مطالعہ کا جنون تھا اور ان کا یہ جنون ورثے میں ہم تینوں بہنوں کو بھی منتقل ہو گیا اور اسی جنون نے مجھے الفاظ کا ذخیرہ جملوں میں استعمال کر کے لکھاری بنا دیا۔

یہ بات کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ جو ڈائجسٹ کے حوالے سے آپ لوگ مجھے بطور لکھاری آشنا ہیں اور یہ جو خواتین ڈائجسٹ سے برسوں پرانا ناتا ہے' جس کی بدولت آج میں یہ الفاظ لکھ رہی ہوں یہ بھی میری امی کی وجہ سے ممکن ہوا اور جب یہ ممکن ہو گیا تو وہ بیک وقت میری بہترین راہنما اور نقاد بن سکیں۔

میری ہر تحریر کو انہوں نے ایک ناقد کی نظر سے پڑھا اور ہمیشہ بھرپور تبصرہ کیا۔ میری شادی سے پہلے وہ لکھنے میں میری معاون تھیں جن دنوں میں کوئی افسانہ' ناولٹ یا ناول کی قسط لکھ رہی ہوتی تھی' وہ مجھے گھر کے ہر کام سے فارغ کر دیتی تھیں' میں بہت بے فکری اور سکون سے لکھا کرتی تھی۔ شادی کے بعد میری تحریروں میں آنے والے طویل وقفوں کی وجہ بھی یہ ہی تھی کہ امی جیسا معاون مجھے میسر نہیں تھا۔

ہم تینوں بہنوں کو انہوں نے صرف ادب سے ہی

متعارف نہیں کروایا وہ اعلا اخلاقی و تمدنی روایات کے
حامل گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے نزدیک
انسان کا اپنے مذہب' روایات' اخلاقیات' شائستگی'
رکھ رکھاؤ اور سلیقے سے گہرا تعلق اس کی بقا کے لیے
بے حد ضروری ہے۔ انہوں نے ہمارے دل میں دین
سے محبت اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر پختہ ایمان کو اس
طرح راسخ کر دیا کہ ان دو چیزوں کی موجودگی میں زندگی
میں کوئی مسئلہ' مسئلہ نہیں لگتا' ان کا خیال تھا کہ جب
یہ دو چیزیں پاس ہوں تو پھر انسان کے اعتماد میں کبھی
لغزش نہیں آتی اور نہ ہی وہ بے جا پریشان ہوتا ہے۔

کچھ معاملات میں وہ بے حد سخت تھیں' ہماری
زبان' لب و لہجے اور شائستگی پر ان کی خاص نظر رہتی
تھی' ہم کن لوگوں کو دوست بناتے ہیں' ہماری سنگت
کیسی ہے' کن چیزوں پر وہ کمپرومائز نہیں کرتی
تھیں۔ حتیٰ کہ ہماری شادیوں کے بعد بھی وہ اس چیز پر
خاص نظر رکھتی تھیں اور تمام محبت اور دوستی کے
باوجود ہم ان معاملات میں ہمیشہ ان سے ڈرتے ہی
رہتے تھے کہ کوئی بات ان کو ناگوار نہ گزرے۔

گھریلو امور میں بھی ہمیں طاق کرنے میں انہوں
نے کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ہم نے بھی ہمیشہ ان کی ہر
بات کو حکم سمجھ کر عمل کرنے کی پوری کوشش کی۔ یہ
اور بات کہ ہم تینوں میں سے شاید کبھی کسی کا کوئی کام
ان کے معیار پر پورا اتر سکے۔

وہ خود امور خانہ داری میں بہت ماہر تھیں' ہمارے
بنائے ہوئے کھانے انہیں بہت کم کبھی پسند آئے تھے
سلائی' کڑھائی میں وہ خود طاق تھیں اور ہم از حد
کوشش کے باوجود ان کے معیار کو نہ پہنچ سکے۔ شادی
کے بعد اپنے گھر میں بھی کوئی کام غلط ہو جاتا تو دل ڈر
جاتا کہ امی کو پتہ لگا تو وہ کتنا ڈانٹیں گی۔

انہیں باغبانی کا بھی جنون کی حد تک شوق تھا'
ہمارے گھر کے لان سارا سال سرسبز اور موسمی پھولوں'
بیلوں اور باڑھوں سے سجے رہتے تھے۔ مالی کے ساتھ وہ
خود بھی کیاریاں بنواتیں' بیج ڈالتیں' گوڈی کرتیں اور
وقت پر پانی لگانے کا اہتمام کرتیں۔ موسمی سبزیاں
اگاتیں اور بچوں کی طرح سبزی باڑی کی حفاظت کرتیں۔
پھولوں سے باتیں کرتے بھی ہم نے ان کو اکثر دیکھا۔
اسی طرح جانوروں خصوصاً بلیوں سے انہیں بہت لگاؤ
تھا۔ آخری وقت تک انہیں گھر میں موجود بلیوں کا
خیال رہا۔ آخری دنوں میں جب تکلیف کی وجہ سے
کچھ کھانے سے قاصر تھیں تو وہ کھانا جو پلیٹ میں اکثر
جوں کا توں ہی رہ جاتا اس کے لیے کہتیں۔

"جاؤ یہ میری بلیوں کو ڈال دو۔"

وہ بہت خالص پاکستانی تھیں' پاکستان سے محبت ان
کے روم روم میں بسی تھی اور اس کے خلاف کوئی بات
برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ ملکی حالات اور سیاست پر
بھرپور تبصرہ کرتی تھیں۔ اخبار کی ہر سطر پڑھتیں اور
پڑھنے کے بعد کہتیں۔

"ملک کے حالات پڑھ کر میرا بلڈ پریشر ہائی ہو گیا
ہے۔"

ہم کہتے "تو اخبار نہ پڑھا کریں۔" مگر یہ عادت اتنی
پختہ تھی کہ سوائے آخری ایک مہینے کے جب بیماری
کی شدت نے انہیں نڈھال کر دیا' وہ اخبار پڑھتی اور
اس کی خبروں پر تبصرہ کرتی رہیں۔

انہیں ہمیشہ سے نیند کم آتی تھی۔ رات دو تین گھنٹے
سونے کے بعد جاگ جاتیں اور پھر اٹھ کر قرآن پاک کی
تلاوت اور پھر تہجد کی نماز ادا کرتیں اور پھر ایک
مخصوص جملہ بولتیں۔

"اتنی لمبی رات کا کوئی کیا کرے' ختم ہونے میں ہی
نہیں آتی۔"

اور ہمیں کہتیں "تم لوگ اتنا کیسے سو لیتے ہو؟" نیند
کم آنے کا مسئلہ ان کے ساتھ عمر بھر رہا بلکہ وقت
گزرنے کے ساتھ زیادہ ہی ہو گیا۔ کبھی کبھی تو نیند
آنا ان کی شدید ترین خواہش بن جاتی تھی۔

وہ ایک وفادار اور اطاعت شعار بیوی تھیں' ان کے
جانے کے بعد میرے والد بہت اکیلے اور ادھورے
لگتے ہیں' رفاقت کا یہ رشتہ اتنا گہرا اور مضبوط ہوتا ہے
کہ اس کے ٹوٹ جانے کے بعد انسان بہت تنہا ہو جاتا
ہے۔ اللہ میرے ابو کو حوصلہ اور صبر دے اور ان کا

سایہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ (آمین)

وہ ایک شفیق ماں تو تھیں ہی مگر حقیقی مشفق نانی
تھیں۔ اس کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا' ہمارے بچوں
کے لیے وہ ایک شجر سایہ دار کی طرح تھیں' جس کے
سائے میں بیٹھ کر وہ بے حد خوش اور مطمئن رہتے تھے
ان سے فرمائشیں کرتے اور منواتے تھے اور ان بچوں
کی ہر بات ماننا جیسے وہ اولین فرض سمجھتی تھیں۔ میرا
بھانجا علی جب پی ایم اے میں تھا تو ساری رات اس کو
یاد کرتیں اور وہاں کی سخت جان زندگی کا ذکر کر کے
رو دیتیں۔ علی کا چھوٹا بھائی شہر یار بھی ابھی ایم سی
کے لیے کوہاٹ گیا اور وہاں ہم پہنچے ہوئے تھے' امی نے
ساری رات بے چینی اور پریشانی میں گزاری' اگرچہ ہم
نے انہیں یہ خبر نہیں دی … لیکن وہ بار بار کہتی رہیں کہ
"میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔" صبح شہر یار کی خیریت کی
اطلاع آئی تو … کہنے لگیں۔

"… میں اتنی بے چین تھی۔"

… قرۃ العین' بورڈ ایگزیم کے دوران ساری
رات جاگتی تھی اس کو دیکھ کر انہیں غصہ آتا اور
کہتیں۔

"یہ کس قسم کی پڑھائی ہے' جس کی وجہ سے بندے
کی نہ شکل رہتی ہے نہ عقل۔"

میرا بیٹا عبداللہ اکیڈمی جاتا تھا انہوں نے سنا کہ وہ
دیر سے گھر واپس آیا کرے گا تو مجھ سے کہا۔

"منع کرو اسے کوچنگ کو' اسے گھر میں خود ہی پڑھا
لیا کرو۔"

ہم کہتے "اس طرح تو یہ بچے کچھ بھی نہیں کر سکیں
گے۔ آپ انہیں ہر کام سے منع کر دیتی ہیں۔" تو کہا
کرتیں۔

"سب ہی کچھ نہ کچھ کر لیتے ہیں' یہ بھی کر ہی لیں
گے۔"

اپنی دوستوں کو ان دنوں میں بہت یاد کیا کرتی تھیں
جب زیادہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہی تھیں' مجھ
سے کہتیں۔

"میری دوستوں کو فون کیا کرو' ان کا احوال دریافت
کیا کرو' والدین کے دوستوں سے بھی پیار کرنا بہت
ضروری ہے۔"

گھریلو ملازمین سے ان کی بہت دوستی رہتی تھی۔ ہر
ایک سے بلکہ اہل خانہ کی خیریت معلوم کرنے کے بعد
اسے کام شروع کرنے کے لیے کہتیں' فیاض اور کھلے
دل کی مالک تھیں' بقول ان کے ملازمین کے ان کی
موجودگی میں ہمیں کبھی کسی چیز کی تنگی اور کمی محسوس
نہیں ہوتی تھی۔ ان کی وفات کے بعد کئی ایسے لوگ
بھی ہمارے پاس تعزیت کے لیے آئے جو کہتے تھے کہ
فلاں فلاں وقت انہوں نے ہماری اتنی مدد کی اور ہمیں
یعنی ان کے بچوں کو اس کی خبر تک نہ تھی۔

ہم میں سے ہر ایک کے نزدیک اس کے والدین دنیا
کے بہترین والدین ہیں' یہ ایک فطری سوچ اور جذبہ
ہے اور اس پر ہم کسی پر اعتراض نہیں کر سکتے۔ انسان
دنیا کے دوسرے لوگوں کے لیے خواہ کیسا بھی ہو' اپنی
اولاد کے لیے دنیا کا بہترین انسان' سب سے پیارا رشتہ
ہوتا ہے۔ آپ کو شاید میری والدہ کے لیے لکھی یہ
باتیں پڑھ کر خیال گزرے کہ اسے دنیا جہان کی خوبیاں
اپنی اماں میں ہی جمع نظر آتی ہیں۔ مگر کیونکہ وہ میری ماں
تھیں میرے لیے بہترین انسان' سب سے پیارا
رشتہ تو میں ان کے لیے جو بھی لکھوں گی وہ ایسا ہی لگے
گا کیونکہ میرے نزدیک میری امی دنیا کی بہترین ماں
تھیں۔

ابھی تک میرے ذہن نے ان کی موت کو قبول
نہیں کیا' میرا ذہن پراگندگی کا شکار ہے۔ میں آج اس
اسٹیج پر ہوں جہاں وہ بچہ اس وقت تھا جب اس کی والدہ
کا انتقال ہوا تھا' میں نے بہت کچھ کہا مگر ابھی اتنا کچھ
کہنے کو باقی ہے جسے کہنے کے لیے میرا الفاظ کا ذخیرہ ناکافی
ہے۔

آپ سے یہی درخواست ہے کہ میری پیاری امی
کے ایصال ثواب کے لیے دعا ضرور کریں۔ میں تاعمر
ممنون رہوں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہر غم سے محفوظ
رکھے اور میری امی کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا
فرمائے۔ (آمین)

خبریں و بس

غزل ثوبان

لیجنڈ

گزشتہ دو ماہ کے عرصے میں کامیڈی کی دنیا کے چار بڑے نام اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان میں لیاقت سولجر، مستانہ، ببو برال اور معین اختر کے نام شامل ہیں۔ تاہم جو مقام معین اختر کو حاصل ہے اسے کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ بلاشبہ ایسے فنکار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ مزاج کی بے ساختگی ان کی اضافی خوبی تھی۔ اس حوالے سے ایک مرتبہ انٹرویو دیتے ہوئے معین اختر نے کہا۔ ”جو کردار کلک ہو جائے وہ لیجنڈ بن جاتا ہے۔ میرے اندر ایک فطری بذلہ سنجی ہے اور یہی میری انفرادی خوبی ہے۔ فن کی دنیا میں کوئی ایسا شخص تو چل جاتا ہے جو بے ضرر ہو لیکن جو بے ضرر ہو نہیں چل سکتا۔ (آج کل اسی چیز کا قحط ہے) ابتدا میں جب ریڈیو پر گیا تو آڈیشن کے بغیر سلیکشن نہیں ہوتا تھا۔ یزدانی صاحب نے کہا پہلے پڑھائی مکمل کرو پھر آنا۔ جب میں ٹی وی اور اسٹیج کرنے لگا تو ریڈیو والوں نے پروگرام کرنے کی دعوت دی۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ اگر مجھ سے پروگرام کروانا ہے بے شک بلائیں لیکن میں آڈیشن نہیں دوں گا۔ چنانچہ مجھے آڈیشن سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ (آپ کو اس کی ضرورت تھی بھلا؟) آج کا فنکار بے شک بیک وقت 20 ڈراموں میں کام کر رہا ہے لیکن پیسے اسے 19 جگہوں سے نہیں مل رہے۔ جہاں تک سوال کہانی کا ہے تو ہدایت کار اور مصنف پیار محبت سے آگے کہانی بڑھنے کو تیار نہیں۔ سولہ کروڑ کی آبادی میں سولہ کروڑ کہانیاں چھپی ہیں کسی شخص کو پاس بٹھا کر تو پوچھیں۔ ہمیں ابتدا سے تربیت دی گئی کہ اسٹیج پر بدتمیزی اور بد تہذیبی والی بات نہ کی جائے اس لیے جب مجھے انڈیا میں کامیڈی پروگرام میں جج بننے کی پیش کش ہوئی تو میں نے سوچا کہ اگر چھوٹی بات پر ہنسوں گا تو لوگ کہیں گے کیسی گھٹیا بات پر ہنس رہا ہے۔ اگر نہیں ہنسوں گا تو کہیں گے کہ بڑا اداکار بن گیا ہے۔ لہٰذا وہ کام کرنا نہیں چاہیے جو متنازع ہو۔ بڑے فنکار کی پہچان بھی یہی ہے۔“

تربیت

طاہرہ سید کا حوالہ ملکہ پکھراج ہیں۔ موسیقی کے خاندان سے وابستہ ہونے کے باعث انہوں نے اپنی والدہ کے پیشے کو ہی اپنایا۔ اس حوالے سے وہ کہتی ہیں ”میں نے والدہ کی وجہ سے اس فیلڈ کو اپنایا۔ جب میرے والد کا انتقال ہوا تو والدہ نے اس صدمے کو دل پر لے لیا۔ والدہ کی دل جوئی کے لیے میں نے موسیقی سے ربط قائم کیا۔ والدہ کا سکھانے کا انداز بے حد سخت تھا۔ وہ تربیت میں سختی کی قائل تھیں۔ وہ ہمیشہ ریڈیو اور ٹی وی پر ریکارڈنگ میں میرے ساتھ جاتیں۔ سر پر دوپٹہ لے کر گانے کا کہتیں۔ مجھے کسی دوست کی سالگرہ یا اسکول ٹرپ پر جانے کی اجازت نہ تھی۔ بس مخصوص دوستوں سے مل سکتی تھی۔ ان سب کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ قدامت پسند تھیں۔ وہ حقوق نسواں اور ترقی پسندی کی قائل تھیں۔ وہ شادی کے بعد عورت کو صرف کچن تک دیکھنا اچھا نہیں سمجھتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ چاہے گلوکارہ بنو، وکیل بنو ایک مقام بناؤ پھر شادی کرو۔ ان کا یقین تھا کہ لڑکی کو اکیلے معاشرے میں چھوڑنا درست نہیں۔ اس طرح وہ بھٹک سکتی ہے۔“ (کامیابی کے لیے اصولوں پر چلنا بھی تو ضروری ہے)۔

کچھ ہٹ کے

شعیب منصور کے لیے جینئس کا لفظ استعمال کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ چہروں کو منفرد انداز میں پیش کرنے کا جو ہنر انہیں آتا ہے، بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے۔ ”بول“ کے اداکار اپنے انٹرویو میں کردار کے حوالے سے کچھ بتانے سے گریزاں ہیں۔ کاسٹ میں ایمان علی، عاطف اسلم، عمیمہ، ماہرہ خان، کامران جیلانی شامل ہیں۔ ہر مرتبہ کی طرح شعیب منصور نے موسیقی پر خاص دھیان دیا ہے۔ جسے سجاد علی، احمد جہانزیب اور عاطف اسلم نے ترتیب دیا ہے، جبکہ پس پردہ موسیقی باقر عباس نے دی ہے۔ فلم کے گانے سجاد علی، شجاع حیدر، شبنم مجید، عاطف اسلم، حدیقہ کیانی، احمد جہانزیب کے آوازوں میں ریکارڈ کیے گئے ہیں۔ یہ فلم بھارت اور پاکستان میں بیک وقت 20 مئی کو پردہ سیمیں پر جلوہ افروز ہوگی۔ دیکھنا یہ ہے کہ پاکستان کے ”شومین“ اس مرتبہ کیا کارنامہ سر انجام دینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

صاف گوئی

نادیہ خان مارننگ شوز کی ہردل عزیز میزبان رہ چکی ہیں۔ پھر اچانک کیا ہوا کہ نادیہ منظر سے غائب ہو گئیں اور ناظرین محض قیاس آرائیاں کرتے رہ گئے۔ اب اسے ان کی بولڈنیس کہیں یا کیا کہ وہ اس صورتِ حال میں بھی سچ بولنا ضروری سمجھتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ

کا ویڈیو شوٹ کروا رہی تھیں۔ اس سے قبل وہ اپنے وکیل انتاریو کے عشق میں مبتلا تھیں۔ تاہم یہ سلسلہ انتاریو کی وفاداری پر شبہ کی بنا پر اختتام پذیر ہوا۔ دیکھتے ہیں کہ ہر کسی کو دل دے دینے والی شکیرا کا نیا جنون کتنا آگے بڑھ پاتا ہے۔

تعصب

غصہ اچھے اچھوں کی مت مار دیتا ہے' حالیہ کرکٹ ورلڈ کپ کے دوران سابق آسٹریلوی بیٹسمین ڈین جونز کو اپنے تعصب اور غصے کے باعث "ٹین اسپورٹس" چینل کی ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ہوا کچھ یوں کہ ساؤتھ افریقن پلیئر ہاشم آملہ نے سری لنکن بیٹسمین سنگاکارا کا کیچ پکڑا تو کمنٹری کرتے ہوئے ڈین جونز بے ساختہ بولے۔ "دیکھیے۔ دہشت گرد نے ایک اور وکٹ لے لی۔" ہاشم آملہ چونکہ مسلمان ہیں اس لیے ان کی غصے کا نشانہ بنے۔ نتیجتاً" ہاشم آملہ ڈین جونز کے خلاف ہتک عزت کا مقدمہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے' اس سے قبل ہی ٹین اسپورٹس نے ڈین جونز کو ملازمت سے برخاست کر دیا۔ (آسٹریلوی تھے شاید اس لیے برخاست کر دیا اگر امریکی ہوتے تو اس کارنامہ پر انہیں ترقی دی جاتی)

"سب چینل مطلب پرست ہوتے ہیں۔ انہیں صرف اپنا مفاد عزیز ہے۔ مجھے اپنے ساتھ ہونے والی دھوکہ دہی پر بے حد افسوس ہے تاہم مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اب بھی مجھے کئی چینلز کی طرف سے پرکشش آفرز ہیں لیکن میری نجی زندگی اتنی مصروف ہے کہ میرے پاس پاکستان آکر پروگرام کرنا ممکن نہیں۔ (لہٰذا دبئی میں رہ کر کچھ کر دکھائیں)

دبئی میں میرے شوہر کی کاروباری مصروفیات ہیں۔ پھر میرے بچے یہاں سیٹلڈ ہیں۔ اس لیے فی الحال کسی کو آفر نہیں کر سکتی۔" (یہ کیوں نہیں کہتیں کہ مطلوبہ آفر کا انتظار ہے)

عشق

محبت نہ قومیت دیکھتی ہے اور نہ ہی رنگ و نسل' یہ تو بس اچانک اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ اب معروف گلوکارہ و رقاصہ شکیرا کو ہی لیجیے جو ان دنوں اسپین کے فٹ بالر Gerard pique کے عشق میں گوڈے گوڈے ڈوبی ہوئی ہیں۔ "واکا واکا" گانے سے شہرت پانے والی اس گلوکارہ نے اپنے حالیہ انٹرویو میں اپنے افیئر کی تصدیق کی ہے۔ تیس سالہ گلوکارہ شکیرا کا اپنے سے دس سال کم عمر ہسپانوی فٹ بالر سے گزشتہ سال اس وقت افیئر پروان چڑھا جب وہ "واکا واکا"

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

گنگل (بڑا لیموں) کا اچار

ضروری اجزاء :

گنگل (بڑا لیموں)	ایک کلو
نمک	کھانے کے دو چمچے
ہلدی پاؤڈر	چائے کا ایک چمچہ
سرخ مرچ پاؤڈر	کھانے کے دو چمچے
ہینگ	چائے کا آدھا چمچہ
رائی پاؤڈر	چائے کا ایک چمچہ
کلونجی	چائے کے دو چمچے
سرسوں کا تیل	کھانے کے دو چمچے

ترکیب :

لیموں کو سلائس کی شکل میں کاٹ لیں اور اس میں سارا مسالا اور تیل ڈال دیں۔ اچھی طرح ملا لیں۔ اب اسے جار میں ڈال کر دھوپ میں رکھ دیں۔

کیری کا اچار

ضروری اجزاء :

کچی کیریاں بڑی بڑی	ایک سیر
کلونجی	ایک تولہ
میتھی کے دانے	ایک تولہ
سونف	ایک تولہ
رائی	ایک تولہ
سرخ مرچ	ایک چھٹانک
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

کیریوں کو کاٹ کر ان کی گٹھلیاں نکال لیں اور ایک' ایک کیری کے دو' دو ٹکڑے کر لیں۔ پھر کلونجی' میتھی' سونف اور نمک مرچ سب ملا کر ہر ٹکڑے میں بھر دیں۔ پھر چینی کے برتن میں رکھ کر اس کا منہ بند کر دیں۔ تین دن کے بعد خالص سرسوں کا تیل اتنا ڈالیں کہ کیریوں کے اوپر ڈیڑھ انچ تک تیل تیرتا ہوا نظر آئے۔ اس کے بعد چار' پانچ دن ایسے ہی پڑا رہنے دیں۔ آم گلنے پر استعمال میں لائیں۔

پیاز کا اچار

ضروری اجزاء :

پیاز	آدھا سیر
(آدھا بڑی گٹھی اور آدھا بالکل چھوٹے سائز کی)	
سرکہ	ایک سیر
سونٹھ اور رائی	دو دو تولہ
سرخ مرچ	ایک چھٹانک
سبز مرچ	ایک چھٹانک
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

پیاز چھیل کر بڑے بڑے ٹکڑے کر لیں اور چھوٹی پیاز صرف چھیل کر رکھ لیں' کاٹیں نہیں۔ سرکے کو ایک شیشے کے مرتبان میں ڈالیں اور اس میں نمک' سرخ مرچ' رائی اور سونٹھ سب باریک پیس کر ڈال دیں۔ کسی لکڑی کے چمچے سے خوب حل کر دیں۔ پھر اس میں پیاز ڈال کر تین' چار دن اسی طرح پڑا رہنے دیں۔ چوتھے دن پیاز گداز ہو جائے گا اور عمدہ اور لذیذ اچار تیار ہو جائے گا۔

کریلے کا اچار

ضروری اجزاء :

کریلے	ایک سیر
تیل سرسوں	آدھا سیر

میتھی دانے	آدھی چھٹانک
کلونجی	آدھی چھٹانک
سرخ مرچ	آدھا پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
خشک دھنیا	آدھا چھٹانک
ہلدی	ذرا سی

ترکیب :

کریلے درمیانہ سائز کے لے لیں اور ان کو چھلکے سمیت دھو کر صاف کر کے خشک کر لیں۔ اب ان کو درمیان سے کاٹ کر ان کے بیج نکال دیں۔ تیل میں سب مسالے ثابت ہی ملا دیں۔ نمک اور سرخ مرچ پیس کر ملا دیں۔ یہ تیل سے بھیگا ہوا مسالا کریلوں میں بھر کر ان کو دھاگے سے بند کر دیں۔ باقی مسالا اور تیل ایک مرتبان میں ڈال کر کریلے بھی ساتھ ڈال دیں اور چار 'پانچ دن تک نہ کھولیں۔ روزانہ دو 'تین گھنٹے دھوپ میں رکھیں۔ چار 'پانچ دن کے بعد کریلوں کا رنگ بدل جائے گا اور نہایت عمدہ کریلے کا اچار تیار ہو جائے گا۔

آلو بخارے کا مربہ

ضروری اجزاء :

آلو بخارے سیاہ سخت	آدھا سیر
چینی	تین پاؤ
عرق گلاب	کھانے کے چار چمچے
سیاہ مرچ	دس عدد
سبز الائچی	چھ عدد

ترکیب :

آلو بخاروں کو ٹھنڈے پانی سے دھو کر قلعی شدہ کھلے منہ کی پتیلی میں ڈال کر کچھ دیر آگ پر رکھ دیں۔ یہاں تک کہ وہ ڈھیلے ہو جائیں۔ اب انہیں اتار لیں۔ ایک دوسری پتیلی میں آدھ سیر چینی 'ایک پاؤ پانی اور عرق گلاب ڈال کر دھیمی آگ پر پکنے دیں۔ یہاں تک کہ چاشنی کو انگلیوں میں لینے سے تار بننے لگے۔ اب اس چاشنی میں آلو بخارے ڈال کر پکائیں۔ ساتھ ہی باقی چینی ڈال دیں۔ جب پانی سوکھ جائے تو آلو بخاروں کی گٹھلیاں اور چھلکے علیحدہ کر لیں اور شہد کی طرح گاڑھے مربے کو ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ جب ٹھنڈا ہو جائے تو اس میں سیاہ مرچ 'سبز الائچی اور کیوڑہ ملا دیں۔ ایک صاف شیشے کے مرتبان میں ڈال کر ڈھکنا بند کر دیں کہ اندر ہوا نہ جانے پائے۔

ہرے مسالے کا رائتہ

ضروری اجزاء :

دہی	آدھا کلو
ہرا دھنیا	ایک گٹھی
پودینہ	ایک گٹھی
ہری مرچیں	چھ عدد
کڑھی پتے	آٹھ پتے
کوکونٹ پاؤڈر	کھانے کے دو چمچے
لہسن	چھ جوے
نمک	حسب پسند
سفید زیرہ	چائے کے دو چمچے
شکر	چائے کا آدھا چمچہ

ترکیب :

تمام اجزاء کو اچھی طرح پیس لیں۔ پھینٹتے ہوئے دہی میں حسب ضرورت ہرے مسالے کی چٹنی ڈال کر مکس کریں۔ آخر میں ڈش میں ڈال کر فریج میں رکھیں۔ ہرے مسالے کا ذائقہ دار رائتہ تیار ہے۔

آپ کا باورچی خانہ

اسماء اقبال عوان

1 : کھانا پکاتے وقت ہمیشہ سب سے پہلے مزاجیت ذائقے پھر گھر والوں کی صحت اور سب سے آخر میں پسند ناپسند کا خیال رکھنا چاہیے۔

2 : گھر میں اب تو مہمان عموماً اطلاع دے کر ہی آتے ہیں اور نہ بھی بتا کر آئیں تو بھی کھانا تو کھلانا ہے بہت سی ایسی ڈشیں ہیں جو صرف 20 سے 30 منٹ تک تیار ہو جاتی ہیں مگر میری مٹن ہانڈی کھا کر سب یہ ضرور کہتے ہیں کہ کسی بھی ریسٹورنٹ سے اچھی ہے ترکیب کچھ یوں ہے کہ۔

مٹن مکھنی ہانڈی

اجزا :

گوشت (گول بوٹی)	آدھا کلو
لہسن ادرک پیسٹ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
سرخ مرچ	ایک چمچ
ہلدی	چوتھائی چمچہ
سوکھا دھنیا	ایک چمچہ
زیرہ	ایک چمچہ
تیل	حسب ضرورت
گرم مسالہ (پسا ہوا)	آدھا چمچہ
ٹماٹر	آدھا کلو
ہری مرچ	6/7 عدد
ادرک (باریک کٹا ہوا)	تھوڑا سا
ہرا دھنیا	تھوڑا سا
مکھن یا دیسی گھی	ایک چمچہ

ترکیب :

سب سے پہلے گوشت کو پریشر ککر میں ڈال کر لہسن ادرک سب مسالے سوائے گرم مسالے ڈال کر 10 منٹ پریشر دے لیں ساتھ ہی مٹی کی ہانڈی میں گھی گرم کرکے اس میں ٹماٹر ڈال دیں جب ٹماٹر گل کر پیسٹ بن جائے تو اس میں گوشت بمعہ مسالوں کے ڈال دیں گوشت کا پانی خشک ہو جانا چاہیے پھر ٹماٹروں میں گوشت کو اچھی طرح بھونیں کہ گھی اوپر آجائے اس کے بعد ہانڈی کو دم لگا دیں۔ سرو کرتے وقت دیسی گھی یا مکھن کا ایک چمچہ ڈال کر گرم مسالا، ہرا دھنیا، باریک ادرک اور باریک کٹی ہوئی ہری مرچ چھڑک دیں مزیدار مٹن ہانڈی تیار ہے۔ (آپ چکن بھی استعمال کر سکتی ہیں۔)

3 : کچن واقعی عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے

کچن کی صفائی ویسے تو ملازمہ ہی کرتی ہے لیکن صفائی کے بعد صفائی کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ بھی کرکے دیکھئے بڑا مزہ آتا ہے۔ میں تو بچپن سے یہی کر رہی ہوں کچن کی صفائی میں کیبنٹ کو ہمیشہ ترجیح دیں اور ممکن ہو سکے تو سب کیبنٹ میں ٹائلز لگوائیں کبھی بھی کچن میں کاکروچ وغیرہ نہیں ہوں گے (آزمائش شرط ہے) اور ایک اہم صفائی کوکنگ رینج کی ہے۔ میرے [illegible] ہمیشہ بہت تعریف ہوتی ہے حالانکہ سال کے بعد [illegible] لگتا ہے اس کے لیے یہ ہے کہ چولہے روزانہ [illegible] وہ بھی ایک کام ہوتا ہے [illegible] اور [illegible] برانٹ کے ساتھ پھر دیکھئے کہ [illegible] چمکتے ہیں ان کو بھی نظر انداز نہ کریں۔

4 : ناشتہ زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے بلکہ ایک ریسرچ کے مطابق [illegible] کو زیادہ ناشتہ کرنا چاہیے اور لڑکوں کو اس سے ان کا دماغ زیادہ مفید کام کرتا ہے۔

[illegible] ناشتہ بناتی ہوں تو مجھے بچوں کے لیے جس [illegible] ورائٹی ہوتی ہے پھر ساڑھے آٹھ بجے عمران کے لیے [illegible] مشکل ہوتا ہے اور اپنا ناشتہ میں اپنی میڈ کے آنے کے بعد کرتی ہوں تاکہ وہ بھی میرے ساتھ گرما گرم ناشتہ کر سکے۔ ناشتے میں بہت سی چیزیں بناتی ہوں ایک ترکیب جب بھی رات کے توس فرنچ ٹوسٹ بنائیں تو اس کے اوپر بھی تل، خشخاش یا میوہ جات لگائیں بہت اچھے لگتے ہیں۔ بہرحال آج آپ سب کے لیے یہ جھٹ پٹ تیار ہونے والی ترکیب۔

ایگ مایونیز سینڈوچ

اجزا :

انڈے ابلے ہوئے	دو عدد
مایونیز	3 بڑے چمچے
مکھن	1 بڑا چمچہ
کالی مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ

انڈے کو کاٹنے سے [illegible] مایونیز اور مکھن ملا کر نمک مرچ ڈالیں اور [illegible] ڈبل روٹی پر لگا کر کنارے کاٹ [illegible] ٹماٹر اور کھیرے بھی ڈال سکتی ہیں [illegible] فوائل میں پیک کر لیں [illegible]

[illegible] ڈبوں کو پلاسٹک یا ایلومینیم فوائل [illegible] سے آپ کا تاثر ہمیشہ خوش ذوقی اور سلیقہ مندی کا رہتا ہے۔

5 : باہر کھانا فیشن بھی ہے اور زندگی میں تھوڑی تبدیلی کے لیے بہت ضروری بھی ہے۔ شادی کے شروع سالوں میں تو لاہور کا کوئی ہوٹل نہیں چھوڑا جہاں کھانا نہ کھایا ہو پھر بچے بڑے ہوئے تو بس یہی KFC، Mc.Donald وغیرہ جس سے میں واقعی تنگ آچکی ہوں اب بھی کسی نئے ہوٹل کو ضرور ٹرائی کرتے ہیں برتھ ڈے، ویڈنگ اینیورسری، کسی تہوار پر ہمیشہ ریسٹورنٹ جاتے ہیں اور سب سے زیادہ مزہ تب آتا ہے جب ہم سب، بہن بھائی اپنے ابو اور اپنے اپنے اہل خانہ کے ساتھ جاتے ہیں اور بڑی سی ٹیبل پر سب کھانا کھاتے ہیں عموماً گھروں میں بارہ کرسیوں سے بڑی ڈائننگ ٹیبل نہیں ہوتی ہے اس لیے بڑے تو سب بیٹھ جاتے ہیں مگر بچوں کے لیے سائیڈ ٹیبل لگا جاتا ہے مگر جب ریسٹورنٹ میں میری فیملی کا چھوٹے سے چھوٹا بچہ بھی سب کے ساتھ بیٹھا نظر آتا ہے تو مجھے یہ منظر بہت بھلا لگتا ہے اور زندگی بھرپور۔

6 : موسم کو مدنظر رکھنا قدرت اور فطرت کا شکر گزار ہونا ہے جب ہمارے پیارے ملک میں چار موسم اس کے ساتھ رنگ برنگے پھل و سبزیاں ہیں اور ہر موسم کے لحاظ سے فائدہ مند اور ذائقے سے بھرپور ہوتی ہیں بغیر موسم کی سبزیوں اور پھلوں کو کھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا مثلاً "سٹرابری" کا جو ذائقہ جنوری میں ہے وہ جون میں نہیں اور آم اگست میں لطف دیتے ہیں نہ کہ دسمبر میں اس لیے میری رائے تو یہی ہے کہ ہر موسم کے پھل اور سبزیوں کو ان کے اپنے موسم میں استعمال میں لائیں۔ یہ یقیناً "صحت بخش" بھی ہیں اور ذائقہ دار بھی۔

7 : اچھا کھانا پکانے کے لیے بہت ضروری ہے کہ آپ اپنی فیملی کے ساتھ بہت پیار کرتے ہوں اور کام کو بوجھ سمجھ کر نہ کیا جائے دل سے، لگن سے کھانا پکایا جائے اور جب کھانا پکانا شروع کریں تو 7 مرتبہ سورۃ فاتحہ پڑھ کر شروع کریں انشاء اللہ کھانا بہت لذیذ بنے گا۔

8 : کچن کی ٹپ تو بے شمار ہیں، ہوم اکنامکس کی پڑھائی کی وجہ سے زندگی میں بہت اعتماد اور ڈسپلن پیدا ہو جاتا ہے۔

1- جب کوئی چیز فرائی کریں تو تیل میں ایک دو لونگ ڈال دیں فرائی کی ہوئی چیزوں کا ذائقہ بڑھ جاتا ہے۔

2- ادرک لہسن کے پیسٹ میں تھوڑا سرسوں کا تیل ڈال دیں ذائقہ ہفتوں خراب نہیں ہوتا۔

3- فریج میں کوئلہ یا بیکنگ پاؤڈر رکھیں بدبو نہیں آئے گی۔

4- جب بھی چاولوں کا زردہ بنائیں لکڑی کا چمچہ استعمال کریں۔ اسٹیل کے چمچے سے چاول اکڑ جاتے ہیں۔

5- بچوں کی روزمرہ کی غذا میں سونف، گاجر اور مصری کا استعمال رکھیں کبھی آنکھوں کی شکایت نہیں ہوگی۔

6- اپنی زندگی میں مثبت سوچ رکھیں اور اس پر ایمان رکھیں کہ جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے اور اللہ جو کرتا ہے وہ [illegible] ہے۔

خوف

ہم اپنی زندگی بے جا خوف میں گزار دیتے ہیں حالانکہ اکثر صورتوں میں خوف کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ خوف کی مختلف صورتیں ہیں جیسے شادی کا خوف، امتحان کا خوف، والدین سے جدائی کا خوف، ذمہ داری کا خوف، جنس کا خوف، انٹرویو کا خوف، نئی جگہ پر جانے کا خوف، کسی نئے آدمی سے ملنے کا خوف، مستقبل کا خوف وغیرہ۔

انسان جس طرح بعض حالات میں خوش ہو کر خوش ہوتا ہے اور بعض حالات میں رنجیدہ ہو کر غمگین اداس ہوتا ہے یا روتا ہے اس طرح وہ تکلیف سے متاثر ہو کر پریشان ہونے لگتا ہے اور پھر یہ عادت بن جاتی ہے۔ جس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے لہٰذا ہر وقت انسان گھبرایا ہوا نظر آتا ہے، اس کے چہرے پر ہر وقت اداسی اور پریشانی نظر آتی ہے۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ پریشانی محض ایک عادت ہے اور یہ نہایت بری عادت ہے یا اس کو یوں سمجھ لیجیے کہ انسان جب اپنے دماغ سے الٹا کام لینا شروع کر دیتا ہے تو اس کو پریشانی ہونے لگتی ہے اور دل و دماغ کی پوری قوت اسی قسم کے خوف اور اندیشوں کی وجہ سے زائل ہوتی رہتی ہے۔ مختصراً یہ عرض کرنا ہے کہ پریشانی کو خود پر سوار نہ کریں۔ اللہ پر بھروسا کریں۔

✡ ✡ ✡

ذہنی جمود کو اداسی اور تنگ مزاجی پیدا کرنے کی ایک وجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہر شخص میں قوت حاصل کرنے کی خواہش ہے اور ذہن کو اگر زنگ لگنے دیا جائے یعنی ذہنی قوتوں کو کسی کام میں نہ لایا جائے تو یہ ذہنی قوتیں پلٹ کر گویا [illegible] حملہ کر دیتی ہیں اور چڑچڑاپن اور اداسی کی سی کیفیت جنم لیتی ہے۔

ایک بار ایک ماہر نفسیات کو ایک ایسی عورت کا تجزیہ کرنے کا اتفاق ہوا جو معمولی معمولی باتوں پر اس قدر غصہ ہو جاتی کہ دیکھنے والے کو خوف آنے لگتا۔ انتہائی اداسی اور ڈپریشن اس کے جزو زندگی بن چکے تھے۔ یہ عورت سمندر کے کنارے ایک نہایت عالی شان ہوٹل میں آکر ٹھہری تھی۔ مختصری ملاقات کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ عورت کے مالدار ہونے میں قطعاً کلام نہیں اور اسے کسی قسم کی کوئی ذہنی اور جسمانی تکلیف بھی نہیں۔ اس عورت کا روزانہ پروگرام اس کی اپنی زبانی یوں تھا۔

"صبح بیدار ہوتی ہوں، اس کے بعد گیارہ بجے کے قریب باہر آتی ہوں۔ اگر موسم اچھا ہو تو سیر کے لیے نکلتی ہوں۔ اگر موسم ابر آلود ہو تو ہوٹل کے ڈائننگ روم میں بیٹھ کر اخبارات دیکھتی ہوں۔ دوپہر کا کھانا کھا کر سو جاتی ہوں اور شام کی چائے کے وقت نیند سے بیدار ہوتی ہوں۔ رات کا کھانا کھانے کے وقت تک یا تو ٹہل لیتی ہوں یا کار میں ادھر ادھر گھوم آتی ہوں۔ رات کا کھانا کھا کر تاش کھیلنے کی کوشش کرتی ہوں مگر اس قدر نیند آتی ہے کہ نو بجے سو جاتی ہوں۔"

بے شمار عورتیں خصوصاً امیر طبقے کی عورتیں محض اس لیے تنگ مزاجی کا شکار ہو جاتی ہیں کہ ان کو کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ اگر وہ گھر کا کام کریں تو ان کو بے صبری، افسردگی اور اداسی سے نجات مل سکتی ہے۔

مہ وش۔۔۔ نامعلوم شہر

آپ کی موجودہ ذہنی کیفیت کی صرف ایک وجہ ہے وہ یہ کہ آپ اپنے حالات سے، اپنے موجودہ ماحول سے فرار چاہتی ہیں اس لیے خیالی دنیا میں پناہ لی ہے۔

جہاں تک موروثی پاگل پن کا تعلق ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کی پھوپھی اور دادی پاگل نہ ہوں وہ بھی ناپسندیدہ حالات ماحول کی گھٹن کی وجہ سے اس کیفیت کا شکار ہو گئی ہوں۔

شادی کو صرف خاندان تک ہی محدود کر دینے اور صرف آپس میں ہی رشتے کرنے سے بہت سے مسائل جنم لیتے ہیں۔ اس سے نسل کمزور ہوتی ہے اور اگلی نسل میں بہت سی بیماریوں کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح وٹہ سٹہ بھی بہت سے جھگڑوں اور پیچیدگیوں کا باعث بنتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ آپ صدیوں کے ان قبیح رسم و رواج کو نہیں بدل سکتیں۔

آپ کے گھر کے حالات کے بارے میں [illegible] نہیں ہے کہ آپ کے لیے یہ ممکن ہے یا نہیں لیکن آپ جس ذہنی کیفیت کا شکار ہیں اس کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ آپ کسی اچھے ڈاکٹر سے معائنہ کرا کر دوائیں لیں۔ آپ کا مسئلہ ابھی دواؤں سے حل ہو سکتا ہے لیکن اگر بڑھ گیا تو پھر علاج مشکل ہو گا۔

اپنی بہن کے معاملے کو اللہ پر چھوڑ دیں کیونکہ آپ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتیں ویسے اس صورت میں جبکہ لڑکا اور لڑکی دونوں [illegible] ہیں شادی ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔

ایک بات کہنا چاہتی ہوں کہ آپ کہانیاں لکھنا شروع کر دیں جب آپ کہانیاں لکھیں گی تو ذہن مصروف رہے گا اور آپ کی خیالی دنیا ایک کہانی کی صورت میں ڈھل کر آپ کو ان خیالوں سے محفوظ رکھے گی۔

[illegible]

س: میں ایک شادی شدہ خاتون ہوں میرے دو بچے ہیں۔ آپی میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں جوائنٹ فیملی میں رہتی ہوں۔ میری ساس تو ایک شفیق خاتون ہیں البتہ میری نندیں میرے لیے مسئلہ بنی ہوئی ہیں۔ میں ایک اسکول میں پڑھاتی ہوں۔ صبح پانچ بجے سے رات گئے تک کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی ہوں پھر بھی تنقید کا نشانہ بنتی ہوں۔ میرے ہر کام میں کیڑے، دیر سویر ہو جانے پر الگ باتیں سنتی ہوں۔ ساس میری حمایت کرتی ہیں مگر بیٹیوں کے آگے بے بس ہیں (شاید اس لیے کہ نندیں بھی جاب کرتی ہیں)۔ آپی! میری نندیں خاصی تعلیم یافتہ ہیں مگر میرے مسائل سمجھنے کو تیار نہیں۔ شوہر الگ رہنے کو تیار نہیں کہ پھر دونوں بہنوں اور ماں کو کس کے سہارے چھوڑیں (نندیں بڑی اور غیر شادی شدہ ہیں)۔ گھر، شوہر، بچوں، ملازمت اور ساس کا خیال رکھنا اب میرے فرائض میں شامل ہے۔ شادی کے پانچ سالوں میں ہی میں بری طرح تھک گئی ہوں۔ خدارا مجھے بتائیں میں کیا کروں؟

ج: اچھی بہن! زندگی میں سب سے اہم چیز اعتدال ہے۔ ایک حدیثؐ کا مفہوم ہے۔ ہر کام میں درمیانی راہ بہتر ہے۔ بہت زیادہ اچھائی، ایثار و قربانی بھی مثبت رویہ نہیں کہا جا سکتا۔ سب سے پہلی بات تو یہی ہے کہ انسان ایک حد تک نبھاتا ہے پھر تھک کر گر جاتا ہے۔ بہت سی خواتین جو خود پر جبر کر کے اپنے اوپر بہت سے بوجھ لاد لیتی ہیں۔ وہ یا تو جسمانی عوارض کا شکار ہو جاتی ہیں یا گہرے ڈپریشن میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ سر درد تو جیسے مستقل ہو جاتا ہے۔ آپ کو شروع سے ایک نارمل رویہ رکھنا چاہیے تھا اور اپنی ذات کی حد تک کسی کو نشانہ بنانے کی اجازت نہیں دینا تھی۔

بہرحال جو ہوا سو ہوا۔ اب آئندہ کے لیے یہ مشورہ تو نہیں دیا جا سکتا کہ آپ کے شوہر آپ کو علیحدہ گھر میں رکھیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ معاشی طور پر اس کے متحمل نہ ہوں۔ ساس کی دیکھ بھال آپ کی ذمہ داری نہیں ہے جبکہ ان کی بیٹیاں موجود ہیں۔ اسی طرح سارے کام اپنے ذمے لینے کے بجائے کاموں کی مناسب تقسیم ہونا چاہیے اور چونکہ آپ کو بچوں کی دیکھ بھال بھی کرنا ہوتی ہے اس لحاظ سے تھوڑی سی رعایت ملنا چاہیے۔ نندوں کی باتوں پر توجہ نہ دیں اور انہیں مناسب لفظوں میں بتا دیں کہ آپ جو کام کر رہی ہیں اس سے زیادہ کرنا آپ کے لیے ممکن نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ وہ (نندیں) خاموشی اختیار کریں۔

✡

امت الصبور

صدف جبیں...... کراچی

س : میرے بال تو پہلے ہی بہت گرتے تھے لیکن شیمپو کے استعمال سے مزید گرنے لگے ہیں اور خشکی بھی بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ بال اتنے کمزور، روکھے، بے جان اور ساتھ ہی خشکی سے بھرے پڑے ہیں۔ کوئی نسخہ بتایئے کہ یہ خشکی ختم ہو جائے۔

ج : سب سے پہلے آپ اپنی غذا پر توجہ دیں۔ جلد اور بالوں کے لیے سب سے ضروری چیز ہے کہ ہماری غذا میں سبزیاں اور پھل شامل ہوں خصوصاً" وہ پھل جن میں آئرن پایا جاتا ہے اور چکنی، تلی ہوئی، تیز مرچ مسالوں والی اشیاء سے پرہیز کیا جائے۔ جو شیمپو آپ استعمال کر رہی ہیں اگر وہ آپ کو نقصان دے رہا ہے تو اس کا استعمال بند کر دیں اور بے بی شیمپو استعمال کریں۔

یہ ہلکا ہوتا ہے اور اس میں ضرر رساں اجزاء کم ہوتے ہیں۔
خشکی کے لیے آپ درج ذیل نسخوں پر عمل کریں۔

1۔ زیتون اور سرسوں کے خالص تیل کو برابر مقدار میں ملا دیں اور اس سے سر پر مالش کریں۔

2۔ ہفتے میں ایک بار انڈے کی سفیدی اور زردی خوب پھینٹ کر سر میں لگائیں اور اچھی طرح مالش کریں تقریباً" آدھا گھنٹہ لگا رہنے دیں پھر نیم گرم پانی سے دھولیں۔

3۔

لیموں کا رس	بیس گرام
کچا دودھ	پچاس گرام

ان دونوں چیزوں کو ملا کر سر کے بالوں میں اور ان کی جڑوں میں خوب اچھی طرح لگا کر لیں اور دو گھنٹے بعد دھو ڈالیں۔ ہفتے میں دو دفعہ سے زیادہ یہ استعمال نہ کریں کیونکہ سر پر لیموں کا زیادہ استعمال کرنے سے بالوں کے قدرتی رنگ پر برا اثر پڑتا ہے۔

4۔

سرکہ	دس ملی لیٹر
پانی	پچیس ملی لیٹر

پانی کو تھوڑا گرم کر کے سرکہ میں ملا لیں اسے روئی کے ساتھ بالوں کی جڑوں میں رات کو سونے سے پہلے آہستہ آہستہ لگائیں اور سوتے وقت سر پر کپڑا باندھ لیں۔ صبح کسی اچھے گلیسرین سوپ سے بال دھو ڈالیں۔ یہ عمل ہفتے میں دو بار کریں۔

5۔ بالوں کی خشکی اور روکھا پن دور کرنے کے لیے تھوڑے سے دہی میں ایک چمچ سرسوں کا تیل ملا کر لگائیں اور خوب مساج کرنے کے بعد نیم گرم پانی سے دھولیں۔

☼